چونکا دینے والی کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
اپریل 2012
PDFBOOKSFREE.PK

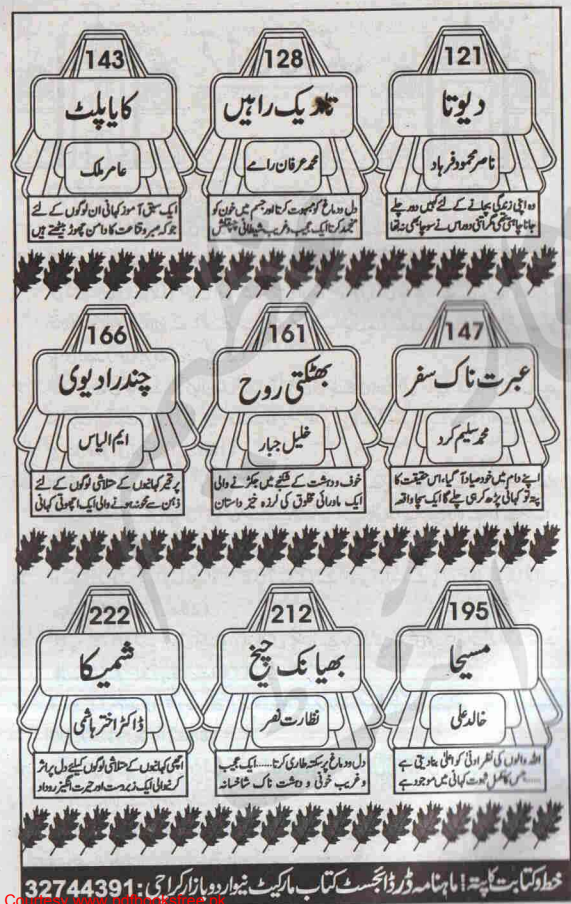

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆ اور ہم کسی قدر خوف اور بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو اللہ کی خوشنودی کی بشارت سنادو۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 155)

☆ کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ یوں ہی بہشت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم کو پہلے لوگوں کی سی مشکلیں تو پیش آئی ہی نہیں۔ ان کو بڑی بڑی سختیاں اور تکلیفیں پہنچیں اور وہ صعوبتوں میں ہلا ہلا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور مومن لوگ جو ان کے ساتھ تھے سب پکار اٹھے کہ کب اللہ کی مدد آئے گی۔ دیکھو اللہ کی مدد عنقریب آیا چاہتی ہے۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت۔ 214)

☆ اے اہل ایمان تمہارے مال و جان میں تمہاری آزمائش کی جائے گی اور تم اہل کتاب سے اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں بہت سی ایذا کی باتیں سنو گے۔ تو اگر صبر اور پرہیزگاری کرتے رہو گے تو یہ بڑی ہمت کے کام ہیں۔ (سورۃ آل عمران 3 آیت 186)

☆ اور وہی تو ہے جس نے زمین پر تم کو اپنا نائب بنایا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کئے تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں بخشا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے بے شک تمہارا رب جلد عذاب دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔ (سورۃ انعام 6 آیت 165)

☆ اور جان رکھو کہ تمہارا مال اور اولاد بڑی آزمائش ہے اور یہ کہ اللہ کے پاس نیکیوں کا بڑا ثواب ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 29)

☆ کیا یہ دیکھتے نہیں کہ یہ ہر سال ایک یا دو بار بلا میں پھنسا دیئے جاتے ہیں پھر بھی توبہ نہیں کرتے اور نہ نصیحت پکڑتے ہیں۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 146)

☆ تو وہ بولے کہ ہم اللہ ہی پر بھروسا رکھتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم کو ظالم لوگوں کے ہاتھ سے آزمائش میں نہ ڈال۔ (سورۃ یونس 10 آیت 85)

☆ جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کے لئے آرائش بنایا ہے تاکہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔ (سورۃ کہف 18 آیت 7)

☆ اور کئی طرح کے لوگوں کو ہم نے دنیا کی زندگی میں آرائش کی چیزوں سے بہرہ مند کیا ہے تاکہ ان کی آزمائش کریں ان پر نگاہ نہ کرنا اور تمہارے رب کی عطا فرمائی ہوئی روزی بہت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ (سورۃ طٰہٰ 20 آیت 35)

☆ کیا لوگ یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ صرف یہ کہنے سے کہ ہم ایمان لے آئے چھوڑ دیئے جائیں گے اور ان کی آزمائش نہیں کی جائے گی اور جو لوگ ان سے پہلے ہو چکے ہیں ہم نے ان کو بھی آزمایا تھا۔ (اور ان کو بھی آزمائیں گے) سو اللہ ان کو ضرور معلوم کرے گا جو (اپنے ایمان میں) سچے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں (سورۃ عنکبوت 29 آیت 2 سے 3)

☆ جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہے تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے میرے علم و دانش کے سبب ملی ہے۔ نہیں بلکہ وہ آزمائش ہے مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔ جو لوگ ان سے پہلے تھے وہ بھی یہی کہا کرتے تھے۔ تو جو کچھ وہ کیا کرتے تھے ان کے کچھ کام بھی نہ آیا۔ (سورۃ زمر 39 آیت 49 سے 50)

☆ مگر انسان عجیب مخلوق ہے کہ جب اس کا رب اس کو آزماتا ہے کر اسے عزت دیتا اور نعمت بخشتا ہے۔ تو کہتا ہے کہ (آہا) میرے رب نے مجھے عزت بخشی اور جب دوسری طرح آزماتا ہے کہ اس پر روزی تنگ کر دیتا ہے تو کہتا ہے کہ (ہائے) میرے رب نے مجھے ذلیل کیا۔ (سورۃ فجر 89 آیت 30)

☆ جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں صرف کرتے ہیں پھر اس کے بعد نہ اس خرچ کا کسی پر احسان رکھتے ہیں اور نہ کسی کو تکلیف دیتے ہیں ان کا صلہ ان کے رب کے پاس تیار ہے اور قیامت کے روز نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ جس خیرات دینے کے بعد لینے والے کو ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینی اور اس کی بے ادبی سے درگزر کرنا بہتر ہے اور اللہ بے پروا اور بردبار ہے۔ مومنو! اپنے صدقات و خیرات احسان رکھنے اور ایذا دینے سے اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور روز آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو اس کے مال کی مثال اس چٹان کی سی ہے جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو اور اس پر زور کا مینہ برس کر اسے صاف کر ڈالے۔ اسی طرح یہ ریاکار لوگ اپنے اعمال کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے اور اللہ ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ (سورۃ بقرہ 2 آیت 263 سے 264)

☆ اللہ تم کو انصاف اور احسان کرنے اور رشتہ داروں کو مدد دینے کا حکم دیتا ہے۔ اور بے حیائی اور نامعقول کاموں سے اور سرکشی سے منع کرتا ہے اور تمہیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم یاد رکھو۔ (سورۃ نحل 16 آیت 90)

☆ یہ لوگ تم پر احسان رکھتے ہیں کہ مسلمان ہو گئے ہیں۔ کہہ دو کہ اپنے مسلمان ہونے کا مجھ پر احسان نہ رکھو۔ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کا رستہ دکھایا بشرطیکہ تم سچے مسلمان ہو۔ (سورۃ حجرات 49 آیت 17)

☆ مومنو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو اللہ تم کو کشادگی بخشے گا۔ اور جب کہا جائے کہ اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہوا کرو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کے درجے بلند کرے گا اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ مجادلہ 58 آیت 11)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خطوط

فرزانہ عابد لاہور سے، مارچ 2012ء کا ڈر ڈائجسٹ انتظار، انتظار اور بہت انتظار کے بعد 22 فروری کو آخر کار مل گیا، دیکھ کر خوشیوں کی انتہا نہ رہی، تمام کام چھوڑ چھاڑ، ڈر ڈائجسٹ کو لے کر بیٹھ گئی، ہر ماہ قرآن کی باتیں پڑھ کر احکام خداوندی کا پتہ چلتا ہے اور میرے خیال میں جو لوگ دانستہ طور سے احکام خداوندی کو پس پشت ڈال دیتے ہیں وہ حقیقتاً سزا کے مستحق ہوں گے، مارچ کے شمارے میں "قرآن کی باتیں" میں واضح طور پر فرمایا گیا ہے کہ اللہ اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں تو مومنو! تم بھی پیغمبر پر درود بھیجا کرو اور پھر اہم بات یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا کرو، اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، نیکی کرو، بیشک اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اگر ان باتوں پر غور کیا جائے تو یہ باتیں ہم لوگوں کے لئے بہت اہم ہیں اور جو دانستہ ان سے چشم پوشی کرے گا تو یقیناً اس کے لئے جہنم کی آگ ہے، احکام خداوندی پر چلنے میں ہماری اپنی بھلائی ہے اور اس طرح ہم دین و دنیا میں سکھ چین سے رہ سکتے ہیں، خیر انسان کی اپنی اپنی سمجھ ہے کہ وہ اپنے لئے نیکی یا پھر بدی کی راہ اپناتا ہے۔ مارچ کی تمام کہانیاں بہت زبردست تھیں مگر جو زیادہ اچھی لگیں وہ ہیں آخری انجام، آخری چوری، کیتلی، قاتل پیراہن اور روحانی لگاؤ، ویسے مجموعی طور پر پورے کا پورا شمارہ زبردست ہے۔ شروع سے آخر تک تمام لکھنے والوں نے زبردست لکھا ہے۔ سارے رائٹر خوب سے خوب تر لگن سے لکھتے ہیں اس کے لئے تمام رائٹروں کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔ اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو ترقی سے نوازے۔

☆☆ فرزانہ صاحبہ: قلبی لگاؤ سے لکھی گئی آپ کی تمام باتیں واقعی غور طلب ہیں، اور جو لوگ دانستہ احکام خداوندی سے چشم پوشی کرتے ہیں وہ سزا سے نہیں بچ سکیں گے، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، عرض یہ ہے کہ ماہ مارچ 2012ء کا شمارہ، منفرد سرورق سے مزین میرے ہاتھ میں ہے، ابتدا "قرآن کی باتیں" سے ہوئی۔ خطوط میں مینجنگ ایڈیٹر خالد علی صاحب نے لہو کو گرماتے ہوئے جذبہ ایمانی کو جھنجھوڑ دیا۔ دیگر دوستوں کے جگمگاتے خطوط بھی اچھے لگے۔ کہانیوں میں ذیشان اقبال عظمی کی "آخری چوری" نے بہت متاثر کیا اور کئی مناظر میں رونگٹے کھڑے کردیئے، ایس امتیاز احمد کی "روحانی لگاؤ" کچھ الگ انداز لئے ہوئے تھی، پڑھنے کے درمیان بالکل بھی دھیان ہٹنے نہیں دیا، اس ماہ کی بہترین تحریر ناصر محمود فرہاد کی "کیتلی" تھی، ایک بہت ہی بہترین کاوش رہی، اس کو رائٹر نے اس انداز سے پیش کیا کہ اختتام تک اس تحریر نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ یہ تو تھی کہانیوں کی بات۔ اس کے علاوہ مجھے آج اپنے محسوسات کو سپرد قلم کرتے ہوئے مسرت کا بے پایاں احساس رگ و پے میں سرایت کرتا محسوس ہورہا ہے۔ تین سال! لگتا ہے وقت پر لگا کر اڑا ہے اور برسوں کی مسافت کو لمحوں میں مقید کرگیا ہے۔ آج مجھے ڈر کی خدمت کرتے تین سال مکمل ہونے والے ہیں۔ پہلی بار اپنے قلم کو جنبش دیتے ہوئے یہ سوچ میں بھی نہ تھا کہ میری تحریروں کو اس طرح پذیرائی نصیب ہوگی اور اس حوصلہ افزائی کے لئے میں ہمیشہ "ڈر والوں کی شکر گزار رہوں گی کہ انہوں نے مجھے آگے بڑھنے کا حوصلہ دیا۔ اس اظہار کو کہ "مجھے ڈر کے لئے لکھتے ہوئے 3 سال مکمل ہورہے ہیں" فخر محسوس ہورہا ہے۔ "ڈر" کا نام میری تحریروں کی پہچان بن چکا ہے اور ڈر کے نام کے بنا میری تحریر بے نام ہے۔ میں ساتھ یہ بھی کہنا چاہتی ہوں کہ میں اپنی تمام تحریروں کو اپنے پیارے پیا کو Didicate کرتی ہوں۔ کاش وہ زندہ ہوتے، کاش وہ میرے ساتھ ہوتے اور میری ان تحریروں کو پڑھتے کاش!!! میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنے پپا کو کتنا شدت سے مس کرتی ہوں۔ بس صرف یہ دعا مانگ سکتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت میں بلند ترین درجات میں انہیں جگہ دے۔ (آمین)

☆☆ ایس صاحبہ: قارئین کے ساتھ ساتھ ہماری بھی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے پپا کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ درجات سے نوازے اور تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم رکھے، یہ حقیقت ہے کہ وقت پر لگا کر اڑ رہا ہے، انسان حالات کی سنگینی میں اس قدر پریشان ہوکر رہ گیا ہے کہ وقت گزرنے کا احساس نہیں رہتا، کہانی آپ کی لیٹ موصول ہوئی لہٰذا اگلے شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔

سحرش اعظم لاہور سے، نیک تمناؤں کے ساتھ! امید ہے کہ آپ سب ٹھیک ہونگے۔ زندگی بہت مصروف ہوگئی ہے۔ فرصت کے اوقات تو بھاگ ہی گئے ہیں مگر "ڈر" کے لئے ٹائم نکال لیتی ہوں۔ میرے کزن کی پچھلے ماہ ڈیتھ ہوگئی، اس کی مغفرت کی

دعا کیجئے گا۔ اس کی موت ہمارے لئے بہت حیران کن تھی کیونکہ وہ بالکل ٹھیک تھا اور بہت چھوٹا تھا۔ 21 برس کی عمر میں ہی چل بسا، بس موت عمر وقت کچھ بھی نہیں دیکھتی، میرا ابھی پچھلے ماہ بہت زبردست ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ مگر جب اللہ کی ذات کا سہارا ہو تو پھر تو کوئی ڈر نہیں الحمدللہ اب میں بہت بہتر ہوں۔ آخر میں یہ کہوں گی کہ اللہ "ڈر" کو یوں ہی شاد و آباد رکھے۔ آمین۔

☆☆ سحرش صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے کزن کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے، اور آپ پر اپنا فضل و کرم کرے، خط لکھنے کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

ساجدہ راجا ہنڈواں سرگودھا سے، امید کرتی ہوں مزاج بخیر ہوں گے۔ اعزازی کاپی تھوڑی لیٹ موصول ہوئی اس لئے خط لکھنے میں بھی کچھ لیٹ ہوگی۔ کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، امید ہے آئندہ بھی شائع ہوتی رہیں گی۔ فروری کے شمارے میں محمد عرفان رامے لاہور کی کہانی کے کرداروں کے نام کے علاوہ باقی تمام کہانی نقل شدہ تھی۔ صرف نام تبدیل کئے گئے تھے۔ بہرحال باقی مارچ کے ڈر کا بھی مطالعہ جاری ہے۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترجمہ کہانیاں دوبارہ شائع ہو جاتی ہیں۔ ترجمہ کہانیاں لکھنے والوں کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کہانی کہیں اور بھی چھپ چکی ہے، بہرحال کہانی بھیجنے والوں کو خیال رکھنا چاہئے۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔ اگلے ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

آسیہ شاہین وہاڑی سے، امید کرتی ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا، آپ نے مجھ ناچیز کی چھوٹی سی تحریر کو اپنے خوبصورت ڈائجسٹ کی زینت بنا کے بہت عزت دی، اس کے لئے میں آپ کا شکریہ لفظوں میں بیان نہیں کرسکتی۔ مارچ کا ڈائجسٹ بھی اپنی مثال آپ تھا۔ بہت خوبصورت اور کہانیاں بھی بہت اچھی تھیں، مندر کا حصار، ٹھک ٹھک اور موت کی لوری بہت زبردست تھیں۔ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت چاہتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ سدا ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔

☆☆ آسیہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی آپ ڈر ڈائجسٹ کو خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔ Thanks۔

سیما ممتاز عباسی لاڑکانہ سے، فروری کا ڈر ہم نے پڑھ لیا ہے، جو روایتی رنگ ڈھنگ سے پڑھنے والوں کو اپنے اپنے موضوع پر لکھی ہوئی تحریریں یقیناً تسکین دیتی ہوں گی۔ ٹائٹل بھی اپنے نام کی طرح تھا۔ خاص طور پر پراسرار کہانیاں قابل برداشت ہوتی ہیں۔ ایم الیاس کی طویل کہانی میں کہیں کہیں پر جھول محسوس ہوتا ہے۔ آپ تو صاحب کمال لکھنے والے ہیں اور اس قسم کے جھول متاثر کردیتے ہیں، اصل موضوع کو! تاریخی کہانی قبلائی خان واقعاتی اور ایک تسلسل کو نمایاں کرنے والی کہانی ہے، جو ہمیں ایک ایسے دور میں لے جاتی ہے جو اپنی روایت پر بربریت کو جنم دیتی ہے! اس طرح سے ایک اور عجیب و غریب نام سے "رولوکا" طویل سلسلہ وار کہانی ہے جسے اے وحید اپنے انداز بیان سے رقم کرتے ہیں، بڑی گہرائی تک پڑھنے والوں کو لے جاتی ہے، اس انداز سے لکھنا صرف فاضل مصنف کا کمال رہتا ہے اس طرح سے ایک اور منفرد تحریر "کھڑکی" کا ہے جو پسند آئی، جسے پڑھ کر مجھے سیاہ فام شاعرہ "ایزرا پاویل" کی نثری نظم یاد آتی رہے، جس میں ایسا منظر تھا جیسے "کھڑکی" میں تھا۔ "شہر وحشت" بھی اپنے انداز میں اچھی تحریر تھی، اس طرح سے مجھے تازہ پرچے میں جو جو اچھی چیز لگی میں نے اس کا برملا اظہار کردیا ہے، یہ ضروری نہیں کہ میری ذاتی رائے سے اتفاق کیا جائے۔ پڑھنے والوں کے لئے متفرق تحریروں کو آنے والے پرچے سے شروع کرنا بہت اچھی بات ہے، کم از کم ہم جیسے کچھ نہ کچھ لکھ کر سکون حاصل کرلیں گے اجالکل اس شعر کی طرح تو اپنی طبیعت ہے۔

میں فقیروں سے ہی کرتا ہوں تجارت اکثر
جو ایک پیسے میں لاکھوں کی دعا دیتے ہیں

☆☆ سیما صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم آئندہ ماہ بھی قلبی لگاؤ سے لکھی ہوئی آپ کی تحریر کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

گلناز شہزادی فاروق آباد سے، قوی امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف اللہ کے فضل و کرم سے ٹھیک ہوگا۔ میں کچھ مہینوں کے بعد دوبارہ ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں شرکت کی جسارت کررہی ہوں۔ امید ہے آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے ڈر میرا اپنا ہے اور میں ڈر ڈائجسٹ کو جب تک پڑھ نہ لوں سکون نہیں ملتا، میری اللہ سے دعا ہے کہ اللہ ہمارے ڈائجسٹ کو دن رات چوگنی ترقی عطا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فرمائے۔ آمین۔

☆☆ گلناز صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر خوش آمدید، امید ہے آئندہ بھی آپ اپنی مصروفیات سے تھوڑا وقت نکال کر خط ضرور لکھیں گی۔

رضیہ عارف کراچی سے، 22 فروری کو مارچ کا شمارہ ہاتھوں میں آیا تو خوشیوں کی انتہا نہ رہی، شروع سے آخر تک کی تمام تحریریں اپنی مثال آپ ہیں، ہر تحریر کی تعریف نہ کرنا بھی زیادتی ہوگی، مگر فرداً فرداً تعریف کے لئے اتنے الفاظ لانا بس کی بات نہیں، بس میں صرف اتنا کہوں گی کہ ڈر ڈائجسٹ کی ہر تحریر اپنی اپنی جگہ بے مثال ہے، اور تمام رائٹر خوب لگن و محنت سے کہانیاں زیر قلم لاتے ہیں، میری دعا ہے کہ تمام رائٹروں کو اللہ تعالیٰ اور زور قلم دے، ڈر ڈائجسٹ کا ایسا چسکا لگا ہے کہ جب تک نیا شمارہ پڑھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ خیر ڈر ڈائجسٹ زندہ باد، اگلے ماہ پھر دوبارہ ملاقات ہوگی، ڈر ڈائجسٹ اس وقت تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ رضیہ صاحبہ: قلبی لگاؤ سے ڈر ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ بھی قلبی لگاؤ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

رانا ظفر اقبال جنڈانوالہ سے، السلام علیکم ا کے بعد عرض ہے کہ امید کرتا ہوں ڈر کا پورا عملہ اور قارئین سب خیریت سے خوش باش ہوں گے۔ پچھلے ماہ آپ کو خط نہ لکھ سکا اس کے لئے معذرت، پچھلے ماہ لیٹر لکھنے کی بہت کوشش کی، پر مصروفیات کی وجہ سے نہ لکھ سکا۔ لیکن اس ماہ بڑی مشکل سے ٹائم نکالا ہے۔ میں اور بھائی بشیر دونوں حاضر ہیں ماہ فروری کا رسالہ ملا۔ ٹائٹل اچھا تھا۔ کہانیاں سب اچھی تھیں پر قسطوار تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ قوس قزح کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ اب کچھ بات مارچ کے رسالے کی ہو جائے۔ جو 25 فروری کو نیوز ایجنسی سے ملا ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ قرآن کی باتوں کو پڑھ کر دلی سکون ملا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ مجھ سمیت تمام مسلمانوں کو نیک عمل بنائے (آمین) اس کے بعد محفل یاراں میں دوستوں کے خطوط پڑھے سب نے اچھا لکھا تھا۔ منیر احمد ساغر کا شکر گزار ہوں گے۔ انہوں نے میری چھوٹی سی کاوش کو پسند کیا۔ اس کے بعد کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ ہمیشہ کی طرح ''چندرادیوی'' ''رولوکا'' بہت اچھی تھیں اور ''دشمیکا'' کا پہلا حصہ بھی زبردست تھا۔ دیکھتے ہیں آگے آگے ہوتا ہے کیا۔

☆☆ رانا صاحب: خط لکھنے کہانیوں اور دیگر تحریروں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

اے ایس نواز بلوچ جڑانوالہ سے، امید ہے کہ سب قارئین خیریت سے ہوں گے۔ میں دو سال سے ڈر ڈائجسٹ کا مطالعہ کررہا ہوں۔ مگر مصروفیت کی وجہ سے کبھی خط نہ لکھ سکا۔ ڈر ڈائجسٹ میں پہلی بار لکھ رہا ہوں، امید ہے کہ آپ مجھ کو Welcome کہیں گے۔ مارچ کا ڈائجسٹ، اس بار پہلے سے جلدی مل گیا۔ ہمیشہ کی طرح رولوکا نمبرون رہی۔ دوسری کہانیاں ابھی تک زیر مطالعہ ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کے پورے اسٹاف کو صحت مند رکھے۔

☆☆ ناز صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی ڈر ڈائجسٹ کے لئے تھوڑا سا وقت نکال لیا کریں گے۔

محمد مشتاق ساغر چکی ننکانہ صاحب سے، سلام الفت کے بعد ہم تو خیریت سے ہیں اور آپ کی خیریت کے متمنی ہیں۔ سر بڑی لمبی غیر حاضری کے بعد دوبارہ لیٹر کی دنیا میں واپس آرہے ہیں۔ لیکن پڑھنے میں کبھی غیر حاضر نہیں رہے، ہر شمارہ وقت پر ملا اور مکمل پڑھا۔ شادی کے بعد حالات یکسر بدل جاتے ہیں۔ اللہ نے مجھے ایک چاند سی بیٹی عطا کی ہے۔ ڈر ڈائجسٹ میں دوبارہ شرکت کررہا ہوں۔ ڈر سے میرا رابطہ 26 مارچ 2010ء سے کچھ لکھنے تک ختم ہوا، آج جب یہ تحریریں پڑھیں رولوکا، اے وحید صاحب، چندرادیوی، میرے فیورٹ ایم الیاس صاحب اور ایم اے راحت صاحب کی شہر وحشت پڑھی تو قلم ہاتھ میں پکڑنے پر مجبور ہوگیا۔

☆☆ مشتاق صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، بیٹی کی خوشیاں بہت بہت مبارک ہوں، اگلے ماہ بھی آپ کے خط کا شدت سے انتظار رہے گا۔

قاسم رضا چنیوٹ سے، ڈر ڈائجسٹ کے تمام عملے کو ڈھیروں دعائیں! سوچا نہیں تھا کہ آپ تحریروں کو اتنا سنبھال کر رکھتے ہیں۔ کہانی دیر سے چھپنے پر آپ سے جو تلخ کلامی تھی اس کے لئے تہہ دل سے معذرت، تقریباً سال پہلے کی بات ہے۔ میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں۔ اس کے بعد میں نے سمجھا تھا کہ اب آپ میری کوئی تحریر نہیں چھاپیں گے مگر مارچ 2012ء کے شمارے میں اپنی تحریر دیکھ کر آنکھوں سے ندامت کے آنسو چھلک پڑے۔ واقعی ''ڈر'' کا اسٹاف ''گریٹ'' ہے۔ جو کسی کی محنت رایگاں نہیں جانے دیتا۔

دل نے کہا تھا کسی اور رسالے میں لکھنا شروع کروں۔ کہانی مکمل بھی کرلی مگر ''ڈر'' کے علاوہ کسی رسالے میں کہانی بھیجنا مجھے اچھا نہیں لگا۔ اس رسالے سے عشق سا ہوگیا ہے۔

''ہم تو محبت میں بھی توحید کے قائل ہیں فراز
ایک ہی ڈائجسٹ کو محبوب بنا رکھا ہے''

یہی وجہ ہے کہ لکھنا چھوڑ دیا مگر ہر ماہ ''ڈر'' ضرور پڑھتا ہوں۔ کہانیوں کی تعریف کرتا مگر ابھی پڑھی نہیں۔ ایک اور بات اگر آپ کو اچھا لگے تو میں پھر سے ''ڈر'' میں آنا چاہتا ہوں آپ کا جواب ''ہاں'' میں ہوا تو اگلے ماہ ایک اچھوتے موضوع پر کہانی بھیجوں گا جو کافی عرصے سے مکمل ہوگئی ہے اور اگر ''نا'' میں ہوا تو مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔ ایک بار پھر نہایت شرمندگی سے معذرت کرتا ہوں!

☆☆ قاسم صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ بصد شوق کہانی ارسال کردیں، ڈر کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا، اب تو آپ کو ارسال کئے بہت دن ہوئے، کہانی کا شدت سے انتظار ہے۔

دلکش امیر پوری لودھراں سے، السلام علیکم کے بعد ہماری دلی خواہش ہے خدا ہمیشہ ڈر لکھنے والوں، شائع کرنے والوں اور پڑھنے والوں کو خوش و خرم رکھے، جناب ہم آپ کے بہت ہی شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری غزل کی اصلاح کرکے شمارے میں جگہ دی۔ جناب تمام کہانیاں جو کہ پڑھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہیں۔ بعض لکھنے والوں کی تحریریں اس طرح ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں یا یہ واقعات ہماری آپ بیتی ہیں۔

☆☆ دلکش صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

احمد شیر خان لودھراں سے، مارچ کا شمارہ اچھا تھا، اپنا خط پا کر خوشی ہوئی، میری ایک کہانی اور غزل جو کہ میں نے پچھلے ماہ ارسال کی تھی اشاعت کی منتظر ہے اگر قابل اشاعت نہیں تو وہ بھی بتادیں۔ امید ہے جب میں اپریل کا شمارہ کھولوں گا تو اپنی کہانی اور غزل کو شامل اشاعت پاؤں گا۔

☆☆ شیر خان صاحب: کہانی شامل اشاعت ہے خوش ہوجائیں اور اسی خوشی میں فوراً ڈر ڈائجسٹ کو خط لکھ دیں۔

محمد بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم اور تمام قارئین خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا ڈر ڈائجسٹ ملا ٹائٹل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا۔ اس کے بعد فہرست میں کچھ نئے رائٹر حضرات نظر آئے۔ سب سے پہلے رولوکا کا مطالعہ کیا۔ جو ہمیشہ کی طرح نمبرون ہے۔ اس کے بعد چندرادیوی بھی اچھی تھی۔ ڈاکٹر اختر ہاشمی کی ''دشمیکا'' بھی اچھی تھی۔ دوسری حصے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

☆☆ محمد بشیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ بھیجنا بھولیں گے نہیں۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ خیریت سے ہوں گے اور میں خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں، ماہ مارچ کا تازہ پرچہ دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ سرورق بہت ہی خوب صورت تھا جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ایسا دلکش پرچہ نکالنے پر دلی مبارکباد قبول کریں۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ کہانیوں میں آخری انجام، زندہ بھوت، موت کا انتظار، رولوکا، شہر وحشت نے حد متاثر کیا تمام قلمکاروں کو میری طرف سے آداب عرض، ڈر ڈائجسٹ پہلے سے زیادہ ترقی کی راہوں پر گامزن ہے۔ پرچے سے دلی پیار ہے۔ جب تک آپ کو خط نہ لکھوں دل کو چین نہیں آتا۔ چند غزلیں ارسال کررہا ہوں کسی قریبی شمارے میں شائع کردیں۔

☆☆ اسلم صاحب: ڈر ڈائجسٹ سے آپ کی چاہت واقعی قابل دید ہے آپ کا خط پڑھ کر دلی خوشی ہوتی ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

محمد شاکر کاشان سکھر سے، میری طرف سے ڈر ڈائجسٹ کے تمام اسٹاف کو سلام امید ہے آپ لوگ خوش و خرم ہونگے اس دفعہ کا ڈر بھی اپنی مثال آپ تھا خاص کر آنکھیں اور کیتلی بہت زبردست اور چندرادیوی اور شہر وحشت خاص نہیں جا رہیں۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دل کو سکون ملا، قوس قزح کے لئے کچھ اشعار بھیج رہا ہوں امید ہے آپ انہیں ڈر کی زینت ضرور بنائیں گے میری طرف سے تمام رائٹر حضرات کو سلام اور اللہ سے دعا ہے کہ ڈر ہمیشہ ترقی کی منزلوں پر گامزن رہے۔ آمین۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

☆☆ شاکر صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، ڈر ڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا، اس کے لئے اور آئندہ بھی خط لکھنے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

عمران قریشی کوئٹہ سے، آپ سے مخاطب ہوں، کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ وجہ کچھ یوں ہے کہ کچھ روز پہلے ایک ایسے دوست سے ملاقات ہوئی جس کی تحریریں کچھ عرصے سے ڈر ڈائجسٹ میں شائع ہو رہی ہیں۔ قصہ مختصر ڈائجسٹ کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک ایسا خط نظروں کے سامنے سے گزرا۔ جو میری توجہ کا مرکز بنا۔ اور جس میں میری کافی عرصہ پہلے شائع ہونے والی تحریر "تین طرفہ" کو تنقید کا مرکز بنایا گیا۔ تنقید نگار کا نام "عثمان علی" تھا۔ خط میں میری کہانی کو نقل شدہ کہانی کہا گیا۔ میرے خیال میں پہلے یہ بتانا ضروری جانتا ہوں کہ نقل شدہ کہانی کیا ہوتی ہے۔ زیادہ تر قارئین اس بات سے واقف ہوں گے کہ ایک ایسی تحریر کو لفظ بہ لفظ لکھ کر اپنے نام کے ساتھ شائع کروا دینا۔ جو پہلے سے کسی کی ملکیت رہ چکی ہو۔ اور ترجمہ نہ ہو۔ نقل شدہ تحریر قرار دی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسی تحریر جو ترجمہ ہو۔ یعنی غیر ملکی تحریر کو اردو کے قالب میں ڈھال کر رائٹر کے نام کے ساتھ لفظاً ترجمہ لکھ کر تحریر کرنا معیوب نہیں۔ علاوہ ازیں کچھ تحریریں ایسی ہوتی ہیں۔ جو ترجمہ ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں حسب ضرورت ترمیم کر کے اپنے انداز میں اخذ کرنے کے بعد شائع کروانا ماخوذ کہلاتا ہے۔ عثمان علی کی تحریر ترجمہ تھی جبکہ میری تحریر ماخوذ تھی۔ بلکہ اگر یوں کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ تین طرفہ جو کہ تین حصوں پر مشتمل تھی۔ اس کے تینوں حصے ماخوذ کردہ تھے۔ یقیناً میں نے تحریر کے نیچے ماخوذ لکھا بھی ہوگا۔ ادارہ چیک کر سکتا ہے۔ یوں قصوار وار نہ تو میں ہوں۔ اور نہ ہی عثمان علی...... کچھ غلط فہمی تھی...... جو شاید دور ہو گئی ہوگی۔ خط کچھ لمبا ہو گیا ہے۔ پتا نہیں ادارہ شائع کرتا ہے یا نہیں...... پھر بھی بہت سی نیک تمناؤں اور خواہشات کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

☆☆ عمران صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں طویل غیر حاضری کے بعد دوبارہ موسٹ ویلکم، ترجمہ کہانیوں کے لئے اکثر کچھ حضرات شکایت کرتے ہیں جو ٹھیک نہیں۔ امید ہے آپ آئندہ اپنے پڑھنے والوں کو انتظار نہیں کرائیں گے۔

محمد نوید انجم چکوال سے، السلام علیکم قوی امید ہے کہ ڈر کا سارا اسٹاف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بالکل خیریت سے ہوگا اور اللہ پاک سے عاجزانہ دعا ہے کہ خیریت ہی رکھے۔ آمین۔ اس دفعہ ڈر "28" تاریخ کو ملا، ٹائٹل دیکھا، تو بہت ہی ڈر لگا اور رات کو خواب میں بھی ڈرا۔ "قرآن کی باتیں" پڑھیں ایمان کو تقویت اور تازگی ملی۔ خطوط کے شروع میں محترم خالد علی صاحب (مینجنگ ایڈیٹر) نے بہت اچھا لکھا۔ اللہ تعالیٰ خالق و مالک ہے جو چاہے کر سکتا ہے۔ اور وہ اپنے بندوں پر زیادتی نہیں کرتا اور ہمیں بھی اس کے فیصلے پر صبر کرنا چاہئے کیونکہ اللہ ہمارے لئے جو بہتر ہوتا ہے وہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے کندھوں پر اتنا زیادہ وزن نہیں ڈالتا جو ہم سہہ نہ سکیں ہمیں ہر حال میں اللہ پاک کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اللہ پاک ہمیں توفیق عطا فرمائے۔

☆☆ نوید صاحب: خط لکھنے اور تحریروں کی تعریف کے لئے شکریہ، انسان کو اللہ کی خوشی میں خوش رہنا چاہئے کیونکہ اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے اس میں انسان کی اپنی بھلائی ہے، آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

منیر احمد ساغر میاں چنوں سے، السلام علیکم، امید ہے کہ آپ اور ڈر ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف بخیریت اچھا ہوگا۔ اس بار تازہ شمارہ 26 فروری کو مارکیٹ سے مل گیا۔ سرورق اس بار بھی کلر فل تھا۔ قرآن کی باتوں کو پڑھا اور پھر خطوط کی محفل میں حاضری دی۔ خالد علی صاحب کی باتوں میں حتمی حقیقت پوشیدہ تھی۔ پھر کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا۔ "رولوکا" کی قسط نمبر 82 ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ چندرادیوی کی قسط 12 اور شہر وحشت کی نئی قسط 17 بھی بڑی عمدگی کے ساتھ مطالعے سے گزریں۔ اگلی اقساط کا شدت سے انتظار ہے۔ آخری صفحات پر مشتمل "شمیکا" کا پہلا حصہ پڑھا۔ ڈاکٹر اختر ہاشمی نے کافی اچھی کہانی تحریر کی ہے۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔

☆☆ منیر صاحب: قلبی لگاؤ سے خط لکھنے اور کہانیوں اور اشعار کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ Thanks۔

شفیق رضا میاں چنوں سے، السلام علیکم، خدا تعالیٰ آپ سب کو اچھی صحت اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ پچھلے ماہ بھی میں نے اپنے انتخاب شدہ چند اشعار اور غزلیں ارسال کی تھیں۔ جنہیں آپ نے شائع کر کے میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی۔ جس پر میں بے حد خوش ہوا ہوں۔ ایک عدد غزل اور دو اشعار کے ساتھ پھر حاضر ہوں۔ امید ہے دل توڑیں گے نہیں اور اس کے لئے پیشگی شکریہ۔ ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو۔

☆☆ شفیق صاحب: خط لکھنے اور دعائیہ کلمات کے لئے شکریہ، شعر شامل اشاعت ہیں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے، السلام علیکم جناب، مارچ 2012ء کا ڈر خوب صورت ٹائٹل سے مزین ہے۔ شمارے کی آخری کہانی شمیکا کا پہلا حصہ پڑھا۔ دوسرے حصے کا انتظار ہے۔ آخری انجام، آخری چوری، دونوں خوب رہیں۔ لنگڑا بھوت، زندہ بھوت، اچھی رہیں۔ کٹھ پتلی، خونی مکڑی، بری آتما، آنکھیں، فارم ہاؤس، موت کا انتظار حسب معمول ڈر کی شاندار روایت کے مطابق خوب رہیں۔

☆☆ بشیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ تحریر شامل اشاعت ہے۔ آئندہ ماہ بھی خط کا انتظار رہے گا۔

ایم مجاہد لیاقت ملتان سے، السلام علیکم: امید ہے تمام اہل ڈر ڈائجسٹ خیریت سے ہوں گے، مارچ 2012ء کا شمارہ ملا۔ مارچ کا شمارہ بہت خوب صورت اور عمدہ تھا جس کو پڑھ کر دل بہت خوش ہوا۔ مارچ کے شمارے میں بہت اچھی کہانیاں تھیں۔ ڈر ڈائجسٹ کو اللہ تعالیٰ ترقی کی منازل کی طرف رواں دواں رکھے۔ (آمین)

☆☆ مجاہد صاحب: یہ خوشی کی بات ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کے اشعار پڑھ کر آپ بھی اشعار کہنے لگے۔ کوشش کریں غزل کہتے کہتے شاعر بن جائیں گے۔ اگلے ماہ بھی خط لکھنا بھولئے گا نہیں۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، السلام علیکم ادارہ، سمیت ڈر کے ساتھیوں کو، قرآن کی باتوں کے بعد خطوط میں آئے۔ خالد صاحب کی سبق آموز تحریر کے بعد خطوط میں دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ محترم ساجدہ راجا کے تبصرے پڑھ کر بے اختیار احباب کے ساتھ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے، کیونکہ ساجدہ راجا صاحبہ نے تنقید و تبصرے کا جواب بھی دے دیا۔ خود ہی تنقید کی، خود ہی صفائی کر دی، چلو شکوہ گلہ ختم، ڈر کے سب ساتھی ایک کنبے کی طرح ہوتے ہیں کسی سے غلطی بھی ہو سکتی ہے۔ بہر حال آپ نے موت کا انتظار بہت خوب صورت طریقے سے لکھی۔ "ہم صرف پسندیدہ انتخاب کرتے ہیں، آپ کے ذہن کے سامنے ہم کچھ بھی نہیں۔" آخر میں سب قارئین کے لئے دعائیں...... ادارے کے بھی شکر گزار ہیں ہمیں ہر ماہ یاد رکھتے ہیں۔ شمیا کی دوسری قسط کا انتظار رہے گا۔

☆☆ شرف الدین صاحب: آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے کہ ڈر کے ساتھی، ایک کنبہ کی طرح ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ آپس میں بھی بہت کچھ چلتا رہتا ہے۔ سمجھداری اس میں ہے کہ جو پڑھا وہ بھول گئے، کیوں ٹھیک ہے ناں۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ مارچ 2012ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہماری اسٹوریز لگانے کا شکریہ۔ آرٹیکلز آپ کے پاس ہیں۔ مزید میٹر میں۔ مندر کا پجاری، غزل، مراسلے ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ اعزازی کاپی کا شکریہ۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور "ڈر ڈائجسٹ" کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام۔

☆☆ امتیاز صاحب: مندر کا پجاری شامل اشاعت ہے اور آپ کی ارسال کردہ دیگر تحریریں موصول ہو چکی ہیں جس کے لئے VV.Thanks۔

سکندر علی رضا فیصل آباد سے، ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ ملا ٹائٹل زبردست تھا ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی تمام کی تمام کہانیاں اچھی اور قابل ذکر تھیں۔ اور قوس قزح میں تمام کی تمام غزلیں اور اشعار بھی اچھے تھے جن کو پڑھ کر مزا آیا۔

☆☆ سکندر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ، آپ کی نئی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔

سجاد حسین نومی پنڈ دادنخان سے، قوی امید ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کا اسٹاف بخیریت ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ بہت معیاری رسالہ ہے۔ ایم اے راحت بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بلاشبہ بہت بڑے رائٹر ہیں۔ شاعری میں زینب نور اوکاڑہ نے بہت متاثر کیا۔ کہانیاں تو بھی اپنی مثال آپ تھیں۔ ڈر ڈائجسٹ بہت جلد تمام ڈائجسٹوں میں ٹاپ آف دی لسٹ ہوگا کیونکہ تمام رائٹر بہت محنت کر رہے ہیں۔

☆☆ سجاد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کی کہانی بنام "ناگ نقش" کمپوز ہو چکی ہے آنے والے شمارے میں شامل اشاعت ہوگی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولیں گے نہیں۔ شکریہ۔

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

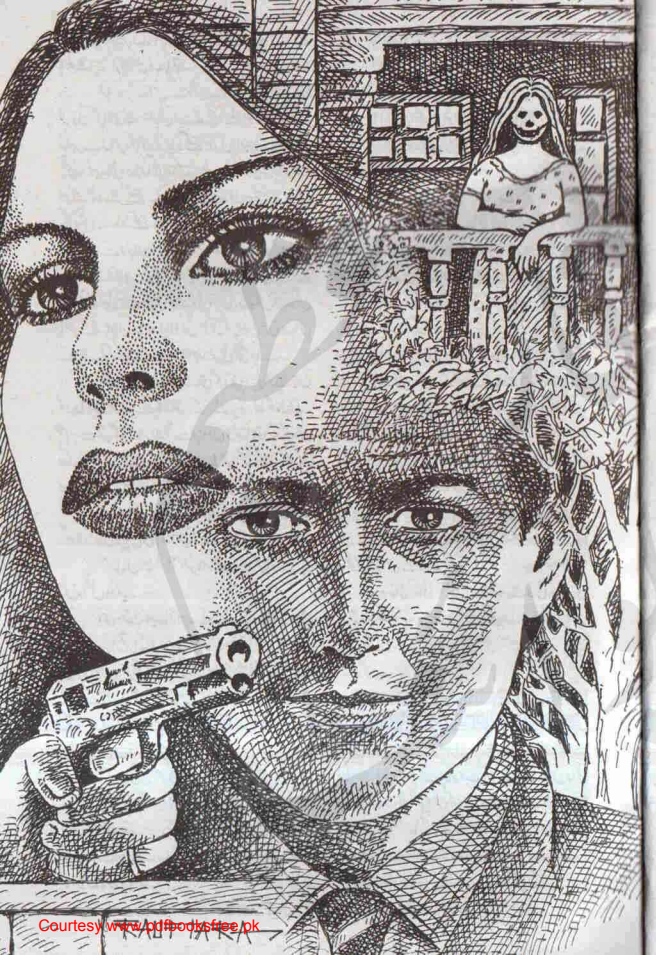

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مندر کا پجاری

ایس امتیاز احمد-کراچی

رات شبنم کے قطروں سے بھیگنے لگی تھی کہ اچانک وہ شعلہ دھن نظر آئی اس کا چہرہ شبنم کے قطرے ہی کی طرح نکھرا نکھرا سا نظر آرہا تھا، نوجوان نے خود کو اس کے سپرد کردیا، تو وہ جذباتی لہجے میں بولی، میں تمہیں امر کردوں گی۔

صدیوں پر محیط چاہت وخلوص کی ایک پراسرار، دل ودماغ سے محو نہ ہونے والی کہانی

رات بے حد تاریک تھی اور بادلوں سے گھرا ہوا آسمان یقین دلا رہا تھا کہ بارش ہوکر رہے گی، نوابزادہ عمر اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہ کبھی کبھی چونک کرتانگے والے سے ذرا تیز چلنے کے لئے کہتا اور پھر خیالات کے بھنور میں ڈوبنے ابھرنے لگتا۔ تانگے والے کا چابک فضا میں لہراتا تو گھوڑے کی رفتار میں تیزی آتی لیکن ذرا ہی دیر بعد پھر ڈلکی چلنے لگتا، اس مریل سے جسم کا تیز رفتاری سے کوئی تعلق ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

جان پور نامی اس قصبے کے یہ ویران سے راستے عمر کے لئے اجنبی تو نہیں تھے لیکن وہ کئی سال سے ان فضاؤں سے بچھڑا رہا تھا جہاں اس کے بچپن کی یادوں کی مہک رچی بسی ہوئی تھی۔ تعلیم کے حصول کے لئے اسے انگلینڈ جانا پڑا تھا۔ اس کے والد یعنی جان پور کے نواب شاہد الزماں اسے ملک کا سب سے بڑا سرجن دیکھنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے بوڑھے سینے پر جوان بیٹے کی جدائی کا پتھر بڑی خوشی سے رکھ لیا تھا۔ عمر ،ان کی مرحوم بیوی کی واحد نشانی تھا۔

جان پور کی عظیم الشان حویلی میں نواب شاہد الزماں کے متعدد عزیز بھی رہتے تھے جن کے بارے میں جان پور کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ جونکیں ہیں جو نواب صاحب کے جسم سے لپٹی ہوئی ہیں۔ ویسے اس سلسلے میں خود نواب صاحب کی پیشانی پر کبھی ایک شکن بھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ وہ اپنے تمام عزیزوں کو عزیز رکھتے تھے۔ ان عزیزوں میں سے کئی نے اپنی جوان بیٹیوں کو محض اس امید پر بٹھائے رکھا تھا کہ شاید کسی روز وہ جان پور کی نواب بیگم بن سکیں لیکن عمر نے اپنی رشتے کی ان بہنوں کی طرف اس نظر سے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے شادی کے بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ انگلینڈ جاکر بھی وہ صرف تعلیم کی طرف متوجہ رہا۔ مغرب کی رنگین فضاؤں کا نشہ بھی اس کے قدموں کو نہیں ڈگمگا سکا تھا۔

ہمہ تن اپنی تعلیم ہی میں مصروف رہتا لیکن اچانک اسے جان پور کا ایک ٹیلی گرام ملا جس کے دو فقرے اس کے ہوش وحواس اڑادینے کے لئے کافی تھے۔ اس نے فوراً ہی ایئرپورٹ کا رخ کیا، پہلی فلائٹ میں تو جگہ نہیں مل سکی تھی لیکن دوسری فلائٹ میں سیٹ مل گئی، اس نے ٹکٹ لینے کے بعد ایک ٹیلی گرام جان پور بھیج دیا کہ وہ فلاں فلائٹ سے پہنچ رہا ہے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ اسے پہلی ہی فلائٹ میں جگہ مل گئی۔ ہوا یہ تھا

کہ ایک مسافر نے اچانک طبیعت خراب ہونے کے باعث اپنا سفر ملتوی کر دیا تھا۔

طیارہ جب اس کے وطن کے ہوائی اڈے پر اترا تو کوئی بھی اس کا استقبال کرنے کے لئے موجود نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی آمد تو چار گھنٹے بعد کی فلائٹ سے متوقع تھی۔ بہرحال وہ بھاگم بھاگ ریلوے اسٹیشن پہنچا تھا اور صرف آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اسے پنجرٹرین مل گئی تھی۔ دو گھنٹے کا سفر تھا۔ جب وہ جان پور کے چھوٹے سے ویران اسٹیشن پر اترا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی اس کا استقبال کرنے کے لئے کوئی موجود نہیں تھا۔ خوش قسمتی سے اس کو اسٹیشن ماسٹر نے پہچان لیا اور اپنا ذاتی تانگہ کو چوان سمیت اس کے حوالے کر دیا تا کہ وہ جلد از جلد حویلی پہنچ جائے۔

گھوڑے کی رفتار بتا رہی تھی کہ حویلی پہنچنے میں آدھا گھنٹہ ضرور لگے گا۔ عمر کے لئے یہ آدھا گھنٹہ ایک قیامت بن گیا۔ بار بار اسے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ بار بار اسے یہ خیال آ رہا تھا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

خدا خدا کر کے تانگہ حویلی کے سامنے رک گیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر ملازمین باہر آ گئے تھے۔

''سامان اتارلو!'' عمر ملازمین سے کہتا ہوا حویلی میں داخل ہو گیا۔

اسی وقت بہت زور سے بادل گرجے اور حویلی کے در و دیوار تھرا گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بنیادیں ہل گئی ہوں۔ عمر تقریباً دوڑتا ہوا نواب شاہد الزماں کے کمرے میں داخل ہوا تمام عزیز و احباب وہاں موجود تھے..... صاف معلوم ہو رہا تھا کہ نواب صاحب کی آخری گھڑیاں آ پہنچی ہیں۔

''ابا جانی!'' عمر کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

بوڑھی آنکھیں ایک دم کھل گئیں جیسے ان کو اسی آواز کا انتظار تھا۔ ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ہمیشہ کے لئے جامد ہو گئی۔ روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

''ابا جانی!'' عمر چیخ کر بستر کے قریب پہنچ گیا۔

ایک ڈاکٹر اپنے اسٹیتھسکوپ سے جلدی جلدی نواب صاحب کے دل کی دھڑکنیں محسوس کر رہا تھا اور دوسرے ڈاکٹر کی انگلیاں نواب صاحب کی نبض پر تھیں۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون'' دونوں ڈاکٹروں کے منہ سے بیک وقت نکلا۔

سینے میں تڑپتی ہوئی محبت ایک چیخ کی صورت میں عمر کے منہ سے نکلی اور ساتھ ہی سارا کمرہ نواب صاحب کے عزیزوں کے رونے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ باہر زور زور سے بادل گرج رہے تھے۔

نواب صاحب کو ان کی آخری منزل تک پہنچا کر جب سب لوگ واپس حویلی آئے تو عمر کو ساری حویلی ویران ویران سی محسوس ہوئی۔ جان پور کے معززین اور عزیزوں کے ہجوم کے باوجود عمر کو سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک ایسی خلا، نظر آ رہی تھی جس کو پر کرنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔

وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر نواب صاحب کی خواب گاہ میں پہنچا۔ اور اندر سے دروازہ بند کر کے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ یہ اس کے باپ کا بستر تھا۔ شاید وہ اس پر اس لئے لیٹا تھا کہ باپ کی آغوش کا تصور کر سکے۔ وہ آغوش جو اس سے روٹھ چکی تھی۔

وہ خالی خالی نظروں سے سامنے والی دیوار کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتے دیکھتے یونہی اسے خیال آیا کہ برسوں قبل جب وہ چھوٹا سا تھا، اس وقت یہ دیوار سپاٹ نہیں تھی۔

اس دیوار میں ایک دروازہ تھا جو نواب بیگم یعنی عمر کی ماں کے کمرے میں کھلتا تھا۔ وہ اس وقت انتقال کر گئی تھیں۔ جب عمر صرف پانچ سال کا تھا۔ نواب صاحب اپنی بیگم سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اس دائمی جدائی نے ان کو نیم پاگل کر دیا۔ وہ اپنے لخت جگر عمر سے بھی بیگانہ ہو کر رہ گئے اور پھر ان پر کچھ ایسی ہی وحشت سوار ہوئی کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دنیا کی سیاحت پر نکل گئے۔ عمر کو انہوں نے اس کے اتالیق کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ کئی سال تک اپنے وطن سے دور رہے اور اس دوران شریف اور مدبر اتالیق نے حق ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ چھ سال بعد اچانک نواب صاحب واپس آ گئے۔

عمر نے اپنے رشتے کے چچا انور سے سنا تھا کہ جب نواب صاحب واپس آئے تھے تو بیحد گھبرائے ہوئے اور وحشت زدہ سے تھے۔ وہ گھبراہٹ اور وحشت کافی دن تک قائم رہی تھی اور پھر اچانک ایک روز انہوں نے معماروں کو بلوا کر اس دروازے میں اینٹیں چنوا دی تھیں۔ جو ان کی مرحوم شریک حیات کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ اس کے بعد نواب صاحب کی حالت سنبھلتی چلی گئی تھی اور ہفتہ دس دن بعد وہ اتنے مطمئن نظر آنے لگے تھے جیسے انہوں نے بے چینی سے نجات حاصل کر لی ہو۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ نواب صاحب نے وہ دروازہ کیوں بند کروا دیا تھا؟ نواب صاحب نے اس سلسلے میں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی اور ان سے پوچھنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

اب اس دروازے کی جگہ دیوار پر دو تصویریں آویزاں تھیں ایک تصویر نواب بیگم کی تھی اور دوسری خود نواب صاحب کی، نواب صاحب کی تصویر جوانی کے زمانے کی تھی اور سنے لوگ اس تصویر کو دیکھ کر یہ سمجھتے تھے کہ وہ عمر کی تصویر ہے۔ نواب صاحب اپنی جوانی میں بالکل ایسے ہی تھے جیسا اب عمر تھا۔ ان دونوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ عمر کی پیشانی بالکل صاف اور بے داغ تھی جبکہ نواب صاحب کی پیشانی پر ایک مسہ بھی تھا۔

یہ مشابہت کی حیرت انگیز مثالوں میں سے ایک تھی۔

عمر کے شب و روز اس طرح گزر رہے تھے جیسے کانٹوں پر بسر ہو رہے ہوں۔ اس نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ باپ کے ساتھ نہیں گزارا تھا لیکن اس کے دل کی تڑپ ایسی تھی جیسے باپ کا وجود ہی اس کے لئے سب کچھ رہا ہو۔ اس کا غم بانٹنے اور دل بہلانے کے لئے تمام عزیزوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اسے اپنے ساتھ بٹھائیں اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اس کے ذہن کا بوجھ کم کریں لیکن عمر ہر وقت سب سے الگ تھلگ رہنے کی کوشش کرتا۔ وہ حویلی سے باہر کبھی نہیں نکلتا تھا۔ باغ میں ٹہلتا رہتا یا اپنے کمرے میں جا لیٹتا۔

ایک روز کمرے میں لیٹے لیٹے ہی اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ اس دیوار کو توڑوا کر اپنی ماں کے کمرے کو دیکھے۔ اس نے شعور کے پہنچنے کے بعد وہ کمرہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے ماں کے کمرے میں پہنچ کر اس کے بے چین دل کو کچھ سکون محسوس ہو سکے۔ وہ لٹے لٹے ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اپنے خصوصی ملازم سلیم بابا کو آواز دی۔

بوڑھا سلیم بابا ہمہ وقت کمرے کے قریب ہی رہا کرتا تھا کہ نہ جانے کب چھوٹے سرکار کو کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے۔ وہ پہلی ہی آواز پر کمرے میں پہنچ گیا۔

''سلیم بابا!'' عمر نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''تم جانتے ہی ہو کے کہ اس دیوار میں بھی ایک دروازہ بھی تھا۔''

''جی چھوٹے سرکار!'' سلیم بابا نواب صاحب کا تیس سالہ نمک خوار تھا۔

''اب میں اس دروازے کو کھلوانا چاہتا ہوں۔ تم کسی کو بھیج کر مزدوروں کو بلوا لو۔''

''بہت اچھا چھوٹے سرکار.....!''

سلیم بابا کے جانے کے بعد عمر نے سگریٹ سلگائی اور کش پر کش لگاتا ہوا کمرے میں ٹہلنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد دروازہ کھل جائے اور وہ اپنی ماں کے کمرے میں پہنچ کر سکون قلب حاصل کرے۔

دروازے پر آہٹ سن کر وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ چچا انور کمرے میں داخل ہو رہے تھے۔ عمر نے جلدی سے اپنا دایاں ہاتھ پشت پر کر لیا جس میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے تپائی تھی جس پر ایش ٹرے رکھا ہوا تھا۔ عمر نے مڑ کر دیکھے بغیر سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا اور پھر اپنے چچا کی..... پذیرائی کے لئے جلدی سے آگے بڑھ آیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ نے کیوں تکلیف کی چچا جان! مجھے بلالیا ہوتا کیا کوئی خاص کام تھا......؟"

"بیٹے......!" انور چچا پرتشویش لہجے میں بولے۔ "مجھے ابھی ابھی سلیم بابا سے معلوم ہوا ہے کہ تم اپنی ماں کے کمرے کو کھول رہے ہو؟"

"جی چچا جان! شاید اس کمرے میں پہنچ کر مجھے کچھ سکون ملے۔" عمر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ تم جانتے ہی ہو کہ اس کمرے کو تمہارے والد نے بند کرایا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کی کوئی خاص ہی وجہ ہوگی۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ابا جان نے امی جان کی یاد کو فراموش کرنے کے لئے ایسا کیا ہوگا، اس کمرے کی چیزوں کو دیکھ کر انہیں بہت ہی یادیں آتی ہوں گی اور وہ تڑپ جاتے ہوں گے۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کمرے کو بند کرانے کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی۔"

"اگر کسی دوسری وجہ پر روشنی ڈال سکیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔"

"بیٹے!" انور چچا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "شاید تم میری باتوں کو ایک بوڑھے دماغ کے توہمات سمجھو لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ اس کمرے کو بند کروا کر ہی تمہارے والد کو کسی شیطانی چکر سے نجات مل سکی تھی۔"

"شیطانی چکر!" عمر نے استعجابیہ لہجے میں دہرایا اور پھر جلدی سے بولا۔ "آپ کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھئے۔"

انور چچا اپنی پیشانی پر تفکرات کی سلوٹیں لئے ہوئے آگے بڑھے اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ وہ چند لمحے تک دیوار پر آویزاں نواب صاحب کی تصویر کو دیکھتے رہے پھر بولے۔ "میں شیطانی چکر کی وضاحت تو نہیں کرسکتا لیکن اس بات پر یقین ضرور رکھتا ہوں کہ تمہارے والد کسی شیطانی چکر میں ضرور پھنس گئے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب تم بہت چھوٹے سے تھے۔ تم کو علم ہی ہوگا کہ بھائی صاحب چھ سال تک مفقود الخبر رہے تھے۔

چھ سال بعد اچانک ہی واپس آ گئے تھے مگر انہوں نے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ اس دوران وہ کہاں رہے، بہت پوچھنے پر بھی بس اتنا ہی کہتے تھے کہ ویرانوں کی خاک چھانتا رہا ہوں۔ ان دنوں ان کی حالت بڑی عجیب رہتی تھی۔ اکثر راتوں کو میں نے انہیں باغ میں ٹہلتے اور بڑبڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں ایسی سرخی بھی رہتی تھی جیسے رات بھر جاگتے رہے ہوں، ان کا یہ حال کافی دن تک رہا لیکن جیسے ہی انہوں نے اس کمرے کو بند کروایا ان کی حالت سنبھلتی چلی گئی۔"

"خوب!" عمر کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری۔ "گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس شیطان کو جو، ان کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس کمرے میں بند کردیا۔"

"میں یہ تو نہیں کہہ سکتا۔" انور چچا سنجیدگی سے بولے۔ "لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اس کمرے کے بند ہونے کے بعد ہی بھائی صاحب مطمئن ہو سکے تھے۔ اب اس سے تم جو نتیجہ چاہو اخذ کرلو!"

"میں تو صرف اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہوں کہ واپس حویلی میں آنے کے بعد ابا جان کی وحشت زدگی کا سبب امی جان کی یادیں ہی ہوں گی اور اس کمرے کو بند کر کے انہوں نے......"

عمر کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا کیونکہ اسی وقت سلیم بابا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"مزدور آ گئے ہیں چھوٹے سرکار!"

"انہیں یہاں لے آؤ......؟" عمر نے کہا۔

سلیم بابا چلا گیا...... انور چچا کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ بیحد فکر مند تھے۔ اچانک وہ کھڑے ہو گئے اور بولے۔

"بیٹے! ایک بزرگ کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ تمہیں سمجھا دوں اب یہ تمہارا فعل ہے کہ میرے مشورے کو قابل سمجھو یا نہ سمجھو۔"

"میں آپ کا مشورہ ضرور مانتا چچا جان لیکن آپ بیسویں صدی میں رہ کر پندرہویں صدی کی باتیں کر رہے ہیں شیطانی چکر آج کل نہیں چلا کرتے۔"

"ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو!" انور چچا نے کرسی سے اٹھتے ہوئے دھیرے سے کہا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

"یہ بوڑھے لوگ بھی عجیب ہی ہوتے ہیں۔" عمر شانے جھٹکتا ہوا بڑبڑایا۔

اتنے میں سلیم بابا مزدوروں کو لئے ہوئے کمرے میں آیا اور عمر سے دو ایک باتیں سمجھنے کے بعد تینوں مزدور اپنی کدالیں سنبھال کر دیوار پر ٹوٹ پڑے۔

اب اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ عمر نے لائٹ آن کی اور سگریٹ پیتا ہوا مزدوروں کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ جیسے جیسے دیوار ٹوٹ رہی تھی ویسے ویسے اب عمر کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ انور چچا کے فقرے اس کے کانوں میں گونجنے لگے تھے۔ وہ بار بار سر جھٹک کر ان لغو خیالات کو ذہن سے الگ کرتا...... لیکن وہ پھر آ چپکتے۔

دیوار پر کدالوں کے ٹکراؤ سے دھماکے ہوتے رہے اور ہر دھماکے پر دیواریں لرزتی ہوئی محسوس ہوتی رہیں۔ کچھ ہی دیر بعد دیوار میں اتنا بڑا سوراخ ہو چکا تھا کہ دو آدمی بیک وقت اندر داخل ہو سکتے۔ اس سوراخ کا وجود میں آنا تھا کہ عمر کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ وہ کمرے میں داخل ہونے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ کوئی انجانی قوت تھی جو اسے کمرے کے اندرونی حصے کی طرف کھینچ رہی تھی۔

"بس...... بس کرو!" وہ اچانک ہاتھ اٹھا کر مزدوروں سے بولا۔ کدالیں رک گئیں اور مزدور استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

"اب تم لوگ جاؤ! باقی کام کل صبح ہوگا۔" عمر نے کہا۔

ممکن ہے کہ پروگرام کی اس تبدیلی پر مزدوروں کے ذہن میں کچھ قیاسات ابھرے ہوں لیکن کسی قیاس کے اظہار کی ہمت ان میں سے کوئی نہیں کرسکتا تھا...... وہ چپ چاپ اپنا سامان لے کر رخصت ہو گئے۔ عمر نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور دیوار کے سوراخ کی طرف بڑھا۔ پھر کچھ سوچ کر ایک الماری کی طرف گھوم گیا۔ الماری کھول کر اس میں سے ایک ٹارچ نکالی اور دوبارہ اس سوراخ کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی پراسرار سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے سوراخ سے گزر کر جیسے ہی دوسرے کمرے میں قدم رکھا ایک نسوانی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"تم آ گئے......!"

عمر بے اختیار اچھل پڑا۔ اس نے ٹارچ جلا کر اس کی روشنی بڑی تیزی سے کمرے میں گھما دی لیکن کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ ایسا سناٹا تھا جیسے وہاں صدیوں سے ویرانی کا راج ہو۔

عمر نے اپنا سر جھٹکا اور پھر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بڑبڑایا۔ "میں بھی کچھ وہمی ہوتا جا رہا ہوں اور شاید یہ چچا انور کی باتوں کا اثر ہے۔"

کمرہ سامان آرائش سے مزین تھا لیکن ہر چیز پر گرد کی ایک ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی...... سامنے والی دیوار میں ایک بہت بڑا فریم آویزاں تھا جس میں عمر کی ماں کی تصویر مسکرا رہی تھی لیکن گرد کی تہہ میں وہ مسکراہٹ بھی مدھم سی پڑ گئی تھی۔

عمر کے جسم میں پھیلی ہوئی سنسناہٹ میں خاص اضافہ ہو چکا تھا اچانک اس کے قدم بے اختیار اس گوشے کی طرف اٹھنے لگے جہاں ایک آبنوسی میز پر ایک منقش صندوقچہ رکھا ہوا تھا۔ کوئی انجانی طاقت تھی جو عمر کو اس صندوقچے کی طرف لے جا رہی تھی۔ قریب پہنچ کر عمر نے دیکھا کہ...... وہ صندوقچہ مقفل نہیں تھا...... دوسرے ہی لمحے عمر نے اسے کھول ڈالا ٹارچ کی روشنی میں صندوقچے کے اندر رکھی ہوئی سونے کی جیبی گھڑی جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صندوقچہ کھلتے ہی عمر کے جسم کی سنسناہٹ ختم ہوگئی اور اسے سکون وطمانیت کا ایسا احساس ہوا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا ایک عجیب سی ٹھنڈک اس کے سارے وجود پر چھاتی چلی گئی تھی۔ پھر اچانک ہی اسے ایک ایسی بات کا بھی احساس ہوا کہ وہ دم بخود رہ گیا۔

جیبی گھڑی سے ٹک ٹک...... ٹک ٹک کی مدھم سی آواز آرہی تھی۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ عمر کے ذہن میں سوال ابھرا۔

''کمرہ تو سالہا سال سے بند تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ گھڑی بھی اسی وقت سے اس صندوقچے میں بند ہوگی۔ پھر یہ اب تک کیسے چل رہی ہے؟...... کیا واقعی اس کمرے سے کوئی شیطانی چکر وابستہ ہے؟''

بات کچھ بھی رہی ہو لیکن عمر اب بڑا سکون محسوس کررہا تھا۔

جب وہ سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو اس نے وہ پراسرار جیبی گھڑی اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔ گھڑی کی ٹک ٹک بدستور جاری تھی اور عمر کو یوں محسوس ہورہا تھا جیسے گھڑی کی وہ دھیمی سی آواز ہی اس کے اعصاب کو سکون پہنچا رہی ہو۔ جلد ہی اسے نیند آگئی۔ بڑی گہری...... اور پرسکون نیند تھی۔

لیکن رات کے کسی حصے میں اس نے ایک خوفناک خواب دیکھا...... اسے ایک استخوانی ہاتھ نظر آیا...... صرف ہاتھ...... کسی انسانی ڈھانچے کا ہاتھ جس کی انگلیوں میں ایک پھول دبا ہوا تھا۔ ایسے پھول عمر کی نظروں سے گزرے تو تھے مگر وہ ان کا نام نہیں جانتا تھا۔

استخوانی ہاتھ عمر کے چہرے کی طرف بڑھا۔ عمر کو ایسا لگا جیسے وہ استخوانی انگلیاں اس کا گلا دبا دینا چاہتی ہوں۔ قریب تھا کہ خوف سے اس کی چیخ نکل جاتی مگر اس سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔

کمرے میں زیرو واٹ کے نیلے بلب کی مدھم مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

یقیناً وہ کوئی خواب ہی تھا...... عمر نے سوچا اور اطمینان کی سانس لی۔ پھر وہ لیٹنا چاہتا ہی تھا کہ اس کی نظریں اپنے تکیے پر پڑیں اور اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی...... خواب میں نظر آنے والا پھول اب اس کے تکیے پر موجود تھا۔

عمر چند لمحے تو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس پھول کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس کا کانپتا ہوا ہاتھ پھول کی طرف بڑھا۔ اس نے پھول اٹھا کر اس طرح پھینکا جیسے وہ کوئی بچھو ہو...... وہ پراسرار پھول اس کے ہاتھ سے نکل کر وارڈ روب کی طرف جاتا نظر آیا لیکن فرش پر گرنے سے پہلے ہی وہ اس طرح غائب ہوگیا جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ اسے اچک کرلے گیا ہو۔

عمر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن پھول تو کجا اس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

عمر کا سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا اور دل کی دھڑکنیں بے قابو ہوچکی تھیں۔

تکیے کے نیچے سے گھڑی کی ٹک ٹک برابر سنائی دے رہی تھی، جیسے ہی عمر کا دھیان اس آواز کی طرف ہوا اس کے اعصاب پرسکون ہوتے چلے گئے۔

اگلے دن مزدوروں نے مزید دیوار توڑ کر اس میں دروازہ لگادیا۔ اب صرف رنگ وروغن ہونا باقی تھا اور اس کام کے لئے دوسرے مزدور بلائے جانے تھے۔

چچا انور کو جب اس کی اطلاع ملی تو وہ دروازہ دیکھنے آگئے لیکن دروازہ دیکھنے کا تو صرف بہانہ تھا وہ دراصل عمر کو دیکھنے آئے تھے اور یہ دیکھ کر انہیں اپنا دل سینے میں بیٹھتا ہوا سا لگا کہ عمر کے چہرے کی رنگت اڑی اڑی سی تھی اور آنکھوں میں کسی انجانے خوف کے سائے ناچ رہے تھے۔

''بیٹے!'' چچا انور بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''بہتر ہوتا کہ تم اس دروازے کو بند کروادیتے۔''

'اب بیکار ہے۔'' عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''کیا مطلب......؟'' چچا انور چونک پڑے۔

عمر اپنے جواب پر خود ہی ٹپٹا گیا تھا لیکن اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''میرا مطلب ہے...... اب تو دروازہ بھی لگ گیا ہے...... اور پھر یہ کہ ابھی تک میری عقل آپ کی باتوں کو تسلیم نہیں کرسکی ہے۔''

چچا انور نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور عمر کو ان سے نظریں چراتے ہی بن پڑی۔

اور پھر عجیب وغریب واقعات کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ پراسرار اور خوفناک واقعات کا سلسلہ...... اور ان واقعات کا محور صرف عمر ہی کی ذات تھی...... اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئیں۔ نت نئے خوفناک خواب نظر آتے تھے اور اس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ ان خوفناک خوابوں میں کبھی کبھی ایک خوب صورت عورت کا وجود بھی شامل ہوجاتا تھا اور بیداری کے عالم میں عمر نے یہ بات اکثر سوچی تھی کہ اتنی خوب صورت عورت اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

عمر کی زندگی اجیرن ہوکر رہ گئی تھی اور اب اس میں کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہا تھا کہ اس ساری مصیبت کی جڑ اسی کمرے میں تھی جسے عمر نے کھلوادیا تھا۔ چچا انور کی یہ بات ذہن نشین ہوگئی تھی کہ اس کمرے سے کوئی شیطانی چکر وابستہ ہے اور اسی چکر سے نجات حاصل کرنے کے لئے عمر کے والد نے اسے بند کروادیا تھا۔

اس کمرے سے عمر کو ایک پراسرار گھڑی ملی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے یقین تھا کہ ان خوفناک واقعات کا منبع ومخرج وہ گھڑی نہیں ہوسکتی اس کی مدھم سی ٹک ٹک تو اس کے اعصاب کو سکون پہنچاتی تھی۔

اس سلسلے کا آخری واقعہ عمر کے لئے بہت بھیانک تھا ایک روز بیٹھے بیٹھے اس پر جنون سا طاری ہوگیا۔ وہ اس وقت سارے خاندان کے ساتھ کھانے کی میز پر موجود تھا۔ اچانک اس نے پھل کاٹنے والی چھری اٹھائی اور انور چچا پر کھینچ ماری۔ وہ بال بال بچے تھے اور ان کو بچتے دیکھ کر عمر خود ہی ان پر ٹوٹ پڑا تھا۔ خاندان کے دوسرے افراد بمشکل تمام بیچ بچاؤ کرسکے تھے اور پھر عمر جیسے ایک دم ہوش میں آگیا تھا۔ وہ دم بخود کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

لوگوں کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھا ہے۔

اچانک اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا اور بڑبڑانے لگا۔

''میں پاگل ہوجاؤں گا...... میں پاگل ہوجاؤں گا۔''

اور پھر وہ اسی طرح بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

خاندان کے تمام افراد پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے تھے لیکن چچا انور کا انداز ترحم آمیز تھا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھی لی تھی۔ غالباً وہ یہی سوچ رہے تھے ''یہ سارا جھگڑا اس شیطانی کمرے کے کھل جانے کے باعث ہے۔''

دوسری طرف عمر اپنے کمرے میں بیٹھا سگریٹ پھونکتا ہوا سوچ رہا تھا۔ ''اسے یہ گھر چھوڑ دینا چاہئے ورنہ خدا جانے کیا ہوجائے۔''

اچانک اس کے ذہن میں خیال ابھرا۔ ''کیوں نہ وہ واپس انگلینڈ ہی چلا جائے۔'' یہ خیال اس کے ذہن میں جمتا ہی چلا گیا۔

تیسرے روز اس کا طیارہ فضا میں اڑ رہا تھا۔

عمر نے خاندان والوں کو اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا بس روانگی سے قبل چچا انور کے لئے ایک پرزہ کاغذ چھوڑ آیا تھا جس پر صرف دو فقرے بکھیر دیئے تھے۔

''میں واپس انگلینڈ جارہا ہوں...... اس روز مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی تھی اس کے لئے معافی کا طلب گار ہوں...... آپ کا عمر۔''

بوئنگ سات سو سات کی پرواز جاری رہی اور عمر اس الجھن میں گرفتار رہا کہ اس شیطانی واقعات کا پس منظر کیا ہوسکتا ہے۔

عمر کے بائیں ہاتھ پر کھڑکی تھی اور صاف شفاف شیشے کی دوسری طرف گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک عمر کو اس اندھیرے میں ایک چمک سی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا اور پھر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی پھیلتی چلی گئی جب اسے تاریک فضا میں وہی خوب صورت نسوانی چہرہ نظر آیا جو خواب میں دکھائی دیتا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی اور پورا چہرہ روشنی میں ڈھلا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ چہرہ عمر کو چند لمحوں کے لئے نظر آیا اور پھر اندھیرے میں تحلیل ہوگیا۔

''اوہ میرے خدا......! اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوٹا ہے۔'' وہ بڑبڑایا۔

''جی!'' عمر کے برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اب عمر بھی چونکا اور سنبھلنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ ''معاف کیجئے گا مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔''

اجنبی ہمسفر نے لاپروائی انداز میں شانے جھٹکے اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

عمر کو اب گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ اس نے ایئر ہوسٹس سے لیمن اسکوائش مانگا۔ وہ جلد ہی اس کے لئے گلاس لے آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔ ''کیا آپ متلی محسوس کر رہے ہیں؟''

''نہیں......بس کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔'' عمر نے جواب دیا اور پھر پوچھا۔ ''اس وقت ہمارا طیارہ کہاں ہے؟''

''ہم اس وقت کوہ الباء کو عبور کر رہے ہیں۔'' ایئر ہوسٹس کا جملہ پورا ہوتے ہی ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔

عمر کو ایسا لگا جیسے طیارے کے پرزے پرزے ہوگئے ہوں اور اس کے ساتھ ہی خود اس کا جسم بھی پارہ پارہ ہو کر فضا میں بکھر گیا ہو۔

آہستہ آہستہ عمر کے حواس بیدار ہونے لگے۔ ذہن پر دھند لکا سا چھایا ہوا تھا اور اس دھند لکے میں طیارے کی تباہی کا منظر بھی دھندلایا ہوا سا تھا۔ ایک ہولناک دھماکہ بے شمار چیخیں......اور طیارے کے بے شمار ٹکڑے جو تیزی سے زمین کی طرف جا رہے تھے۔ ان ٹکڑوں میں انسانی جسموں کے ٹکڑے بھی ضرور رہے ہوں گے۔

جب حواس پوری طرح بحال ہوئے تو عمر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا، اس کے نیچے سخت کھردری زمین تھی اور سر پر کھلا آسمان دائیں بائیں اونچی نیچی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں۔ عمر کو یاد آیا کہ اس کا طیارہ ایک ہولناک دھماکے کے ساتھ پھٹ گیا تھا۔ شاید کوہ الباء کی کوئی بلند چوٹی اس کی راہ میں حائل ہوگئی تھی۔

عمر نے بوکھلائے ہوئے انداز میں اپنا سارا جسم ٹٹول ڈالا لیکن کوئی زخم تو زخم معمولی سی تکلیف بھی جسم کے کسی حصے میں نہیں تھی اور یہ ایک حیرت انگیز امر تھا۔ ناقابل یقین اس حادثے میں طیارے کے کسی مسافر کا زندہ بچ جانا ناممکن تھا چہ جائیکہ اس طرح بچ جانا کہ جسم پر معمولی سی خراش تک نہ آئے یہ تو اسی صورت میں ممکن تھا کہ کسی پراسرار قوت کے غیر مرئی ہاتھ اسے فضا ہی میں سنبھال لیتے اور پھر نیچے لا کر آہستگی سے زمین پر لٹا دیتے۔

عمر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر اسے کچھ نظر نہ آیا۔ گھور تاریکی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ طیارے کا ملبہ اور اس کے مسافر زندہ یا مردہ جانے کہاں جا گرے تھے۔ عمر کو اپنے اردگرد چٹانوں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔

خشک ہوا کی ہلکی ہلکی لہریں چٹانوں سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کر رہی تھیں۔ اس آواز کے سوا ماحول پر مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ اس سکوت میں عمر کو اپنے دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں...... اور ہاں......ان دھڑکنوں کے ساتھ ایک اور آواز بھی شامل تھی۔ ٹک ٹک کی مدھم سی آواز، وہ پراسرار گھڑی عمر کی جیب میں موجود تھی۔

اچانک عمر کو وہ پراسرار نسوانی چہرہ یاد آ گیا جو اسے طیارے کی کھڑکی سے باہر تاریک فضا میں چمکتا ہوا نظر آیا تھا۔ عمر نے سوچا کہ طیارے کی تباہی کا باعث وہ چہرہ بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ طیارے کے ہوا باز کو بھی نظر آ گیا ہو۔ وہ ایک ایسی بات تھی کہ ہوا باز مبہوت ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا ہوگا اور اسے یہ خبر نہ ہوسکی ہوگی کہ کوہ الباء کی کوئی بلند چوٹی اس کے راستے میں حائل ہوگئی ہے۔

بہر حال یہ ساری سوچ صرف عمر کی تھی۔ طیارے کی تباہی کا سبب کچھ اور بھی ہوسکتا تھا۔

اب عمر کے لئے سب سے پریشان کن چیز اس کا اپنا مستقبل تھا۔ وہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، اسے نہیں معلوم کہ وہ شہری آبادی سے کتنی دور ہے۔ پچیس پچاس میل کی بات ہوتی تو سوچا جاسکتا تھا کہ وہ مر کھپ کر کسی نہ کسی طرح یہ فاصلہ طے کرلے گا لیکن اگر اس سے زیادہ فاصلہ تھا تو پھر کوئی بات بھی یقین سے نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اگر خورد و نوش کا سامان ساتھ ہو تو زیادہ فاصلہ بھی پیدل چل کر طے کیا جاسکتا ہے لیکن عمر کے پاس صرف وہی چیزیں تھیں جو جیبوں میں ہوسکتی ہیں۔ سگریٹ کا پیکٹ، ماچس، پرس، رومال اور سوٹ کیسوں کی چابیاں! بس یہی سب کچھ عمر کا اثاثہ تھا۔

عمر ایک حوصلہ مند نوجوان تھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اپنی بے بسی پر رو پڑتا لیکن عمر بھرپور امنگوں کے ساتھ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے سگریٹ نکال کر جلائی اور ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا اردگرد نظریں دوڑاتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر کسی طرح طیارے کے ملبے تک پہنچ جائے تو زندہ بچ جانے کے امکانات روشن ہوسکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ طیارے کی گمشدگی کا پتہ چلنے پر اس کی تلاش ضرور کی جاتی اور پتہ چل جانے پر امدادی پارٹیوں کو وہاں بھیجا بھی جاتا۔

طیارے کا ملبہ زیادہ سے زیادہ ایک میل کے دائرے میں ہونا چاہئے۔ عمر نے بڑے حتمی انداز میں سوچا اور یہ بھی یقین کرلیا کہ وہ ملبے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ رات کی تاریکی اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی مگر دن کی روشنی میں وہ لازمی طور پر اپنی منزل تک پہنچ جاتا۔

اس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے فضا میں اچھال دیا۔ سگریٹ جس طرح گرا، وہ اسی طرف چل پڑا۔ اسے بڑی احتیاط سے قدم اٹھانا پڑ رہے تھے کیونکہ اندھیرے کی وجہ سے کوئی کھڈ یا دراڑ نظر نہیں آ سکی تھی۔

اچانک اسے کچھ فاصلے پر مدھم سی روشنی دکھائی دی۔ وہ چونک پڑا اور ساتھ ہی ایک ایسا خیال بھی ذہن میں آیا کہ اس کے جسم میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ خیال یہ تھا کہ غالباً طیارے کا کوئی ٹکڑا پڑا ہوا جل رہا ہے درمیان میں کوئی چٹان حائل ہونے کی وجہ سے بس مدھم سی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

مگر جب وہ روشنی کے قریب پہنچا تو اسے پتہ چلا کہ وہ روشنی ایک غار کے دہانے سے باہر آ رہی تھی غالباً وہاں کوئی مشعل جل رہی تھی۔

''اس ویرانے میں کوئی رہتا ہے!'' عمر نے بڑی حیرت سے سوچا۔ اس کے قدم جو ٹھٹک کر رہ گئے تھے۔ پھر اٹھنے لگے ابھی وہ غار کے دہانے سے چند گز دور ہی تھا کہ ایک خوفناک قہقہے سے ساری فضا گونج اٹھی۔ اس کا دل بڑی زور سے اچھلا اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم یکلخت رک گئے۔

قہقہے کی گونج نے چٹانوں سے ٹکرا کر تاریک ماحول کو بڑا ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ اس کے مساموں سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ دل دھڑکنے کی رفتار بھی دوچند ہوچکی تھی۔ وہ سراسیمگی کی حالت میں کھڑا اس غار کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ قہقہے کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ کوئی دکھائی بھی دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا، اب ماحول پر پھر وہی پرہول سناٹا طاری ہوچکا تھا، کسی طرف سے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر اچانک ہی ایک بار پھر وہ سارا ماحول ایک شور سے گونج اٹھا۔ اس مرتبہ وہ شور اس غار کی طرف سے نہیں ہوا تھا بلکہ چاروں طرف سے آوازیں آتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چٹانوں سے آدمی ابل پڑے ہوں، ان کی تعداد تیس چالیس سے کم ہرگز نہیں رہی ہوگی......

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عمر بوکھلا بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے قدیم زمانے کے روم میں پہنچ گیا ہو۔ ان لوگوں کے جسموں پر قدیم رومن سپاہیوں کا آہنی لباس نظر آرہا تھا اور ہاتھوں میں بڑے بڑے بھالے تھے۔

پلک جھپکنے میں عمر نے خود کو ان کے نرغے میں پایا۔ ایک لمحے کے لئے تو اس کے ذہن میں یہی خیال ابھرا تھا کہ وہ سارے بھالے اس کے جسم پر برس پڑیں گے اور اس کا قیمہ بن کر رہ جائے گا..... لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان سب نے عمر کو نرغے میں تو لے لیا تھا مگر ان کے کسی انداز سے یہ بات ظاہر نہیں ہوئی تھی کہ وہ عمر سے کوئی جارحانہ سلوک کرنا چاہتے ہوں گے۔

اچانک ساری فضا ایک بار پھر اسی مکروہ قہقہے سے گونج اٹھی اور اس مرتبہ عمر کو غار کے دہانے پر وہ چہرہ بھی نظر آ گیا جو قہقہے لگا رہا تھا۔

وہ ایک بڑھیا تھی جس کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید نظر آرہے تھے۔ چہرے پر نحوست برس رہی تھی اور چمکتی ہوئی آنکھوں سے شیطانیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

عمر نے دیکھا کہ رومن سپاہی اسے دیکھتے ہی رکوع کی حالت میں جھکتے چلے گئے اور انہوں نے کچھ نعرے بھی لگائے تھے۔ ان نعروں میں سے صرف ایک ہی لفظ عمر کی سمجھ میں آسکا تھا جو کئی مرتبہ دہرایا گیا تھا اور وہ لفظ ''سیمیل'' تھا۔ لیکن عمر کے فرشتے بھی نہیں جانتے تھے۔ اس لفظ کا کیا مطلب ہے۔

بڑھیا کی کھرکھراتی ہوئی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی مگر جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ عمر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکا کہ رومن سپاہیوں نے بھی اس زبان میں نعرے لگائے تھے۔

بڑھیا کے خاموش ہوتے ہی ایک مرتبہ پھر ''سیمیل..... سیمیل'' کے نعرے لگائے گئے اور اس کے ساتھ ہی بڑھیا کا منحوس چہرہ غار میں غائب ہو گیا۔ تمام سپاہی جو ابھی تک رکوع کی حالت میں تھے، سیدھے کھڑے ہو گئے۔ عمر کے قریب کھڑے ہوئے دو سپاہیوں نے اس کے بازو پکڑ لئے مگر ان کی گرفت غیر دوستانہ نہیں تھی۔ وہ مسکرائے بھی تھے ان کی مسکراہٹ عمر کو اس لئے دکھائی دے گئی تھی کہ آسمان کے مغربی کونے سے چاند ابھر آیا تھا اور اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی چٹانوں پر ہر طرف چمک گئی تھی۔ چاندنی میں ان سپاہیوں کا آہنی خود اور لباس سونے کی طرح چمکنے لگے تھے۔

عمر صحیح معنوں میں حواس باختہ نظر آرہا تھا، یہ صورت حال اس کی عقل کے کسی گوشے میں بھی نہیں سما سکتی تھی۔

سپاہی اسے اپنے نرغے میں لئے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ وہ بیحد خوش نظر آرہے تھے۔ آپس میں گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا لیکن زبان عمر کے لئے اجنبی ہی تھی۔ ایک مرتبہ اس کے دل میں آیا کہ وہ ان لوگوں سے ان کے بارے میں پوچھے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ جس طرح وہ ان لوگوں کی زبان نہیں سمجھتا اسی طرح وہ لوگ بھی اس کی بات نہیں سمجھ سکیں گے۔

کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں دو سپاہی پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان کو غالباً اس لئے چھوڑا گیا تھا کہ وہ اس چھتر کی حفاظت کرسکیں جو ایک طرف رکھا ہوا تھا یہ اسی قسم کا چھتر تھا جیسا رومن اکابرین استعمال کیا کرتے تھے۔ عمر کے ذہن میں یونہی یہ خیال اُبھر آیا کہ اسے اس چھتر پر بٹھا دیا جائے گا اور چار سپاہی اس چھتر کو اپنے کاندھے پر اٹھا کر چلیں گے۔

عمر کا یہ خیال درست ہی ثابت ہوا۔ اب سپاہی اسے اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے چل رہے تھے۔ جب وہ تھک جاتے تو دوسرے چار سپاہیوں کی ٹولی ان کی جگہ لے لیتی۔

عمر کا ذہن اُلجھتا ہی چلا گیا۔ یہ سارا سیٹ اپ دیکھ کر تو اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ اس کے منتظر ہی تھے۔ گویا انہیں معلوم تھا کہ طیارہ یہاں آ کر تباہ ہوگا اور انہیں اس کا بھی علم تھا کہ وہ اس میں سفر کر رہا ہے۔ تیسرے وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ طیارے کی تباہی کے باوجود وہ زندہ بچ جائے گا۔

اب عمر کو یقین ہو چکا تھا کہ وہ کسی پُراسرار چکر میں پھنس گیا ہے۔ سارے ماڈرن خیالات دھواں بن کر اس کے دماغ سے اڑ گئے تھے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اس دنیا کے بعض حصوں میں پُراسرار قوتوں کی حکمرانی آج بھی موجود ہے۔

غیر یقینی مستقبل کے خیال سے عمر کا ذہن اُلجھتا رہا۔

سفر جاری تھا۔ اور وہ رات بھر جاری رہا۔ صبح قریب تھی جب کسی لمحے عمر کی آنکھ لگ گئی۔ وہ چھتر پر بیٹھے بیٹھے ٹیک لگا کر سو گیا کیونکہ تمام الجھنوں کے باوجود اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ جن لوگوں کے ساتھ تھا وہ اس کے دشمن نہیں تھے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک نرم و گداز بستر پر پایا وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا غالباً یہ خیمہ تھا۔ اس کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ دھیرے دھیرے ہل رہا تھا اور دھوپ اندر آ رہی تھی۔ غالباً کافی دن چڑھ چکا تھا۔ عمر بستر سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھا اور باہر نکل کر کھڑا ہو گیا۔

یہ ایک سرسبز و شاداب وادی تھی جس کے بیچوں بیچ پندرہ سولہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ ان خیموں کے ارد گرد گھوڑے چرتے پھر رہے تھے۔ تین چار رومن سپاہی بھی ادھر ادھر ٹہلتے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی قدیم رومن دستے نے پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔

عمر کو دیکھ کر رومن سپاہی چونکے اور پھر ان میں سے ایک سپاہی دوڑتا ہوا اس خیمے میں گیا جس کی رنگت دوسرے خیموں سے مختلف تھی۔ عمر اپنی جگہ پر کھڑا ہوا بڑی دلچسپی سے اس خیمے کی طرف دیکھتا رہا۔ چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس خیمے سے وہی رومن سپاہی کسی کے ساتھ باہر نکلا۔ وہ دوسری شخصیت اس رومن دستے کی کمانڈر معلوم ہوتا تھا۔ پھر وہ سپاہی تو دوسری طرف چل گیا لیکن کمانڈر سیدھا عمر کی طرف آیا۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ قریب آ کر اس نے مخصوص انداز میں عمر کو تعظیم پیش کی۔

''تم لوگ کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟'' عمر بے اختیار سوال کر بیٹھا۔

کمانڈر نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور پھر عمر کو خیمے کے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

عمر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور مزید خیمے میں داخل ہو گیا یہ بات اس کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی کہ وہ صورت حال سے آگاہ نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کے پیچھے پیچھے کمانڈر بھی خیمے میں آ گیا۔ بستر کے قریب آبنوس کی بنی ہوئی دو کرسیاں اور ایک تپائی موجود تھی۔ وہ دونوں ان کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ عمر کے معدے میں گزگڑاہٹ تھی بھوک پیاس کا درد عمل اس کے سوا اور کیا ہوتا۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی حالت سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا اس پر جھلاہٹ سی طاری ہونے لگی۔ کمانڈر اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور وقفے وقفے سے مسکرا دیتا تھا۔

اس سے پہلے کہ عمر جھلا کر اس کی مسکراہٹ کو گالیاں دینے لگتا خیمے کے دروازے پر پڑا ہوا پردہ ہٹا اور ایک سپاہی خوان سنبھالے ہوئے اندر آیا۔ بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو اس کی قوت شامہ سے ٹکرائی تو بھوک اور کھل گئی۔

جیسے ہی سپاہی تپائی پر خوان رکھ کر ہٹا، عمر کے ہاتھ حرکت میں آ گئے، وہ صرف کلی کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کمانڈر خاموش بیٹھا مسکراتا ہوا اس کی طرف دیکھتا رہا۔

بھنا ہوا گوشت کسی چھوٹے پرندے کا تھا۔ اس کی لذت نے عمر کو پوری طرح صاف کرنے پر مجبور کر دیا۔ سب کچھ صاف کرنے کے بعد عمر نے پانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ اسے اپنے پیروں کے نیچے زمین لرزتی محسوس ہوئی اور ہاتھ میں دبے ہوئے گلاس کا پانی چھلک کر اس کے کپڑوں پر گرا۔

کمانڈر چونک کر کھڑا ہو گیا اور بے ساختہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے منہ سے کوئی فقرہ نکلا۔ جس کا مطلب عمر کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

دوسری مرتبہ زمین کانپی تو عمر بھی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ایک طرف گر پڑا تھا۔

اچانک گڑگڑاہٹ کی آوازیں بھی سنائی دیں اور پھر باہر سے چیخ پکار کی آوازیں آئیں۔ کمانڈر خیمے کے دروازے کی طرف جھپٹا عمر بھی اس کے پیچھے لپکا تھا لیکن درمیان ہی میں لڑکھڑا کر گر پڑا کیونکہ اس مرتبہ زمین شاید ٹیکٹونک ڈگری کا زاویہ بناتی ہوئی ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ یہ ٹیڑھا پن چند لمحوں کے لئے ہوا تھا اور زمین پھر سیدھی ہو گئی تھی لیکن عمر تو گر ہی پڑا تھا۔ جیسے ہی زمین سیدھی ہوئی وہ اٹھ کر پھر خیمے کے دروازے کی طرف جھپٹا اور باہر نکل گیا۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی لفظ گونج رہا تھا۔

زلزلہ.....!

خیمے سے باہر نکلتے ہی اس نے ایک خوفناک منظر دیکھا۔ زمین میں کئی جگہ دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ دو خیمے ان دراڑوں میں پھنسے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ زمین کے ساتھ ساتھ اب وادی کے ارد گرد کے پہاڑوں نے بھی ہلنا شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار درخت جڑوں سے اکھڑ کر نیچے گرنے لگے۔

اچانک عمر نے پہاڑ کی ڈھلوان سے ایک درخت کو اکھڑ کر گرتے ہوئے دیکھا۔ وہ اسی جگہ گرتا جہاں عمر کے گھوڑے کو گرنا تھا اور جہاں سے دوسرے گھوڑے گزر رہے تھے۔ عمر کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ گھوڑا بغیر لگام کے تھا اس لئے یہ بات ناممکن تھی کہ عمر اس کا رخ تبدیل کر سکتا۔

درخت ایک دھماکے کے ساتھ زمین پر گرا اور گھوڑا اس کے نیچے پس گیا لیکن وہ گھوڑا عمر کا نہیں بلکہ اس کے آگے والے ایک رومن سپاہی کا تھا۔

عمر کے گھوڑے نے ایک جست لگائی اور درخت کے اوپر سے گزر گیا۔ اب وہ درہ نظر آنے لگا تھا۔ جہاں سے رومن سپاہیوں کے گھوڑوں کو گزرنا تھا۔

اچانک عمر کو ایک بار پھر اپنی موت صاف نظر آنے لگی بائیں طرف کے پہاڑ سے ایک بہت بڑی چٹان لڑھکتی ہوئی نیچے چلی آ رہی تھی۔

''اوہ..... خدایا.....'' عمر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

یکلخت گھوڑے کی رفتار کچھ اور تیز ہو گئی۔ شاید خدا نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اس کا تیز دوڑنا ضروری ہے۔

عمر ایک بار پھر موت کے خوفناک جبڑوں سے بچ نکلا چٹان ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ اس وقت زمین پر گری جب عمر کا گھوڑا گزر چکا تھا۔ عمر نے فوراً مڑ کر دیکھا کیونکہ اسے خیال تھا کہ کمانڈر کا گھوڑا زیادہ پیچھے نہیں رہا ہے۔

کمانڈر کے ساتھ چند دوسرے سپاہیوں کے گھوڑے بھی تھے۔ وہ سب کے سب چٹان کے نیچے دب گئے۔ ان کی آخری چیخیں بڑی لرزہ خیز تھیں۔ خون کی ایک بڑی سی چادر اس چٹان کے نیچے سے نکلی اور پھیلتی چلی گئی..... وہ منظر دیکھ کر عمر کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے موت کی ایسی گرم بازاری اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔

عمر کا گھوڑا درے میں داخل ہو گیا۔ عمر کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کے آگے ایک بھی گھوڑا نہیں تھا۔ کیا ان سب کو زمین نگل گئی تھی؟ عمر کو اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

گھوڑا دوڑتا رہا۔ عمر نے آگے جھک کر اس کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے تھے کیونکہ اس پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی۔ اس عالم میں وہ گھوڑے سے گر بھی سکتا تھا۔

وقت گزرنے کا احساس فنا ہو گیا..... عمر کو خیال نہیں تھا کہ گھوڑا کتنی دیر تک تیز رفتاری سے دوڑتا رہا اور کب اس کی رفتار بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔ پھر جب وہ رک ہی گیا تو عمر نے دھیرے دھیرے آنکھیں

کھولیں اسے اپنا اور گھوڑے کا عکس نظر آیا۔ چند لمحے تو اس کی عقل نے کام نہیں کیا لیکن پھر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ گھوڑا سر جھکائے ہوئے پانی پی رہا تھا۔ اسی پانی میں عمر کا عکس نظر آیا تھا۔

پیاس سے عمر کے حلق میں کانٹے پڑے ہوئے تھے کھانا کھانے کے بعد اسے پانی پینا نصیب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ جلدی سے گھوڑے کی پیٹھ سے اتر پڑا۔ یہ کوئی دریا تھا۔

عمر نے بھی جھک کر پانی پیا اور پھر گھوڑے کی گردن تھپتھپانے لگا۔ گھوڑا اپنی باچھوں سے پانی اڑا رہا تھا۔

اب عمر نے چاروں طرف دیکھا مگر اندازہ نہیں لگا سکا کہ گھوڑا اسے کس سمت سے یہاں لایا تھا وہ موت کی وادی نہ جانے کہاں رہ گئی تھی۔

عمر کھڑا ہوا ابھی اپنے غیر یقینی مستقبل کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اسے کافی فاصلے پر کچھ دھول سی اڑتی نظر آئی۔ اس کی نگاہیں اسی طرف جم گئیں۔ جلد ہی اس غبار میں سے کچھ گھوڑے نکلتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک لمحے کے لئے عمر کے جی میں آئی کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر کسی طرف بھاگ نکلے لیکن دوسرے ہی لمحے ایک ایسا خیال بھی ذہن میں آیا کہ وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔ شاید ایسی بے بسی اس نے زندگی میں پہلی بار محسوس کی تھی۔ وہ اگر بھاگتا بھی تو کدھر؟ اور اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس طرف آنے والے گھڑسوار اس کے دشمن ثابت ہوں گے یا دوست؟

ذرا ہی دیر میں وہ گھڑسوار واضح طور پر دکھائی دینے لگے۔ ان کے لباس اور ہتھیار دھوپ میں چمک رہے تھے۔ ان کا حلیہ رومن سپاہیوں جیسا تھا۔

''تو پھر انہیں میرا دوست ہی ہونا چاہئے!'' عمر زیر لب بڑبڑایا۔ اور جہاں تھا وہیں کھڑا رہا۔

گھوڑے قریب آ گئے اور ان کے سوار کود کر اتر پڑے وہ پندرہ سولہ تھے۔ زیادہ تعداد نوجوانوں کی تھی۔ مگر ایک معمر بھی تھا ان سب کے چہروں سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عمر کو پا کر بہت خوش ہوئے ہیں۔ وہ آپس میں گفتگو بھی کر رہے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ عمر کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔

معمر شخص عمر کے بالکل قریب آ گیا اور اس نے اشاروں ہی اشاروں میں کچھ کہنے کی کوشش کی۔ عمر جو بات سمجھ سکا وہ یہ تھی کہ اسے گھوڑے پر بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ چل پڑنا چاہئے اس نے ایسا ہی کیا اور وہ سب لوگ بھی گھوڑوں پر سوار ہو گئے ان کا رخ اسی طرف تھا جدھر سے آئے تھے۔

یہ سفر غروب آفتاب تک جاری رہا۔ اب ایک بستی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اندھیرا پھیلنے لگا تھا وہ بستی میں پہنچ گئے سات مکانات قدیم رومن کی یاد دلا رہے تھے۔ اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ مکانات کی چھتوں پر مٹی کی دبیز تہہ لگا کر جھاڑ جھنکاڑ اگا لئے گئے تھے۔ اس ماحول کو دیکھ کر عمر سوچنے لگا کہ وہ کہیں قبل از مسیح کے زمانے میں تو نہیں پہنچ گیا.....؟

یہ قافلہ ایک مکان کے سامنے پہنچ کر رکا اور ایک سفید پوش بوڑھے نے باہر نکل کر ان کا استقبال کیا۔

''خوش آمدید.....! عظیم ڈائنا کے اجنبی مہمان!'' بوڑھے نے کہا۔

عمر دم بخود رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہاں اس ماحول میں کوئی شخص اس کی زبان بول سکے گا۔

بوڑھے نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور مکان کے اندر لے گیا۔

وہ قدیم طرز کا پر تکلف انداز میں سجا ہوا کمرہ تھا جہاں بوڑھے نے عمر کو لے جا کر بٹھایا اور بولا۔

''عظیم ڈائنا کے مہمان.....! میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں۔ آپ آرام کرنا چاہتے ہیں یا کسی چیز کی خواہش محسوس ہو رہی ہے؟..... آپ بلا تکلف حکم فرمائیں.....!''

''میں..... میں.....'' آواز عمر کے حلق میں نکلنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہاں ہاں...... فرمایئے......!"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ میری زبان کیسے بول رہے ہیں۔"

"یہ عظیم ڈائنا کا فیض ہے اجنبی!...... اس نے صرف آج کے لئے مجھے یہ زبان بخش دی ہے کہ میں آپ کی زبان بول بھی سکوں اور سمجھ بھی سکوں۔ اگر عظیم ڈائنا ایسا نہ کرتی تو آج یہاں آپ کا استقبال کون کرتا اور کس طرح کرتا؟"

"ڈائنا کون ہے؟"

"آپ ڈائنا کو نہیں جانتے اجنبی؟" بوڑھا حیرت سے بولا۔ "وہ ہماری دیوی ہے۔ کائنات کی دیویوں میں سب سے بڑی دیوی۔"

عمر کا دماغ چکرا کر رہ گیا۔ اس نے کتابوں میں قدیم روم کی دیوی ڈائنا کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا لیکن یہ بات کبھی اس کے ذہن کے تاریک ترین گوشوں میں بھی نہیں آئی تھی کہ خود اسے ڈائنا سے واسطہ پڑسکتا ہے...... آج کے دور میں ان باتوں کی اہمیت اس طرح سے زیادہ نہیں تھی۔ اس نے یہ بھی پڑھا تھا کہ کوہ البا کے دامن میں ڈائنا کا جو مندر تھا وہ کبھی کا تباہ ہوچکا ہے۔

"دیوی...... ! عمر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ہاں میں اس کے بارے میں جانتا ہوں...... لیکن...... کیا وہ اب بھی ہے......؟"

"وہ ابدالآباد تک کے لئے ہے اجنبی......!"

"اچھا!" عمر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تو میں ڈائنا کا مہمان ہوں۔"

"ہاں اجنبی...... اسی لئے تم کو یہاں لایا گیا ہے۔"

"مگر کیوں...... ! کس لئے؟" عمر نے بے چینی سے کہا۔

"میں ایک حقیر انسان ہوں اس لئے عظیم ڈائنا نے مجھے کچھ نہیں بتایا میں ایک اندازہ تو لگا سکتا ہوں لیکن زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ ہوسکتا ہے کہ میری لب کشائی عظیم ڈائنا کو ناگوار گزرے...... ہاں تو آپ نے بتایا نہیں آپ کسی چیز کی خواہش تو نہیں محسوس کررہے ہیں......؟"

"فی الحال میں صرف آرام کرنا چاہتا ہوں۔"

"جب بھی آپ کو کسی چیز کی خواہش ہو، صرف ایک مرتبہ تالی بجا دیجئے گا......!" بوڑھے نے کہا پھر وہ احتراماً جھکا اور الٹے قدموں دروازے کی طرف لوٹ گیا۔

رات ہوچکی تھی۔

اور وہ رات عمر کی زندگی کی ایک یادگار رات بن گئی۔ ناقابل فراموش رات۔ اس رات کا نشہ، حلاوت اور بانکپن وہ کبھی نہیں بھول سکا تھا۔

کھانے میں لذیذ ترین اشیاء موجود تھیں جن کو کھا کر عمر پر غنودگی سی طاری ہونے لگی اور اسی عالم میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ شاید کوئی خواب تھا۔

رات کا ہر لمحہ جیسے خوشبو بن گیا۔ ساری فضا مست کن ہوچکی تھی دھیمی دھیمی گھنٹیاں سی بج رہی ہیں۔ جیسے دور کہیں سے شہنائیوں کا قافلہ گزر رہا ہو۔ جیسے کہکشاں کی لڑیاں بار بار وجود پاکر آسمان کی لامحدود وسعتوں میں بکھر بکھر جاتی ہوں۔

عجیب عجیب سے احساسات تھے عمر کے...... اور اس کے ذہن پر چھائی ہوئی خمار آلود سی کہر ایک چہرے کو جنم دے رہی تھی۔ ایک چہرہ طلوع ہورہا تھا۔ ایک ماہتاب کہر کا سینہ چیر کر اپنی تابانیاں بے نقاب کررہا تھا...... اوہ! وہ حسن جگر سوز......؟ وہ چہرہ پہلے بھی عمر کو خوابوں میں نظر آتا رہا تھا لیکن آج تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ایک ایسی بات کہ سینے میں دل دھڑک اٹھا اور ایسی بات کہ دنیا بھر کی شرابوں کا نشہ ایک ایک روئیں میں سما جائے۔

اور پھر اس چہرے کا جسم واضح ہونے لگا۔ وہ ایک شعلہ عریاں تھی۔ شاید دیویاں ستر پوشی کی منت کش نہیں ہوتیں۔ ہاں وہ دیوی تھی۔ عمر کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ڈائنا تھی۔

"ڈائنا!" عمر بے ساختہ پکار اٹھا۔

اور وہ یوں مسکرا پڑی جیسے کسی چمن میں منہ بند کلی چٹک گئی ہو۔

عمر نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ وہ بے اختیار ہوچکا تھا اور ڈائنا اس کے قریب ہوتی چلی جارہی تھی۔ ایک شعلہ تھا جو اس کے قریب آتا جارہا تھا۔ اس شعلے کی ایک ہی جھلک عمر کے خانہ دل میں آگ لگا چکی تھی۔ ایک ایسی آگ جس میں خوشی سے جل جانے کو جی چاہتا ہے۔

اس کا پیکر جیسے نور میں ڈھلا تھا۔ جیسے اس کے انگ انگ پر چاندنی متصل کی گئی تھی۔ بل کھاتے لہراتے بکھرے ہوئے اس کے لمبے لمبے بال سونے کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ ایک ایسا ہی حسن بے پناہ تھی کہ بڑے بڑے زاہدان خشک بھی "العطش......؟ العطش،" چیخ اٹھتے۔ عمر بیچارہ تو کسی شمار وقطار میں تھا ہی نہیں وہ اگر اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تو کوئی تعجب نہیں......!

وہ حسن جہاں تاب اس طرح عمر کی آغوش میں آ گرا جیسے خود بھی اس آغوش کی گرمی کے لئے بے چین رہا ہو۔ عمر کو اب کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ اس تابندہ چہرے پر جھکتا چلا گیا۔ اس کے لب لعلیں کی حلاوتیں عمر کے احساسات میں جذب ہونے لگیں۔ وہ ان آنکھوں کو بھی چوم رہا تھا جن پر غزالان فردوس بھی رشک کرسکتے تھے وہ ان آتشیں رخساروں کو بھی چھو رہا تھا جن سے مشک وعنبر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ عمر کے جذبات کی طغیانی اب کسی بند کے روکے نہیں رک سکتی تھی۔ وہ ڈائنا میں اور ڈائنا اس میں سما جانا چاہتی تھیں۔ وہ اس کے انگ انگ کی بے چینیوں کو اپنی بے چینیوں سے ہم آہنگ کررہا تھا۔

اور جب حسن وعشق سیراب ہوگئے۔ جب طوفانی جذبات نے دامن اعتدال تھاما اور جب بے ربط سے سانسوں نے مرکزیت کو اپنایا تو عمر آنکھیں بند کئے لیٹا ہوا تھا اور ڈائنا دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں اپنی خوب صورت اور مخروطی انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اس کے غلافی آنکھوں میں اب بھی سارے جہاں کا پیار

چڑیل

ایک عورت نے نئی Sim خریدی اور شوہر کو سرپرائز دینے کی خاطر اسے کچن میں جاکر کال کی، شوہر ڈرائنگ روم میں تھا۔

"ہیلو ڈارلنگ۔"

شوہر دھیمی آواز سے۔

"پلیز! تم مجھے بعد میں کال کرنا، ابھی چڑیل کچن میں ہے۔"

(ساجدہ راجا۔ ہنڈواں سرگودھا)

منجمد تھا۔ وہ اس طرح عمر کی طرف دیکھ رہی تھی جیسے وہ کبھی کوئی دیوتا ہو۔

محبت میں کیا نہیں ہوجاتا......؟ جب کیوپڈ کی محبت دنیا کی ایک عام سی لڑکی کو دیوی درجہ بخش سکتی ہے تو پھر دیویاں بھی کسی عام خاکی انسان کو دیوتا کے مرتبے پر فائز کرسکتی ہیں۔

اور پھر ڈائنا نے بولنا شروع کیا...... اس کی مترنم آواز عمر کے کانوں میں دلکش سازوں کا ارتعاش بکھیرنے لگی وہ کہہ رہی تھی۔

"عمر! تم صدیوں سے میرے ہو اور ہمیشہ میرے رہو گے، تمہارے جسم بدلتے رہیں گے لیکن صورت کبھی نہیں بدلے گی، تمہارے نام بدلتے رہیں گے لیکن روح نہیں بدلے گی...... کسی دور میں تمہارا نام ہپولیٹس رہا ہے اور کسی دور میں وربیں...... کسی زمانے میں شاہد الزماں اور کسی وقت میں عمر......!"

"شاہد الزماں......؟" عمر حیرت سے بولا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔

"ہاں......!" ڈائنا نے جواب دیا۔

"لیکن یہ تو میرے باپ......"

"ہاں یہ تمہارے باپ کا نام تھا لیکن دراصل وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی تم ہی تھے۔ مختلف جسم مگر ایک روح' فی الحال یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی لیکن جب میں تم کو عظیم طاقتوں سے سرفراز کردوں گی تو تم سب کچھ سمجھنے لگو گے۔"

عمر کو اب بھی یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے، ڈائنا کی آواز اسے بہت دور سے آتی معلوم ہو رہی تھی۔ جب وہ خود بولتا تھا تو اسے اپنی آواز بھی کسی کنوئیں کی گہرائی میں گونجتی محسوس ہوتی تھی..... اب ڈائنا اسے ایک قصہ سنانے لگی وہ کہہ رہی تھی۔

"کچھ عرصے پہلے بھی تم یہاں آئے تھے اس وقت تمہارا نام شاہد الزماں تھا اسی شاہد الزماں نے ایک عظیم فتح حاصل کی اور میرے مندر میں میرے پجاری کا منصب سنبھالا اگر وہ یہاں زیادہ عرصے رک جاتا تو میں اسے اپنی عظیم طاقتوں سے سرفراز کر چکی ہوتی اور پھر وہ کسی سے خائف نہ ہوتا لیکن وہ اس سے پہلے ہی یہاں سے ڈر کر بھاگ نکلا۔ اسے میرے قدیم مخالف پانی اور سمندر کے دیوتا پوسیڈون نے ڈرایا تھا۔ وہ اتنا خائف ہوا کہ میری محبت اور میری جسمانی قرب کی لذتوں کو فراموش کر کے یہاں سے بھاگ نکلا۔" ڈائنا نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ مجھے امید تھی کہ اسے پھر یہاں بلالوں گی کیونکہ ایک ہی چیز شاہد الزماں کے پاس تھی جو کویا میرے نمائندے کی حیثیت سے شاہد الزماں کے ساتھ رہتی۔ وہ ایک عجیبی گھڑی تھی۔ شاہد الزماں اکثر اس میں چابی بھرا کرتا تھا ایک روز میرے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ میں نے وہ گھڑی لے کر اپنی مٹھی میں بند کرلی اور چند لمحے بعد مٹھی کھول کر گھڑی اسے واپس کردی میں نے اس سے کہا تھا کہ اب اسے زندگی بھر اس گھڑی میں چابی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ جب تک یہ دنیا قائم ہے گھڑی اپنا کام کرتی رہے گی اور اس میں سے نکلنے والی ٹک ٹک کی آواز اس کے اعصاب کو پرسکون رکھے گی بلکہ اس کے دل میں میری محبت کو تابندہ رکھے گی۔

عمر کو وہ گھڑی یاد آگئی جو اس نے اپنی ماں کی خواب گاہ سے نکالی تھی اور جو اس وقت بھی اس کے پاس موجود تھی۔

ڈائنا کہتی رہی..... "گھڑی سے نکلنے والی ٹک ٹک صدا کی آواز شاہد الزماں کو ایک بار پھر میرے پاس لے آئی۔ لیکن وہ پوسیڈون سے اتنا خائف ہوگیا تھا کہ اس نے گھڑی ہی سے نجات حاصل کرلی۔ اس نے اپنے چند مذہبی عالموں کی نگرانی میں اس گھڑی کو ایک کمرے میں بند کردیا اور عالموں نے اس کمرے پر نہ جانے کیا پڑھ کر پھونکا کہ پھر میری طاقتیں بھی بے بس ہو کر رہ گئیں۔ دراصل اس گھڑی کو اگر زمین کے ساتویں طبق میں بھی پہنچایا جاتا تو میرے اشارے پر وہ پھر شاہد الزماں کے پاس پہنچ جاتی مگر ان عالموں کے جادو کے سامنے مجھے شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور میں شاہد الزماں کی واپسی کے سلسلے میں ناامید ہوگئی۔ بہرحال اس کے بعد بھی مجھے اپنے محبوب کا انتظار تھا۔ اس بات کا انتظار تھا کہ روح اپنا جسم بدلے گی..... اور جب روح نے اپنا جسم تبدیل کیا تو وہ خود ہی اس گھڑی کے لئے بے چین ہوگئی۔ اس نے وہ گھڑی حاصل کرلی اور پھر اس کی ٹک ٹک کی آواز نے اسے ادھر آنے پر مجبور کردیا۔"

"لیکن یہاں میری آمد محض ایک اتفاق ہے۔" عمر نے اس طرح کہا جیسے خواب میں بول رہا ہو۔ "اگر میرا طیارہ تباہ نہ ہوتا تو میں کہیں اور پہنچتا۔"

"ہرگز نہیں....." ڈائنا مسکرائی۔ "مجھے علم تھا کہ تمہارا طیارہ تباہ کیا جائے گا۔ دراصل میرے مندر کے موجودہ پجاری کو اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ میں تم میں دلچسپی لے رہی ہوں۔ اسے یہ ڈر رہا کہ تم مستقبل میں اس کی جگہ پر قبضہ نہ کر بیٹھو، چنانچہ اس نے تمہیں خوفزدہ کرنے کی کوششیں کیں، کیا تمہیں وہ خواب یاد نہیں رہے؟"

عمر کو وہ بھیانک خواب یاد تھے جن میں اسے کسی ڈھانچے کا استخوانی ہاتھ نظر آیا کرتا تھا۔

"وہ خواب تمہیں پاگل کردیتے۔" ڈائنا کہہ رہی تھی۔ "لیکن گھڑی کی آواز تمہیں سکون بخشتی رہی۔ پھر جب تم اپنے ملک سے بھاگتے لگے تو میری مراد بر آئی۔ تمہاری اس اڑنے والی مشین کو میرے دیس کی فضاؤں سے گزرنا تھا..... جب تم ادھر سے گزرے تو میرے مندر کے پجاری ارکلیس نے تمہاری اڑنے والی مشین کو تباہ کردیا۔ مجھے پہلے ہی سے اس کی توقع تھی اس لئے میں فضا میں موجود تھی میری انگلی کے ایک ہی اشارے سے تمہارا جسم بڑی آہستگی سے زمین تک پہنچ گیا اور چونکہ مجھے ان سب باتوں کا علم پہلے ہی سے تھا لہٰذا میں نے اس بستی کے سپاہیوں کو تمہارے استقبال کے لئے اس طرف روانہ کردیا تھا۔ وہ وہاں پہنچے اور انہوں نے تم کو خوش آمدید کہا۔"

عمر کو وہ بوڑھی عورت یاد آئی جو ایک غار میں سے نکلی تھی اور جس کا مکروہ قہقہہ سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے اس نے ڈائنا سے اس کے بارے میں پوچھا۔

"اوہ!" ڈائنا مسکرائی۔ "وہ سمبل ہے قدیم کاہنہ وہ سیکڑوں سال سے زندہ ہے اور سیکڑوں سال تک زندہ رہے گی ان لوگوں کو جو تمہیں لینے گئے تھے اس نے بشارت دی تھی کہ وہ بہت جلد تمام معیبتوں سے چھٹکارا پالیں گے۔"

"کیسی مصیبتیں.....؟"

"میرے مندر کا پجاری ارکلیس ان لوگوں کے لئے مصیبت ہی بن گیا ہے۔ بستی کی کنواریاں آئے دن اس کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔"

اب عمر کو وہ خوفناک زلزلہ یاد آیا اور وہ اس کا بھی ذکر کر بیٹھا۔

ڈائنا بولی..... "وہ مصنوعی زلزلہ تھا۔ وہ ارکلیس کی طاقت تھی جو اس وادی میں پہنچ کر زلزلہ بن گئی۔ اس کا مقصد تمہیں ہلاک کرنا تھا۔ ایک بار پھر میری ہی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی۔ لیکن وہ تمام آدمی ختم ہوگئے جو تم کو لینے گئے تھے۔ اسی لئے میں نے تم کو لینے کے لئے دوسرا دستہ بھیجا تھا۔"

عمر کے ذہن پر چھایا ہوا خمار اب گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ "کیا تم ارکلیس کی مخالف ہو؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں اس سے نفرت کرتی ہوں، میں اسے ختم کردینا چاہتی ہوں۔"

"تو کیا یہ تمہارے اختیار میں نہیں.....؟" عمر کی آواز ڈوبتی جارہی تھی۔

"تم ٹھیک سمجھے۔ دراصل ارکلیس کو سمندر کے دیوتا پوسیڈون کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اگر میں بذات خود ارکلیس کو ختم کرنا چاہوں گی تو پوسیڈون میرے مقابل آجائے گا لیکن اگر کوئی عام انسان ارکلیس کو مقابلے کی دعوت دے تو پوسیڈون غیر جانبدار رہے گا۔"

عمر کا ذہن ڈوبتا چلا گیا..... اور اب وہ نیند کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔

صبح جب وہ بیدار ہوا تو خمار اس کے دل و دماغ پر بدستور چھایا ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے سوچنے لگا کہ کیا وہ محض ایک خواب تھا.....؟ نہیں نہیں اس نے خود کو باور کرانا چاہا۔ وہ خواب نہیں ہوسکتا۔ سب کچھ حقیقت تھی۔ وہ ڈائنا کے وصل سے ہی سرشار ہوا تھا۔ اسی دیوی کے وصل سے جس کا تعلق حسن و عشق کے جنسی پہلو اور مردوزن کے جذباتی رشتے سے ہے۔

کمرے میں اب تک ڈائنا کے جسم کی خوشبو رچی بسی ہوئی تھی، عمر نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی سانس کھینچی۔ وہ اس ساری خوشبو کو اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔ اس خوشبو میں بھی ایک انجانی سی لذت مضمر تھی۔ جیسے وہ اس خوشبو کو نہیں بلکہ ڈائنا کے جسم کو اپنے اندر سموئے رہا ہو..... وہ عظیم دیوی کے مچلتے ہوئے..... حساب و شباب سے سیراب ہو چکا تھا۔ لیکن یہ کیسی سیرابی تھی کہ تشنگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔

عمر کافی دیر تک آنکھیں بند کئے اس کے تصور ہی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ پھر جب معدے نے اپنے خالی ہونے کا اعلان ذرا شدت سے کرنا شروع کیا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور تالی بجائی۔ فوراً ہی ایک لڑکی اندر آئی اور سینے پر ہاتھ باندھ کر مودب کھڑی ہوگئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بلاشبہ وہ کافی خوبصورت تھی لیکن عمر جو ڈائنا کے شباب سے ہم آغوش ہو چکا تھا اس پر بس ایک اچٹتی سی نظر ڈال کر رہ گیا۔

"ناشتہ.....!" اس کے منہ سے نکلا۔

لڑکی کچھ اور خم ہوئی۔ پھر الٹے قدموں کمرے سے چلی گئی اچانک عمر کو خیال آیا کہ لڑکی نے اس کی بات کیسے سمجھی ہوگی، کیا وہ بھی اس بوڑھے کی طرح اس کی زبان سمجھنے پر قادر ہوگئی ہے؟

ڈائنا کے لئے کچھ مشکل نہ تھا کہ وہ ساری بستی کو اس امر پر قادر کر دیتی۔

ڈائنا.....! عمر ایک بار پھر اس کے تصور میں ڈوب گیا اس کے رگ و ریشے میں ڈائنا کے عشق کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب ڈائنا ہی اس کے لئے اول و آخر ہے۔ وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا۔ شاید ڈائنا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ جنم جنم کے ساتھی ہیں۔

عمر نے سوچا..... "کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وہیں کا ہو کر رہ جائے؟" اب اسے اپنی دنیا سے تو کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی جہاں ڈائنا نہ ہو وہاں رہنے کا تصور بھی اب عمر کے لئے محال تھا۔

ذرا ہی دیر میں وہ خوب صورت کنیز ناشتہ لے کر آ گئی۔ پھر وہ چپ چاپ واپس لوٹ جانا چاہتی تھی کہ عمر ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "ٹھہرو!"

وہ رک گئی اور اپنی بڑی بڑی پلکیں جھپکاتی ہوئی عمر کی طرف دیکھنے لگی۔

"کیا تم میری بات سمجھ سکتی ہو؟" عمر نے پوچھا۔

"وہ اب بھی خاموش رہی اور بدستور پلکیں جھپکاتی رہی۔

"تم جواب کیوں نہیں دیتیں!" عمر بگڑ گیا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک ہلکے سے قہقہے کی آواز سنائی دی اور پھر کہا گیا۔ "یہ آپ کی زبان نہیں سمجھ سکتی اجنبی!" بوڑھا میزبان اب کمرے میں آ گیا تھا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟" عمر حیرت سے بولا۔ "میں نے اس سے ناشتے کے لئے کہا تھا اور یہ ناشتہ لے کر آئی ہے۔"

"میں دوسرے کمرے میں موجود تھا اور میں نے آپ کی آواز سن لی تھی۔ میں نے ہی اسے بتایا تھا کہ آپ نے کیا طلب کیا ہے۔"

"اوہ!" عمر کے منہ سے بس اتنا ہی نکل سکا۔

لڑکی اب کمرے سے جا چکی تھی۔

ناشتہ آنے سے قبل عمر نے کچلی میں منہ دھویا تھا اس نے بوڑھے سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو جائے بوڑھے نے شکریہ کے ساتھ یہ دعوت قبول کر لی۔ اب وہ کچھ سنجیدہ نظر آنے لگا تھا۔ کچھ دیر تک خاموشی رہی پھر عمر بولا۔

"محترم بزرگ! کیا آپ کچھ پریشان ہیں؟"

"کچھ!" بوڑھا تلخی سے مسکرایا۔ "میں بہت زیادہ پریشان ہوں اجنبی.....؟"

"کیا میں آپ کے کچھ کام آ سکتا ہوں؟"

"شاید....." بوڑھا زیر لب کہہ کر کچھ سوچتا ہوا عمر کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔

"اگر میں آپ کے کام آ سکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہوگی۔"

"عظیم ڈائنا کے اجنبی مہمان!" بوڑھے نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اس بستی میں لوگ کافی عرصے سے پریشان ہیں۔ پریشانی کا سبب ڈائنا کے مندر کا پجاری ارکلیس ہے، بستی کی نوجوان لڑکیاں آئے دن اس کی ہوس کا نشانہ بنتی رہتی ہیں۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے ٹوک سکے۔"

"کیا وہ بہت طاقتور ہے؟"

"مندر کا پجاری طاقتور ہی ہوتا ہے حیرت انگیز قوتوں کا مالک!"

"کیا یہ ممکن نہیں کہ کسی اور کو اس کی جگہ دیدی جائے اس سے اس کا منصب چھین لیا جائے؟"

"بستی کے لوگ پجاری سے اس کا منصب نہیں چھین سکتے۔ اس سے اس کا منصب واپس لینے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ قدیم زمانے سے ایک رسم چلی آ رہی ہے لیکن اس کی ادائیگی کی ہمت بستی کے کسی نوجوان میں نہیں ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے بغیر اس مصیبت سے چھٹکارا پانا مشکل نہیں ہے۔ کافی دن ہوئے بستی کے دو ایک نوجوانوں نے اس کی ہمت کی بھی تھی تو ان بدنصیبوں کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے، ارکلیس سے ٹکرانا کوئی آسان بات نہیں ہے۔"

عمر نے سوچا کہ اسے ڈائنا کی مستقل قربت حاصل کرنے کے لئے ارکلیس سے ٹکر لینا ہی پڑے گی۔

"محترم بزرگ!" عمر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے اس رسم کے بارے میں بتایئے، میں ارکلیس کے مقابلے پر جانے کو تیار ہوں۔"

بوڑھے کی دمدلائی ہوئی آنکھیں چمک اٹھیں۔ "کیا واقعی؟"

"ہاں۔" عمر نے پرعزم لہجے میں کہا۔

زمانہ قدیم سے اب تک یہ صحرائی خطہ ایک مسلسل المیے سے دوچار تھا۔ اس کا آغاز ہوئے نہ جانے کتنی صدیاں گزر چکی تھیں۔

کوہ الباء کی کھڑی چٹانوں کے عین نیچے جھیل کے شمالی کنارے پر حسن کی دیوی ڈائنا کا مقدس شجر زار مندر کھڑا تھا، اس مقدس شجر زار میں ایک خاص درخت بھی تھا اور یہ الیسا ہی درخت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے قریب ہی آباد قصبے کے لوگوں کو اکثر رات کی تاریکی میں اور کبھی کبھی دن میں بھی اس درخت کے آس پاس ایک وحشت ناک پیکر چکر کاٹتا دکھائی دیتا اور اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار ہوتی۔ وہ اس طرح چوکس نظر آتا جیسے اس کو ہر دم کسی دشمن کے حملے کا خدشہ ہو۔

یہی مضطرب اور بے چین شخص مندر کا پجاری ہوتا تھا اور جب وہ اس طرح چکر کاٹتا ہوا نظر آتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ کسی طرح اس کو اس بات کی بھنک مل گئی ہے کہ کوئی شخص اس مقدس درخت کی شاخ توڑنے والا ہے۔

عہد قدیم سے ہی یہ دستور چلتا آ رہا تھا کہ کسی نئے آدمی کو پجاری کا منصب حاصل کرنے کے لئے اس مقدس درخت کی شاخ توڑنی پڑتی تھی اور پھر اگر وہ اس وقت کے پجاری کو ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا تھا تو اسے پجاری کی جگہ مل جاتی تھی۔ گویا پجاری کی جگہ لینے کے لئے اس وقت کے پجاری کا قتل بنیادی شرط تھی۔

اور عمر وہ خونی کھیل کھیلنے کے لئے تیار تھا۔

ارکلیس کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ چکی تھی چنانچہ وہ پوری طرح چوکس تھا اس کے ہاتھ میں برہنہ تلوار تھی اور وہ مقدس درخت کے گرد پہرہ دے رہا تھا۔

وہ اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی یہاں آ دھمکا تھا اور اب اسے ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں گزار دینی تھی۔ دن کی روشنی میں اسے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ اس خونی کھیل کی بنیادی شرط تھی کہ مقدس درخت کی شاخ توڑنے والا صرف رات میں ہی شاخ توڑ سکتا ہے۔ دن کی روشنی میں اس کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی دن کی روشنی میں ایسا کرتا تو اسے اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس درخت کی شاخ کو حاصل کرنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ شاخ توڑنے والے کو غیر معمولی قوتیں حاصل ہو سکیں تاکہ پجاری اس پر اپنی غیر معمولی قوتوں کا استعمال نہ کر سکے۔ دونوں برابر کی قوتیں بن جائیں اور پھر تلوار کی نوک ان دونوں کی قسمت کا..... فیصلہ کر سکے۔ اس مقابلے کے لئے شمشیر زنی کی رسم صدیوں سے چلی آ رہی تھی۔

دن کی روشنی میں شاخ توڑنے والے کو وہ پراسرار قوتیں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں لہٰذا پجاری دن کے وقت اس مقدس درخت کی طرف سے بے فکر ہو جاتے تھے۔

اندھیرا پھیلے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور ارکلیس تلوار سونتے ہوئے درخت کے گرد چکر کاٹ رہا تھا کہ ایک دھماکا سا ہوا اور ارکلیس اچھل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ کوئی شخص درخت سے کود رہا تھا۔ اندھیرا میں وہ سائے کی مانند نظر آ رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ارکلیس نے بے اختیار اپنے بائیں ہاتھ کو مخصوص انداز میں حرکت دی۔ اس کی انگلیوں میں چنگاریاں سی پھوٹیں اور اس سائے کی طرف بڑھ گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس طرح ٹھنڈی ہوگئیں جیسے کسی نے ان پر پانی ڈال دیا ہو۔

"یہ سب کچھ بیکار ہے ارکلیس......اب صرف تلوار ہی سے فیصلہ ہوسکتا ہے۔" اندھیرے میں عمر کی آواز دور تک پھیلتی چلی گئی۔

"تم......تم......!" ارکلیس کے منہ سے دو مرتبہ نکلا۔

"ہاں...... میں......" عمر نے جواب دیا۔ درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اس شاخ کو ہلاتا ہوا بولا۔ "میں آج دن ہی میں اس درخت پر آبیٹھا تھا اور خود کو اس کی گھنی شاخوں میں چھپالیا تھا، مجھے حیرت ہے کہ مجھ سے پہلے کے لوگوں نے یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا۔ کیا وہ یہ سمجھتے تھے کہ رات کو شاخ توڑنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ رات ہی کو درخت پر چڑھا جائے؟ اگر یہ بات نہیں تو پھر اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا کہ وہ ڈرتے ہوں گے اگر انہیں یہ دھڑکا لگا رہتا ہوگا کہ دن کی روشنی میں پجاری نے ان کو درخت پر چڑھتا ہوا دیکھ لیا تو پھر وہ خود کو کسی طرح بھی نہیں بچاسکیں گے اور مارے جائیں گے...... خیر...... ہوگا کچھ......! مجھے ان باتوں سے کیا غرض؟...... آؤ اب ہمارا تمہارا فیصلہ ہوجائے!" عمر نے اپنے بوڑھے میزبان کی ہدایت کے مطابق اپنا دایاں ہاتھ فضا میں اٹھایا اور دوسرے ہی لمحے ایک تلوار اس کے ہاتھ میں آگئی۔ ایسا معلوم ہوا تھا جیسے وہ تلوار فضا ہی میں پیدا ہوئی ہو۔

ارکلیس نے اچانک اس پر حملہ کردیا۔ شاید وہ عمر کو سنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ اچانک حملہ کرنے سے اناڑی نوجوان نروس نروس ہوجاتے ہیں لیکن یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ عمر بڑی صفائی سے خود کو بچا گیا تھا۔ اس کا یہ خیال قطعی غلط تھا کہ عمر اناڑی ہے۔ وہ کوئی عام نوجوان نہیں بلکہ ایک نواب زادہ تھا شمشیر زنی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔

ارکلیس بوکھلا گیا۔ اس کی خاصی عمر ہوچکی تھی اور قوی اضمحلال کی طرف مائل تھے۔ اس کے دل میں یہ خوف پیدا ہوگیا کہ وہ اس پھرتیلے اور تنومند نوجوان کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔

جب عمر نے حملہ کیا تو ارکلیس بھی اپنی تجربہ کاری کے باعث وار بچا گیا لیکن اب اس کے رہے سہے شبہات بھی ختم ہوگئے اسے یقین ہوگیا کہ وہ اس نوجوان کی تلوار سے خود کو زیادہ دیر تک محفوظ نہیں رکھ سکے گا۔

"سنو......!" اچانک ارکلیس پیچھے ہٹ کر ہاتھ اٹھاتا ہوا بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اس مقدس شجر زار کو خون سے رنگنے کی کوئی ضرورت نہیں...... میں اب بوڑھا ہوچکا ہوں میرے قویٰ جواب دینے لگے ہیں۔ میں خود بھی اب ان ذمہ داریوں سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں......تم بخوشی میرا منصب لے لو......!"

"عیاری مت دکھاؤ ارکلیس تم کسی وقت دھوکے سے مجھے ختم کرنے کی کوشش کروگے۔ مجھے پتا ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔ میں اس مقدس درخت کی شاخ توڑ چکا ہوں......اب صرف میں زندہ رہ سکتا ہوں یا صرف تم......!"

عمر دوبارہ حملہ کرنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ ارکلیس پلٹ کر بھاگ نکلا۔ اس کے اچانک بھاگنے پر عمر حیرت زدہ سا اپنی جگہ پر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پجاری اس طرح بزدلی دکھائے گا۔ عمر چند لمحے تو کھڑا رہا لیکن پھر چونکا اور پجاری کو للکارتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔

پجاری کا رخ ڈائنا کے مندر کی طرف تھا۔

مندر میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ عمر پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ اس لئے دروازے سے جا ٹکرایا۔ لیکن ٹکرایا کہاں؟......وہ تو اس طرح دروازے سے گزر گیا جیسے وہ دروازہ ٹھوس لکڑی کے بجائے دھویں کا بنا ہوا ہو۔ ایک لمحے کے لئے وہ اس امر پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ لیکن پھر اسے خیال کہ مقدس درخت کی ٹوٹی ہوئی شاخ اس کے ہاتھ میں ہے اور اب وہ پراسرار قوتوں کا مالک بن چکا ہے۔

پجاری اب مندر کی چھت پر پہنچنے کے لئے زینے طے کررہا تھا۔ نہ جانے کیا ارادے تھے اس کے؟

عمر اس کے پیچھے پیچھے چھت پر پہنچ گیا۔ اب وہ پجاری کے اتنے قریب تھا کہ اس بزدل کو مڑ کر مقابلے پر آنا ہی پڑا۔ تلواریں ایک جھنکار کے ساتھ ٹکرائیں۔ عمر اسے دھکیلتا ہوا چھت کے کنارے تک لے آیا۔ اب مزید پیچھے ہٹنا پجاری کے لئے ناممکن تھا اس نے پینترا بدل کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن عمر کی تلوار شائیں سے گھومی اور پجاری کی گردن کٹ کر تاریک فضا میں اچھل گئی بغیر سر کا جسم ڈگمگایا اور پھر پیچھے کی طرف گرا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خاصی بلندی سے نیچے گرتا چلا جارہا تھا۔ اس کی کٹی ہوئی گردن بھی کسی گیند کی طرح اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ایک دھماکہ ہوا...... پجاری ارکلیس کی لاش دریائے ٹائبر کی نذر ہوچکی تھی۔

بستی میں عمر کے نام کی دھوم مچ گئی اور لوگ ارکلیس سے نجات کے سلسلے میں جشن منانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ دوسرے ہی روز وہ جشن برپا ہوا۔ عمر کو ڈائنا کے پجاری کی مسند خاص پر بٹھایا گیا بستی کی کنواریاں عمر کی خدمت پر مامور تھیں لیکن وہ الجھا الجھا سا تھا۔ اسے یہ باتیں بیکار معلوم ہورہی تھیں وہ تو ڈائنا کا پرستار تھا۔ اسے ڈائنا کی ضرورت تھی۔ اس کے جلتے ہوئے شباب سے لپٹ جانے کی خواہش تھی۔ اسے اب اس دنیا میں اور کچھ نہیں چاہئے تھا۔

اور جب رات شبنم کے قطروں سے بھیگنے لگی تو عمر نے ڈائنا کو اپنے قریب پایا۔ اس کا چہرہ شبنم کے کسی قطرے ہی کی طرح مہک اور نکھر انکھرا سا نظر آرہا تھا اور پچھلی مرتبہ کی طرح آج بھی وہ بے نیاز پیرہن تھی۔ ایک لپکتا ہوا برہنہ شعلہ......!

اور عمر نے خود کو اس شعلے کے سپرد کردیا۔ ہمیشہ کے لئے۔ "ڈائنا!" عمر نے سسکاری سی لی۔

"اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا......"

ڈائنا نے جذباتی سے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق امر کردوں گی۔ تمہیں دیوتاؤں کا رتبہ مل جائے گا۔ میں خداوند جیوپیٹر سے تمہارے لئے بھیک مانگ لوں گی۔"

عمر کے جذبات پوری طرح مشتعل ہوچکے تھے۔ اس نے ڈائنا کی پوری بات نہیں سنی اور اس کے سلگتے ہوئے ہونٹوں کی گرمی اپنے وجود میں جذب کرنے لگا، اور پھر دھیرے دھیرے دھوئیں میں تحلیل ہوکر ڈائنا کے وجود کے ساتھ اوجھل ہوگیا۔

اور اس طرح یہ کہانی ختم ہوگئی۔ یہ کہانی اس ڈائری سے اخذ کی گئی ہے جو 1955ء میں ایک سیاح کو دریائے ٹائبر کے کنارے پڑی ہوئی ملی تھی۔ وہ ڈائری عمر کی تھی۔ پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے اس کی تمام عبارت نہیں پڑھی جاسکی۔ جتنا پڑھنا بھی ممکن تھا اس کی مدد سے عمر کی زندگی کے یہ حالات قلمبند کئے گئے۔ اس ڈائری سے یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ عمر کی باقی زندگی کہاں اور کس طرح گزری......!

اٹلی کی حکومت نے اس ڈائری میں بیان کردہ جگہ پر اس بستی کو تلاش کرنے کی بیحد کوشش کی مگر اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ اسی بنیاد پر بعض لوگوں نے یہ خیال قائم کیا تھا کہ وہ ڈائری کسی پاگل نے لکھی ہوگی۔

لیکن ڈائری میں بیان کردہ تاریخ کو کوہ الباء کے قریب جو طیارہ حادثے کا شکار ہوا تھا اس میں عمر نامی ایک مسافر بھی تھا اور تحقیق سے یہ بات بھی ثابت ہوچکی ہے کہ وہ جان پور کے نواب شاہد الزماں کا بیٹا تھا۔

جو لوگ قدیم افسانوی دور پر ایمان رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ ڈائنا نے حیرت انگیز قوتوں سے اپنے پوجنے والوں کی بستی کو ساری دنیا سے چھپا رکھا ہے اور عمر آج بھی اس پوشیدہ دنیا کے چمن زاروں میں ڈائنا کے ساتھ محوِ خرام ہوگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرا جنم

ذکاءاللہ قریشی-کندیاں

وقت کے ساتھ ساتھ زندگی اپنی نہج پر آہی جاتی ہے، نوجوان اپنے جسم پر قابو پانے کی کوشش میں مصروف عمل تھا پہلے پہل وہ ہر لفظ بولنے کے لئے بہت تگ و دو کرتا رہا لیکن اس کے باوجود بھی کیوں چکرا گیا؟

مغرب کی آزاد فضاؤں میں جنم لینے والی ایک تحیر انگیز حیرت انگیز لرزہ براندام کہانی

بارہ سال کی عمر میں مجھے بچوں کی جیل کا منہ دیکھنا پڑا، اٹھارہ سال کا تھا تو جیل کی ہوا کھائی اور زندگی کا بیشتر حصہ ایک جیل خانے سے دوسرے جیل خانے کی نذر ہوگیا، کاریں میں نے چرائیں جعلی چیک میں نے بنائے، دکانوں کو میں نے لوٹا اور مسلح ڈاکہ زنی بھی کی، مسلسل دس سال میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ میں نے چند ماہ سے زیادہ عرصہ جیل کی چاردیواری سے باہر گزارہ ہو۔

پھر میں اپنی قسمت بدلنے کیلئے لمبی سیاحت پہ نکل گیا لیکن اس کا نتیجہ خلاف توقع انتہائی خراب نکلا، میں نے مزید ٹھوکر کھائی اور ایک بار پھر جیل پہنچ گیا، ایک روز میں قید خانے میں ایک قیدی کے ساتھ کھڑا تھا کہ کسی نے پیچھے سے اسے چاقو گھونپ دیا، قتل کے الزام میں مجھ پر مقدمہ چلا، اس مرتبہ میرا کوئی قصور نہ تھا مگر میری سابقہ کارگزاریاں اور موجودہ سنگین جرم دیکھتے ہوئے جج نے مجھے سزائے موت سنادی، میں سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ غالباً میں لاشعوری طور پر اسی مرحلے کیلئے خود کو تیار کررہا تھا۔

میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا، ویسے بھی میرا تھا ہی کون جس کیلئے میں جینے کی خواہش رکھتا، میرا خیال تھا کہ جیل کا وارڈن کو میری سزائے موت سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا مگر وہ جب بھی مجھ سے ملنے آتا مجھ پر ترس کھائی ہوئی نظروں سے دیکھتا، اور بہت کچھ کہنے کی کوشش کرتا مگر اپنی کوشش میں ہمیشہ ناکام ہوجاتا، شاید اسے میری موت کا صدمہ ہو، چرچ کے فادر کو جب بھی کسی مجرم کا پتا چلتا جس کے دن گنے جاچکے ہوں، وہ اسے حتی الامکان منانے کی کوشش کرتا کہ سابقہ گناہوں کو قبول کرکے سیوع مسیح سے وہ معافی مانگ لے، بقول فادر کے، کہ ایسا کرنے سے وہ دوسرے جنم میں وہ لوگ عیش وعشرت کی زندگی گزار سکیں گے۔

مجھے نہ تو فادر کی باتوں میں دلچسپی تھی نہ دوسرے جنم پر اعتقاد، اسی وجہ سے میں نے دوسری بار بھی فادر کے آنے پر اس سے ملنے سے معذرت کرلی، پر اس نے میرے پاس آمدورفت ختم نہیں کی۔

جیل کا وارڈن جسکا نام ریمنڈ تھا، وہ حال ہی میں بھرتی ہوا تھا، کسی کو پھانسی چڑھانے کا اس کا بھی پہلا تجربہ تھا۔ لیکن اس کی طرف دیکھنے پر یوں لگتا جیسے سزائے موت مجھے نہیں اسے ہونے والی ہو۔

"تمہیں معلوم ہے کہ اب تمہاری زندگی کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں؟" ایک روز وارڈن ریمنڈ نے مجھ سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔"

"کیا تم نے فیصلہ کرلیا ہے کہ...... ہم تمہارے لئے کونسا طریقہ استعمال کریں؟"

میں نے اس کی طرف الجھی نگاہوں سے دیکھا، "طریقہ میں سمجھا نہیں"

"اس ریاست میں سزائے موت دینے کے دو منظور شدہ طریقے ہیں، ایک پھانسی کا پھندہ، اور دوسرا گولیوں کی بوچھاڑ، میرا خیال تھا کہ تمہیں سب کچھ معلوم ہوگا"؟ اس نے غالباً یہ بات اس لئے کی تھی کہ میں ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔ "کوئی زیادہ سستا ذریعہ نہ ہو تو کیا اس طریقے سے سزائے موت دی جاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ بجلی کی کرسی استعمال کی جاتی ہوگی۔"

"جیسا کہ میں نے کہا ہے تمہیں انتخاب کا حق ہے۔" اس نے جواب دیا، یہ بتاتے ہوئے اس کا چہرہ تاریک سا ہوگیا۔

"پھانسی نہیں چلے گی وارڈن!" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔ گولی مارنے والے دستے کو ہدایت دے دیجئے کہ وہ اپنی رائفلوں کی صفائی کرلیں۔"

وارڈن جب بولا اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی، تمہیں اس سے تکلیف محسوس نہیں ہورہی جوزف ...... یوں موت کا انتخاب کرتے ہوئے؟"

"بالکل نہیں، جب مجھے اس دنیا سے جانا ہی ہے اور میں اس بارے میں کچھ کر بھی نہیں سکتا، تو اس کا طریقہ منتخب کرنے میں کیا قباحت ہے۔"

وہ اترا ہوا چہرہ لئے واپس چلا گیا۔

اگلے دو ہفتوں کے دوران میں، میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا، اور خوب آرام کیا، میرا وزن پانچ پونڈ بڑھ گیا اور وارڈن اپنا وزن دس پونڈ کم کر بیٹھا۔ وہ مجھ سے زیادہ میری سزا کے بارے میں سوچتا تھا اس وقت وہ ایک تھکا ہوا ریمنڈ لگ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت ہینڈسم تھا، اور اسکی بیوی اس سے بھی زیادہ حسین تھی شاید...... میں نے خود تو اسے نہیں دیکھا تھا۔ مگر نئے قیدیوں کی زبانی اس کے قیامت خیز جوانی اور شعلہ بدن جسم کے بارے میں اکثر کہانیاں سن رکھی تھی۔

جب میری سزائے موت میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تو ایک روز وارڈن ایک اجنبی کو میرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پاس لایا۔

"یہ ڈاکٹر ڈینی ہے" اس نے کہا۔

"تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔" میں نے ڈاکٹر کو سر سے پاؤں تک دیکھا، اسے غالباً کوئی خصوصی رعایت دی گئی تھی۔ کیونکہ مجرم کو پھانسی دینے سے پہلے ڈاکٹر اسکے قریب نہیں آسکتا تھا۔

سنتری نے قفل کھولا تو ڈاکٹر ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

"میں تم دونوں کو تنہا چھوڑتا ہوں۔" وارڈن ریمنڈ یہ کہہ کر جلدی سے واپس چلا گیا۔

"میں مرسی اسپتال میں دماغی سرجری کے شعبے کا انچارج ہوں، میں چاہتا ہوں کہ تم اپنا جسم سائنسی تحقیق کیلئے عطیہ دے دو، درحقیقت میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنا جسم مرنے کے بعد میرے نام لکھ دو۔"

اس نے مصافحہ کے بعد بنا کسی تمہید کے انتہائی کاروباری لہجے میں کہا۔ اس کے رویے میں غیر معمولی بات نہ تھی وہ محض میرا جسم چاہتا تھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا ڈاکٹر؟" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

"تم نے اعضاء کی حالیہ پیوند کاری کے بارے میں پڑھا ہوگا جگر گردوں اور دل وغیرہ کی تبدیلی۔"

"میں صرف اخبارات کے چلی حروف ہی پڑھ سکتا ہوں۔"

"خیر کوئی بات نہیں تکنیکی چیزیں اتنی ترقی پا چکی ہیں کہ وہ کچھ ہو رہا ہے جو ابھی کچھ عرصہ پہلے تک معجزہ سمجھا جاتا تھا۔ تم اپنا جسم دے کر کئی زندگیاں بچا سکتے ہو۔"

"کئی.....؟" میں نے تصور کے آئینے میں خود کو ٹکڑے ٹکڑے ہوتے اور تاش کے پتوں کی طرح بٹتے دیکھا۔ میں اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"دیکھو..... میں بچہ نہیں ہوں۔ پچاس کے لگ بھگ ہو چکا ہوں میں شروع سے یہی سمجھتا ہوں کہ تم لوگ جوان گوشت چاہتے ہو۔ اس کے علاوہ جب گولیاں میرے جسم سے اتر جائیں گی تو میرے اعضاء، میرے یا کسی اور کیلئے قطعاً کارآمد نہیں رہیں گے۔"

ڈاکٹر ڈینی کے پاس ہر بات کا جواب تھا۔ وہ بولا "مجھے جیل کے ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ تم اپنی عمر کے لحاظ سے قابل رشک صحت کے مالک ہو، اس کی وجہ وارڈن نے یہ بتائی ہے کہ تم وقتاً فوقتاً لمبے لمبے عرصے کیلئے جیل میں بند رہ کر بیرونی دنیا کی آلائشوں سے محفوظ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے اعضاء ویسے ہی ہونگے جیسا میں چاہتا ہوں۔ جہاں تک اس طریقے کا تعلق ہے جسے تم نے اپنی سزائے موت کیلئے منتخب کیا ہے..... تو میری خواہش ہے کہ تم اس پر نظر ثانی کرلو....."

"میں اپنا فیصلہ نہیں بدل سکتا ڈاکٹر!"

"اچھا.....! اور جسمانی عطیے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں گولیوں سے مرنے کے بارے میں اپنے فیصلے کو بدلنے کا ارادہ نہیں رکھتا، البتہ میرا بچا کھچا جسم بخوشی استعمال کر سکتے ہو۔"

"میں اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گا۔" یہ کہہ کر وہ میرے قریب آیا اور چند کاغذات جو اس نے ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے میری طرف بڑھائے جن پر میں نے دستخط کر دیئے۔

ڈاکٹر مجھ سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گیا۔

اسکے بعد میں بڑی خوشدلی سے قریب تر ہوتے ہوئے یوم حساب کا انتظار کرنے لگا۔ بعض اوقات موت سے لاتعلق رہنا مشکل نظر آتا تھا اس کے علاوہ ڈاکٹر نے میرے ذہن پر بوجھ بھی ڈال دیا تھا۔ پہلے جب میں اپنے مر جانے کا تصور کرتا تھا تو میرے ذہن میں یہی تصویر ابھرتی تھی کہ میں اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے نہایت سکون سے سو رہا ہوں، لیکن اب مجھے اس آخری منظر کی چنداں پرواہ نہیں تھی۔

آخر وہ دن بھی آ گیا جس کا مجھے شدت سے انتظار تھا۔ وارڈن ریمنڈ حسب معمول مجھ سے زیادہ دل گرفتہ تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے رات جاگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرگزاری ہواور اس کی سانسوں میں وھسکی کی بو بتا رہی تھی کہ وہ کس بے قراری کے عالم میں جاگتا رہا ہوگا۔

میں اس کے اور پادری کے ساتھ احاطے میں آ گیا۔

سنتریوں نے ہاتھ ہلا ہلا کے مجھے الوداع کہا۔

کہیں کہیں زیرلب جملے بھی میری سماعت سے ٹکرائے شاید یہ لوگ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ میں آخری وقت میں پہلے کی طرح پرسکون رہوں گا یا نہیں......؟؟؟

☆......☆......☆

جیل کے احاطے میں گرمی نہیں تھی، سورج کی پہلی کرنیں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں تقریباً پچاس گز کے فاصلے پر دیوار کے ساتھ ایک بھاری کرسی تھی جس پر چمڑے کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اس کے۔ سامنے لکڑی اور کینوس کا ایک چھوٹا سا ڈھانچہ کھڑا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ گولی چلانے والوں کا دستہ اس ڈھانچے کے اندر کینوس کے پیچھے چھپا ہوا تھا جب وقت آئے گا تو کینوس ہٹا دیا جائے گا اور پھر تڑاتڑ درجنوں گولیاں چلیں گی جو میرے جسم کو...... کرسی کے بائیں جانب تقریباً بیس گز کے فاصلے پر ایک ٹریکٹر کھینچنے والی ٹرالی بھی موجود تھی ڈاکٹر ڈینی اس گاڑی کے قریب چند آدمیوں کے ساتھ کھڑا تھا سب لوگوں نے سبزی مائل گاؤن پہن رکھے تھے۔ جیل کے چار دیواری کے سکوت کو صرف ٹرالی کے ڈیزل جنریٹر کی آواز توڑ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ میرے اعضاء کو محفوظ رکھنے کا سارا انتظام کرلیا گیا ہے۔

میں سیدھا جا کر کرسی پر بیٹھ گیا مجھے سنتریوں کے اطمینان کی سانس صاف محسوس ہوئی۔ وہ خوش تھے کے انہیں مجھے کرسی پر بٹھانے کیلئے زور آزمائی نہیں کرنی پڑی۔

وارڈن نے کپکپاتی آواز میں ایک تحریر پڑھ کے سنائی جو غالباً سرکاری اہلکاروں کے لئے تھی۔ اس کے بعد دو سنتریوں نے میرے ہاتھ اور ٹانگیں چمڑے کی پٹیوں سے باندھ دیئے۔ ڈاکٹر نے گولیوں کے نشانے کیلئے میرے سینے پر ایک نشان پن سے نتھی کر دیا اور پھر مجھے ایک فولادی خود پہنا دیا گیا۔

چند سیکنڈ تک مکمل سکوت طاری رہا...... میں ابھی کچھ کہنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے اپنے سینے سے ایک نوکیلا لوہا سا ٹکراتا ہوا محسوس ہوا اور اس کے ساتھ ہی فضا گولیوں کی دھاڑ سے گونج اٹھی، گولیوں کی آواز دیواروں سے ٹکرا کر بڑی بھیانک محسوس ہوئی خون اچھل کر میرے حلق میں آ گیا میں صرف یہی سوچ سکا کہ اب ڈاکٹر ڈینی میرے پھیپھڑوں کو استعمال نہیں کر سکے گا۔

اس کے بعد میں اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ اپنے بارے کچھ سوچ سکتا۔

☆......☆......☆

آنکھیں کھلی تو مجھے ہلکی ہلکی روشنی نظر آئی اور آس پاس کچھ کچھ نقل و حرکت محسوس ہوئی لیکن اس پر توجہ مرکوز کرنا دشوار تھا۔ میں جتنی نقاہت محسوس کر رہا تھا اتنی زندگی بھر میں کبھی محسوس نہیں کی تھی۔

"ڈاکٹر کو فوراً بلاؤ" ایک نسوانی آواز سنائی دی "اسے ہوش آ گیا ہے اور اس مرتبہ کچھ گڑبڑ کرنے کے موڈ میں نظر آ رہا ہے۔"

میرے گرد و پیش کچھ نقل و حرکت تھی مبہم سائے نمایاں ہوتے جا رہے تھے۔ پھر ڈاکٹر ڈینی کا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے آ گیا جلد ہی صورتحال مجھ پر واضح ہوگئی ڈاکٹر ڈینی نے مجھے موت کی کرسی سے اٹھا کر نیا دل دیا تھا۔ میں نے لرزتا ہوا ہاتھ اٹھا کر اس کی شکایت کرنی چاہی لیکن صرف گڑبڑا کر رہ گیا۔

دل و دماغ اس بات کو تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ چھلنی دل کی پیوندکاری بھلا کیسے ممکن ہے؟

دماغ...... کا لفظ ذہن میں آتے ہی حقیقت عیاں ہوتی گئی...... ڈاکٹر ڈینی نے میرے جسم سے دل نہیں بلکہ میرا دماغ کسی اور کے سر میں لگا دیا تھا...... میں حیران تھا کہ میرا باقی وجود کہاں ہے؟ خدا ہی بہتر جانتا تھا کہ مجھے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔

"بات کرنے کی کوشش مت کرو۔" ڈاکٹر ڈینی نے نرمی سے کہا۔ تم خاصے طویل عرصے تک زندگی سے محروم رہے ہو کچھ دیر آرام کرلو......"

معاً میں نے اپنے چہرے کو پٹیوں میں جکڑا ہوا محسوس کیا......

"تم تیزی سے ٹھیک ہو رہے ہو تمہیں جلد ہی بستر سے اٹھنے کے قابل بنا دیں گے، اور تم چند دنوں میں چلنے پھرنے لگو گے۔ جب تمہاری پٹیاں اتار دی جائیں گی تو تم بالکل ویسے ہی لگو گے جیسا کے پہلے تھے۔ تم نے کار ڈرائیونگ اور شراب کو آپس میں گڈمڈ کر دیا تھا اور کار سے باہر جا پڑے تھے۔

زیادہ خراشیں تمہارے بالوں میں چھپ جائیں گی۔ "تم سمجھ رہے ہو نا ڈیئر ڈیوس......"

میں نے ڈاکٹر کی بات سے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ڈاکٹر نے مجھے خاموش پا کر نرس کو اشارہ کیا، اس نے تیزی سے میرے پاس آ کر میرے ہاتھ سے منسلک سوئیاں نکالنے لگی۔

میرے دماغ میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور اس بارے میں سوچنا موقوف کر دیا۔

ڈیوس کی بیوی، یعنی میری بیوی روزانہ پانچ منٹ کی ملنے والی اجازت سے مجھے ملنے آتی تھی۔ ایک دراز قد، بھرے بھرے جسم کی مالک بے پناہ حسین عورت تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات ایسے تھے جو خوشگوار مستقبل کی امید بندھاتے تھے۔ وہ میرے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے بیٹھی رہتی اور آنسو بھری آنکھوں سے میری پٹیوں میں لپٹے چہرے کو گھورا کرتی...... بار بار کہتی تھی "میں تو سمجھی تھی کہ تمہیں ہمیشہ کیلئے کھو چکی ہوں!"

یہ دوسری الجھن پیدا ہوگئی تھی، وہ کسی اور کی بیوی تھی مگر اب۔

زندگی اپنی نہج پر آ ہی جاتی ہے وقت کے ساتھ ساتھ میں اپنے جسم پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا جو میرا جسم تھا ہی نہیں، مجھے اس جسم سے کوئی اپنائیت محسوس نہیں ہوتی تھی، بات چیت میرے لئے سب سے مشکل

اسلم راہی ایم اے کی تحریر کردہ بہترین کتابیں

حضرت ابوبکر صدیقؓ
حضرت عمر فاروقؓ
حضرت عثمان غنیؓ
حضرت علیؓ
حضرت ابوعبیدہ بن جراح
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ
حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ
حضرت زبیر بن عوامؓ
حضرت سعید بن زیدؓ
خالد بن ولید
عمر بن عبدالعزیزؒ
حجاج بن یوسف
محمد بن قاسم
طارق بن زیاد
ہارون الرشید
مامون الرشید
رکن الدین بیبرس
سلطان ملک شاہ سلجوقی
سلطان الپ ارسلان

قیمت فی کتاب -/25 روپے

Ph:32773302

شمع بک ایجنسی نوید اسکوائر اردو بازار کراچی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کام تھا پہلے پہل مجھے ہر لفظ سوچنا پڑتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ میں آسان جملے بولنے لگا۔

ڈاکٹر ڈینی نے مجھے بستر سے اٹھنے اور احتیاط سے اسپتال کے کمرے میں گھومنے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ آنکھوں میں خوشی کی چمک لئے مجھے دیکھتا رہتا۔

اس کی اندر کے چھپے جوش اور خوشی کو میں سمجھ سکتا تھا اس نے کسی کو دوسرا جنم دے کے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ مجھے روزانہ مختلف قسم کی ذہنی اور جسمانی ورزش کروائی جاتی تھی، البتہ تا حال میرے چہرے اور سر پر بندی پٹیوں کو اتارا نہیں گیا تھا۔ مجھے اپنی قوت فیصلہ کو ابھارنا تھا اور سوچ کی نئی گہرائیوں تک پہنچنا تھا۔ میں جس ذہنی کیفیت میں گرفتار تھا شاید آج تک وہ کیفیت کسی پر نہ آئی ہو۔ میں ٹھیک ٹھاک ہوشمند انسان تھا، مگر میں اپنا پورا نام تک نہیں جانتا تھا۔ روز بروز میرے جسم میں طاقت آتی جارہی تھی، یہ اس وقت سے شروع ہوا جب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ میرا نیا جسم ایک خوبصورت اور نوجوان جسم ہے میں برسوں بعد خود کو بہتر محسوس کررہا تھا، لیکن ایک روز جب ڈاکٹر نے مجھے دوبارہ کام شروع اور گھر جانے کا کہا تو میں کانپ کے رہ گیا گھر کی مجھے کوئی خاص فکر نہیں تھی، لیکن کام..... یقیناً اس کے پیش نظر کوئی ایسی ملازمت نہیں تھی جو میں کرسکتا تھا۔ میں تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی تھا، جس نے تیس سال جیل کی اونچی سلاخوں کے پیچھے گزار دیئے تھے۔ میرے پاس کوئی ہنر نہیں تھا۔ میں نے کوئی ٹریننگ نہیں لی تھی زیادہ تعلیم یافتہ بھی نہیں تھا سوائے اس کے ہفتے میں میں دو تین کتابیں جیل کی چار دیواری میں پڑھ لیا کرتا تھا یا پاکٹ ڈائری میں لکھ لیا کرتا تھا۔

میں گھر آگیا تھا مگر میرے چہرے پر پٹیاں بدستور موجود تھی۔ ڈاکٹر نے محض میرے دماغ کو فریش کرنے کیلئے مجھے گھر دکھانے لایا تھا۔ گھر فریش ہونے کی بجائے میں اور الجھ گیا۔ میں جس قدر ڈیوس کی بیوی کو دیکھتا انتہائی دل چاہتا کہ کاش میں وہی ہوتا۔ ڈاکٹر نے شاید میری بدلتی کیفیت کو میری آنکھوں سے نوٹ کرلیا وہ مجھے واپس اسپتال لے آیا۔ تقریباً دو روز بعد میری پٹیاں بھی کھول دی گئی، مگر خود کو دیکھ نہیں سکتا تھا، اس سے اگلے دن ڈاکٹر ہاتھوں میں کپڑے کا بنڈل اٹھائے میرے پاس آیا۔ اور بولا کہ کپڑے بدل لو تمہیں اپنے دفتر جانا ہے۔

میں نے احتجاج کرنا چاہا مگر اس نے ہر بات نظر انداز کردی۔ ”بس تھوڑی دیر کیلئے چلیں گے اور واپس آجائیں گے“ یہ کہہ کر وہ مجھے جلد کپڑے بدلنے کی تاکید کرکے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر کے ساتھ کار میں بیٹھتے ہوئے میں کسی نامعلوم سفر پر رواں دواں تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ جس ڈیوس نامی شخص کو میں نے اپنایا ہوا تھا اس کا پیشہ کیا ہے۔ مجانے وہ وکیل تھا، انجینئر تھا، معمار تھا یا سڑکوں کی صفائی کرتا تھا۔

یہ احتمالہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ جس طرح اس کے جسم میں داخل ہوگیا تھا، اسی طرح آسانی سے اس کا پیشہ بھی اپنا لوں گا۔ میں نے سر جھکا کر کار کے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے گزرنے والی چیزوں کو ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور پھر کار رک گئی میں نے سر گھما کر دیکھا۔

اطمینان کی ایک طویل سانس میرے حلق سے خارج ہوگئی مجھے سہارا دے کر کار سے اتارا گیا، فٹ پاتھ پر خاصا ہجوم تھا۔ اپنے آفس تک مجھے قدم قدم پر باوردی سنتریوں نے خوش آمدید کہا۔

ان میں سے پیشتر کو میں جانتا تھا بہت اچھی طرح جانتا تھا۔

”واپسی مبارک ہو“ وارڈن ریمنڈ“ وہ کہہ رہے تھے اور میرا ہر اٹھتا ہوا قدم لڑکھڑا رہا تھا۔

”مائی نیم از ریمنڈ ڈیوس“

نامراد

شائستہ سحر-راولپنڈی

رات کی تاریکی میں بستر پر لیٹی دوشیزہ کے وجود سے ایک اور وجود ہیولا کی شکل میں باہر نکلا اور لہرتا ہوا فضا میں معلق ہوگیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہیولا اچانک خوف زدہ ہو کر لرزنے لگا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے، جس کا ثبوت کہانی میں اتم موجود ہے

”**میں** تنگ آگئی ہوں اس ناچ گانے سے! بھلا ہماری بھی کوئی زندگی ہے، تمام عمر ناچ گا کر، در در کی بھیک مانگ کر کمائو، لعنت ہے ایسی زندگی پر۔“ نازو نامی خواجہ سرا نے بڑے دکھ سے کہا۔

”شش!“ چنبیلی نامی خواجہ سرا نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”آہستہ بول اگر گرو نے سن لیا تو تیری کھال کھنچوادے گا۔“

نازو نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ”اس سے کہہ دے، کھنچوادے میری کھال اور ساتھ ہی میرے دماغ کا بھی کچھ ایسا علاج کردے کہ میں دوبارہ اپنی اصلیت یاد کرنے کے لائق نہ رہوں۔“

”تو تو سچ مچ پاگل ہوگئی ہے، میں تیرا کیا کروں۔“ چنبیلی نے اپنا سر پکڑ لیا۔ اتنے میں ایک اور خواجہ سرا کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی اپنے چہرے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”ہائے تم دونوں ابھی تک تیار نہیں ہوئیں ہمیں چھ بجے شادی والے گھر جانا ہے۔“

چنبیلی نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ”تو جاہم ابھی تیار ہو کر آتے ہیں۔“ اس خواجہ سرا کے جاتے ہی چنبیلی نے بہ مشکل نازو کو ساتھ چلنے پر آمادہ کیا۔

شادی کی تقریب انتہائی شاندار تھی خواجہ سرا کی یہ ٹولی جس میں نازو نامی خواجہ سرا بھی شامل تھا شوخ گانوں پر خوب لہک لہک کر ڈانس کر رہے تھے۔

نازو انتہائی بے دلی سے اپنے ساتھیوں کا ساتھ دے رہی تھی، اسے کبھی بھی اپنی یہ زندگی پسند نہ تھی، اور نہ ہی لوگوں کے سامنے ناچنا اسے اچھا لگتا تھا۔ اچانک چند منچلے نوجوان بھی تالیاں بجاتے ہوئے ان کے قریب کھڑے ہو گئے ایک دو نے تو باقاعدہ چھیڑ چھاڑ بھی کی تو نازو کا خون کھول اٹھا، اس نے دل پر جبر کر کے یہ سب برداشت کیا۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر ان کو داد دے رہے تھے لوگوں کی آنکھوں سے چھلکتے تمسخر سے اسے نفرت تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ لوگوں کی نظر میں ایسی مخلوق سمجھی جاتی ہے جو جذبات و احساسات سے عاری ہوتی ہے۔ تقریب سے واپسی پر اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا۔ بستر پر گرتے ہی اس نے اپنی حالت زار پر آنسو بہانا شروع کر دیا۔ سوچوں کا ایک طوفان اس کے دماغ میں مچل رہا تھا، اس اثناء میں چنبیلی کمرے میں داخل ہوئی ”ارے تو ادھر پڑی ہے، چل اٹھ کھانا کھا لے۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے“ نازو نے بے دلی سے جواب دیا۔ چنبیلی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا ”تیری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں!“

”ہاں ٹھیک ہے“ نازو نے آنکھیں موند کر جواب دیا، پھر انتہائی دکھ سے بولی۔ ”ہماری کوئی زندگی نہیں، میں مایوس ہوں، مجھے پتہ ہے ہم کبھی بدل نہیں پائیں گے، ہمارے نصیب میں خوشیاں نہیں، ہم تمام عمر یونہی لوگوں کے لئے قابل تمسخر رہیں گے“ نازو نے انتہائی کرب سے آنکھیں کھولیں اور چنبیلی کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”ہم ایسے کیوں ہوتے ہیں چنبیلی؟“

چنبیلی نے جھنجلاتے ہوئے اپنا سر جھٹکا ”تیری کھوپڑی الٹی ہے، اس لئے تو الٹا الٹا سوچتی ہے، بھلا ہمیں سرکار ان باتوں سے! مجھے تو حیرت ہوتی ہے! آج تک میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا جیسا تو سوچتی ہے۔“

نازو نے تلخ لہجے میں کہا ”کاش میں بھی تیری جیسی سوچ رکھتی مگر میرا بھی دل کرتا ہے میرا بھی کوئی گھر ہو، گھر والے ہوں، ہم اپنوں کے لئے قابل شرم ہوتے ہیں ہمارے اپنے سگے ماں باپ، بہن بھائی اور رشتے دار ہمیں اپنا کہتے ہوئے ہچکچاتے محسوس کرتے ہیں، کتنی انوکھی اور عجیب مخلوق ہیں ناں ہم شاید ہمیں انسانوں میں شمار کیا ہی نہیں جاتا حالانکہ ہم خود اپنی مرضی سے تو ایسے نہیں بنتے ناں۔“

چنبیلی نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا ”تجھے تو اللہ ہی سمجھائے، تیرا دماغ تو پتہ نہیں کیا کیا سوچتا رہتا ہے چنبیلی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

آدھی رات کا وقت تھا جب خواجہ سراؤں کی اس قیام گاہ میں شور مچ گیا کیونکہ نازو نامی خواجہ سرا نے پنکھے کے ساتھ جھول کر خود کشی کر لی تھی۔

☆.....☆.....☆

”عالیہ ارے کہاں ہو تم؟“ ناصر تیزی سے پکارتا ہوا بیڈ روم میں داخل ہوا۔ عالیہ بستر پر دراز میگزین پڑھ رہی تھی اسے دیکھتے ہی چونک گئی۔ ”کیوں کیا ہوا آپ اتنی جلدی آ گئے؟“

”آج دن ہی کچھ ایسا ہے“ ناصر نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس کے بہت قریب بیٹھ گیا۔

”کیوں کوئی خاص دن ہے آج؟“ عالیہ نے جلدی سے رسالہ ایک جانب رکھ کر سوال کیا۔

”جی جناب! آج واقعی بہت خاص دن ہے، تم تو اپنے دوستوں اور پارٹیوں میں سب کچھ بھول جاتی ہو مگر مجھے تمہارے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک پل یاد رہتا ہے جلدی سے تیار ہو جاؤ، آج ہم ڈنر باہر کریں گے۔“ ناصر نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟۔

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن میں ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دار لکتب
قدافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

”مگر کیوں؟ آپکو میں نے صبح ہی تو بتایا تھا میری طبیعت کچھ بوجھل ہے ورنہ آپ تو جانتے ہیں اس وقت بھی میں کسی پارٹی میں ہوتی“ عالیہ جھنجلا کر بولی۔

ناصر نے اچانک سنجیدگی سے کہا ”عالیہ آج ہماری شادی کی پہلی سالگرہ ہے کم از کم آج تو ہمیں اپنا وقت اچھا گزارنا چاہئے، میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ تم دن بدن مجھ سے اور اس گھر سے لاپرواہ ہوتی جا رہی ہو“

عالیہ کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اس نے ناصر کے ہاتھ تھام لئے ”او سوری ناصر! آج میری طبیعت ٹھیک نہیں اس لئے مجھے کچھ یاد نہیں رہا، پلیز! غلط مت سوچا کرو ایسا بالکل بھی نہیں جیسا تم سوچتے ہو، میری عادات اور مشاغل سے تو تم شروع دن سے واقف ہو اور تم نے مجھے ان عادات اور مشاغل سمیت قبول کیا ہے، سو کسی قسم کا اعتراض مت کرو، اپنا موڈ ٹھیک کرو، میں ابھی پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آتی“ عالیہ نے اتنا کہہ کر مسکراتی ہوئی وہاں سے اٹھ گئی۔

ناصر اور عالیہ کی شادی کو ایک سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ دونوں نے پسند کی شادی کی تھی۔ ناصر کے والد سیٹھ اکرم اور عالیہ کے والد ایڈووکیٹ کمال آپس میں بہت اچھے دوست تھے اس لئے یہ شادی بغیر کسی رکاوٹ کے انتہائی خوش اسلوبی سے ہوئی تھی ناصر عالیہ کو پا کر بہت خوش تھا تاہم اسے عالیہ کی کچھ باتیں پریشان کر دیتی تھیں وہ گھر میں بالکل دلچسپی نہیں لیتی تھی، سارا سارا دن سہیلیوں کے ساتھ طرح طرح کی پارٹیاں اٹینڈ کرنے میں گزار دیتی کبھی کبھی یہ پارٹیاں لیٹ نائٹ جاری رہتی تھیں، جس کی وجہ سے ناصر کے والد سیٹھ اکرم نے کئی بار ناصر کو عالیہ پر کنٹرول کرنے کا کہا تاہم ناصر عالیہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا اور ہمیشہ اس کی ان حرکتوں کو برداشت کرتا رہتا تھا۔

ڈنر سے واپسی پر عالیہ اور ناصر بہت خوش تھے۔ کافی عرصے بعد انہوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ واپسی پر بھی وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے، اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آئندہ زندگی کے بارے میں طرح طرح کے منصوبے بنارہے تھے مگر آنے والے وقت کا کسے علم ہوتا ہے۔ وہ دونوں بھی بے خبر تھے اس حادثے سے جس نے ان دونوں کو آن دبوچا تھا۔

اچانک ہی بے دھیانی میں ان کی گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ایک خوفناک حادثہ رونما ہوا تھا جس نے موقع پر موجود ہر شخص کو دم بخود کردیا تھا۔

ناصر نے تکلیف سے آنکھیں کھولیں دھند کے پردے چھٹے تو اسے سیٹھ اکرم کا پریشان چہرہ نظر آیا اس کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا وہ عالیہ ہی کا تھا اس نے بے چین لہجے میں پوچھا ''ابو عالیہ کدھر ہے؟''

سیٹھ اکرم دکھی لہجے میں بولے۔

''بیٹا میں نے تمہیں ہمیشہ حالات کا مقابلہ کرنا سکھایا ہے، امید ہے تم یہاں بھی پورے حوصلے سے میری بات سنو گے! میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا، عالیہ بیٹی مرچکی ہے، اس کے سر پر شدید چوٹیں آئی تھیں جنہیں وہ برداشت نہ کرپائی۔''

سیٹھ اکرم کی بات کسی ہتھوڑے کی طرح اس کے دل ودماغ پر برسی تھی دماغ شل ہورہا تھا دل غم سے نڈھال ہورہا تھا وہ خاموش رہا اور آنکھیں بند کرکے اپنے ضبط کو آزمانے لگا۔

بہت تھوڑا ساتھ تھا اس کا اور عالیہ کا اور یہ ساتھ اسے تمام عمر کے لئے تنہائی اور محرومی میں مبتلا کر گیا تھا، بہت ضبط کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب امنڈنے لگا تھا۔

سیٹھ اکرم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ''حوصلہ کرو بیٹا؟ میں گھر جارہا ہوں عالیہ کے کفن دفن کا انتظام بھی کرنا ہے۔''

ناصر نے اشکبار آنکھوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ ''پاپا میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں عالیہ کو آخری بار دیکھنا چاہتا ہوں۔''

سیٹھ اکرم نے اس کے شانے کو تھپتھپایا ''بیٹا ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہاری کنڈیشن ایسی نہیں کہ تم اٹھ سکو کیونکہ تمہاری ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ آئی ہے، کم از کم تمہیں کچھ بہتر ہونے میں ایک ہفتہ لگ جائے گا، پلیز! سمجھنے کی کوشش کرو'' ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے آپ جائیں شاید میں بھی عالیہ کو مردہ حالت میں نہ دیکھ سکوں۔''

سیٹھ اکرم کے جانے کے بعد وہ خوب رویا تنہائی ملتے ہی وہ کبھی خدا سے اور کبھی عالیہ سے شکوے کرتا رہا۔ اسے کب نیند آئی اسے کچھ پتہ نہ چلا۔

اچانک ایک دھماکے سے اس کی آنکھ کھلی ناصر کا ایک ملازم جس کا نام ندیم تھا۔

گھبرایا ہوا وارڈ روم میں داخل ہوا، اس دوران اس کا ہاتھ ٹیبل پر پڑے ہوئے گلاس سے ٹکرایا تو گلاس زمین پر گر کر چکنا چور ہوگیا۔ یہ گلاس ٹوٹنے کی آواز تھی جس نے ناصر کو فوراً بیدار کردیا۔ اس نے چونکتے ہوئے سامنے دیکھا تو اسے ندیم نظر آیا۔ ندیم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''کیا ہوا ندیم؟'' ناصر نے بیدار ہوتے ہی فوراً پوچھا۔

ندیم ہکلاتے ہوئے۔ بولا ''وہ......وہ صاحب جی! عالیہ بی بی۔''

ناصر اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا ''جانتا ہوں وہ مرچکی ہے، پھر بار بار یہ بات سنا کر میرا دل کیوں دکھاتے ہو؟''

ندیم بہ مشکل بولا۔ ''نہیں صاحب وہ مری نہیں ہیں بلکہ زندہ ہوچکی ہیں۔''

''کیا؟'' ندیم کے اس انکشاف پر اچانک ناصر بری طرح چیخا اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹ گئیں۔ ''تم یہ کیا کہہ رہے ہو، کیا ایسا ہوسکتا ہے؟''

''م......میں سچ کہہ رہا ہوں، آپ بے شک بڑے صاحب سے پوچھ لیں۔'' ندیم نہایت خوفزدہ لہجے میں ہکلایا۔

ناصر نے اپنے والد کو فون کیا تو اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ ندیم سچ کہہ رہا ہے۔

عالیہ کی میت کو جب دفنانے کے لئے قبرستان لیجایا گیا تو وہ وہیں اٹھ کر بیٹھ گئی اور اپنے جسم پر کفن دیکھ کر چیخنے لگی وہاں موجود کئی لوگ جنازہ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ عالیہ کے والد کمال اور سسر سیٹھ اکرم نے بڑی بہادری سے اس صورت حال کا سامنا کیا تھا اور خود کے ساتھ ساتھ عالیہ کو بھی سنبھال لیا تھا۔

عالیہ کے مرکر دوبارہ جی اٹھنے کی خبر شہر میں دور دور تک پھیل گئی تھی تاہم عالیہ کے گھر والے اور ناصر کے گھر والے اور خود ناصر بھی ان بھوت پریت کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ انہیں ڈاکٹر کی اس بات پر پورا یقین تھا کہ ''کئی بار انسان کی حرکت قلب اس قدر آہستہ ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹرز بھی دھوکا کھا جاتے ہیں اور مریضوں کو مردہ قرار دے دیتے ہیں۔

''عالیہ کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔'' یہی سوچتے ہوئے وہ سب بہت خوش تھے، خصوصاً ناصر کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس نے عالیہ کو دوبارہ پالیا تھا۔ عالیہ بھی چند دن میں نارمل ہوگئی اور ناصر بھی چلنے پھرنے کے لائق ہوگیا تھا۔ اپنی حالت بہتر ہوتے ہی عالیہ نے گھرداری کے کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا تھا اس میں حیرت انگیز تبدیلی واقع ہوئی تھی وہ عالیہ جو گھر کے کاموں کو ہاتھ لگانا اپنی توہین سمجھتی تھی اب ہر وقت گھر کے کاموں میں جتی رہتی تھی۔

اپنے دوستوں کے ساتھ پارٹیوں میں جانے کی عادت بھی اس میں تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ وہ بالکل عام سی گھریلو عورت کی طرح اپنے شوہر کی خدمت میں کوشاں رہتی۔ ناصر کے لئے یہ تبدیلی حیرت کا باعث تھی تاہم اس کے لئے یہ تبدیلی خوش آئند بھی تھی ان کی ازدواجی زندگی حقیقت میں اب نکھری تھی۔ ''عورت اپنی خوبصورتی سنوارنے سے زیادہ اپنے گھر کو سنوار کر اچھی لگتی ہے۔''

ناصر کو بھی عالیہ پہلے سے کہیں زیادہ اچھی لگنے لگی تھی اس کا بس نہیں چلتا تھا وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ عالیہ کے ساتھ گزار دیتا۔ مگر پھر ناصر کی ہنستی مسکراتی زندگی کو خدا جانے کس کی نظر لگ گئی۔

اس رات وہ دیر سے سویا تھا مگر اس کی آنکھ جلد کھل گئی تھی پھر کافی دیر اس کو نیند نہیں آئی تو اس نے تنگ آکر لیمپ کا بٹن آن کیا۔ اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دفعتاً اس کی نگاہ عالیہ پر پڑی جو اس کے برابر میں بستر پر بالکل سیدھی لیٹی ہوئی تھی، اس کی کھلی ہوئی آنکھیں خوفناک حد تک حلقوں سے ابھری ہوئی تھیں اور وہ چھت پر مرکوز تھیں، ان میں زندگی کی رعنائی نہ تھی۔

ناصر نے گھبرا کر عالیہ کی نبض دیکھی تو وہ لرز اٹھا۔ عالیہ کا بے حس وحرکت سرد وجود اس بات کی تصدیق کررہا تھا کہ وہ زندگی کی ہر رمق سے عاری ہوچکا ہے۔

ناصر گھبرا گیا، وہ اپنے گھر والوں کو بیدار کرنے کے لئے جیسے ہی بستر سے اتر کر بھاگا اسے کچھ سمجھ نہ آئی۔ اس کا پاؤں پھسل گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا زمین پر گرتے ہی اس کا سر ایک طرف پڑے میز کے کونے کے ساتھ بری طرح ٹکرایا اور وہ وہیں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اپنے بیڈ پر موجود تھا اس نے حیرانگی سے اردگرد کا جائزہ لیا کچھ ہی دیر میں گزشتہ واقعات اس کے دماغ میں تروتازہ ہوگئے اس نے گھبرا کر اپنی پیشانی کو ٹٹولا، اس کی پیشانی پر جہاں چوٹ لگی تھی وہاں پٹی بندھی ہوئی تھی۔ عالیہ کا خیال آتے ہی اس نے بے چین ہوکر اٹھنا چاہا تو اسی لمحے عالیہ سوپ لیکر کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے اپنے سامنے زندہ دیکھ کر ناصر کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس کو گھورے جارہا تھا۔

عالیہ اس کی حیرت نظر انداز کرکے بولی۔ ''آپ کی اب طبیعت کیسی ہے؟''

''میں ٹھیک ہوں'' وہ بدستور اس کو گھورتے ہوئے بولا۔

''آپ کیسے گر گئے تھے میں تو صبح آپ کو بے ہوش پڑا دیکھ کر چیخ پڑی تھی تب انکل اور آنٹی بھی آگئے، انہوں نے ڈاکٹر کو فوراً بلا کر آپ کی مرہم پٹی کروائی مگر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آپ تو چلنے میں ذرا احتیاط نہیں کرتے" عالیہ نے روانی میں بولتے ہوئے کہا۔

"بس کبھی ہو جاتا ہے ایسا مجھے شاید چکر آ گیا تھا۔ خیر ابو کہاں ہیں" ناصر بات کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

"وہ آفس گئے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے ان کی کال آئی۔ آپ کا پوچھ رہے تھے" عالیہ نے جواباً کہا۔

ناصر اس کا جواب سن کر خاموش ہوگیا۔ وہ دن اس کی بربادیوں کا آغاز تھا اور پھر وہ ہر رات زندگی کی تمام تر رمق سے عاری وجود بستر پر پاتا تھا۔ وہ حیران تھا پہلے شروع کے دنوں میں وہ رات بارہ بجے سے پہلے ہی سو جاتا تھا اور اس کی آنکھ صبح ہونے سے پہلے نہیں کھلتی تھی مگر اب خدا جانے کیا ہونے لگا تھا اس کو نیند ہی نہیں آتی تھی۔ ایک شدید قسم کی پریشانی نے اس کی نیندیں حرام کردی تھیں۔

چاروناچار اس نے اپنے والد سے اپنی تمام پریشانی بتادی جسے سن کر سیٹھ اکرم بہت حیران ہوئے انہوں نے اس سے پہلے کبھی ایسا واقعہ نہ تو سنا تھا اور نہ ہی دیکھا تھا۔ سیٹھ اکرم کے ایک دوست ایسے تھے جو ایک مسجد میں پیش امام تھے، اس کے علاوہ ان کے پاس ایسے لوگ بھی آتے تھے جو عجیب وغریب قسم کے پر اسرار مسائل کا شکار ہوتے تھے وہ کلام الٰہی سے ان کی پریشانیوں کا فوراً حل نکال دیتے تھے۔ تمام جاننے والے ان کو مولوی شمس الدین کے نام سے جانتے تھے۔

سیٹھ اکرم نے اپنی تمام پریشانی ان کو بتادی۔

یہ مسئلہ انتہائی عجیب وغریب تھا۔ مولوی شمس الدین نے ان کے گھر آ کر ان کی بہو سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اور اسی دن وہ عالیہ سے ملنے گھر پہنچ گئے عالیہ کو دیکھ کر مولوی صاحب کے چہرے پر تشویش پھیل گئی جبکہ عالیہ ان کو دیکھ کر گھبرا گئی، اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی تھی مگر اس نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پالیا، وہ تھوڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھی رہی مگر اس دوران وہ کافی گم صم رہی پھر اٹھ کر اپنے بیڈروم میں چلی گئی۔

سیٹھ اکرم حیرت سے بولے "یہ عالیہ کو کیا ہوگیا؟"

مولوی صاحب مسکرائے "تباہی کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر کسی کا پریشان ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" سیٹھ اکرم نے یکلخت پوچھا۔

"تم کو جلد تمام باتیں پتہ چل جائیں گی، مجھے بس آج کا دن دے دو، میں موکلات سے سب پتہ چلا لوں گی اور آج رات ہی اس سارے کھیل کی بازی الٹ جائے گی، میں رات کو پھر آؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ واپس چلے گئے۔

تقریباً رات بارہ بجے کے بعد مولوی صاحب پھر سیٹھ اکرم کے گھر آئے۔ ناصر ان کو اپنے کمرے میں لے آیا جہاں عالیہ کا بے حس وحرکت جسم بستر پر موجود تھا۔ مولوی صاحب نے آگے بڑھ کر عالیہ کی نبض دیکھی اور پھر سر جھٹک کر پیچھے ہٹتے ہوئے بولے "تم دونوں میرے ساتھ باہر آؤ"

مولوی صاحب کے اشارے پر ناصر اور اس کے والد کمرے سے باہر آ گئے، کچھ دیر بعد وہ تینوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔

مولوی صاحب سنجیدگی سے بولے۔ "میں تم دونوں کو جو کچھ بتاؤں گا، اس کو ہمت اور حوصلے سے سننا، پھر وہ ناصر سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹا تمہیں یہ سن کر بہت دکھ ہوگا کہ تمہاری بیوی عالیہ آج سے تین ماہ پہلے ہونے والے ایکسیڈنٹ میں مرگئی تھی۔"

"کک...... کیا؟ مگر عالیہ تو بچ گئی تھی۔" ناصر ہکلاتے ہوئے بولا۔

مولوی صاحب ناگواری سے بولے "وہ خود تو مرگئی تھی مگر اس منحوس نامراد کی بدروح اس کے جسم میں حلول کرگئی تھی۔"

"کیا؟ ناصر یکلخت جیسے چلایا "ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"ایسا ہو چکا ہے تمہیں یہ حقیقت ماننی پڑے گی، اندر کمرے میں تمہاری بیوی کا وجود تو موجود ہے مگر اس میں روح ایک خواجہ سرا کی گھسی ہوئی ہے۔

مولوی صاحب کی بات سن کر بیک وقت ناصر اور سیٹھ اکرم کو جھٹکا لگا۔ مولوی صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "وہ ایک بدروح ہے، قدرت کے کاموں میں مخل ہو کر اپنی نامکمل خواہشات کی تکمیل کرنا چاہتی ہے مگر وہ ہر وقت عالیہ کے جسم میں نہیں رہ سکتی، اس لئے رات کے وقت اس کو عالیہ کے جسم سے نکلنا پڑتا ہے، اب تم مجھے اجازت دو تاکہ میں آج ہی اس کے ساتھ نمٹ لوں۔"

ناصر سر جھکائے بولا۔ "ایسی صورت میں تو مجھے عالیہ کو کھونا پڑے گا۔"

مولوی صاحب اس کو سمجھاتے ہوئے بولے "بیٹا تم عالیہ کو اب سے تین ماہ پہلے ہی کھو چکے ہو، اس بات کو تسلیم کرو، یہ محض دکھاوا ہے، اس خواجہ سرا کی بدروح تمہاری بیوی کے مردہ وجود کو استعمال کررہی ہے جو کہ سراسر زیادتی ہے، وہ سزا کی حقدار ہے، مجھے اس کو اس کے انجام تک پہنچانے دو۔"

دل مضبوط کرتے ہوئے ناصر بولا۔ "ٹھیک ہے آپ جو چاہیں کریں مگر یہ سب میرے سامنے ہوگا۔"

مولوی صاحب نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے چلو آؤ۔"

مولوی صاحب دوبارہ ناصر کے کمرے میں آئے۔ ناصر کو ایک طرف بیٹھ جانے کا اشارہ کرکے وہ خود بھی تسبیح اٹھائے زمین پر بیٹھ گئے اور آنکھیں بند کرکے تسبیح پر کچھ پڑھنے لگے۔ چند لمحوں بعد ناصر نے جو منظر دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہورہا تھا۔ ایک طویل قامت سایہ یکلخت کہیں سے نمودار ہوا، اور اس نے ایک ہیولے کو زمین پر پٹخنے کے انداز میں پھینکا اور ایک لمحے میں غائب ہوگیا۔ اسی ساعت مولوی صاحب نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور غضب ناک نگاہوں سے اس ہیولے کو دیکھا "مردود نامراد! تجھے پتہ ہے کہ تو نے کتنا بڑا گناہ کیا ہے؟"

اچانک ہی کمرے میں اس ہیولہ کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ "مجھے معاف کردیں مولوی صاحب! مجھ سے واقعی بہت بڑا گناہ سرزد ہوا ہے مگر میں بھی کیا کرتی، ساری دنیا کی نظر میں، میں اور میرے جیسے کئی ادھورے انسان ایک تماشا ہوتے ہیں، ہمیں انسان نہیں سمجھا جاتا، میں اپنی زندگی میں تو اپنی نامکمل خواہشات کی تکمیل نہ کرپائی مگر مرنے کے بعد مجھے ایسا موقع مل گیا جب لوگ مجھے ایک انسان سمجھنے لگے، میری عزت کرنے لگے، مجھ سے محبت کرنے لگے یہی میں نے چاہا تھا، یہی میری زندگی کی ادھوری خواہشات تھیں جن کو میں پورا نہیں کرسکتی تھی اس لئے میں نے خودکشی کرلی تھی۔ مرنے کے بعد میں اس عورت کے مردہ جسم پر قابض ہوگئی مگر میں ہر وقت اس جسم میں نہیں رہ سکتی تھی۔ رات بارہ بجے کے بعد مجھے اس جسم کو چھوڑنا پڑتا تھا، مجھے کچھ دن پہلے ہی اندازہ ہوگیا تھا کہ اس عورت کے شوہر کو کچھ شک سا ہوگیا ہے مگر میں اپنی جگہ مجبور تھی مجھے معاف کردیں۔" وہ گڑگڑایا مولوی صاحب گرجدار آواز میں بولے۔

"دل تو چاہتا ہے کہ تجھے تیرے کیے کی اس وقت سزا دوں کیونکہ تو نے قدرت کے کاموں میں مداخلت ڈالنے کی کوشش کی ہے اور تو جانتا ہی ہوگا کہ خدا بھی ایک خاص وقت تک کسی کو ڈھیل دیتا ہے، بس تیری ڈھیل بھی ختم ہوچکی ہے، تیرا معاملہ خدا کے ساتھ ہے، وہی تجھے سزا دے گا، تو جا اوپر، اب تیری اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے" مولوی صاحب جیسے ہی چپ ہوئے تو وہ بدروح دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوگئی۔

ناصر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب گہرا سانس لے کر اس سے مخاطب ہوئے۔

"بیٹا زندگی صرف ایک بندے پر ختم نہیں ہو جاتی، عالیہ کا غم کرنے کی بجائے اس کی روح کو زیادہ سے زیادہ ثواب پہنچانے کا وسیلہ بنو۔"

ناصر نے نمناک آنکھوں سے عالیہ کے مردہ وجود کو دیکھا اور آنسو پونچھتے ہوئے مولوی صاحب کی بات کی تائید میں سر ہلادیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

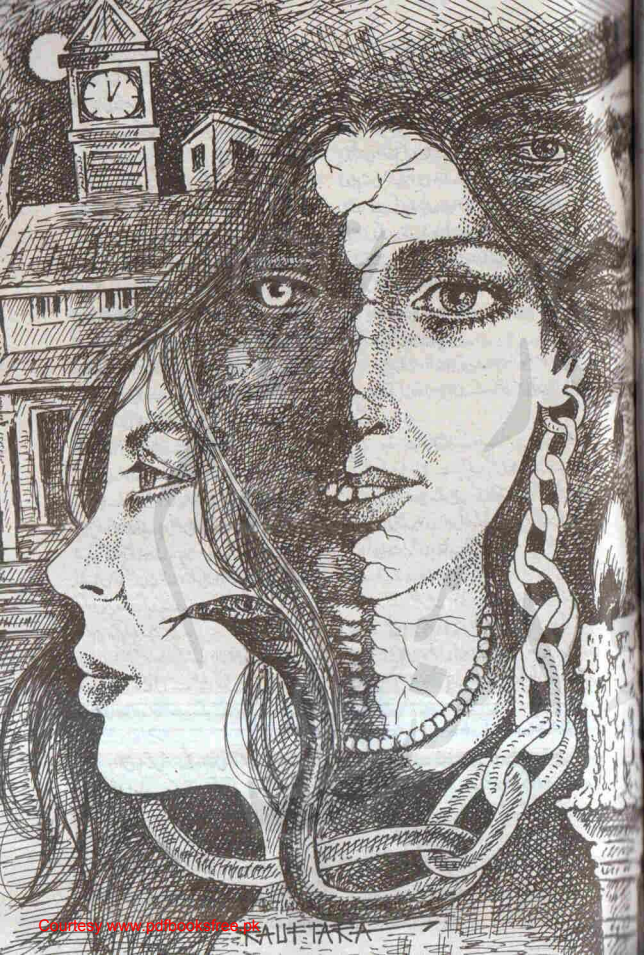

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:83

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

بہت سارے کتوں کی آوازیں یکدم جیسے ان کے گلے میں گھٹ گئی تھیں۔ قرب و جوار کے لوگ بھی حیران تھے کہ آخر اچانک یہ سارے کتے کیوں خاموش ہوگئے۔ صبح کا اجالا پھیلتے ہی سارا گاؤں حیران و پریشان تھا کیونکہ سلامت کے گھر کے سامنے بارہ تیرہ کتے مردہ پڑے تھے، ہر شخص اچنبھے میں تھا کہ اتنے سارے کتے یک بیک کیسے مرگئے، ہر آدمی کی عقل سکتے میں تھی، خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا تھا، رات کے ساڑھے بارہ بجتے ہی سلامت نے اپنے چہرے پر نسوانی ہاتھوں کا لمس محسوس کیا تو گھبرا کر اپنے بستر پر اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''مدھو تمہیں اگر اس وقت کسی نے دیکھ لیا تو غضب ہوجائے گا، گاؤں میں میرے بابا کی عزت ہے وہ جیتے جی مرجائیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں تم گھبراؤ نہیں مجھے آتے جاتے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا، اس کے بعد مدھو نے پیار و محبت کی باتیں کیں اور رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں غائب ہوکر چلی گئی۔ وقت آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ مدھو روزانہ رات میں آتی اور سلامت سے مل ملا کر چلی جاتی، سلامت کی جسمانی کمزوری دن بدن بڑھ رہی تھی۔ رولوکا نے اکیلے میں سلامت کو بلا کر بولا کہ رات کے وقت تم جس لڑکی کے ساتھ وقت گزار رہے ہو وہ کوئی عام لڑکی نہیں بلکہ ایک نادیدہ قوت ہے جو کہ وقت کے ساتھ ساتھ تمہارے جسم کا خون چوس رہی ہے، بہرحال وقت مقررہ پر میں تمہارے گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ اور یہ سوئی تم اپنے پاس رکھ لو اس میں دھاگہ پڑا ہوا ہے جب وہ لڑکی رات میں آئے تو اس کی نظر بچا کر یہ سوئی دھاگہ سمیت اس کے کپڑوں میں لگا دینا، رات میں مدھو آئی تو سلامت نے سوئی دھاگہ سمیت اس کے کپڑوں میں لگادی، صبح کے وقت رولوکا سلامت کے گاؤں پہنچ گیا اور سلامت کو لے کر آموں کے ایک باغ میں گیا، کافی ڈھونڈنے کے بعد اسے ایک درخت کے کھوہ میں دھاگہ لٹکتا ہوا نظر آگیا۔ رولوکا نے کھوہ میں ہاتھ ڈالا تو کھوہ میں ایک مضبوط بڑی ہڈی پڑی تھی جو کہ دراصل دن کے وقت مدھو کی اصلیت تھی۔ رولوکا نے اس ہڈی کو گرم تیل میں جلا ڈالا، اس طرح مدھو جو کہ ایک چڑیل تھی اس کا خاتمہ ہوگیا اور دوبارہ رولوکا حکیم وقار کے مطب میں واپس آگیا۔

(اب آگے پڑھیں)

حکیم وقار اپنے مطب میں خاموش بیٹھے تھے جنہیں دیکھ کر رولوکا بولا۔ ''حکیم صاحب کیا بات ہے، بہت خاموش بیٹھے ہیں؟''

رولوکا کی بات سن کر حکیم وقار مسکرائے اور بولے۔ ''بیٹھیے؟''

کرسی کھینچ کر رولوکا بیٹھ گیا اور بولا۔ ''آپ نے جواب نہیں دیا، میرا سوال یہ ہے کہ ''اس وقت آپ بہت زیادہ خاموش لگ رہے ہیں؟''

''دراصل بات یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے سامنے سڑک پر ایک سائل جا رہا تھا۔ یہ بولتا ہوا ''سامان سو برس کا ہے اور پل کی خبر نہیں!''

بس یہی بات میرے دماغ میں گردش کررہی ہے کہ بات تو بالکل حقیقت ہے۔ دنیا میں انسان ہوش سنبھالتے ہی اور اپنے حالات پر قابو پاتے ہی زیادہ سے زیادہ دھن دولت جمع کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اکثر اوقات وہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا ہے؟ کاش کہ انسان اپنے لئے متعین کردہ حدود میں رہے، اپنی ذات کے لئے اس قدر تگ و دو کرے جتنی کہ اس کی جائز ضروریات ہیں۔ مگر ایک انسان ایسا نہیں کرتا، دنیا میں زیادہ تر وہ لوگ

ہیں جو کہ اپنی ضرورتوں کے لئے دوسروں کا حق مارتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ بالکل بھی نہیں ہچکچاتے اور پھر انتہائی قدم اٹھا بیٹھتے ہیں۔

جب ایک فرد کی شادی ہوتی ہے تو پھر وہ اپنی بیوی بچوں کی ذات کے لئے مال اور دشمن دولت جمع کرنا شروع کردیتا ہے اور یہ کہاں کا انصاف ہے کہ وہ دوسروں کے بچوں کا حق مار کر اپنے بچوں کے لئے جمع کرتا ہے۔ وہ ایسا یوں کرتا ہے کہ وہ زور آور ہوتا ہے، اس کے پاس طاقت ہوتی ہے، اس کے پیچھے دوسرے لوگ اس کی مدد کرنے والے ہوتے ہیں، دوسرے لوگ اس کی خود غرضی اور مطلب پرستی کو جائز قرار دیتے ہیں، اس لئے کہ وہ ظالم اور غاصب شخص ان کی بھی تھوڑی بہت مدد کرتا ہے جو لوگ اس کی پشت پناہی کرتے ہیں۔

بسا اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ظالم شخص اپنے خونی رشتوں کا بھی خیال نہیں کرتا بلکہ اپنے بھائی کے مال پر بھی قبضہ جمالیتا ہے۔ اپنی طاقت کے زور پر لوگوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیتا ہے، رات تو رات دن کے اجالے میں بھی خون خرابے سے دریغ نہیں کرتا۔

اور جب وہ حکمرانی کے مسند پر بیٹھ جاتا ہے تو اسے کھلی چھٹی ہوتی ہے کہ جو چاہے وہ جو کچھ بھی کرے، ایک تن تنہا شخص چونکہ وہ حکمران ہوتا ہے، اپنا حکم بے شمار لوگوں پر صادر کردیتا ہے اور بے شمار لوگ ایک شخص کے حکم پر سر خم کردیتے ہیں۔

اکثر حکم صادر کرنے والا جنونی ہوجاتا ہے۔ وہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیلنے لگتا ہے، اپنی رعایا اپنے ملک کی بقا اور حفاظت کے لئے جائز باتیں بھول کر ناجائز قدم اٹھا بیٹھتا ہے۔

حق باتیں کرنے والوں کو دشمن گردانتا ہے، اس کی کوشش ہوتی ہے کہ حق باتیں کرنے والوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کردے اور پھر وہ ان لوگوں پر تہمتیں لگا کر غداری کا لیبل چسپاں کردیتا ہے، وہ دوسرے لوگوں کو ان کے خلاف بھڑکا دیتا ہے، لوگ اس مردِ حق کے دشمن بن جاتے ہیں اور پھر اس مردِ حق کی گردن جسم سے جدا کردی جاتی ہے۔

ایک ظالم اور جابر انسان محافظ کے روپ میں اپنی تجوریاں بھرنے لگتا ہے خود کو رات دن عیش و آرام میں مبتلا کرلیتا ہے۔ انصاف پسند اور کمزوروں پر جنگیں مسلط کردیتا ہے۔ اپنی طاقت اور برتری کے ڈوم میں شب خون مارنے سے بھی نہیں رکتا، راتوں رات خون کی ندیاں بہادیتا ہے، خواتین بچوں اور بوڑھوں کو روند دیا جاتا ہے۔ لوگ سسکتے ہیں، آہیں بھرتے ہیں، آنسوؤں کا سمندر اس کے سامنے بہنے لگتا ہے مگر پھر بھی اس ظالم کو رحم نہیں آتا بلکہ اس کا جنون اور زیادہ بڑھ جاتا ہے، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مرتا دیکھ کر وہ خوش ہوتا ہے۔

حکمرانی، دولت، شہرت اور ہوس کا متوالا کبھی یہ نہیں سوچتا کہ وہ دوسروں کے ساتھ کس قدر انسانیت سوز ظلم کررہا ہے۔

جذبات کو بھڑکانے والے نعروں سے لوگوں کو مشتعل کردیا جاتا ہے۔ ایک شخص کا فیصلہ سب لوگ ماننے پر مجبور ہوجاتے ہیں، کسی ایک میں بھی حکم عدولی کی طاقت نہیں بچتی، اور اگر کوئی ہمت کرکے کبھی بھار حق کی بات کر بھی دیتا ہے تو اس پر غداری کا الزام لگا کر اسے راستے سے ہٹادیا جاتا ہے۔

ایک حکمران ہوتا ہے اور چند اس کے ساتھی ہوتے ہیں اور پھر وہ چند افراد مل کر پورے ملک اور پوری عوام کا بیڑہ غرق کردیتے ہیں، لوگوں کی رات کی نیندیں حرام ہوجاتی ہیں، لوگ پیٹ بھر کر کھا بھی نہیں سکتے، بجلی، گیس اور دیگر چیزوں کے لئے عوام کی زندگی اجیرن کردی جاتی ہے، ملک کی معیشت تباہ کردی جاتی ہے، لوگ اذیت سے دوچار کردیئے جاتے ہیں، لوگ آرام سکون کے لئے ترسنے لگتے ہیں، مگر قوم و ملک کے حکمران عیش و عشرت کی زندگی گزارتے ہیں۔

حق کی بات کرنے والوں کی زبان کاٹ دی جاتی ہے، فریاد کرنے والوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیا جاتا ہے اور ہم خیال لوگوں کو مراعات سے نوازدیا جاتا ہے۔

جن لوگوں کو نواز اجاتا ہے وہ لوگ ہر جائز کو ناجائز قرار دیتے ہیں، ملک میں ظالم دندناتے پھرتے ہیں، وہ خدا کو یکسر بھول جاتے ہیں۔

انصاف کی دھجیاں بکھیر دیتے ہیں مگر انہیں دوسروں کا خیال نہیں آتا۔ مگر ایسے ظالم کو یہ یاد نہیں رہتا کہ بہت کم وقت میں اس کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے، ایک پل میں اس کے جسم کا سانس رک جائے گا اور وہ منوں مٹی تلے دبادیا جائے گا۔ دنیا میں جتنا دشمن دولت اس نے جمع کیا ہے سب کچھ یہیں رہ جائے گا، صرف بیس گز کفن کا ٹکڑا اس کے حصے میں آئے گا۔ کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس دنیا سے جانے والا کفن سے بھی محروم رہ جاتا ہے۔ اب اگر کوئی اس ظالم اور مال و دولت جمع کرنے والے سے پوچھے کہ تو نے تو اپنی زندگی میں دوسروں کا حق مار کر نہ جانے کتنا کچھ جمع کیا اور اپنے ساتھ کیا لے جارہا ہے۔''

حکیم صاحب آپ کی باتیں سو فیصد درست ہیں، اگر انسان ذرا بھی ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرے تو ایسا ظلم کا پہاڑ دوسروں پر نہ توڑے، غفلت میں پڑنے والوں کو ضرور سوچنا چاہئے کہ دین و دنیا کا حکمران اوپر بیٹھا ہے جو کہ بہت بڑا منصف ہے، وہ ہر انسان کے کرتوت کو نوٹ کررہا ہے ظاہری تو ظاہری بلکہ وہ دل کی بات بھی جان لیتا ہے۔

ایک انسان اپنے عمل سے دنیا میں غافل رہتا ہے لیکن مرنے کے بعد صرف وہ اپنا عمل لے کر جاتا ہے، ظالم اور بے انصاف لوگوں سے دنیا میں بھی لوگ نفرت کرتے ہیں اور جب وہ مرجاتا ہے تو اس کی موت کے بعد بھی لوگ اسے برے الفاظ سے یاد کرتے ہیں، اس کے لئے بددعائیں کرتے ہیں، اور اچھے لوگوں کے لئے لوگ دعائیں کرتے ہیں، اپنے مذہب اور طریقے سے صدق دل سے یاد کرتے ہیں اور ظالموں کے لئے نفرت کے بول بولتے ہیں۔'' رولو کا بولا۔

حکیم وقار نے رولو کا سے کہا۔'' ہمارا مذہب امن و شانتی کا درس دیتا ہے۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں بلکہ انسان کی بڑائی اس کے عمل سے ہوتی ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ پیار و محبت کا درس دیا۔ اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ لوگوں کو صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ دشمن دولت اور امارت سے کسی کی بڑائی نہیں بلکہ بڑائی ہے تو صرف اور صرف عمل سے۔ قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے ہر بات کھول کھول کر بتادی ہے۔ اب انسان پر لازم ہے کہ وہ قرآن میں بیان کردہ قانون کے مطابق اپنی زندگی گزارے، اگر ایک انسان قرآن کے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا تو اس کے لئے دین و دنیا دونوں جہانوں میں سکون ہے اور اگر کوئی قرآن کی باتوں سے انحراف کرتا ہے تو وہ گنہگار ہے اور گنہگار کی سزا ''جہنم کی آگ ہے۔''

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج کے خطبہ میں واضح فرمادیا ہے اور یہ خطبہ رہتی دنیا تک مشعل راہ ہے۔ آخری خطبہ جسے پڑھ کر قیامت تک مسلمانوں کے دل، ایمان سے منور ہوتے رہیں گے، یہ خطبہ آپ نے 9 ذی الحجہ 10 ہجری کو دیا۔

☆ لوگو! تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور عزتیں یقیناً ایک دوسرے کے لئے اس طرح احترام کے لائق ہیں جیسا کہ تم آج کے دن اس شہر اور اس مہینے کا احترام کرتے ہو۔

☆ تمہیں عنقریب اللہ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اللہ تم سے تمہارے اعمال کی نسبت سوال فرمائے گا۔

☆ لوگو! عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں اور تم پر عورتوں کے حقوق ہیں۔ عورتوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آؤ کیونکہ اللہ کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا اور اللہ کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لئے حلال کیا ہے۔

☆ اپنی امانتوں میں دیانت دار رہو گناہ سے بچتے رہو، سود حرام ہے، آج کے بعد مقروض صرف اصل ادا کرے گا اور سب سے پہلے میں خود اپنے خاندان سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عباس بن عبدالمطلب کا سود معاف کرتا ہوں۔

☆زمانہ جاہلیت کے تمام جھگڑے مٹائے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں خود ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔

☆اپنے غلاموں کا خیال رکھو، انہیں وہی کھانا کھلاؤ جو تم خود کھاتے ہو، وہی پہناؤ جو تم خود پہنتے ہو، اور اگر ان سے کوئی قصور سرزد ہو جو تم معاف نہ کر سکو تو ان کو خود سے جدا کر دو کیونکہ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں اور ظلم کے لئے پیدا نہیں کئے گئے۔

☆لوگو! میری بات غور سے سنو، جان رکھو کہ سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا بھائی کا خون بھائی پر حرام ہے، جو چیز ایک بھائی کی ملکیت ہے دوسرا انہیں لے سکتا، جب تک وہ خود بخوشی اسے نہ دے، اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائے رکھو۔ کسی گورے کو کسی کالے پر کسی کوئی برتری نہیں۔ بلکہ ہر کوئی اپنے نیک عمل سے بڑا ہے۔

☆جو لوگ موجود ہیں وہ ان لوگوں کو جو موجود نہیں ہیں، یہ الفاظ پہنچا دیں۔ ممکن ہے وہ لوگ جو موجود نہیں، وہ زیادہ یاد رکھنے والے ہوں جنہوں نے اپنے کانوں سے سنا ہے۔

☆اس کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے دریافت فرمایا۔ ”لوگو! کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے؟“

☆ہر شخص نے جواب دیا۔ ”ہاں! پہنچا دیا۔“

☆تین بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی سوال کیا اور اثبات میں جواب سن کر آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا۔

☆”اے اللہ! گواہ رہنا، میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں تک پہنچا دیا اور اپنے کام کو پورا کر دیا۔“

یہ سن کر رولو کا بولا۔ ”حکیم صاحب، اگر انسان ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرے تو اس کی زندگی میں سکون ہی سکون ہو، کوئی کسی اذیت سے دوچار نہ ہو، لوگوں میں بھائی چارے کی فضا پیدا ہو جائے، ہر آدمی سکھ کی نیند سوئے اور چین کی غذا کھائے، لیکن زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جو ہوس کے غلام بن بیٹھے ہیں۔

انسان کو جانوروں سے سبق سیکھنا چاہئے کہ جب کسی درندے کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ کسی اور جانور کی طرف شکار کی غرض سے دیکھتا بھی نہیں، مگر انسان کے پاس ضرورت کی تمام چیزیں ہوتے ہوئے بھی انسان اور کے چکر میں پڑ جاتا ہے اور پھر جب آدمی وقت آتا ہے تو وہ اپنی جمع کی ہوئی چیزوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے لیکن وہ مجبور ہوتا ہے، ان چیزوں کو چھو بھی نہیں سکتا۔ اس کی جمع کی ہوئی چیزوں سے دوسرے عیش و آرام کرتے ہیں، انسان کو اپنی اصلیت پہچاننی چاہئے.....“ رولو کا بول کر خاموش ہو گیا۔

حکیم وقار بولے۔ ”آپ کی بات بالکل درست ہے۔ کاش! کہ انسان اپنی موت کے متعلق سوچے اور یہی حقیقت ہے۔ ”سامان سو برس کا ہے اور پل کی خبر نہیں۔“

ہاں! یاد آیا کہ ایک صاحب شانتی پور سے آئے تھے۔ بہت پریشان تھے، آپ ان کی پریشانی کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ باتیں کرتے کرتے وہ آبدیدہ ہو گئے تھے، میں نے آپ کا حوالہ دیا تھا۔ ان کے گاؤں میں کچھ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ جو سمجھ سے باہر ہیں۔ شام پانچ بجے تک آپ کا انتظار کیا، میں نے ان سے کہہ دیا تھا کہ حکیم کامل کسی اہم مسئلے کی وجہ سے گئے ہوئے ہیں اور اس قسم کے مسائل وہی حل کرتے ہیں، وہ چلے تو گئے مگر یہ بول گئے کہ میں پرسوں پھر خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ حکیم وقار نے کہا۔

”ٹھیک ہے حکیم صاحب جب وہ آئیں گے تو ان کے مسائل سن کر سو جھیں گے۔“ رولو کا نے کہا۔

☆.....☆.....☆

دلی سے شانتی پور آٹھ کوس کے فاصلے پر تھا۔ بہت ہی سرسبز و شاداب قصبہ تھا۔ جدھر نظر اٹھ جاتی ہریالی ہی ہریالی نظر آتی تھی۔ بیک وقت اس علاقے میں کئی چشمے بہتے تھے۔ ہر قسم کے پھلدار درختوں سے

علاقہ بھرا پڑا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں لوگوں کو مست کر دیتی تھیں۔ اس علاقے کے لوگ میٹھی باڑی کرتے تھے۔ کوئی بھی گھر ایسا نہ تھا جو کہ خوشحال نہ ہو۔ اس علاقے میں تمام تر غلے ضروریات زندگی کے لئے وافر مقدار میں پیدا ہوتے تھے۔ ساگ سبزی کی بہتات تھی۔ ہر کوئی اپنی ضرورت کے مطابق سبزیاں لگاتا تھا۔ مچھلیاں زیادہ تعداد میں ملتی تھیں۔ کھجوروں کے بڑے بڑے پیڑ جن پر گچھے کے گچھے لگے ہوئے پیلے پیلے اور سرخ کھجور بہت ہی دلکش منظر پیش کرتے، جگہ جگہ آموں کے پیڑ پر کچے پکے ہوا کے دوش پر جھولتے ہوئے آم دل کو خوش کرتے، خوشنما اور مزیدار بیروں کے پیڑ دل کو لبھاتے، چشمے میں صاف و شفاف میٹھے بہتے ہوئے پانی دل کو فرحت بخشتے، لبھاتے ہوئے کھیت جن میں کھلے ہوئے سرسوں کے پیلے پھول دل میں عجیب طرح کے کسک پیدا کرتے، تاحد نظر پورا علاقہ پیلا ہی پیلا نظر آتا جنہیں دیکھ کر لوگ پھولے نہ سماتے تھے۔

پورا علاقہ خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ علاقے کے لوگوں میں محبت بھی محبت تھی۔ گاؤں والوں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایسا علاقہ ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ کبھی کسی کی آپس میں لڑائی تو لڑائی بلکہ تو تو میں میں بھی نہیں ہوئی۔ سب لوگ آپس میں شیر و شکر تھے۔

اگر کوئی مہمان اس گاؤں میں آ جاتا تو اس دلکش نظارہ گاؤں سے جانے کا دل نہیں کرتا دوسرے گاؤں والوں کی خواہش ہوتی تھی کہ شانتی پور والوں سے ہمارا رشتہ قائم ہو جائے اور یہ رشتہ داری لڑکے لڑکیوں کی شادی سے ہی ہو سکتی تھی۔ اس علاقے سے ایک سڑک گزرتی تھی جب دور دراز کے لوگ اپنی اپنی گاڑیوں پر اس علاقے سے گزرتے تو کسی جگہ اپنی گاڑی کو روک کر کھڑے ہو جاتے اور پھیلے ہوئے دلکش مناظر میں کھو جاتے تھے۔ جب ان کا دل بھر جاتا تو پھر آگے کو بڑھتے تھے۔

کسی جگہ پر تھوڑے بہت کھانے پینے اور چائے پانی کے ہوٹل بھی تھے۔ ہوٹلوں میں بہت ہی مزیدار اور سواد کے کھانے ملتے تھے۔ اصلی دودھ کی چائے تو لوگوں کو چکر لیتی تھی۔ لوگ ایک کپ کے بجائے کئی کئی کپ پیتے تھے۔ تلی ہوئی مچھلیاں، پکی کی گرما گرم روٹی، سرسوں کے ساگ کے ساتھ اور پھر مزیدار لسی لوگوں کے دلوں میں عجیب سرور پیدا کر دیتی تھی۔

اس گاؤں میں کبھی بھی چوری ڈکیتی کا کوئی ادنیٰ سا بھی واقعہ رونما نہیں ہوا تھا۔ رات دن لوگوں کے دروازے کھلے رہتے تھے، گاؤں میں اکثر جوان الہڑ دوشیزائیں ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی نظر آتی تھیں۔ جھرمٹ کے جھرمٹ میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ اٹھکیلیاں بھرتی ادھر سے ادھر اٹھلاتی ہوئی گھومتی پھرتی تھیں لیکن مجال ہے کہ کوئی ان پر غلط نگاہ ڈالے۔

دن کی پو پھوٹتے ہی مرد حضرات کام کے لئے اپنے اپنے کھیتوں میں چلے جاتے۔ اپنے اپنے کھیت میں کام کے علاوہ گاؤں والے دوسرے کی مدد بھی کرتے تھے۔ وہ سب مل ملا کر ایک دوسرے کے کھیت میں کام کرتے اور اس طرح ایک دوسرے کی مدد ہوتی رہتی تھی۔

گاؤں میں ہندو مسلمان دونوں رہتے تھے دونوں مذہب والے ایک دوسرے کو چھیڑتے نہیں تھے، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے تہواروں میں خوش ہوتے تھے، دونوں ایک دوسرے کے چوپالوں میں بیٹھ کر اپنا وقت گزارتے تھے۔ اگر کوئی بھی گھمبیر مسئلہ درپیش ہوتا تو سارا گاؤں سر جوڑ کر بیٹھ جاتا اور اس مسئلہ کا حل تلاش کیا جاتا تھا۔

جوان لڑکے لڑکیوں کے معاملے میں کبھی بھی کوئی ناز یبا بات سامنے نہیں آتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک بدمعاش قسم کے نوجوان نے ایک لڑکی کو اکیلے میں ہاتھ پاؤں سے چھیڑ دیا۔ وہ لڑکی روتی پیٹتی گھر آ گئی۔ اس لڑکے نے لڑکی کو دھمکی بھی دی تھی کہ اگر اس نے اپنے گھر والوں کو بتایا تو آئندہ اس کی خیر نہیں، وہ لڑکی اپنی عزت سے لٹی پٹی اس لڑکے کے باپ کے پاس گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لڑکی کے باپ نے اپنے لڑکے کو لاٹھی سے اس قدر مارا کہ وہ لڑکا وہیں گر کر اپنی زندگی ہار گیا۔ ایسا کرنے کے بعد اس لڑکے کا باپ لڑکی کے گھر والوں کے پاس گیا اور اپنا سر اس نے لڑکی کے باپ کے قدموں میں رکھ کر معافی مانگی اور پھر اس غیرت مند باپ نے اس لڑکی کو اپنے دوسرے بیٹے سے بیاہ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ آج اگر یہ معاملہ میری اپنی لڑکی کے ساتھ ہو جاتا تو اسے کون اپناتا۔

پورے گاؤں والے ایک دوسرے کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کی دعوت میں بڑی عزت و احترام کے ساتھ بلائے جاتے تھے۔ مرنے جینے میں بھی ایک دوسرے کا ساتھ دیتے تھے۔ ہندو مسلمان اپنے اپنے مذہب کے اعتبار سے آزاد تھے۔

مسلمان لڑکیاں اپنے رسم و رواج کے مطابق لباس استعمال کرتی تھیں اور ہندو لڑکیاں اپنے حساب سے گھاگرا اور چولی میں نظر آتی تھیں۔ اس لباس میں ان کی ابلتی ہوئی جوار بھاٹا کی طرح سرکش جوانی جوانوں کا دل مسوس کر رکھ دیتی تھی۔ انہیں دیکھ کر گاؤں کے نوجوان دل ہی دل میں آہیں بھرتے تھے۔ نوجوانوں کی نظریں لڑکیوں پر پڑتے ہی جیسے پتھرا کر رہ جاتی تھیں۔ ان کے جسم میں سنسنی دوڑ جاتی اور دماغ سائیں سائیں کرنے لگتا، رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو جاتی اور یہی نہیں بلکہ رات میں اپنے بستروں پر کروٹیں بدلنے لگتے تھے۔ وہ سب دیکھ کر مسکرا تو سکتے تھے مگر زبانی چھیڑ چھاڑ سے ہم جاتے تھے۔ کیونکہ شانتی پور کا قانون جیسے چٹان کا پتھر تھا، اور یہی وجہ تھی کہ ہر جوان لڑکی بے خوف و خطر جدھر چاہتی نکل جاتی تھی۔

کیونکہ اکثر ایک جوان لڑکی کو کسی جوان اور سرکش مرد سے خطرہ رہتا ہے۔ لڑکیاں کھیتوں میں بھی آزادانہ آتی جاتی تھیں۔

گاؤں میں ایک بہت ہی ضعیف العمر رامو کاکا تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ سنایا۔

ایک لڑکی تھی جس کا نام سندری تھا۔ سندری واقعی اپنی سندرتا کی وجہ سے اپنی مثال آپ تھی۔ اس پر بھگوان کی خاص کرپا تھی۔ بھگوان نے اسے واقعی ایسے حسن سے نوازا تھا کہ جو بھی دیکھتا تو بس دیکھتا ہی رہ جاتا۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں اسے دیکھ کر بس سوچتی رہ جاتی تھیں۔ اور جوانوں کی تو باتیں ہی نرالی تھیں۔ ہر جوان اسے دیکھ کر خود کو جیسے آگ پر لوٹتا ہوا محسوس کرتا تھا۔ اس کی جوانی سب کا ایمان ڈگمگا کر رکھ دیتی تھی۔

ایک دن دوپہر میں وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ آم کے پیڑ پر ڈلے ہوئے جھولے پر جھول رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور بھی لڑکیاں اپنے اپنے جھولوں پر جھول رہی تھیں۔ اس کے حد سے بڑے لمبے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ گرمیوں کے دن تھے۔

اچانک سندری نے گلا پھاڑ کر چیخ ماری۔ اس کی چیخ اتنی زور کی تھی کہ آموں کا پورا باغ جیسے ہل کر رہ گیا۔ تمام لڑکیاں یکدم سہم کر رہ گئیں۔ سب کے جھولے آناً فاناً رک گئے۔

ایسا لگا کہ سندری کو کسی ان دیکھی طاقت نے جھولے پر سے اتار کر نیچے بیٹھا دیا ہو۔ وہ آلتی پالتی مار کر نیچے زمین پر بیٹھ گئی۔ ساری لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئیں۔ سب کی سب سکتے کے عالم میں تھیں۔ سب کی سب ایک دوسرے کو کبھی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور نظروں ہی نظروں سے جیسے ایک دوسرے سے سوال کر رہی تھیں۔ ”ایسا کیا ہو گیا؟“

سندری کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ ایسے بیٹھی تھی کہ جیسے پتھر کا بت بیٹھا ہو۔

چند منٹ گزر گئے تو ایک لڑکی نے ہمت کی اور اس نے ”سندری سندری“ کہہ کر اس کے کندھے کو ہلایا۔ مگر سندری ٹس سے مس نہ ہوئی۔ سندری اکڑ چکی تھی۔ پھر اس لڑکی نے زور سے اس کا کندھا ہلایا تو سندری نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

سندری کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں

آنکھوں کا رنگ ایسے ہو گیا تھا کہ جیسے ان میں کسی نے خون بھر دیا ہو، جس لڑکی نے اسے جھنجھوڑا تھا۔ اسے اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی اور پھر ایک زبردست زناٹے دار تھپڑ اچانک اس لڑکی کو جڑ دیا۔

تھپڑ کا پڑنا تھا کہ وہ لڑکی تیورا کر دور جا گری۔

اس حرکت کو دیکھ کر اس جگہ موجود ساری لڑکیاں جیسے تھر تھر کانپنے لگیں۔ کیونکہ دھان پان سی نازک سندری کے ہاتھ میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ اس کے تھپڑ سے ایک مضبوط جسامت والی لڑکی تھپڑ کے پڑتے ہی لہرا کر دور جا گری تھی۔ لڑکیاں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے ہی والی تھیں کہ ادھر سے اسی وقت رامو کاکا کا گزر ہوا۔ رامو کاکا کو دیکھ کر لڑکیاں چیخنے لگیں۔

لڑکیوں کو چیختا دیکھ کر رامو کاکا اس جگہ آ گئے اور انہوں نے ساری روداد سنی تو وہ بھی چکرا کر رہ گئے مگر وہ سمجھ گئے کہ اصل معاملہ کیا ہے؟

رامو کاکا کو سمجھ گئے تھے کہ سندری پر کوئی ہوائی چیز سوار ہو گئی ہے، یعنی سندری چھیڑے میں آ گئی ہے۔

اتنی دیر میں سندری اپنے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو چکی تھی۔ رامو کاکا نے سندری کو اپنے کندھے پر ڈالا اور لڑکیوں کو ساتھ لے کر آ گئے۔ سندری کو اس کے گھر میں چارپائی پر لٹا دیا۔ لڑکیوں نے رو رو کر سارا واقعہ اس کے گھر والوں کو سنا دیا۔

چند منٹ میں یہ واقعہ سارے گاؤں میں پھیل گیا۔ گاؤں بھر کے سارے لوگ سندری کے گھر میں جمع ہو گئے۔ چارپائی پر سندری بے حس و حرکت چاروں شانے بے ہوش پڑی تھی۔ اس حالت میں دیکھ کر سندری کی ماں آگے بڑھی اور سندری کے منہ پر پانی کا چھینٹا مارا مگر پانی کا چھینٹا مارنے کے باوجود بھی سندری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

پھر سندری کے باپ نے آگے بڑھ کر چلو میں پانی لیا اور کئی چلو پانی سندری کے چہرے پر ڈال دیا تاکہ اس کی بیہوشی ختم ہو۔

مگر سندری نے اپنی آنکھیں کھول دیں جیسے پھنکارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنے باپ کا گریبان پکڑ کر اس زور سے دھکا دیا کہ وہ غریب ایک طرف کو لڑھک گیا۔ لحیم شحیم اس کا باپ ایک جھٹکے سے نیچے پڑ گیا تھا۔

اس جگہ موجود تمام مرد و عورتوں نے یہ اندازہ کر لیا کہ سندری پر ضرور کوئی ہوائی مخلوق سوار ہو گئی ہے۔

اچانک سندری کے منہ سے مردانہ آواز نکلی۔

”اوئے! تیری ہمت کیسے ہوئی پانی ڈالنے کی، کان کھول کر سن لے، یہ مجھے پسند آ گئی ہے، میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، اب یہ صرف میری ہے۔“

یہ سننا تھا کہ اس جگہ موجود سارے لوگ یکدم سہم کر رہ گئے۔ سب کے سب سکتے میں آ گئے۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب کھسکتے چلے گئے۔ چند منٹ میں ہی سوائے گھر والوں کے کوئی بھی اس جگہ موجود نہیں رہا۔ لوگ فوراً اس جگہ سے نہیں جاتے تو کسی کے ساتھ بھی کچھ ہو سکتا تھا۔

سندری چھیڑے میں آ گئی ہے، سندری پر بھوت سوار ہو گیا ہے، سندری پر آسیب آ گیا ہے، سندری پر جن آ گیا ہے، سندری پر زور آور کسی آتما نے قبضہ کر لیا ہے۔ بہر حال جتنے منہ اتنی باتیں۔ یہ خبر آناً فاناً آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔

پورے گاؤں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔ لوگوں نے اپنی جوان لڑکیوں کو گھر سے نکلنے کے لئے منع کر دیا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سخت تاکید کر دی کہ خاص طور سے سندری کے گھر کوئی بھی نہ جائے، کیونکہ ہو سکتا ہے اس ہوائی مخلوق کی نظر میں کوئی اور لڑکی بھی آ جائے۔

سندری کی آنکھوں سے جیسے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ اس کے لمبے لمبے بال ایسے اکڑ گئے جیسے کہ وہ نرم و نازک بال نہ ہوں بلکہ بڑے بڑے سخت تنکے ہوں۔ اس کی شکل یکلخت بدل گئی جسے دیکھ کر لوگوں کو خوف آنے لگا تھا۔

سندری کی ماں رونے پیٹنے لگی، اور رو رو کر دہائیاں دینے لگی۔ ”اے بڑھیا! زیادہ شور نہ کر تیرا یہ رونا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دھونا بے کار ہے، چپ کر جا! نہیں تو تجھے اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دوں گا، یا پھر تیری گردن توڑ کے رکھ دوں گا، چپ کر جا نہیں تو تیری زبان کھینچ کر باہر نکال دوں گا۔“ مردانہ آواز میں سندری کے منہ سے آوازیں نکلیں۔

سندری کا باپ فوراً گھر سے نکلا اور دوڑتا ہوا گاؤں کی مسجد میں پہنچ گیا۔ مسجد کے پیش امام عبداللہ صاحب بہت پہنچے ہوئے تھے۔ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ پیش امام صاحب رات میں جنات کو قرآن پڑھاتے ہیں۔ پیش امام صاحب کی قرآن کی خوش الحانی بہت مشہور تھی۔ جب وہ رات میں قرأت کرتے تو سننے والا ساکت ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز دور دور تک لوگوں کو مبہوت کر دیتی تھی، قرب و جوار کے لوگ بت بنے ان کی خوش الحانی سنتے رہتے تھے، لوگوں کی خواہش ہوتی تھی کہ پیش امام صاحب رات بھر اسی طرح قرأت کرتے رہیں، اور سننے والے رات بھر ان کی آواز سنتے رہیں۔ یہ بھی لگتا کہ جیسے اردگرد کے علاقے پر سکوت چھا گیا ہے۔

سندری کے باپ نے پیش امام صاحب کے سامنے جاتے ہی اچانک ان کے پیر پکڑ لئے۔ پیش امام صاحب نے فوراً اس کے کندھے پکڑ کر اٹھایا اور بولے۔ ”ارے رام چند! کیا ہو گیا! کیوں پریشان ہو، بتاؤ تو سہی، روتے نہیں، بتاؤ تو ہوا کیا؟“

”مولوی صاحب! میری سندری پر کوئی ضدی آسیب سوار ہو گیا ہے، بہت اودھم مچا رکھا ہے، مجھے پکڑ کر نیچے پھینک دیا، بہت دھمکی دے رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ وہ سندری کو اپنے ساتھ لے جائے گا، مولوی صاحب آپ کو بھگوان کا واسطہ جلدی سے چلئے، میری سندری کو بچا لیجئے۔“ اور یہ کہہ کر وہ آنسوؤں سے رونے لگا۔

”رام چند ہمت سے کام لو۔ گھبراؤ نہیں، میں چلتا ہوں۔“ یہ کہہ کر پیش امام صاحب رام چند کے ساتھ اس کے گھر آ گئے۔

سندری جو چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ پیش امام صاحب کے صحن میں قدم رکھتے ہی جیسے اسے کرنٹ لگا اور وہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اب سندری کی گردن خود بخود چاروں طرف گھومنے لگی تھی۔

”السلام علیکم!“ سندری کے سامنے آ کر پیش امام صاحب نے کہا۔ سلام کا جواب نہ ملنے پر پیش امام صاحب نے دوبارہ سلام کیا مگر اس مرتبہ بھی جواب ندارد تھا۔

”اچھا تو، تو بے دین جن ہے۔“ پیش امام صاحب بولے۔

”او مولوی! بس تو یہاں سے چلا جا، نہیں تو تیری خیر نہیں، چلا جا! نہیں تو تیری گردن توڑ کر رکھ دوں گا۔ فوراً یہاں سے بھاگ جا۔“ سندری کے منہ سے گرجدار مردانہ آواز نکلی۔

”اس میں تیری بھلائی ہے کہ تو اس بچی کی جان چھوڑ دے، میری بات مانے گا تو ٹھیک ہے، ورنہ پھر مجھے کچھ اور بھی سوچنا پڑے گا۔“ پیش امام صاحب نے کہا۔

”مولوی تو اپنی خیر منا، تیری عزت اسی میں ہے کہ تو دم دبا کر بھاگ، نہیں تو کیا فائدہ تیری بے عزتی ہو جائے اور ساتھ ہی تیرے ہاتھ پاؤں بھی ٹوٹ جائیں۔“ سندری پر سوار جن بولا۔

”دیکھ بھئی جب دو پہلوان ٹکراتے ہیں تو ایک نہ ایک کو تو شکست ہوتی ہے۔ میں زیادہ سختی کا قائل نہیں، میری بات مان لے، میں نہیں چاہتا کہ تیرے مدمقابل، جنات برادری سے کسی کو کھڑا کروں، بلکہ میں خود تنہا تیرے لئے کافی ہوں۔ اگر میں آواز دوں تو کئی جن میری آواز پر دوڑے چلے آئیں گے اور وہ سب تیرا قیمہ بنا کر رکھ دیں گے۔ تو اپنا بھلا چاہتا ہے تو اس بچی پر سے اپنا تسلط ختم کر کے چلا جا، نہیں تو تجھے پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملے گا۔“ پیش امام صاحب صبر و تحمل سے بولے۔

”بڈھے تجھے میری طاقت کا اندازہ نہیں، میرا باپ اپنے قبیلہ کا سردار ہے، میری ایک آواز پر پورا

قبیلہ دوڑا چلا آئے گا، مگر میں اس لڑکی کی خاطر نہیں چاہتا کہ کچھ ایسا ہو، اگر میں چاہوں تو پلک جھپکتے ہی یہ سارا مکان جل کر راکھ میں تبدیل ہو جائے اور تو بھی جل کر اس میں بھسم ہو جائے گا۔

اب بھی وقت ہے تو چلا جا، مجھے تیرے بڑھاپے پر رحم آ رہا ہے، اور یہ بھی خیال ہے کہ تو اس گاؤں کا مولوی ہے اور پھر اس لڑکی کا جاننے والا بھی ہے، چل فوراً چلا جا، نہیں تو، تیرا میں حشر نشر کرنے والا ہوں۔“ وہ جن غراتے ہوئے بولا۔

پیش امام صاحب نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی شیشی نکالی، لگتا تھا اس شیشی میں پانی موجود تھا۔

پھر وہ بولے۔ ”دیکھ اب بھی وقت ہے، میری بات مان لے، اور چھوڑ دے اس بچی کو۔“

اتنے میں سندری کے منہ سے ایک زوردار آواز نکلی جو کہ کوئی انجان زبان میں تھی۔ وہ آواز اتنی فلک شگاف تھی کہ سارے در و دیوار ہل کر رہ گئے۔

پیش امام صاحب نے فوراً اس جگہ موجود لوگوں کو وہاں سے الگ ہٹ جانے کو کہا اور فوراً شیشی کا منہ کھول کر اس میں سے تھوڑا پانی اپنے چلو میں لیا اور اس پانی کو چارپائی کی طرف اچھال دیا۔ پوری چارپائی کے گرد گہرا دھواں سا پھیل گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے دھوئیں کی ایک دیوار چارپائی کے چاروں طرف بن گئی ہو۔ پھر پیش امام صاحب کی آواز سنائی دی۔ ”یہ آواز نکال کر تو نے اچھا نہیں کیا، تو اپنے ہمدردوں کو بلا بیٹھا، وہ سب آ تو جائیں گے مگر تیرے لئے وہ سب بے کار ہوں گے، ان میں سے کوئی بھی تیری مدد نہیں کر سکتا، تو نے میری رحم دلی کو کمزوری سمجھ لیا تھا۔ میں نے بار بار تجھے سمجھایا مگر تو نے میری ایک نہ مانی۔ اور مجبوراً مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔

تو تو بے دین یعنی کافر جن ہے۔ اگر میں چاہتا تو دیندار جنات بلا لیتا، میری ایک آواز پر جنات کے کئی قبیلے دوڑے ہوئے آ جائیں گے۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ اب بول تیری بولتی کیوں بند ہو گئی، یہ جو تیرے گرد دھوئیں کی دیوار موجود ہے، تو اسے چھو کر بتا کہ تیرے اندر کتنی طاقت ہے، تجھ میں کتنا زور ہے، اگر میں چاہوں تو اس دیوار میں تجھے زندگی بھر قید کر کے رکھ دوں، مگر تو اس کا بھی حقدار نہیں کہ تجھے قید رکھا جائے اور تو زندہ رہنے کے بھی قابل نہیں۔

دیکھ تیری آواز تک سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ تو نے اپنے قبیلے والوں کو بلا کر اچھا نہیں کیا...... میری خواہش تھی کہ میں تجھے قید کر کے کہیں دور کسی ویران علاقے میں پھنکوا دوں مگر تیری اوچھی حرکت نے مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔

مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ تیرے ہمدرد یہاں تک پہنچ چکے ہیں مگر وہ سب کے سب تیری ہٹ دھرمی اور ضد کے پیش نظر کف افسوس مل رہے ہیں، وہ بھی بے بس ہیں اور تیری ذرہ برابر بھی مدد نہیں کر سکتے۔ لے اب تیرا باپ بھی اس علاقے میں اس گھر کے باہر پہنچ چکا ہے اور تیرے لئے جیسے آگ پر لوٹ رہا ہے مگر وہ بھی تیری آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اگر میں چاہوں تو تیرے پورے قبیلے کو اذیت سے دوچار کر دوں۔ تیرے باپ کے پاس سے خبر آئی ہے کہ تیرا وجود ختم نہ کیا جائے بلکہ تجھے معذور کر کے چھوڑ دیا جائے۔

تیرا باپ بھی کافی ضعیف ہو چکا ہے اور میں بھی کب تک زندہ رہوں گا۔ تیرا باپ تو وعدہ کر سکتا ہے کہ وہ شانتی پور والوں کے لئے کوئی غلط قدم نہیں اٹھائے گا اور نہ ہی کسی کو اجازت دے گا کہ کوئی اور قبیلہ کا جن کوئی قدم اٹھائے مگر جب تیرے باپ کا وجود ختم ہو جائے گا تو اس کے بعد کوئی بھی کچھ کر سکتا ہے۔ اگر تو معذور ہو کر پڑا رہے گا تو تجھے دیکھ دیکھ کر اشتعال پھیلے گا، جنات برادری مشتعل ہو گی اور پھر شانتی پور میں تہلکہ مچا دیا جائے گا۔

جنات کی عمریں کئی کئی ہزار برس کی ہوتی ہیں، تجھ جیسے ضدی جن ہمیشہ اپنا نقصان کروا بیٹھتے ہیں، تو میری ساری باتیں سن رہا ہے، لیکن اپنی بے بسی دیکھ کہ تو بول بھی نہیں سکتا، تو نے اپنے والوں کو ہمیں تہس نہس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے لئے بلالیا۔ اگر میں کمزور ہوتا تو تو اور تیرے والے آج شانتی پور کا حشر نشر کردیتے۔"

یہ بول کر پیش امام صاحب خاموش ہوگئے اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ بہت قلیل وقت میں نظر آیا کہ کالا کالا دھواں جو کہ چارپائی کے چاروں گرد پھیلا تھا، چارپائی سے اوپر کو اٹھنا شروع ہوا اور پھر چارپائی سے الگ ہو کر ایک جگہ ٹھہر گیا۔ پھر وہ دھواں سمٹ کر ڈیڑھ فٹ کی چوڑائی میں ایک دائرے کی شکل اختیار کرگیا۔

دھواں جب ایک کونے میں ٹھہر گیا تو پیش امام صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر اپنی شہادت کی انگلی اس دھوئیں کی طرف کردی۔ انگلی کا اس طرف ہونا تھا کہ اچانک دھوئیں میں ایک زبردست شعلہ لپکا اور پھر پورا دھواں راکھ میں تبدیل ہو کر نیچے گر پڑا۔

اتنی دیر میں جھٹ سے سندری اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئی اور تمام لوگوں کو اچنبھے سے دیکھنے لگی۔

پیش امام صاحب بولے۔ "رام چند تمہاری بچی اب خیریت سے ہے، کسی قسم کا ڈر خوف نہیں اور آئندہ بھی یہ خیریت سے رہے گی۔ لیکن جتنی جلدی ہوسکے اس کی شادی کردو۔"

پھر پیش امام صاحب چارپائی کی طرف گئے۔ نیچے کونے میں تھوڑی سی کالے رنگ کی راکھ پڑی تھی، اس راکھ کو انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے ایک کپڑے میں رکھ کر پوٹلی باندھی اور اس پوٹلی کو لے کر کھڑے ہوگئے اور بولے۔ "رام چند میں جارہا ہوں۔ تمام ڈر و خوف دماغ سے نکال کر خوشی خوشی رہو۔ اور سندری کو کچھ دن تک گھر سے نکلنے نہیں دینا اور خاص طور پر آموں کے باغ میں نہیں جانے دینا۔ قطعی ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

پیش امام صاحب کے قدموں پر رام چند اچانک جھک گیا تو پیش امام صاحب نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا تو وہ بولا۔ "مولوی میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا، آپ نے میری بچی کو نئی زندگی دی ہے، اور ہمارے تمام پریوار پر احسان کیا ہے۔"

"رام چند احسان والی کوئی بات نہیں۔ یہ میرا فرض تھا جو میں نے کیا، اب اپنے منہ سے احسان والی بات مت نکالنا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس گاؤں پر اور گاؤں والوں پر اپنا فضل و کرم رکھے، سب کے دکھ تکلیف دور کردے اور سب کو خوشیوں سے نوازے، اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور پھر پیش امام صاحب راکھ والی پوٹلی ہاتھ میں تھامے گھر سے نکلتے چلے گئے۔

رام چند کے گھر سے نکلنے کے بعد پیش امام صاحب مسجد کی طرف جارہے تھے کہ راستے میں ایک درخت کے پاس رک گئے۔ ایک آواز سنائی دی۔ "پیش امام صاحب میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، وہ میرا بیٹا تھا جو کہ اپنے انجام کو پہنچا، اس کی ضد اور ہٹ دھرمی اسے لے ڈوبی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بہت رحم دل ہیں، آپ نے اسے ہر طرح سے سمجھایا تھا، کاش! کہ وہ آپ کی بات مان لیتا تو اس انجام کو نہ پہنچتا۔ میرا تعلق جنات کی بے دین برادری سے ہے لیکن میں خود بھی بہت انصاف پسند ہوں۔ میری اپنی سوچ ہے کہ غلطی کرنے والے کو سزا ملنی چاہئے۔ میرے اور بھی تین بیٹے ہیں مگر وہ تینوں اچھے دل و دماغ کے ہیں۔

میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں کہ ہمارے قبیلے کا کوئی بھی جن آنکھ اٹھا کر بھی شانتی پور کی طرف نہیں دیکھے گا۔ آپ جیسی نیک ہستی کی وجہ سے ہی شانتی پور میں مکمل شانتی ہے۔ ایک مرتبہ میں پھر آپ سے معافی مانگتا ہوں، میں اب اپنے قبیلہ میں جارہا ہوں، میں خود بھی کبھی کبھار آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہوں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔" اور پھر آواز آنا بند ہوگئی۔

پیش امام صاحب نے راکھ والی پوٹلی لے جا کر بہتے ہوئے پانی میں کھول کر پھینک دی۔

اس واقعہ کے بعد پھر کبھی شانتی پور میں چڑیل آسیب یا جن کا کوئی بھی واقعہ رونما نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ بعد پیش امام صاحب کا انتقال ہوگیا۔ انتقال کے بعد پیش امام صاحب کو مسجد کے ایک کونے میں جہاں کہ کافی جگہ موجود تھی۔ اس جگہ پیش امام صاحب کو دفنا دیا گیا۔ پھر گاؤں والوں نے مل کر اس جگہ ان کا مزار بنادیا۔

☆......☆......☆

ایک طویل عرصہ کے بعد اب نہ جانے شانتی پور کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔

رات میں سنیل اپنے کام کاج سے فارغ ہو کر سویا۔ صبح جب گھر والوں نے دیکھا تو سنیل مردہ پڑا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل سیاہ پڑ چکا تھا۔ آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور آنکھوں کا رنگ بھی بہت ہی کالا پڑ چکا تھا۔ سنیل کا چہرا دیکھنے والوں پر دہشت طاری ہوچکا تھا۔ ہر شخص اپنی اپنی جگہ انگشت بدنداں تھا۔

ہر آدمی اپنی بولیاں بول رہا تھا۔ پورا شانتی پور ماتم کدہ بن گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چہرا سوجنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے کی کھال خودبخود جگہ جگہ سے پھٹنے لگی۔ کھال کے پھٹتے ہی تمام جگہ سے کالا کالا مواد بہنے لگا۔ ماتھا، سر، چہرہ اور گردن تک کا حصہ بالکل کالا پڑ چکا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے دونوں آنکھیں بھی باہر کو ابل پڑیں اور پھر دونوں آنکھیں بھی پھٹ کر بہہ گئیں۔

عمر رسیدہ لوگوں نے مشورہ دیا کہ اب جتنی بھی جلدی ہو سنیل کو چتا کے حوالے کردیا کیونکہ ایسا نہ ہو کہ چہرے کے ساتھ ساتھ کہیں جسم بھی نہ پھٹ جائے۔ اور اسی کے پیش نظر جلدی سے سنیل کو چتا کے حوالے کردیا گیا۔

وہ رات بڑی سوگوار تھی، تمام گاؤں پر سناٹا طاری تھا۔ سنیل کی حالت دیکھتے ہوئے لوگوں کی بھوک اڑ چکی تھی۔ سوائے بچوں کے بڑوں کو کھانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سنیل بہت ہی کڑیل جوان تھا۔ دو بھائی اور چار بہنوں کا بھائی تھا۔ گاؤں کے تمام لوگوں کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

جاگتے جاگتے لوگوں کی آنکھیں پتھرا گئیں، آخر تھک ہار کر لوگ اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

دن کا سورج طلوع ہوا، ہر طرف اجالا پھیل گیا کہ اچانک پھر گاؤں میں ایک شور اٹھا۔ گاؤں کا ایک اور نوجوان رامو موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ دن کے اجالے میں لوگوں نے دیکھا اس کا چہرہ گردن تک سیاہ پڑ چکا تھا۔ اب تو ایسا تھا کہ دیکھنے والوں کے جسم کا ٹوتو لہو موجود نہیں تھا۔ گاؤں کا ہر فرد سوالیہ نشان بن چکا تھا۔ سب کی زبانیں گنگ تھیں، آنکھوں میں صاف طور پر خوف نظر آتا تھا، رامو کی موت بھی بالکل سنیل جیسی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہونے لگا جیسا سنیل کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بھی مسخ ہونے لگا تھا۔ ہر ڈاکٹر حکیم اپنی اپنی جگہ ششدر تھا کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ دونوں کس بیماری یا آفت سے مرگئے۔ جلدی جلدی کرکے رامو کو بھی چتا کے حوالے کردیا گیا۔

پورے گاؤں پر موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ پوری فضا سوگوار ہوگئی تھی۔ ہر آدمی سہم گیا تھا۔

مسلمان اور ہندو دونوں ہی اپنے اپنے طریقے سے دعائیں کررہے تھے اور آنے والی مصیبت سے چھٹکارا کے لئے سر جوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ کوئی بولتا بھی تو کیا بولتا۔

دن گزر گیا۔ رات آگئی۔ گاؤں کے لوگ آخر کب تک جاگتے۔ کسی نے بھی کھیتوں میں جا کر کام نہیں کیا تھا۔ صبح کی پھو پھوٹتے ہی سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا کیونکہ راجا اپنی جگہ پر مردہ پڑا تھا۔ اس کا چہرا اور گردن تک کا حصہ بالکل سیاہ ہوگیا تھا اور یہی نہیں آج تو دو بیل بھی مردہ پائے گئے تھے۔

خوف اور ڈر کی وجہ سے لوگوں پر کپکپی طاری ہوگئی تھی۔ گھر کے چولہے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ ایسی موت تو اس سے پہلے کسی نے بھی نہ دیکھی تھی۔

دن کے وقت کوئی بھی موت سے ہمکنار نہیں ہوتا تھا۔ رات کے اندھیرے میں جیسے موت آ کر لوگوں کو دبوچ لیتی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھتے ہی دیکھتے راجا کا چہرہ بھی مسخ ہونے لگا، چہرے کی جلد جگہ جگہ سے پھٹنے لگی اور پھر پھٹی ہوئی جگہ سے کالا کالا مواد بہنے لگا تھا۔ تل جل کر لوگوں نے جلدی جلدی کفن دفن کا انتظام کیا اور پھر اسے بھی منوں مٹی تلے دبا دیا گیا۔ دونوں بیلوں کو بھی گڑھا کھود کر اس میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی گئی۔

لوگوں کا دن کا چین اور رات کا سکون برباد ہو کے رہ گیا تھا۔ گاؤں کا کوئی بھی مرد کام کے لئے کھیت میں نہ گیا تھا۔ مرد ٹولیوں کی شکل میں بیٹھ گئے تھے اور عورتیں اپنے اپنے گھروں میں دبک کے رہ گئی تھیں۔

بولتے ہیں کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے، ایک انسان کب تک جاگ سکتا ہے، کھانا پینا بھی لوگوں کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کافی رات گئے تک لوگ جاگتے رہے اور پھر لوگوں کی آنکھیں بند ہو گئیں، لوگ نیند کی وادی میں پہنچ گئے۔

گاؤں دیہات میں چونکہ لوگ سرشام ہی سو جاتے ہیں اور صبح پو پھٹنے سے پہلے جاگ جاتے ہیں۔ آج کا سورج بھی جب طلوع ہوا تو ایک بری خبر لے کر آیا۔ گاؤں کا ایک فرد رات جندر سب سے ناطہ توڑ کر موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ راجندر جیسا پورے گاؤں میں کڑیل جوان کوئی اور نہیں تھا۔ چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کسرتی بدن، پہلوانی کا شوق، شکل وصورت میں سب سے آگے، اس کی موت بھی اسی طرح واقع ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ بھی سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کچھ زیادہ سوج گیا تھا۔ دوپہر سے پہلے پہلے اس کے چہرے کی جلد بھی پھٹنی شروع ہو چکی تھی۔

راجندر کی بھی دونوں آنکھیں پھٹ کر بہہ گئیں۔ عجیب موت تھی، بڑے بڑے سیانے اور گیانی حیران تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے، موتیں ہوتی ہیں، بیماری سے، وبا سے یا کسی آفت سے مگر اتنی اذیت ناک موت شاید دنیا میں کہیں اور نہ ہوئی ہوگی، راجندر کا گردن سے نچلا دھڑ سوجنے لگا تھا۔

جلدی جلدی کر کے اسے بھی چتا پر لٹا کر اس کی چتا کو بھی آگ لگا دی گئی۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بھی جل کر راکھ ہو گیا۔

شام ہوتے ہوتے لوگوں نے فیصلہ کیا کہ آج رات کے وقت پورے گاؤں میں پہرا دیا جائے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ گاؤں کے سارے لوگ اس بات پر متفق ہو گئے۔ گاؤں میں موجود جوانوں نے ہاتھوں میں مضبوط ڈنڈے پکڑ کر رات میں گاؤں کے پہرے پر راضی ہو گئے، اور یہ بھی فیصلہ ہوا کہ سارے جوان تین تین کی ٹولیوں میں بٹ جائیں گے اور وقفے وقفے سے سیٹیاں بجا کر اپنے جاگنے اور چوکس رہنے کا اظہار کریں گے۔

پورے گاؤں پر گھٹا ٹوپ اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ جوانوں کی چھ ٹولیاں بنا دی گئیں، ہر ایک ٹولی میں تین جوان شامل ہو گئے۔ رات کے آٹھ بجے سے انہوں نے پورے گاؤں میں پہرا دینا شروع کر دیا۔ وقفے وقفے سے انہوں نے زور دار آواز میں سیٹیاں بجانی شروع کر دیں۔ سیٹی بجانے کا اصل مقصد یہ تھا کہ ہم لوگ چوکس طریقے سے اپنے فرائض کی ادائیگی کر رہے ہیں۔

آج پورا گاؤں سکون کی نیند سو رہا تھا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کے دماغ میں بے چینی ڈیرہ جمائے موجود تھی۔ انہیں یقین تھا کہ یہ جو موت کی بلا گاؤں میں گھس آئی ہے ایسا نہ ہو کہ نظر بچا کر آج بھی کسی کی جان لے لے۔ رات بھر سیٹیوں کی آوازیں آتی رہیں۔

صبح کے سورج نے روزانہ کی روایت کے مطابق شان سے اپنا اجالا پورے علاقے پر بکھیر دیا۔ جوانوں کی رات بھر کی محنت اکارت گئی۔ گاؤں کے ایک گھر سے دھاڑیں مار مار کر رونے کی آوازیں لوگوں کا دل دہلانے لگیں۔ ریاض الدین کی بہنیں پچھاڑ کھا کر گر رہی تھیں۔ دونوں ایسی تھیں کہ متواتر بے ہوش ہو جاتی تھیں چار بہنوں کا اکلوتا بھائی آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ وہ جابر ظالم، وحشت ناک اور خوفناک موت

کے منہ میں چلا گیا تھا۔

ریاض کی والدہ کا کہنا تھا کہ رات میں ڈر و خوف کی وجہ سے ہم پورے گھر والوں کو نیند نہیں آ رہی تھی لہٰذا ہم ایک کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور اللہ سے دعائیں بھی کرتے رہے کہ ہمارے گاؤں سے اس خونی بلا کا خاتمہ ہو جائے۔ آج کی رات پورے گاؤں میں پہرا دیا جا رہا ہے تو قوی امید ہے کہ آج اس بلا کا گاؤں میں آنا ناممکن ہوگا۔

رات ساڑھے گیارہ بجے ریاض کے ابا نے کہا کہ بچو! جاؤ اور جا کر آرام کرو۔ ریاض اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ارے ہمیں کیا معلوم تھا کہ آج کی رات موت نے ہمارا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔ ارے اگلے ہفتے تو ہمارے لخت جگر کی منگنی ہونی تھی۔ وہ بے چاری اپنا سر اور سینہ پیٹ رہی تھی۔

ریاض کا چہرہ بھی گردن تک سیاہ پڑا تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ کفن دفن کا انتظام جلدی سے کر دیا جائے کیونکہ اس کے ساتھ بھی وہی ہوگا جو دوسروں کے ساتھ ہوتا آیا ہے یعنی اس کا چہرہ بھی مسخ ہو جائے گا۔ چہرے کی جلد پھٹنی شروع ہو جائے گی۔ لہٰذا بھاگم بھاگ اس کے کفن دفن کا انتظام کر دیا گیا۔

گاؤں والوں نے جنازہ اٹھایا اور قبرستان کی طرف لے کر چلے۔ ریاض کے والد بے چارے بہت ہی کمزور و ناتواں تھے، جنازے میں دو آدمیوں نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ ان کی تو کمر ویسے ہی ٹیڑھی ہو چکی تھی کیونکہ ریاض ان کا اکلوتا بیٹا تھا، ان کے بڑھاپے کا سہارا انہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا تھا۔ کہتے ہیں کہ جوان بیٹا باپ کا سہارا ہوتا ہے، باپ کا بازو بنتا ہے، جوان بیٹے کو دیکھ کر باپ کی ہمت بندھی ہوتی ہے باپ اپنے اندر طاقت و توانائی محسوس کرتا ہے اور اپنا سینہ ٹھونک کر کہتا ہے کہ میں بھی جوان بیٹے کا باپ ہوں۔ ہر ماں باپ کو بیٹے کا سہرا دیکھنے کا شوق ہوتا ہے مگر یہاں تو سارا شوق ساری طاقت ساری توانائی ریاض کی موت نے ختم کر دی تھی۔ ریاض کے والد سے قدم اٹھانا بھی

مقروض

ماسٹر نے کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے کہا۔ "آج کا موضوع ہے قرض۔" دیکھو بچو! قرض لینا اچھی بات نہیں۔ اور پھر قرض پر سود ادا کرنا تو ایک لعنت ہے۔ قرض خور کا انجام برا ہوتا ہے۔ قرض ایک چھوت ہے۔ لعنت ہے۔ وبا ہے، بیماری ہے۔ مقروض کی بخشش بھی نہیں ہوتی۔ یہ جہنم واصل ہوتا ہے۔ مقروض کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔" کلاس کے پچھلے حصے سے آواز آئی۔ "ماسٹر صاحب ہمارا پیارا ملک بھی تو طاغوتی طاقتوں کا مقروض ہے۔"

(بشیر احمد بھٹی۔ فوجی بستی بہاولپور)

دو بھر تھا، آج وہ اپنی طاقت اپنی توانائی سے محروم ہو چکے تھے اور دوسروں کا سہارا کب تک کا ہوتا ہے۔

اچنبھے میں سارا گاؤں تھا کیونکہ رات بھر اٹھارہ جوانوں نے تندہی سے پورے گاؤں میں پہرا دیا تھا۔ ان لوگوں کو کسی طرف سے ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہوا تھا کہ موت آج کی رات ریاض کو اپنے آہنی پنجے میں جکڑ لے گی۔ ان پہریداروں کے ساتھ ساتھ گاؤں بھر کے کتے بھی جاگتے رہے تھے اور خاص طور سے وہ اٹھارہ جوان زیادہ فکر مند تھے کہ رات بھر پہرا ہونے کے باوجود موت نے اپنا شکار کر لیا تھا۔

آج کی رات اور بھی زیادہ بھاری تھی کیونکہ پورے گاؤں میں چھ عدد جوان مردہ پڑے تھے۔ ایک ہی گھر یعنی گاؤں کے چوہدری کے باڑے میں بندھے چار بیل جو کہ پورے گاؤں میں اپنی مثال آپ تھے، وہ باڑے میں مردہ پڑے تھے، چوہدری کو بیلوں کی تو اتنی فکر نہ تھی جتنی فکر اسے گاؤں کے جوانوں کی تھی۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ تھی کہ ابھی تک کوئی ضعیف نہیں مرا تھا۔ جتنے بھی لوگ مرے وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سب کے سب نوجوان مرے تھے۔ اور یہ بھی سوچنے والی بات تھی کہ ابھی تک کوئی عورت بھی نہیں مری تھی۔ یہ دونوں باتیں سوچ سوچ کر گاؤں والے زیادہ پریشان تھے کہ یہ کیسی وبا یا آفت آئی ہے جو کہ صرف اور صرف نوجوانوں کو اپنا شکار بنا رہی ہے۔

لوگوں کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ گاؤں میں پوری رات پہرا دیا جانا چاہئے۔ ہوسکتا ہے کہ چند دن متواتر پہرا دینے سے کچھ فرق پڑے مگر گاؤں والوں کی سوچیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں۔ کوئی رات ایسی نہ گزرتی تھی جس رات کوئی نہ مرے، سونے والا کوئی نہ کوئی نوجوان موت کے منہ میں چلا جاتا تھا۔ پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گیا تھا۔ اب تو انسان کے ساتھ ساتھ گاؤں کے جانور بھی مرنے لگے تھے۔ رو رو کر گاؤں والوں کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ ہر شخص کے چہرے پر ویرانی چھا گئی تھی۔ گاؤں بھر کے نوجوان سہم کر رہ گئے تھے۔ سب کی کوشش ہوتی تھی کہ کوئی بھی نوجوان اکیلا نہ رہے، مگر موت تھی کہ تیزی سے نوجوانوں کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتی تھی۔ ہر آنے والی رات قیامت کی اذیت سے بڑھ کر ہونے لگی تھی۔

شانتی پور والوں کی ساری خوشیاں چھن گئی تھیں، آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔ سارے علاقے پر ویرانی چھا گئی تھی۔ لوگوں کے چہرے زرد پڑ چکے تھے۔ کوئی بھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھا رہا تھا، اگر ایک وقت پکتا تو دو دو تین تین ٹائم کھانا چلتا کیونکہ موت کے خوف نے سب کی بھوک اڑا کر رکھ دی تھی۔ جب کسی کو یہ پتہ چل جائے کہ میں آج رات کسی بھی وقت موت سے ہمکنار ہو جاؤں گا تو بھلا اسے بھوک کیسے لگ سکتی ہے اور بھوک ہی نہیں بلکہ اس کا تو چین سکون غارت ہو کر رہ جائے گا۔ ایک دو شخص کی بات ہوتی تو گاؤں والے صبر کر کے بیٹھ جاتے مگر یہاں تو ہر روز رات میں ایک نوجوان لقمہ اجل بن رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ جانور بھی مر رہے تھے۔

کیسی موت تھی؟ کون سی آفت تھی؟ اور ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ یا کسی نے جادو کے زور پر شانتی پور میں کسی بیر یا پھر کسی بلا کو معمور کرا دیا تھا۔ لوگوں کی تمام سوچیں تمام اندازے غلط ہو گئے تھے۔

ہر روز ایک فرد کا جنازہ اٹھ رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ جانور بھی مر رہے تھے۔ شانتی پور میں تمام لوگوں کا کام کاج چوپٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

موت کا ہرکارہ صرف نوجوانوں اور جانوروں کا ہی شکار کر رہا تھا۔ لوگ تھک ہار کر پنڈت، جوگی، سادھو اور عاملوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگے تھے۔ عامل پنڈت سادھو اور جوگی آتے اپنی اپنی زبان میں کچھ پڑھتے اور لوگوں کو دلاسہ دے کر چلے جاتے، ابھی تک کسی نے بھی یہ نہیں بتایا تھا کہ اصل میں وہ ہے کیا جو کہ تیزی سے نوجوانوں کو مار رہی ہے، اور طریقہ بھی ہر مرنے والے کا ایک ہی ہوتا تھا۔ سر سے لے کر گردن تک کا حصہ سیاہ پڑ جاتا تھا اور دیر ہونے پر چہرے کی جلد پھٹنے لگتی تھی۔

اب تو نوجوانوں سے ہٹ کر موت نے شادی شدہ مردوں کو بھی دبوچنا شروع کر دیا تھا۔ یعنی موت صرف مرد ذات کو ہی نشانہ بناتی تھی اور جانور بھی مر رہے تھے۔

رات کا گھپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا۔ پہرا دینے والے گاؤں میں گھوم رہے تھے۔ ان میں سے ایک جس کا نام اشوک تھا اسے رفع حاجت محسوس ہوئی تو اس نے اپنے ساتھیوں سے اجازت لے کر قریب کے کھیت میں چلا گیا۔ ویسے بھی گاؤں دیہات میں اکثر لوگ حاجت کے لئے کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔ ”اشوک ہم تیرا انتظار کر رہے ہیں، جلدی سے فارغ ہو کر آ جا۔“ جمال نے کہا۔

اشوک قریب کے کھیت میں چلا گیا۔

پانچ منٹ، دس منٹ اور پھر اس طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا، مگر اشوک اپنے ساتھیوں کے پاس واپس نہیں آیا تو سب کو تشویش ہوئی۔ ”ارے اشوک ابھی تک نہیں آیا۔“ ایک نے کہا۔

”بات تو ٹھیک ہے۔ آٹھ دس منٹ میں تو اسے آ جانا چاہئے تھا۔“ جمال بولا۔

جمال نے بلند آواز سے اشوک کو آوازیں دینے لگا، مگر اشوک کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر دونوں ساتھی گھبرا گئے، اور اسی گھبراہٹ میں وہ دونوں تابڑ توڑ سیٹیاں بجانے لگے، جس کا مطلب تھا کہ قریب ہی پہرا دینے والے ساتھی متوجہ ہوں۔ چند منٹ تک بغیر رکے جب وہ سیٹیاں بجانے لگے تو دوسری طرف سے بھی سیٹیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

اور پھر چند منٹ بعد ہی چھ ساتھی اس جگہ پہنچ گئے۔ جب وہ قریب آ گئے تو جمال بدحواسی کے عالم میں بولا۔ ”اشوک رفع حاجت کے لئے سامنے کھیت میں گیا تھا، پون گھنٹہ ہونے کو آیا ابھی تک واپس نہیں آیا، میں آواز دے دے کر تھک چکا ہوں۔“

”اچھا چلو چل کر دیکھتے ہیں، اسے تو دس منٹ میں آ جانا چاہئے تھا۔“ پران بولا۔

اور پھر آٹھوں ساتھی کھیت میں جانے کے لئے آگے بڑھنے لگے۔ ”اشوک...... اشوک۔“ وہ آوازیں بھی دے رہے تھے مگر ابھی تک اشوک کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں بڑی ٹارچیں بھی تھیں۔ آوازیں دیتے ہوئے سب کے سب سامنے کھیت میں پہنچ گئے۔

جو منظر ان کے سامنے آیا، اسے دیکھ کر وہ آٹھوں دہل گئے، ان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا، ان سب کی آنکھیں پتھرا گئیں، سینے سے دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا، آٹھوں کے آٹھوں ساتھی کھڑے کھڑے جیسے پتھر کے بت بن گئے تھے، ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کے جسم کی رگوں میں خون منجمد ہو گیا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی مسلسل اشوک کا حاطہ کئے ہوئے تھی۔

اشوک کھیت میں زمین پر بے سدھ پڑا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھٹ پڑی تھیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اس نے ہاتھ پیر بہت چلائے ہوں، کیونکہ کھیت کی بھربھری مٹی ادھر ادھر ہو گئی تھی، لگتا تھا تکلیف کی وجہ سے اس نے مٹی میں لوٹنا شروع کر دیا ہو، اشوک مر چکا تھا۔

اچانک رات کے اندھیرے میں ایک بڑا سا الو اپنی کریہہ آوازیں نکالتا ہوا، اوپر سے گزرا تو وہ سب چونک گئے۔ کئی تو اس جگہ سسک پڑے۔ ”یار! یہ تو مر گیا، اچھا بھلا تو ہمارے پاس سے آیا تھا، یہ اچانک کیا ہو گیا؟ ایسا لگتا ہے۔ یہ آفت تمام مردوں کو مار کر ہی چین سے بیٹھے گی۔“ جمال بولا۔

”اب کیا کریں؟ اس کے گھر والو کو کیا جواب دیں گے۔“ لکشمن بولا۔

”جمال تو اسے کندھے پر اٹھا لے، اسے گھر لے کر چلتے ہیں۔“ مہندر بولا۔

جمال نے اشوک کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ کیوں کہ جمال اپنے ساتھیوں میں زیادہ تگڑا تھا۔ مرے ہوئے اشوک کو لے کر وہ سب اس کے گھر پہنچ گئے اور پھر گھر والوں کی چیخ و پکار سے سارا گاؤں دہل کر رہ گیا۔ اشوک کو چارپائی پر لٹا دیا گیا۔ دوستوں میں ہمت نہیں تھی کہ وہ کچھ بتا سکیں۔ سب کے سب خاموش تھے اور صبح ہوتے ہوتے اشوک کا چہرہ بھی سیاہ ہونے لگا۔

آج تو اشوک کی موت پر سارا گاؤں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ گاؤں والوں کا ضبط غم اب ختم ہو کے رہ گیا تھا۔ آج تو بچے بھی رو پڑے تھے۔ دھاڑیں مارتے ہوئے لوگوں نے مل کر اشوک کو بھی چتا پر لٹا دیا۔

اشوک کی ماں چند منٹ کے لئے ہوش میں آتی اور پھر غش کھا کر گر پڑتی۔ اشوک کے گھر میں موجود سارے لوگ ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ”نہ جانے آج کی رات کون ہم سے جدا ہو جائے گا؟“

”کیا اس موت کو صرف مردوں ہی سے دشمنی ہے، ایک ایک کر کے ہمارے کڑیل جوان مر رہے ہیں اور ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ جمال کے والد نے کہا۔ یا خدا ہم پر رحم فرما، ہماری غلطیوں کو معاف کر دے، نہ جانے ہم شانتی پور والوں سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ آج ہمارے بچے موت کے منہ میں جا رہے ہیں، یا خدا!

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے حبیبؐ کے صدقہ ہم بوڑھوں کو مار دے اور ہمارے بچوں کو بچالے، خدایا اب تو ہم میں سکت اور طاقت بھی نہیں رہی کہ ہم اپنے بچوں کا جنازہ اٹھا سکیں۔" اور یہ بول کروہ زاروقطار رونے لگے۔

☆......☆......☆

اس خونی واقعہ کورونما ہوئے بائیس دن گزر گئے تھے۔ اور ان بائیس دنوں میں بائیس ہی نوجوان لقمہ اجل بن چکے تھے۔

جمال کے والد کا نام سلیم الدین تھا۔ وہ اٹھے اور سسکتے آنسو بہاتے مسجد کی طرف جانے لگے۔ وہ مسجد کے احاطہ میں پہنچ گئے اور مسجد میں موجود پیش امام عبداللہ صاحب کے مزار کے قریب بیٹھ گئے، ان کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے، آنسو کیا تھے بلکہ ان کا دل اور جگر پانی کی شکل اختیار کرکے آنکھوں کے راستے باہر کو نکل رہا تھا۔ مزار کی جالی پکڑ کر وہ زاروقطار ہچکیوں سے رونے لگے وہ دھاڑیں مار مار کر روتے رہے، پون گھنٹہ تک وہ زاروقطار ہچکیوں میں اپنے آنسو بہاتے رہے، ایسا لگتا تھا کہ اب تو ان کے آنسو بھی خشک ہوگئے ہیں۔

"یا اللہ! تو رحمٰن ہے رحیم ہے، دین و دنیا کا خالق و مالک ہے، اللہ کس کی نظر لگ گئی ہے ہمارے گاؤں کو، یا اللہ اپنے حبیبؐ کے صدقے ہماری خطاؤں کو معاف کردے، اللہ ہم کہاں اور کس کے پاس جائیں، وہ تو ہی ہے جو اس مصیبت سے ہماری جان چھڑا سکتا ہے، اللہ دیکھ میں تیرے نیک بندے کے مزار پر آیا ہوں، پیش امام صاحب بہت نیک تھے، تیری عبادت کرنے والے تھے، پیش امام صاحب کی نیکیوں اور عبادتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم شانتی پور والوں پر فضل وکرم کردے، ہمارے سارے آسرے ٹوٹ چکے ہیں، ہم بے یارومددگار ہوگئے ہیں، اب تو صرف اور صرف تیرا ہی آسرا رہ گیا ہے۔ اللہ......ہم پر رحم فرما...... اللہ ہم پر کرم کردے۔" اور یہ بول کر سلیم الدین بلند آواز سے چیخ چیخ کر رونے لگے۔

اسی وقت مسجد میں دو نمازی بھی آگئے نماز کی غرض سے، انہوں نے سلیم الدین کو روتا ہوا دیکھا تو دونوں ان کے قریب بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ان میں سے ایک نے سلیم الدین کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، تو سلیم الدین اور بھی زور زور سے رونے لگے۔

کافی دیر تک سلیم الدین روتے رہے، پھر ان کے آنسو تھم گئے، انہوں نے نظریں اٹھا کر ان دونوں کی طرف دیکھا تو وہ چونک گئے کیونکہ وہ دونوں شانتی پور کے نہیں تھے۔

ان میں سے ایک بولا۔ "ہم نے آپ کی باتیں سن لی ہیں، آپ لوگوں کا غم واقعی ناقابل برداشت ہے، ہمت سے کام لیں۔ اللہ تعالیٰ بڑا غفور الرحیم ہے، آپ لوگوں کی مصیبتیں ختم کردے گا۔" اور پھر ایک نے مسجد کے گھڑے سے پانی لاکر پلایا۔ پانی پینے کے بعد سلیم الدین نے ان دونوں کے پوچھنے پر ساری روداد سنادی۔ جسے سن کر وہ دونوں افسردہ ہوئے، ایک بولا۔

"آپ لوگ اللہ سے مدد مانگیں۔ اللہ ہی دکھ و تکالیف کو دور کرنے والا ہے۔ اب ہم چلتے ہیں، نماز کی ادائیگی کے لئے ہم آگئے تھے۔"

وہ دونوں اٹھ کر نماز کے لئے مسجد میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر تک سلیم الدین پیش امام صاحب کے مزار کے قریب بیٹھے رہے پھر اٹھ کر اپنے گھر آگئے۔

اسی دن گاؤں میں ایک جوگی آگیا، لوگوں کو غمزدہ دیکھ کر ٹھٹک گیا، معلوم کرنے پر گاؤں والوں نے ساری باتیں اس کے گوش گزار کردیں، جسے سن کر جوگی بہت افسردہ ہوا۔ وہ کہنے لگا۔ "اگر آپ لوگ راضی ہوں تو میں اس بلا کو قابو کرسکتا ہوں، لیکن اس کے لئے میں ایک بڑی رقم لوں گا۔"

یہ کہاوت مشہور ہے کہ "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" لوگوں نے آپس میں مشورے کئے اور فوراً رضامندی ظاہر کردی، اور آپس میں چندہ کرکے جوگی کی مطلوبہ رقم اسے دے دی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی وہ جوگی ایک برگد کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور کسی انجان زبان میں با بلند آواز کچھ پڑھنے لگا۔

پہریداروں نے رات میں اپنا پہرا جاری رکھا۔ رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ پورے گاؤں پر مکمل سناٹا طاری تھا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ زیادہ اندھیرا یوں تھا کہ اماوس کی راتیں شروع ہوچکی تھیں۔ جوگی بدستور منتر جنتر پڑھنے میں مصروف تھا۔

اچانک رات کے ساڑھے تین بجے جوگی کی فلک شگاف چیخ پہرا دینے والوں کو اور ساتھ ہی گاؤں والوں کو دہلا گئی۔

لوگ جلدی جلدی جوگی کے پاس پہنچے تو دیکھا جوگی مرچکا تھا۔

لوگوں کا ایک ہجوم جوگی کے گرد جمع تھا، جب سیانا اور گیانی جوگی اس جان لیوا بلا سے ہلاک ہوگیا تو ایک عام آدمی کی وقعت کیا، سارے لوگ حیران پریشان تھے کیونکہ وہ نہیں جانتے تھے کہ جوگی کون ہے اور کہاں کا رہنے والا ہے؟ ہندو ہے یا مسلمان ہے، یہ کسی قریبی گاؤں کا ہے یا پھر کسی دور دراز گاؤں کا رہنے والا، عجیب شش و پنج میں لوگ پڑ گئے تھے۔ سارا گاؤں رات میں ہی سر جوڑ کر بیٹھ گیا کہ "اس کا کریں تو کیا کریں۔" چوہدری نے مشورہ دیا کہ سب سے پہلے تھانے میں اس کی اطلاع کرنی چاہئے۔

پو پھوٹتے ہی لوگوں کو پتہ چل گیا کہ جوگی کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا ہے جو کچھ دوسرے مرنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے اور اگر اس کی لاش بھی زیادہ دیر تک رہی تو اس کی جلد بھی پھٹنا شروع ہوجائے گی۔

چوہدری نے فوراً اپنی گھوڑا گاڑی نکلوائی اور تیزی سے تھانے کی طرف بھاگا۔ تھانے پہنچ کر چوہدری نے تھانیدار سے ساری روداد جوگی کی سنادی۔ تھانیدار فوراً چوہدری کے ساتھ آیا، اور اس نے جوگی کی لاش دیکھ کر بولا۔ "جو آپ لوگوں کی مرضی ہو، وہ کردیں، میں لکھ کردے دیتا ہوں۔" تھانیدار نے ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا کہ "یہ جوگی لاوارث ہے۔ لہٰذا تھانہ کی اجازت سے یہ جس ذات سے تعلق رکھتا ہے، اس کے مطابق گاؤں والے اسے آخری منزل تک پہنچا سکتے ہیں۔" اور تھانیدار واپس چلا گیا۔

گاؤں والوں نے جب چیک کیا تو جوگی ہندو نکلا۔ لہٰذا گاؤں والوں نے جلدی جلدی کرکے اسے چتا پر لٹا کر آگ کے حوالے کردیا۔ کیونکہ جوگی کی موت بھی اسی طریقے سے ہوئی تھی جس طرح ابھی تک دیگر لوگ مرے تھے۔ دن میں موسم بہت خراب تھا۔ ہلکی بوندا باندی شروع ہوچکی تھی۔ بادلوں کی گھن گھرج ویسے ہی دل کو دہلا رہی تھی ہر کوئی اپنے گھر میں دبکا پڑا تھا۔ لہٰذا بارش میں پہرا دینا ناممکن تھا۔ آج رات کوئی بھی اپنے گھر سے نہیں نکلا۔ رات سر پر آگئی تھی اور پھر دبے قدموں سے رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرنے لگی۔

رات بھر بادلوں کی گرجدار آواز تہلکہ مچاتی رہی۔

دن کا سورج دل کو دہلاتا ہوا طلوع ہوا۔ آج رات میں دو نوجوانوں کی موت ہوگئی تھی۔ گاؤں والے سوائے رونے دھونے اور چیخ و پکار کرنے کے اور کر بھی کیا سکتے تھے۔ زاروقطار روتے ہوئے دونوں مرنے والوں کو آخری منزل تک پہنچا دیا گیا۔ گاؤں والے ہر روز ایک دو جنازہ اٹھا اٹھا کر نڈھال ہوچکے تھے، اب تو رو رو کر ان کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہوچکے تھے، اب اتنا بیزار ہوچکے تھے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے مالک سے شکوہ کناں تھے کہ یہ روز روز کے مرنے سے اچھا ہے کہ پورے گاؤں والوں کو ایک ہی دن موت سے ہمکنار کردیا جائے۔

دونوں مرنے والوں میں سے ایک ہندو تھا، دوسرا مسلمان، موت کی بلا یہ نہیں دیکھتی تھی کہ کون مسلمان ہے یا کون ہندو ہے، اسے تو بس مارنا تھا۔ بے چارے جانور بھی بلاناغہ مر رہے تھے۔ جانوروں کے لئے رات دن کا قید نہیں تھا۔ رات تو رات، دن میں بھی جانور مر رہے تھے، لیکن انسان صرف رات میں ہی موت سے ہمکنار ہوجاتے تھے۔

☆......☆......☆

رات میں سلیم الدین نے خواب دیکھا کہ نماز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد حیران و پریشان مسجد کے دروازے کے قریب بیٹھے ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں کہ ایک بزرگ نورانی چہرہ آئے اور آتے ہی بولے۔ ”حوصلہ کر، ہمت نہیں ہار، دلی مطلب میں چلا جا، دلی جانا بھولنا نہیں، فوراً چلا جا، کام ہو جائے گا، ظلم کوئی کرتا ہے اور بھگتتا کوئی اور ہے، جو کے ساتھ ظلم بھی پس جاتا ہے، جلدی سے چلا جا۔“ اور یہ بول کر وہ بزرگ نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

سلیم الدین کی فوراً آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے، اس خواب کے متعلق سوچنے لگے اور انہوں نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی دلی روانہ ہو جائیں گے۔ ”حقیقت میں یہ خواب ہمارے فائدے کے لئے دکھایا گیا ہے۔“

اللہ اللہ کر کے صبح ہوتے ہی وہ چوہدری کے پاس گئے اور اپنے خواب کے متعلق بتایا۔ خواب کے بارے میں سن کر چوہدری بھی بہت خوش ہوا، اپنے چوہان کو بلایا اور حکم دیا کہ ”فوراً سلیم الدین کو دلی لے جائے۔“

کوچوان نے اثبات میں سر ہلایا اور سلیم الدین کو لے کر دلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

دلی میں حکیم وقار بہت مانے ہوئے حکیم تھے۔ مطب کے بارے میں ہر شخص جانتا تھا۔ دلی شہر کی حدود میں داخل ہوتے ہی کوچوان نے گھوڑا گاڑی روک کر ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ”جناب یہاں مطب کس طرف ہے؟“

یہ سن کر راہ گیر بولا۔ ”اچھا تو آپ نے حکیم وقار کے مطب جانا ہے، مطب فلاں جگہ پر ہے، آپ سیدھے چلے جائیں۔“ بہرحال پوچھتے پوچھتے گھوڑا گاڑی حکیم وقار کے مطب کے سامنے جا کر رک گئی۔ سلیم الدین نیچے اترے اور مطب میں داخل ہو گئے، سلیم الدین یہ بھی سوچنے لگے کہ مطب میں تو بیماروں کا علاج ہوتا ہے، یہاں تو کسی خوفی بلا کا مسئلہ ہے، لیکن وہ خواب والی بات پر مطمئن تھے، مطب میں جا کر ایک طرف بیٹھ گئے، اور بھی کئی مریض بنچ پر بیٹھے ہوئے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، سلیم الدین بھی بیٹھ کر اپنی باری کا انتظار کرنے لگے۔

ایک گھنٹہ بعد سلیم الدین کا بھی نمبر آ گیا، تو وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حکیم وقار کے کمرے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ حکیم وقار انہیں دیکھ کر مسکرائے اور بولے۔ ”جناب تشریف رکھیں۔“ جب سلیم الدین کرسی پر بیٹھ گئے تو حکیم وقار نے کہا۔ ”جناب اب آپ اپنی پریشانی بیان کریں، آپ کو کیا تکلیف ہے؟“

یہ سن کر سلیم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے، یہ دیکھ کر حکیم وقار نے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور بڑی شفقت سے گلاس کا پانی سلیم الدین کو پلایا۔

پانی پینے کے بعد سلیم الدین کے جسم میں کچھ تازگی آ گئی، چند منٹ بعد حکیم وقار نے کہا۔ ”جناب آپ گھبرائیں نہیں، حوصلے سے کام لیں، آپ بتائیں کہ آپ کو کون سی بیماری ہے؟“

حکیم وقار کی بات سن کر سلیم الدین نے ساری روداد حکیم وقار کے گوش گزار کر دی۔ سارے حالات و واقعات سننے کے بعد حکیم وقار بولے۔ ”محترم میں جسمانی بیماریوں کا علاج کرتا ہوں، اور میرے دوست حکیم کامل روحانی علاج کرتے ہیں۔

آج حکیم کامل سے ملاقات مشکل ہے آپ برائے مہربانی پرسوں تشریف لے آئیں۔ مجھے قوی امید ہے کہ حکیم کامل آپ کا مسئلہ حل کر دیں گے۔ حکیم کامل موجود ہوتے ہیں مگر آج ہی علی الصبح ایک ضروری کام سے گئے ہیں اور ان کی واپسی کل کسی وقت متوقع ہے۔ آپ کو زحمت تو ہوگی مگر آپ کو آنا پڑے گا، آپ بے فکر ہو کر جائیں، اور یہ امید لے کر جائیں کہ انشاءاللہ آپ کا کام ہو جائے گا، اور آپ یہ بھی ذہن میں رکھئے گا کہ حکیم کامل کوئی پیسہ پائی لیتے نہیں ہیں۔“

حکیم وقار کی تسلی آمیز باتیں سن کر، اور پھر ان کے دماغ میں بزرگ کی بتائی گئی بات بھی تھی، سلیم الدین کو مصیبت سے نجات کی کرن نظر آ گئی تھی۔ انہوں نے حکیم وقار سے مصافحہ کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔

حکیم وقار بولے۔ ”برائے مہربانی اپنا پتہ

لکھوا دیں، اس میں آپ کا ہی فائدہ ہے۔“

سلیم الدین نے اپنا پتہ لکھوا دیا اور دل میں امید کی کرن لے کر واپس اپنے گاؤں آ گئے اور امید افزا باتیں چند لوگوں کو بلکہ خاص طور سے چوہدری کو بتا دی۔

دوسرے دن رولو کا کام سے فارغ ہو کر مطب میں واپس آ گیا۔ حکیم وقار کے کمرے میں گیا اور حکیم وقار سے مصافحہ کرنے کے بعد ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور دونوں باتوں میں مصروف ہو گئے، آدھا گھنٹہ بعد اچانک حکیم وقار کو سلیم الدین کی باتیں یاد آ گئیں تو حکیم وقار نے سلیم الدین کی زبانی ساری باتیں رولو کا کے گوش گزار کر دیں، ساری باتیں سننے کے بعد رولو کا بہت افسردہ ہوا اور بولا۔ ”کیا انہوں نے اپنا اتہ پتہ دیا ہے۔“

حکیم وقار بولے۔ ”سلیم الدین نے پتہ لکھوا دیا ہے، یہ لیجئے ان کا پتہ۔“

رولو کا نے سلیم الدین کا پتہ لیا اور بولا۔ ”میں آج رات ہی معلوم کروں گا کہ اصل مسئلہ ہے کیا؟“ تھوڑی دیر تک دونوں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے اور اس کے بعد رولو کا حکیم وقار کے پاس سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ سلیم الدین کی روداد سن کر رولو کا بہت زیادہ افسردہ ہو گیا تھا۔

شام ہوئی اور شام کے بعد رات کا اندھیرا ہر سو پھیل گیا۔ رولو کا نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں آ کر اندر سے چٹخنی لگا لی۔

رات بارہ بجے تک اپنے کمرے میں موجود رہا، وہ بستر سے اٹھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ رولو کا غائب ہو کر شانتی پور پہنچ گیا۔ شانتی پور پہنچ کر وہ غائب ہی رہا۔ اس نے پورے گاؤں کا ایک بھرپور چکر لگایا۔

دراصل وہ غائبانہ طریقے سے یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ لوگوں کے مرنے کا اصل جواز ہے کیا۔ گاؤں میں پہریدار پہرا دے رہے تھے۔ رات بھر وہ پورے گاؤں میں گھومتا رہا اور اس نے پتہ لگایا کہ لوگوں کے مرنے کے کارن کیا ہیں۔ وہ موت کی بلا کے پیچھے پیچھے چلتا رہا،

ایصال ثواب

نامور کہانی نویس، ناول نگار، ہندی اور گجراتی ناولوں کے مترجم یعقوب جمیل کافی علالت کے بعد 13 مارچ 2012ء کو خالق حقیقی سے جا ملے، ”انا للہ وانا الیہ راجعون“ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

ادارہ ماہنامہ ڈرڈائجسٹ

اور اس نے اس بلا کو موقع نہیں دیا کہ وہ آج کی رات کسی کو اپنا شکار بنا سکے۔

وہ بلا جہاں کسی کو مارنے کے لئے جھپٹتی تو درمیان میں رولو کا آ جاتا، اور وہ بلا مایوس ہو کر اس گھر سے باہر نکل جاتی، اس طرح چکر رات بھر چلتا رہا، اور صبح کا سپیدہ ہر طرف پھیلنے لگا۔ آج گاؤں میں کوئی بھی نہیں مرا تھا۔ رولو کا واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔

سلیم الدین اور چوہدری بلکہ سارے گاؤں والوں کی خوشیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔

سلیم الدین بھاگتے ہوئے چوہدری کے پاس پہنچے اور اس سے بولے۔ ”چوہدری صاحب کوچوان کو بول دیں کہ وہ فوراً میرے ساتھ دلی چلے۔ حکیم کامل کا ہی کرشمہ نظر آ رہا ہے کہ ان کی دعا سے آج گاؤں میں کسی کی بھی موت واقع نہیں ہوئی۔“

چوہدری نے کوچوان کو حکم دیا کہ سلیم الدین کو لے کر فوراً دلی چلا جائے۔ سلیم الدین کو لے کر کوچوان دلی پہنچ گیا۔ دن کے دس بجنے والے تھے۔ حکیم وقار کے کمرے میں رولو کا بھی بیٹھا تھا۔ حکیم وقار نے اپنے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ سلیم الدین نامی ایک صاحب آئیں تو انہیں فوراً میرے کمرے میں پہنچا دیا جائے۔

سلیم الدین کے گاڑی سے اترتے ہی ملازم ان کی طرف لپکا اور انہیں لے کر حکیم وقار کے کمرے میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ گیا جہاں کہ رولوکا بھی کرسی پر براجمان تھا۔ سلیم الدین نے آتے ہی رولوکا اور حکیم وقار سے مصافحہ کیا۔ سلیم الدین کو دیکھ کر حکیم وقار بولے۔ ”سلیم صاحب یہ ہیں حکیم کامل۔“

سلیم الدین فوراً سے پیشتر نیچے جھک کر رولوکا کے پاؤں کو ہاتھ لگایا تو جھٹ سے رولوکا نے انہیں کندھے سے پکڑ کر اوپر کو اٹھایا اور بولا۔ ”آپ گھبرائیں نہیں، صبر سے کام لیں، میری کوشش ہوگی کہ آپ سارے گاؤں والوں کی جان چھوٹ جائے، اس خونی بلا سے۔“

سلیم الدین کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ رولوکا بولا۔ ”آپ آنسو پونچھ لیں اور آپ میرے کمرے میں چلیں، وہیں بیٹھ کر آپ کی باتیں سنوں گا۔“

سلیم الدین کو لے کر رولوکا اپنے کمرے میں آ گیا اور سلیم الدین سے بولا۔ ”آپ کرسی پر بیٹھ جائیں اور اپنی روداد سنائیں کہ مسئلہ کیا ہے؟“

جبکہ رولوکا اپنے تئیں رات میں غائبانہ طریقے سے شانتی پور جا کر اصل معاملہ دیکھ چکا تھا، اور وہ اس بلا کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا جس کی وجہ سے آج رات شانتی پور میں کوئی مرا نہیں تھا۔ رولوکا نے سلیم الدین کو بہت تسلی دی اور بولا۔ ”آپ بالکل بھی فکر نہ کریں اور اپنی زبانی بتائیں کہ اصل واقعہ ہے کیا؟“

سلیم الدین نے شروع سے آخر تک کا سارا معاملہ رولوکا کے سامنے رکھ دیا۔ جسے سن کر رولوکا بہت افسردہ ہوا، اور بولا۔ ”آپ مطمئن ہو کر واپس اپنے گاؤں چلے جائیں۔ میں حسب ضرورت آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا، آپ کے گاؤں کا پتہ میرے پاس موجود ہے، آپ نے ہی اپنا پتہ لکھ کر حکیم وقار کو دیا تھا۔

رولوکا اپنی کرسی سے اٹھا اور سلیم الدین کے ساتھ حکیم وقار کے کمرے میں آ گیا۔ رولوکا اور سلیم الدین دونوں حکیم وقار کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئے، اتنے میں ایک مریض کمرے میں داخل ہوا، اس مریض کو کئی دن پہلے سانپ نے ڈسا تھا۔ وہ مریض حکیم وقار کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا، تو حکیم وقار اس کی طبیعت کا پوچھنے لگے اور پھر بولے۔ ”میاں تم نے عقل مندی کی جس کی وجہ سے تمہاری جان بچ گئی۔“

رولوکا بولا۔ ”حکیم صاحب جو لوگ اپنے حواس پر قابو رکھتے ہیں وہ اپنی مصیبتوں پر قابو پا لیتے ہیں، اکثر گاؤں دیہات میں زیادہ سانپ ہوتے ہیں جو کہ زیادہ تر لوگوں کو پاؤں پر ڈستے ہیں، اور اگر ایسا ہو تو جس جگہ سانپ نے کاٹا ہے، اس جگہ سے تھوڑا اوپر کس کر رسی باندھ دینا چاہئے اور پھر اوپر ایک گرہ اور لگانی چاہئے، پھر کسی تیز دھار چاقو سے اس جگہ سے دو انچ ہٹ کر چیرا لگا دینا چاہئے، ایسا کرنے سے سانپ کا زہر خون کے ذریعہ باہر نکل جاتا ہے، یعنی اس جگہ زہر کی مقدار کم ہو جاتی ہے، اور جب زہر کی مقدار کم ہو جاتی ہے تو اس متاثرہ شخص کے بچنے کی امید زیادہ ہو جاتی ہے۔“

اس کے بعد سلیم الدین سے مخاطب ہو کر رولوکا بولا۔ ”سلیم صاحب آپ تشریف لے جائیں فکر کرنے کی قطعی ضرورت نہیں، میری کوشش ہوگی کہ بہت جلد آپ لوگوں کی جان اس بلا سے چھوٹ جائے۔“ اس کے بعد سلیم الدین نے ان سب سے مصافحہ کیا اور گھوڑا گاڑی پر بیٹھ کر اپنے گاؤں آ گئے۔

گاؤں میں پہنچ کر سلیم الدین نے گاؤں والوں کو خوش خبری دی کہ ایک دو روز میں ہم سب کی جان اس موت کی بلا سے چھوٹ جائے گی۔“ یہ سن کر گاؤں والے بہت خوش ہوئے۔

رات کا اندھیرا پورے گاؤں کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا۔ پہریدار بدستور گاؤں میں پہرا دے رہے تھے، رات کا خاتمہ ہونے والا تھا اور تھوڑی دیر میں صبح کا اجالا پھیلنے والا تھا۔ ایک گھر میں دو میاں بیوی ایک چھوٹے پائے کی چارپائی پر محو خواب تھے۔ دونوں کے سر پیر ایک دوسرے کے مخالف میں تھے کہ اچانک شوہر کی آنکھ کھل گئی، وجہ یہ تھی کہ اس کے پاؤں کے انگوٹھے پر کسی چیز نے کاٹا تھا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے صاف طور سے دیکھا کہ ایک دو گز کا لمبا سانپ اس کے انگوٹھے

پر کاٹ کر بھاگ رہا ہے، بدحواسی میں اس نے اپنی بیوی کو اٹھایا اور بولا۔ ”جلدی سے کوئی کپڑا یا رسی لا۔“

بیوی فوراً ایک رسی لے آئی تو اس شخص نے انگوٹھے سے ہٹا کر دو جگہ رسی کس کر باندھ دی، اس کے بعد تیز چھری سے انگوٹھے کے نیچے چیرا لگا دیا، چیرا لگاتے ہی بھل بھل خون بہنے لگا، اس کی بیوی نے شور مچایا، پاس پڑوس کے لوگوں کو جگا دیا، اور لوگ دیسی طریقے سے سانپ کاٹے کا علاج کرنے لگے۔ اب صبح کا اجالا کافی پھیل چکا تھا۔

پورے گاؤں میں شور مچ گیا تھا کہ رامو کو ایک خطرناک سانپ نے ڈس لیا ہے۔ سانپ کی لمبائی دیکھ کر رامو ویسے بھی دہشت زدہ ہو گیا تھا۔

اب آہستہ آہستہ رامو پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ دیسی علاج کوئی بھی مکمل کارگر ثابت نہیں ہو رہا تھا۔ رامو کی بیوی کا رو رو کر بہت برا حال تھا۔ رامو اپنے گھر کا خود کفیل تھا، گزشتہ سال ہی اس کے ماتا پتا پرلوک سدھار گئے تھے۔ تھوڑے سے کھیت تھے جس میں اناج اگا کر رامو اپنی گرگرہستی چلاتا تھا۔

اچانک رولوکا گاؤں میں ایک طرف سے داخل ہوا، اور سیدھا سلیم الدین کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ سلیم الدین اپنے گھر کے سامنے چند لوگوں سے رامو کے متعلق ہی باتیں کر رہے تھے۔ رامو کے لئے سلیم الدین بہت پریشان تھے۔ سلیم الدین ہی کیا بلکہ رامو کے لئے سارا گاؤں ہی بہت زیادہ پریشان تھا۔

رولوکا پر نظر پڑتے ہی سلیم الدین لمبے ڈگ بھرتے ہوئے رولوکا کی جانب لپکے تو سب سے پہلے رولوکا نے سلام کیا اور مصافحہ کے لئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سلیم الدین نے رولوکا سے مصافحہ کیا اور بولے۔ ”حکیم صاحب آپ نے آنا تھا تو اسی دن کہہ دیتے میں گھوڑا گاڑی لے کر آ جاتا، آپ صبح ہی صبح اتنی جلدی کیسے تشریف لے آئے؟ گاؤں کا اتہ پتہ کیسے چلا؟“

”جناب آپ نے اپنے گاؤں کا پتہ حکیم وقار کو لکھوا دیا تھا اور میں اسی پتہ پر پہنچ گیا۔“ رولوکا بولا۔

خیریت تو ہے ناں کیونکہ پورے گاؤں میں ہلچل سی مچی ہوئی ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے کوئی بڑی پریشانی لاحق ہو گئی ہے؟“

”جی حکیم صاحب! رامو نامی ایک جوان کو علی الصبح سانپ نے ڈس لیا ہے اور آہستہ آہستہ رامو پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی ہے، رامو کا کہنا ہے کہ وہ سانپ عام سانپوں سے کہیں بڑھ کر لمبا تھا، سانپ نے رامو کے پاؤں کے انگوٹھے پر ڈس لیا ہے۔ اس وجہ سے پورا گاؤں پریشان ہے۔ رامو اپنے گھر کا اکلوتا ہے، خدا نہ کرے اگر اسے کچھ ہو گیا تو بے چاری اس کی بیوی......“ اور سلیم الدین نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”سلیم صاحب آپ پریشان نہ ہوں، مجھے اس کے پاس لے چلیں، میں چل کر دیکھتا ہوں۔“ رولوکا بولا۔

رولوکا کو لے کر سلیم الدین رامو کے گھر کی طرف چل پڑے، دونوں جب رامو کے گھر کے پاس پہنچے تو دیکھا بہت سارے لوگ رامو کے گھر کے پاس بے چینی کے عالم میں نظر آئے، سلیم الدین اور رولوکا کو دیکھ کر لوگ ایک طرف کو ہٹتے چلے گئے۔ رولوکا کو لے کر سلیم الدین رامو کے گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ رامو چارپائی پر بے سدھ پڑا تھا پورا چہرہ ایسا نظر آ رہا تھا کہ جیسے پورے چہرے اور پورے جسم پر ہلدی مل دی گئی ہو۔

رولوکا نے اپنی جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکالی، شیشی میں سرخ رنگ کا کوئی سیال بھرا تھا۔ رولوکا بولا۔ ”سلیم صاحب یہ دوا اسے پلا دیں، یہ دوا کارگر ثابت ہوگی، اس کا منہ ذرا کھول کر یہ دوا اس کے منہ میں انڈیل دیں۔“

لہٰذا سلیم الدین نے دونوں ہاتھ سے رامو کا منہ زور لگا کر کھولا تو رولوکا نے فوراً شیشی کی ساری دوا رامو کے منہ میں انڈیل دی، ساری دوا فوراً رامو کے پیٹ میں اترتی چلی گئی۔ رولوکا بولا۔ ”سلیم صاحب گھر سے باہر والی جگہ لوگوں سے خالی کرا دیں تاکہ میں رامو کی بچت کے لئے ایک مکمل کارروائی کر سکوں، ذرا جلدی کریں، اگر دیر ہو گئی تو معاملہ بگڑ سکتا ہے، اب دیر کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گنجائش نہیں، کیونکہ سانپ کافی زہریلا لگتا ہے، اس کا زہر پورے جسم میں تیزی سے پھیلتا جارہا ہے، لہٰذا زہر کا تدارک بہت ضروری ہے۔“

رولوکا اور سلیم الدین دونوں گھر سے باہر نکلے، اور سلیم الدین نے لوگوں سے کہا۔”بھائیو! آپ لوگ برائے مہربانی اس جگہ کو صاف کردیں کیونکہ اس جگہ بیٹھ کر حکیم صاحب رامو کی حفاظت کے لئے کچھ کام کریں گے۔“

یہ سننا تھا کہ لوگ اس جگہ سے ارد گرد ہٹتے چلے گئے تو رولوکا بولا۔”سلیم صاحب ایک چھوٹی سی چٹائی منگائیں جس پر میں بیٹھ سکوں۔“

رولوکا کی بات سن کر سلیم الدین پاس کھڑے ایک شخص سے بولے۔”راجا کسی کے گھر سے ایک چھوٹی چٹائی جلدی سے لے آ۔“

سلیم الدین کی بات سن کر راجا ایک طرف کو دوڑا چلا گیا اور چند منٹ بعد ہی ایک چھوٹی سی چٹائی لے کر حاضر ہوگیا۔

چٹائی لے کر رولوکا نے زمین پر بچھائی اور اس پر بیٹھ گیا۔

رامو کے گھر سے ہٹ کر سامنے جھاڑیوں کا سلسلہ کافی دور تک نظر آتا تھا۔ جس طرف جھاڑیاں نظر آرہی تھیں، رولوکا نے اشارہ کیا کہ اس طرف لوگ کھڑے نہ ہوں، سلیم الدین نے بلند آواز سے کہا۔”بھائیو! اس طرف کی ساری جگہ خالی چھوڑ دیں۔“ سلیم الدین کی بات سنتے ہی سارے لوگ اس طرف سے ہٹتے چلے گئے۔

رولوکا نے سلیم الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔”اب چھوٹے چھوٹے تین عدد مٹی کے ناند منگوا کر اس جگہ رکھیں اور تینوں ناند فوراً دودھ سے بھر دیں۔“

رولوکا کی بات سن کر سلیم الدین نے کئی لوگوں سے کچھ کہا تو وہ لوگ ادھر ادھر بھاگے ہوئے چلے گئے، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین عدد چھوٹے ناند لے آئے، اس کے بعد کئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے کافی مقدار میں دودھ لے آئے اور سارا دودھ ناند میں ڈال دیا گیا۔ تینوں ناند دودھ سے بھر گئے تو رولوکا نے اشارہ کیا کہ اس جگہ موجود سارے لوگ خاموشی کا مظاہرہ کریں۔

رولوکا چٹائی پر بیٹھ گیا اور پھر ایک مرتبہ بولا۔ ”سلیم صاحب آپ، لوگوں سے کہہ دیں کہ سارے لوگ اپنی اپنی جگہ بالکل خاموش کھڑے رہیں۔ جب سانپ آئے تو اسے دیکھ کر لوگ ہلڑ بازی یا شور شرابہ نہ کریں، بلکہ اسے آتا دیکھ کر بھاگیں نہیں کیونکہ سانپ کسی اور کی طرف دیکھے گا بھی نہیں، بلکہ شور شرابے سے غصے میں آسکتا ہے، کیونکہ وہ بہت اڑیل اور ضدی لگتا ہے۔“

رولوکا کی بات کا بابلند آواز سے سلیم الدین نے اعلان کردیا۔ سلیم الدین کی آواز سن کر لوگ اپنی اپنی جگہ خاموشی سے کھڑے ہوئے، آنے والے وقت کا انتظار کرنے لگے۔

رولوکا چٹائی پر بیٹھ گیا اور چٹائی کے گرد ایک بڑی کیل سے چاروں طرف حصار کھینچ دیا۔ پھر اس نے حصار سے دو فٹ دور ایک چوکور دائرہ بنایا۔ پھر دائرہ کے اندر چاروں کونوں سے لکیر بنا کر چار خانے بنادیئے۔ اس کے بعد اپنی جیب سے ایک چھوٹی پڑیا نکال کر اس میں سے چار عدد کوڑیاں نکالیں۔ (گھونگے کی ذات کی ایک قسم ہوتی ہے جسے کوڑی کہتے ہیں)

چوکور دائرے کے چاروں کونوں پر ایک ایک کوڑی رکھنے کے بعد منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ ایک کوڑی اپنی جگہ سے ہوا میں اڑتی ہوئی مغرب کی جانب غائب ہوگئی۔ دوسری کوڑی پہلی کوڑی کی مانند اڑتی ہوئی مشرق کی جانب چلی گئی۔

تیسری کوڑی دونوں کوڑیوں کی طرح شمال کی طرف پرواز کرگئی۔

چوتھی کوڑی تینوں کوڑیوں کی طرح جنوب کی طرف اڑتی چلی گئی۔

رولوکا اپنی جگہ بدستور بیٹھا ہوا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہا۔ چند منٹ گزرے تھے کہ مغرب کی طرف گئی ہوئی کوڑی واپس اڑتی ہوئی آئی اور مغرب کی طرف بنے ہوئے کونے کی جگہ پر حاضر ہوگئی۔ اس طرح مشرق اور جنوب کی طرف جانے والی دونوں کوڑیاں بھی واپس آگئیں مگر شمال کی طرف گئی کوڑی واپس نہیں آئی۔

یہ دیکھ کر رولوکا نے اپنی شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا تو مغرب کی طرف کی کوڑی اڑتی ہوئی ہوا میں معلق ہوئی اور شمال کی طرف پرواز کرگئی۔

رولوکا اپنی جگہ بیٹھا کچھ پڑھنے میں منہمک رہا۔ چند منٹ رولوکا شمال کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے مشرقی کونے کی طرف کوڑی کی جانب اشارہ کیا تو وہ کوڑی بھی ہوا میں معلق ہوئی اور شمال کی طرف اڑتی ہوئی غائب ہوگئی۔ چند منٹ رولوکا شمال کی طرف دیکھتا رہا پھر اس نے جھٹ جنوب کی طرف کونے میں پڑی ہوئی کوڑی کی طرف انگلی سے اشارہ کیا تو وہ کوڑی بھی جھٹ ہوا میں معلق ہوئی اور ژن سے شمال کی طرف پرواز کرگئی۔

رولوکا جس جگہ بیٹھا تھا اس جگہ ایک بڑا سا برگد کا درخت تھا۔ وہ جگہ کافی سایہ دار تھی۔ رولوکا نے سلیم الدین سے کہہ کر وہ چارپائی جس پر رامو بے سدھ پڑا تھا اسے باہر منگا کر سایہ میں رکھوادیا تھا۔ چارپائی رولوکا کے سامنے چار فٹ کے فاصلہ پر پڑی تھی۔

رولوکا کو دائرہ میں بیٹھ کر پڑھتے ہوئے پندرہ منٹ ہوگئے تھے مگر ان چاروں کوڑیوں میں سے کوئی ایک بھی کوڑی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ تقریباً اٹھارہ منٹ ہوئے ہی تھے کہ جھاڑیوں کی طرف سے آتے ہوئے کالا بھجنگ کافی موٹا اور ڈیڑھ دو گز لمبا ایک سانپ آتا نظر آیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سانپ اپنی مرضی سے نہیں آرہا ہے۔ جب سانپ کافی قریب آگیا تو لوگوں نے دیکھا۔

دو کوڑیاں اس کی کنپٹی کی دونوں طرف چپکی پڑی تھیں، تیسری کوڑی اس کے منہ کے نیچے والے حصے میں چپکی ہوئی تھی جبکہ چوتھی کوڑی سانپ کے سر پر وقفے وقفے سے اوپر کو اٹھتی اور پھر زبردست زوردار طریقے سے اس کے سر پر ضرب لگاتی جس سے بلبلا کر سانپ آگے کو بڑھتا، سانپ کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ چاروں کوڑیاں اسے اذیت دیتے ہوئے کھینچ کر لارہی ہیں۔

سانپ رولوکا کے سامنے آن کر کھڑا ہوگیا اور قہر آلود نظروں سے رولوکا کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال دیں۔ چاروں کوڑیاں بدستور اپنے کام میں مشغول رہیں۔ چند منٹ سانپ اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔

رولوکا نے اپنی انگلی سے اشارہ کیا۔ اس طرف جس طرف کم اونچی چارپائی پر رامو بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے دونوں پاؤں چادر سے باہر کو نکلے پڑے تھے۔ رولوکا کے بار بار اشارہ کرنے پر آخرکار سانپ رامو کی طرف متوجہ ہوا، طوعاً و کرہاً رامو کی چارپائی کی طرف بڑھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی اپنا منہ رامو کے انگوٹھے پر اس جگہ رکھ دیا جہاں اس نے ڈسا تھا۔ اس درمیان بھی چاروں کوڑیاں اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دینے پر مصروف تھیں۔

چند منٹ تک سانپ رامو کے انگوٹھے پر اپنا منہ رکھے انگوٹھے سے زہر چوستا رہا کہ اچانک وہ نیچے کو گر پڑا تو رولوکا اپنی جگہ سے اٹھا اور سانپ کو اٹھا کر دودھ سے بھرے ایک ناند میں ڈال دیا۔

سانپ کا ناند میں پڑنا تھا کہ چند منٹ میں دودھ کا رنگ سفید سے نیلاہٹ میں تبدیل ہوگیا۔ اس درمیان رولوکا اپنی جگہ جا کر حصار میں چٹائی پر بیٹھ چکا تھا۔ تھوڑی دیر میں سانپ کلبلاتا ہوا، دودھ سے باہر نکلا اور رولوکا کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا تو رولوکا نے دوبارہ اسے رامو کی طرف اشارہ کیا تو اس مرتبہ بھی سانپ بحالت مجبوری رامو کی چارپائی کی طرف بڑھ گیا اور رامو کے قریب پہنچ کر اپنا منہ رامو کے انگوٹھے پر رکھ کر انگوٹھے سے زہر چوسنے لگا، اور پھر پہلے کی مانند چند منٹ زہر چوسنے کے بعد دوبارہ نیچے زمین پر لڑھک گیا۔ رولوکا پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور سانپ کو پکڑ کر دودھ سے بھرے دوسرے ناند میں ڈال دیا۔

(جاری ہے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حفاظت

احمد شیر خان-لودھراں

رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ تینوں چیخے مگر ان کی چیخیں رائیگاں گئیں کیونکہ اب وہ تینوں اپنی ٹانگوں سے معذور ہوچکے تھے، حلال روزی اور اللہ کی راہ میں دینے والے کی دولت اور مال کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔

ایک ایمان افروز کہانی جسے پڑھنے کے بعد یقیناً..... ایمان کی پختگی ہو جائے گی

رات کی تاریکی ایسی تھی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ سردی اتنی تھی کہ لوگوں کو بستر کے اندر بھی شدید سردی کا جھٹکا لگ رہا تھا۔ ایسے میں تین سائے حرکت کرتے ہوئے قبرستان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھے اور انہوں نے اپنے چہروں پر سیاہ کپڑے لپیٹ رکھے تھے۔ قبرستان میں وہ داخل ہوئے اور درختوں کے پھیلے ہوئے جھنڈ میں ایک پرانے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔

''وہ بڈھا تو ایسے سو رہا تھا جیسے تھکا ماندہ مزدور سوتا ہے۔ بھلا اتنی دولت ہو اور پھر نیند آ جائے۔ تو کمال کی بات؟'' ان میں سے ایک بولا۔

''ویسے تمہاری بات ٹھیک ہے۔ ہمیں توقع نہ تھی کہ بغیر کسی مزاحمت کے اتنا سارا مال مفت میں ہاتھ آ جائے گا۔'' دوسرا بولا

''اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو اور مال کے تین حصے کرو تاکہ اندھیرے میں ہم اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔'' تیسرا شخص بولا جو ان دونوں سے کم گو اور سنجیدہ تھا۔ ''ہاں، ہاں کرتے ہیں، تمہیں اتنی جلدی کیا پڑی ہے؟'' پہلے والا سایہ بولا۔

ان میں سے ایک نے تھیلا کھولا اور مال کے تین حصے کرنے لگا۔

وہ تینوں چور تھے اور اس پیشے سے ایک طویل عرصہ سے وابستہ تھے۔ انہوں نے چوری کا آغاز ہوش سنبھالتے ہی کر دیا تھا اور آج وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ وہ اپنے کام میں مشاق اور عیار تھے، یہی وجہ تھی کہ وہ آج تک پکڑے نہیں گئے تھے۔

آج رات انہوں نے ایک ایسے گھر میں چوری کی تھی جو بہت بڑا تاجر تھا۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ بہت مالدار ہے اور حد درجے کا کنجوس ہے اور حیرت کی بات یہ کہ وہ دنیا میں اکیلا ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی رشتہ دار ہے، اور نہ ہی اس نے اپنے گھر میں کوئی نوکر رکھا ہوا ہے۔ وہ تینوں چور جب اس مالدار آدمی کے گھر میں داخل ہوئے تو ان کو کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا اور نہ ہی مال کو تلاش کرنے میں کوئی دقت ہوئی۔ وہ مالدار آدمی سویا ہوا تھا۔ تاہم ان تینوں نے اس بات کو ضرور نوٹ کیا کہ سوتے ہوئے اس کے چہرے پر بلا کا اطمینان اور سکون تھا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کوئی نادیدہ قوت اس کی دولت کی حفاظت کر رہی ہے۔

وہ تینوں ہمیشہ چوری کرنے کے بعد اسی قبرستان میں آ کر چوری شدہ مال کو آپس میں تقسیم کرتے تھے۔ تاہم آج یہاں آتے ہوئے انہیں کچھ خوف محسوس ہوا اور انہوں نے اس خوف کو وہم سمجھ کر اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ تاہم یہ خوف ابھی تک ان کے ذہن سے نہیں جا رہا تھا۔ اسی خوف کے ساتھ وہ قبرستان میں داخل ہوئے۔

''لو جی، ہو گئے مال کے تین حصے،، ان میں

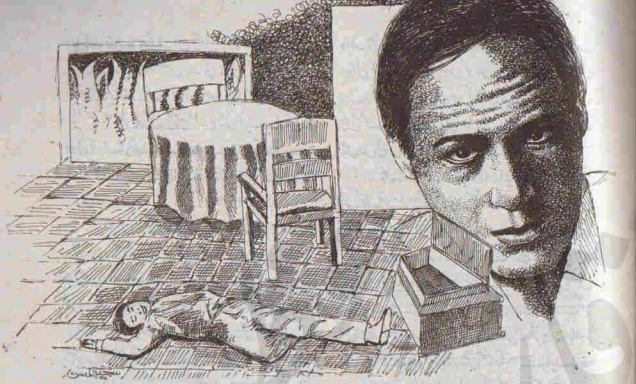

سے ایک نے آہستہ آواز میں کہا۔

ابھی وہ اپنا اپنا حصہ اٹھا ہی رہے تھے کہ انہیں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ خوف سے ان تینوں کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ تینوں جنوں، بھوتوں اور روحوں پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ وہ ہر دفعہ چوری کرنے کے بعد اسی قبرستان میں اپنا اپنا حصہ بانٹتے تھے اور آج تک وہ اس قبرستان سے خوفزدہ نہ ہوئے تھے اور نہ ہی ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ تینوں قدموں کی آہٹ کا مشاہدہ کرنے لگے کہ قدموں کی آہٹ کس سمت سے آ رہی ہے۔

اچانک قدموں کی آہٹ تھم گئی پھر ان تینوں کو محسوس ہوا کہ جیسے ان کو کوئی دیکھ رہا ہے اور اندھیرے میں ان کو خوفناک آنکھیں گھور رہی ہیں۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔ ''لگتا ہے یہ ہمارا وہم تھا یا پھر کوئی جانور اس طرف نکل آیا ہے۔ ورنہ کسی انسان کا رات میں یہاں کیا کام؟'' ان تینوں میں سے ایک ہمت کر کے بولا۔

''ہاں ہمیں بھی ایسا ہی محسوس ہوتا ہے،، دونوں چوروں نے اس کی تائید کی۔

اچانک انسانی کھانسی کی آواز سنی تو وہ تینوں بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔

ایک دفعہ پھر وہ اس سمت کا مشاہدہ کرنے لگے جہاں انہیں کسی کے موجود ہونے کا شبہ تھا۔ کچھ دور انہیں ایک گھنا اور پر اسرار درخت نظر آیا جو ان سے کچھ فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ قدموں کی چاپ اور کھانسنے کی آواز یقیناً اس درخت سے آئی تھی۔ وہ اس درخت کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے اچانک انہیں محسوس ہوا کہ ایک سایہ اس درخت سے نکل کر ان کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس کا قد آٹھ فٹ سے بھی نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک وہ اس بات کا اندازہ نہیں کر پائے تھے کہ وہ انسان ہے یا کوئی اور مخلوق۔ تاہم یہ بات تو طے تھی کہ کسی انسان کا قد آٹھ فٹ نہیں ہوتا۔

وہ سایہ آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی تک اس کا چہرہ واضح نہیں ہوا تھا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو بھی نہیں پہچان سکتے تھے اور وہ ہمیشہ ایسی ہی اندھیری راتوں میں چوری کرتے تھے۔ وہ تینوں اس سایے کا چہرہ دیکھنے سے قاصر تھے تاہم اس سائے کے چلنے کا انداز بالکل انسانوں جیسا تھا۔ وہ سایہ اب بھی ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ سایہ ان سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک غائب ہوگیا۔ ان تینوں نے اس سائے کے خوف سے اپنی آنکھیں بند کی ہوئی تھیں۔ آنکھیں کھولے پر سائے کو نہ پا کر ان کو تھوڑی سی تسلی ہوئی۔

"چلو بھاگ چلیں" ان میں ایک نے کپکپائی ہوئی آواز میں کہا۔ خوف کی وجہ سے اس کے منہ سے جو آواز نکلی تو ایسے پتہ چلا جیسے یہ آواز کنوئیں میں سے آرہی ہو۔

انہوں نے لوٹا ہوا مال اٹھایا اور کھڑے ہونے لگے، ان کے حیرت سے پھٹے چھوٹ پڑے ان سے کھڑا ہی نہیں ہوا جارہا تھا۔ جب انہوں نے اپنی ٹانگوں کی طرف نظر دوڑائی تو اپنی ٹانگوں کو بہت ہی لاغر پایا۔

"اوہ میرے خدا" ان میں سے ایک بولا اور شاید یہ لفظ اس کے منہ سے پہلی دفعہ ادا ہوا تھا۔

اچانک انہیں روشنی محسوس ہوئی۔ روشنی اتنی پھیلی کہ ان کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ تاہم انہیں سایہ صاف نظر آگیا جس کی آہٹ انہوں نے اس قبرستان میں سنی تھی۔ اس کا چہرہ خوفناک نہیں بلکہ نورانی تھا۔ چہرے پر گھنی اور سفید داڑھی سے وہ کوئی اللہ والا معلوم ہوتا تھا۔ وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ روشنی میں ان تینوں چوروں نے اس کو صاف دیکھ لیا تھا اور ان تینوں کے لئے وہ بالکل اجنبی تھا۔ ان تینوں میں سے کسی نے اس کو پہلے نہ دیکھا تھا کیونکہ وہ دن کے وقت اپنی بستی اور ارد گرد کی بستیوں میں آزادی سے پھرتے تھے اور کسی کو ان کے بارے میں شبہ تک نہیں ہوتا تھا کہ یہ چور ہیں۔

تینوں نے اچانک ایک آواز سنی "میری بات سنو" وہ آواز کی سمت کا تعین کرنے لگے۔ ان تینوں نے آواز کی سمت کا تعین کرلیا۔ یہ آواز اسی درخت کی طرف سے آرہی تھی جس درخت کے تنے سے وہ نورانی چہرہ والا بوڑھا ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔

"آج تک تم نے بہتی چوریاں کیں۔ وہ اسی قبرستان میں آکر تقسیم کیں۔ اس سے پہلے تم لوگوں کو کسی پریشانی کا سامنا اور نہ ہی تمہارے ساتھ کسی قسم کا واقعہ پیش آیا۔ جانتے ہو کیوں؟" بوڑھے شخص نے سوال کیا۔ اب ان تینوں کو اس کی صرف آواز سنائی دے رہی تھی اور وہ اس کو دیکھ نہیں رہے تھے کیونکہ اب خوفناک اندھیرا تھا۔ اس سائے کے سوال کے جواب میں ان تینوں کے منہ سے ایک لفظ بھی ادا نہ ہوسکا۔

پھر کچھ توقف کے بعد وہ سایہ بولا "اس لئے کہ اب تک تم نے جتنے لوگوں کے گھروں میں چوریاں کیں وہ سب لوگ بے ایمان، سنگ دل، بے رحم ظالم جابر اور زکوٰۃ و خیرات کو جرمانہ سمجھنے والے تھے اور غریبوں، مجبوروں کو ایک پیسہ نہ دینے والے تھے۔ مگر جس شخص کے گھر میں تم نے آج چوری کی وہ بہت بڑا تاجر ہے مگر اس نے اپنی ذات پر ضرورت سے زیادہ خرچ نہ کیا اور جو کچھ کماتا ہے، وہ غریبوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک ہاتھ سے دیتا ہے تو کسنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ جو زیور تم نے چرایا، کیا وہ اب بھی تمہارے پاس موجود ہے؟"

ان تینوں نے زیور کو ٹٹولا تو زیور غائب تھا۔

"سارا زیور دوبارہ اس شخص کے پاس پہنچ چکا ہے۔ وہ شخص اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ زیور اس نیک آدمی نے ایک غریب مزدور آدمی کو دیا تھا۔ جس کی تین بیٹیوں کی شادی چند روز بعد ہے۔"

وہ تینوں بت بنے سب کچھ سن رہے تھے۔ سائے نے دوبارہ کلام کیا۔ اب سارا زیور دوبارہ اس نیک آدمی کے گھر پہنچ چکا ہے۔ اس کے زیور اور دولت کو کوئی چرا نہیں سکتا۔ سزا کے طور پر تم تینوں ٹانگوں سے معذور ہو چکے ہو۔ جتنا عرصہ جیو گے اب تم تینوں بغیر ٹانگوں کے جیو گے۔" یہ کہہ کر سایہ اپنی جگہ سے غائب تھا۔

"نہیں" وہ تینوں چیخے مگر ان کی چیخیں رائیگاں گئیں۔ وہ واقعی تینوں اپنی ٹانگوں سے معذور ہو چکے تھے۔ انتاہ کو سمجھ چکے تھے کہ حلال روزی اور اللہ کے راہ میں دینے والے کی دولت اور مال کی حفاظت اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے۔

ساگوان چکر

ساجدہ راجا۔ ہندواں سرگودھا

بوڑھا جن بولا۔ اگر گیارہ آدم زادیوں کا جو اماوس کی رات پید اہوئی ہوں ان کا خون اگر لڑکی کے ماتھے پر ٹپکایا جائے تو وہ زندہ ہوجائے گی اور تم سے شادی پر رضامند ہوجائے گی۔

مادرائی مخلوق کے جال میں پھنس جانے والی.....ایک دوشیزہ کی بھیانک روداد

مسلسل چیخنے کی آواز سن کر گھر کے سارے لوگ دوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں آئے تو دیکھا کہ وہ منہ پر ہاتھ رکھے چیخے جارہی تھی، اس کی آنکھیں خوف و دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے بہت خوفناک اور ڈراؤنا منظر دیکھ لیا ہو۔

"کیا ہوا رانیہ بیٹی؟" اس کی ماں ہانپتے کانپتے اس کے پاس آئی اور اس کو سینے سے لگالیا۔

"و.....وہ مجھے لے جائیں گے.....مار ڈالیں گے مجھے.....خدا کے لئے اماں مجھے ان سے بچالو....." رانیہ ماں کے سینے سے لگی ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"کچھ نہیں ہوگا.....میں تمہارے پاس ہوں، کیا تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے؟" فاطمہ بیگم نے اسے سینے سے لگائے ہوئے کہا۔

"نہیں اماں یہ خواب نہیں.....وہ واقعی مجھے اپنی دنیا میں لے جائیں گے اور مجھے مار ڈالیں گے.....اماں مجھے ان کے ساتھ نہیں جانا، مجھے ان سے خوف آتا ہے۔" رانیہ مسلسل روئے جارہی تھی۔

"اچھا بیٹی تو.....رو مت، میں تیرے پاس ہی سو جاتی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے فاطمہ بیگم اس کے پاس ہی لیٹ گئی اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں رانیہ گہری نیند کی آغوش میں جاچکی تھی۔

رانیہ اپنے والدین کی بہت لاڈلی تھی، دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لئے سب کی بہت لاڈلی تھی اگر ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھی تو بھائی بھی اس پر جان چھڑکتے تھے اور اس کی ہر فرمائش خوشی خوشی پوری کرتے، اس وجہ سے وہ تھوڑی ضدی بھی ہوگئی تھی۔ جس گاؤں میں ان کی رہائش تھی، ان کے گھر کے نزدیک ہی ایک بہت پرانا اور خستہ حال مندر تھا۔ لوگ اس مندر کے قریب جانے میں بھی خوف محسوس کرتے تھے۔

اس مندر کے بارے میں مشہور تھا کہ اکثر اوقات اس مندر کے احاطہ میں ایک نوجوان لڑکی کی موت واقعہ ہو جاتی ہے۔ مندر کے احاطے میں ایک بہت قدیم آم کا درخت بھی تھا۔

جوں جوں رانیہ شعور کی سیڑھیاں چڑھتی گئی اسے بھی نہایت سختی سے اس مندر سے دور رہنے کا کہا گیا تھا لیکن رانیہ کو ان باتوں پر یقین نہیں تھا۔

ایک دن اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھومتے پھرتے وہ اس مندر کے سامنے آنکلی۔ گرمیوں کا موسم ہونے کی وجہ سے آم کا پیڑ آموں سے لدا پڑا تھا پیلے پیلے لٹکے ہوئے آموں کو دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ "میں ابھی بہت سارے آم توڑ کر لاتی ہوں پھر مل کر کھائیں گے۔" رانیہ نے یہ کہتے ہوئے مندر کے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے اس کی سہیلیوں نے اسے بہت منع کیا لیکن وہ سنی ان سنی کرتی ہوئی مندر میں داخل ہوگئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آم کے پیڑ کے نزدیک جا کر اس نے بہت سارے آم توڑ لئے اور اپنے آنچل میں بھر کر جونہی وہ واپسی کے لئے مڑی تو اس نے ایک آواز سنی جیسے کوئی دوسرے سے مخاطب ہوتا ہے۔

"ہاں ساگوان یہ وہی لڑکی ہے اب تم آسانی سے اپنی منزل کو پالو گے۔" اس آواز نے کسی اور سے مخاطب ہو کر کہا۔ یہ آوازیں اس درخت سے آرہی تھیں جہاں سے اس نے بہت سے آم توڑے تھے ان آوازوں کو کن کر وہ تھوڑی خوفزدہ ہوگئی اور جلدی سے واپسی کے لئے مڑ گئی۔

☆.....☆.....☆

اب تو یہ ہر روز ہونے لگا ہر رات سوتے میں وہ چیخنے لگتی اس کی ماں اس کی حالت سے بہت پریشان تھی۔ اس رات تو حد ہوگئی، انہیں ابھی سوئے کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ رانیہ کی لرزہ خیز چیخ اور اس کے بعد کمرے سے آتی عجیب و غریب آواز کو سن کر وہ سب رانیہ کے کمرے کی طرف دوڑے، جونہی انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، ان کے دروازہ کھولتے ہی غائب ہو گیا تھا۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ تیر کی مانند اٹھی اور ماں کے گلے سے جھول گئی۔ "رانیہ..... رانیہ بیٹی کیا ہوا؟ کچھ تو بتاؤ اور وہ آواز کیسی تھی؟" لیکن رانیہ تو بے ہوش ہو چکی تھی۔

گاؤں میں چند دن پہلے ہی ایک بزرگ آئے تھے، وہ بزرگ بہت پہنچے ہوئے تھے لوگ انہیں شاہ جی کے نام سے پکارتے تھے۔

فاطمہ بیگم نے لوگوں سے ان کی تعریف سنی تو ان کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ دوسرے دن وہ ان بزرگ کے پاس پہنچیں۔ بہت سارے لوگ بیٹھے تھے اور اپنے اپنے مسائل کا ذکر کر رہے تھے۔

اپنی باری آنے پر شاہ جی کے سامنے گئیں۔ شاہ جی شکل سے ہی اللہ والے لگ رہے تھے ان کے چہرے پر نوری نور جھلک رہا تھا۔ ماتھے پر نشان عبادت گزار ہونے کا مکمل ثبوت دیتا تھا۔

فاطمہ بیگم نے جونہی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو شاہ جی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور بولے۔

"ہم جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟ وہ اس وقت ساگوان چمپک" میں پھنس چکی ہے اور اس کا بچنا بہت مشکل ہے۔ اور چونکہ آپ کی بیٹی اماوس کی رات پیدا ہوئی تھی اس لئے وہ اسے کسی صورت نہیں چھوڑیں گے۔"

"بابا جی مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ مسئلہ کیا ہے؟" فاطمہ بیگم نے پریشانی سے کہا۔

شاہ جی کچھ دیر خاموش رہے پھر بولے۔ "یہ آج سے تقریباً دو سو سال پہلے کی بات ہے۔ شہنشاہ جنات کے بیٹے ساگوان کو ایک آدم زادی اتنی پسند آگئی کہ وہ اس سے شادی پر مل گیا، وہ چونکہ لڑکی کے پاس ایک نہایت خوبصورت نوجوان کے روپ میں جاتا تھا اس لئے وہ لڑکی جس کا نام منشا تھا، وہ بھی اس نوجوان پر دل و جان سے فریفتہ تھی۔ دونوں نے شادی کا فیصلہ کرلیا چونکہ لڑکی پہلے ہی سے ساگوان کی حقیقت سے واقف تھی اس لئے اس نے ساگوان کی دنیا میں جانے سے انکار نہیں کیا۔

جب وہ دونوں جنات کے قبیلہ میں پہنچے تو وہاں بھونچال آ گیا۔ ایک جن زادے کا کسی آدم زادی سے شادی کرنا انہیں اپنی توہین لگا بلکہ ناممکن تھا۔ جنات کا شہنشاہ جنات سے ساگوان کو اپنے مطالبے سے باز رہنے کے لئے کہا لیکن چونکہ وہ شہنشاہ جنات کا اکلوتا اور لاڈلا بیٹا تھا اس لئے اس نے بھی بیٹے کی حمایت کی تو مجبوراً سب کو خاموش ہونا پڑا چونکہ جن زادے اور آدم زادی کا ملاپ ممکن نہیں تو اس کے لئے ضروری تھا کہ ایک خاص منتر کے بعد اس لڑکی کو ایک خاص مشروب دیا جاتا جس میں سانپ کا زہر ملایا ہوا تھا، اس منتر کی وجہ سے لڑکی پر زہر کا کچھ اثر نہ ہوتا اور وہ آہستہ آہستہ اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔

ایک مہینہ اس کو یہ مشروب پینا تھا اس کے بعد وہ اس قابل ہو جاتی کہ جن زادے سے شادی کر سکے۔ 29 راتیں پوری ہو چکی تھیں لیکن آخری رات میں لڑکی کسی وجہ سے منتر پڑھنا بھول گئی اور وہ زہر والا مشروب پینے ہی وہ موت کے منہ میں چلی گئی۔ اس مشروب میں یہ صفت تھی کہ لگاتار مشروب پینے کے بعد اس کے جسم میں یہ خاصیت پیدا ہوگئی تھی کہ اس کا جسم ایک عرصہ تک خراب نہیں ہو سکتا۔

لڑکی کی موت کے بعد ساگوان تو صدمے سے پاگل ہو گیا، کچھ عرصہ خود فراموشی کی حالت میں رہنے کے بعد وہ کچھ نارمل ہوا تو اسے اس بوڑھے جن کا خیال آیا جو اس کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا تھا چونکہ ساگوان منشا کو دوبارہ زندہ دیکھنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اس بوڑھے جن سے ملاقات کی اور اس سے اپنی مدد کرنے کو کہا۔ بوڑھا جن راضی ہو گیا اس نے ساگوان کو بتایا۔

"اگر گیارہ آدم زادیوں کا جو اماوس کی رات پیدا ہوئی ہوں ان کا خون اگر منشا کے ماتھے پر ٹپکایا جائے تو وہ دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے۔ کیونکہ مشروب پینے سے اس کا مزاج نہیں ہو سکتا، اور تم سے شادی بھی کر سکتی ہے۔" اس جن سے ساگوان کو ایک منتر بتایا کہ کسی بھی ایسے مندر میں جس کے احاطے میں آم کا پیڑ ہو، یہ منتر پڑھ کر اس درخت پر پھونک دینا، اس منتر میں ایسی کشش ہوتی کہ ہر وہ لڑکی جو اماوس کی رات پیدا ہوئی ہو، خود بخود کھنچتی چلی آئے گی اور اگر اس نے اس درخت سے آم توڑ کر کھا لئے تو وہ آسانی سے تمہارے قبضے میں آجائے گی۔" یہ کہہ کر بوڑھے جن نے اسے جانے کی اجازت دے دی۔

ساگوان بہت خوش تھا اس نے انسانی دنیا میں جا کر اس طرح مندر کی تلاش کرنا شروع کر دی اور آخر کار وہ مندر اسے نظر آ گیا جو اسی گاؤں میں تھا۔ اس نے فوراً وہ منتر پڑھا اور آم کے درخت پر پھونک دیا اس وقت سے لے کر اب تک وہ دس لڑکیوں کا شکار کر چکا ہے اور اس کا آخری شکار آپ کی بیٹی ہے جس کا خون منشا کے ماتھے پر ٹپکانے سے وہ دوبارہ زندہ ہو جائے گی اور پھر وہ شادی کر لیں گے۔"

"شاہ جی خدا کے لئے میری مدد کریں..... کچھ تو ایسا طریقہ ہوگا جس سے میری بیٹی ان کے چنگل سے بچ جائے فاطمہ بیگم نے روتے ہوئے شاہ جی سے کہا۔

شاہ جی نے کچھ دیر آنکھیں بند کرلیں اور بولے۔ "صرف ایک طریقہ ہے جس سے آپ کی بیٹی کی جان بچ سکتی ہے۔"

"وہ کون سا طریقہ ہے؟ مجھے بتائیں میں ہر حال میں اس پر عمل کروں گی؟" فاطمہ بیگم نے لرزتے ہوئے کہا۔

شاہ جی نے اسے ایک تعویز دیتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کرنا یہ تعویز لڑکی کے کمرے میں ایسی جگہ رکھنا جہاں لڑکی کی نظر نہ پڑے، وہ اسے نہ چھوئے اگر ان سات دنوں کے اندر اس نے تعویز کو چھو لیا تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں بچا سکے گی۔ یہ سات دن اس کی زندگی کے لئے بہت اہم ہیں، ورنہ پھر وہی ہوگا جو وہ چاہیں گے۔" شاہ جی نے تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے فاطمہ بیگم سے کہا۔

فاطمہ بیگم نے وہ تعویز فوراً لیا اور گھر آ کر رانیہ کے کمرے میں پڑے میز کے نیچے رکھ دیا۔ کیونکہ وہاں رانیہ کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

چوتھے دن رانیہ کی سہیلی کی شادی تھی وہ خوشی خوشی شادی میں جانے کے لئے تیار ہوگئی۔ کانوں میں جھمکا ڈالتے ہوئے اچانک جھمکا اس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا اور پاس پڑی میز کے نیچے چلا گیا تو وہ جلدی سے جھکی اور ہاتھ آگے کر کے جھمکا اٹھانا چاہا لیکن اس جگہ تک ہاتھ نہیں پہنچا۔

"رانیہ..... رانیہ بیٹی جلدی کرو دیر ہو رہی ہے بار بار تمہاری سہیلی کا بلاوا آ رہا ہے۔"

ماں کی آواز پر اس نے "جی اماں" کہا اور میز کو پیچھے کی طرف کھسکا دیا اور جھمکا اٹھانے کے لئے جھکی تو دیکھا کہ جھمکا تعویز کے نزدیک پڑا تھا۔ جھمکا اٹھاتے ہوئے اس کی نظر تعویز پر پڑی تو اس نے تعویز کو اٹھا کر دیکھا۔

جب کافی دیر ہو گئی اور رانیہ کمرے سے نہ نکلی تو فاطمہ بیگم خود کمرے کی طرف چل پڑیں جا کر دیکھا تو رانیہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔ اچانک ان کی نظر میز پر پڑی تو وہ ٹھٹک گئی میز اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی تھی۔ اور اس کے نیچے پڑا تعویز صاف نظر آ رہا تھا۔

فاطمہ بیگم کو ساری بات سمجھ تو آ گئی لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بیٹھتی چلی گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روگی

ذیشان اقبال عظمی۔کراچی

اچانک سائیڈ ٹیبل پر رکھے پتھر کے لیمپ کی آنکھیں خودبخود روشن ہوگئیں اور پھر پورا کمرہ لرزنے لگا اور پرھول آوازیں ابھرنے لگیں،پڑھا ہوا پانی جیسے ہی لیمپ پر چھڑکا گیا تو اس میں سے دھواں سا اٹھا اور اس کی آنکھیں تاریک ہوگئیں۔

دل ودماغ میں حیرتوں کے جھکڑ چلا دینے والی ایک پراسرار اور پرتجسس کہانی

باقر پیلس میں اس روز بے حد رونق اور گہما گہمی کے آثار تھے۔باقر صاحب کا اکلوتا بیٹا عرفان امریکہ سے تعلیم مکمل کرکے لوٹا تھا اور اسی خوشی میں باقر صاحب نے آج پورے خاندان کی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔صبح سے ہی ملازمین گھر کی صفائی اور تزئین وآرائش میں جتے ہوئے تھے۔باقر صاحب کی اہلیہ ذکیہ بیگم کچن میں موجود تھیں اور سارے کھانے اپنی نگرانی میں بنوا رہی تھیں۔گو دعوت رات کے کھانے کی تھی لیکن سہ پہر سے ہی رشتے داروں اور دیگر مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔قریبی رشتے دار خواتین نے تو آکر ذکیہ بیگم کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا جبکہ لڑکیاں لڑکے ایک طرف جمع ہوکر خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔بڑی عمر کے مردوں نے بھی باقر صاحب کے ساتھ مل کر محفل جمالی۔اس محفل میں سیاست اور حالات حاضرہ پر گرما گرم تبصرے ہورہے تھے۔کچھ دیر میں عرفان بھی تیار ہوکر اپنے کمرے سے نکل آیا اور اپنے دوستوں اور کزنز کے ساتھ شامل ہوگیا۔کئی سال بعد باقر پیلس کی رونقیں واپس لوٹی تھیں۔یوں لگ رہا تھا جیسے گھر میں کوئی شادی ہورہی ہو۔

رات کو پرتکلف کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ذکیہ بیگم چونکہ میزبان تھیں اس لئے وہ کھانے کے دوران بھی ملازمین کو ہدایات دیتی رہیں اور بار بار اٹھ کر کچن میں چکر لگا کر آتی رہیں۔

عرفان چونکہ بہت عرصے بعد اپنے سارے کزن اور دیگر رشتے داروں سے ملا تھا اس لئے کئی چہرے اس کی یادداشت میں دھندلا چکے تھے۔ایسے میں شائلہ نے اس کی مدد کی۔شائلہ اس کے سب سے چھوٹے چچا کی بیٹی تھی اور دونوں ایک ہی اسکول اور کالج میں پڑھتے رہے تھے۔امریکہ جانے کے بعد بھی عرفان اور شائلہ میں گاہے بہ گاہے انٹرنیٹ پر رابطہ رہتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ اس وقت بھی شائلہ عرفان کے ساتھ ساتھ تھی اور مشکل پڑنے پر سرگوشی میں عرفان کو خاندان کے مختلف لوگوں کا تعارف کرارہی تھیں۔

"شائلہ!وہ لڑکا کون ہے؟"عرفان نے کھانے کے دوران شائلہ سے سرگوشی میں پوچھا۔

"کون لڑکا؟"شائلہ نے چونک کر پوچھا۔

"وہ بڑی سی عینک اور الجھے بالوں والا۔جس نے نیلی جینز اور ڈھیلا ڈھالا کرتہ پہنا ہوا ہے۔" عرفان نے دور بیٹھے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

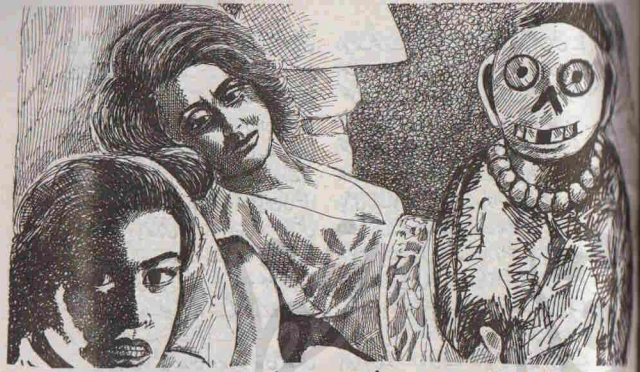

"وہ..... وہ تو خاور ہے۔اس سے کافی دور کا رشتہ ہے ہمارا۔یہ بڑی تائی کے بہنوئی کا بھتیجا ہے۔" شائلہ نے اسے بتایا تو وہ حیران ہوگیا۔

"اچھا؟اتنی دور کا رشتہ ہے تو پھر انہیں مدعو کس نے کیا!یہ تو قریبی رشتے داروں کی دعوت تھی۔"اس نے تعجب سے پوچھا۔

"شاید بڑی تائی کے ساتھ آئے ہوں۔" شائلہ نے خیال ظاہر کیا۔"ویسے بھی خاور اور اس کے اماں ابا کو زبردستی ہر ایک کا مہمان بننے کا شوق ہے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے تمہیں ان سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہے۔تبھی ایسا کہہ رہی ہو۔"عرفان نے کھانے کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔مجھے کسی سے کوئی ناراضگی وغیرہ نہیں ہے۔یہ پوری فیملی ہے ہی ایسی۔" شائلہ نے چڑ کر جواب دیا۔

"اچھا؟کم از کم خاور تو ایسا نہیں لگتا۔"عرفان نے بھی حرف لیتے ہوئے کہا۔

"خاصے دل پھینک واقع ہوئے ہیں۔ موصوف۔پہلی ملاقات میں ہی مجھے پرپوز کرچکے ہیں۔ رشتہ بھیجنے کی بات کررہے تھے۔ڈانٹ دیا میں نے۔" شائلہ کے گالوں پر سرخی سی چھا گئی۔

"اچھا تو یہ بات تھی۔" عرفان نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔"تبھی کہوں اتنی بیزاری کا اظہار کیوں ہورہا ہے۔بھئی ویسے لڑکا اتنا برا بھی نہیں ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بس بس رہنے دو۔ابھی ملے بھی نہیں ہو اور رائے قائم کرنی شروع کردی۔" شائلہ نے منہ بنا کر کہا۔"ویسے تم خاور میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟"اس نے سوال کیا۔

"ایسے ہی۔تمہارے آنے سے پہلے ہی میں اس سے مل چکا ہوں۔خود میرے پاس آیا تھا۔بڑی گرمجوشی کا اظہار کررہا تھا۔کوئی تحفہ وغیرہ بھی لایا تھا۔ میں نے امی کو تھما دیا۔"عرفان نے اسے بتایا۔

"تو اس میں نئی بات کیا ہے جو تم اس کے بارے میں اتنا پوچھ رہے ہو۔"شائلہ نے کہا۔

"کچھ نہیں۔ایک تو تعارف نہیں تھا۔پھر اس کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔نام پتہ بتائے بغیر مجھ سے یوں ملا جیسے ہم گہرے دوست رہے ہوں۔لیکن اس کی گرمجوشی میں عجیب سا تضاد تھا۔یوں لگا جیسے اس کے دل میں کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور ہے۔ پھر تحفہ دے کر فوراً ہی واپس چلا گیا۔" عرفان نے شمائلہ کو بتاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو عرفان۔ میں اس معاملے میں نہیں پڑنا چاہتی لیکن تمہیں اتنا بتا دوں کہ خاندان میں ان لوگوں کی شہرت اچھی نہیں ہے۔" تمام رشتہ دار ان سے دور رہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ گن چن کر چند لوگ ہیں جن کے گھر ان کا آنا جانا ہے۔ ان کے ہاتھ کا پکا کھانا یا ان کی بھیجی ہوئی سوغات کو ہاتھ نہیں لگایا جاتا لیکن ساتھ ہی کوشش کی جاتی ہے کہ ان سے براہ راست کوئی مخاصمت مول نہ لی جائے۔ تم بھی ان سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔" شمائلہ نے اس بار سنجیدہ لہجے میں کہا تو عرفان کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نظر آنے لگے۔

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو شمائلہ، میری سمجھ میں تمہاری ایک بھی بات نہیں آئی۔ گول مول الفاظ کے بجائے مجھے سیدھے سادے انداز میں بتاؤ مسئلہ کیا ہے۔" عرفان نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ ابھی شمائلہ نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ذکیہ بیگم کسی بڑی عمر کی خاتون کے ساتھ عرفان کے پاس آ کھڑی ہوئیں اور ان سے عرفان کا تعارف کروانے لگیں۔ عرفان مجبوراً ان کی طرف متوجہ ہو گیا اور شمائلہ سر جھکا کر کھانے میں مصروف ہو گئی۔ اگلے روز عرفان ناشتہ کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو میز پر کافی سارے تحائف کے ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ شاید ذکیہ بیگم نے کسی ملازم کو کہہ کر گزشتہ روز کے سارے تحائف عرفان کے کمرے میں رکھوا دیئے تھے۔ عرفان نے میز کھینچ کر بستر کے قریب کی۔ اور بستر پر بیٹھ کر دلچسپی سے تحفے کھولنے لگا۔ زیادہ تر تحفے عمومی انداز کے تھے۔ گھڑی، بٹوے، دھوپ کے چشمے، شیونگ کٹ اور پرفیوم وغیرہ۔ عرفان تحفے کھولتا گیا اور ایک طرف رکھتا گیا۔ شمائلہ کے تحفے کو اس نے زیادہ اشتیاق سے کھولا۔ یہ ایک خوب صورت کف لنکس اور ٹائی پن کا سیٹ تھا۔ ساتھ ہی ایک دیدہ زیب کی چین تھی جس پر اس کا نام خوب صورت لکھائی میں کندہ تھا۔ عرفان کچھ دیر تک محویت سے کی چین کو دیکھتا رہا، پھر اس نے احتیاط سے ڈبے کو ایک طرف رکھ دیا۔ مزید چند تحائف کھولنے کے بعد عرفان کو ایک قدرے مختلف تحفہ نظر آیا۔ یہ ایک آدمی کا سر تھا جو پتھر سے بنا ہوا تھا۔ سائز تقریباً ایک عام آدمی کے سر جتنا ہی تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ خلا تھا۔ یہ سر مکمل طور پر گہرے جامنی رنگ کا تھا۔ عرفان نے سر کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اسے گردن کے نچلے حصے میں ایک تار نظر آئی۔ اس نے سر کو اٹھا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور تار کو بستر کے پاس دیوار میں موجود سوئچ میں لگا دیا۔ سوئچ آن کرتے ہی جیسے سر کے اندر موجود کوئی دودھیا بلب جل اٹھا۔ لیکن یہ بلب اس طرح لگایا گیا تھا کہ صرف منہ اور آنکھوں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ عرفان نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پردے گرائے اور لائٹ بھی بند کر دی۔ اب اندھیرے کمرے میں صرف اس پتھر کے سر سے نکلتی روشنی نظر آ رہی تھی۔ یہ منظر خاصا دل دہلا دینے والا تھا۔ پہلی نظر میں اسے دیکھنے سے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کسی سچ مچ کے آدمی کی آنکھیں دہک رہی ہوں اور ان آنکھوں میں سیاہی کے بجائے مکمل سفیدی ہو اور ساتھ ساتھ منہ سے بھی روشنی نکل رہی ہو۔ اس مجسمے کے جامنی رنگ نے اسے اور بھی ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ عرفان نے ڈبے کے اندر جھانک کر دیکھا۔ ڈبے میں مزید کچھ چیزیں موجود تھیں۔ عرفان نے ڈبہ بستر پر الٹ دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا لوہے کا اسٹینڈ تھا اور کپڑے کی چھتری نما کوئی چیز تھی لیکن اسے بھی اس طرح بنایا گیا تھا کہ چمگادڑ کے پھیلے ہوئے پر معلوم ہوتے تھے۔ عرفان نے لوہے کا اسٹینڈ مجسمے کے سر کے اوپر رکھا اور اس پر چمگادڑ نما چھتری رکھ دی۔

"بہت خوب! تو یہ ایک ٹیبل لیمپ ہے۔" عرفان نے تعریفی انداز میں کہا۔ اسے اس لیمپ کی پراسرار اور ڈراؤنی شکل سے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا بلکہ اسے یہ خاصی دلچسپ چیز لگی تھی۔ وہ امریکہ کے آزاد اور ماڈرن ماحول میں رہ کر آیا تھا جہاں اس قسم کی

منفرد چیزوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا یونہی ٹیبل لیمپ کو دیکھتا رہا جس کی آنکھوں اور منہ سے دودھیا روشنی پھوٹ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھا اور کمرے کی بتی جلا دی۔ سوئچ کا بٹن دباتے ہی بٹن سے اچانک ایک چنگاری سی پھوٹی اور عرفان کو ایک زوردار بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس نے بے ساختہ ہاتھ پیچھے کر لیا۔ اس کے ہاتھ میں زبردست سنسناہٹ اور جلن ہو رہی تھی۔ اس نے غور سے سوئچ بورڈ کو دیکھا۔ "ٹھیک کروانا پڑے گا۔" اس نے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے کہا اور واپس بستر کی طرف مڑ گیا۔ ٹیبل لیمپ کا بٹن بند کر کے اس نے لیمپ کا ڈبہ اٹھایا اور بھیجنے والے کا نام دیکھا۔ یہ تحفہ بھیجنے والا کوئی اور نہیں بلکہ خاور تھا۔

"جیسا خود انوکھا انسان ہے ویسے ہی تحفہ بھی انوکھا بھیجا ہے۔" اس نے سوچا اور سارے تحفے سمیٹ کر واپس میز پر رکھ دیئے۔ اس کے ہاتھ میں ابھی تک تیز سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ اس نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

باقر صاحب کی عرفان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ بیٹے کے اعلیٰ مستقبل کی خاطر انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر اسے پڑھنے کے لئے امریکہ بھیج تو دیا تھا لیکن اس کی جدائی انہیں بے حد شاق گزرتی تھی۔ پچھلے کچھ سالوں سے ویسے بھی انہیں اپنا کاروبار وغیرہ بوجھ لگنے لگا تھا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ عرفان اب ان کے کاروبار میں دلچسپی لینا شروع کر دے تاکہ وہ کاروبار کے امور اسے سمجھا کر کچھ عرصے میں باقاعدہ ریٹائرمنٹ لے لیں۔ عرفان کے لوٹنے کے تقریباً ڈیڑھ دو ماہ تک تو انہوں نے عرفان پر کوئی زور نہ دیا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ تعلیم مکمل کرتے ہی اسے عملی زندگی میں مصروف کر دیا جاتا لیکن جب عرفان کو امریکہ سے لوٹے تین ماہ سے زائد ہو گیا تو انہوں نے سرسری الفاظ میں عرفان کو اس کی ذمے داریوں کا احساس دلانا شروع کر دیا۔ اس روز بھی اتفاق سے گھر کے سارے افراد رات کو کھانے کی میز پر موجود تھے۔ باقر صاحب موقع مناسب جان کر عرفان سے بات شروع کر دی۔

"تو بیٹا عرفان! آج کل کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟" انہوں نے گپ شپ لگانے کے انداز میں کہا۔ "کچھ خاص نہیں پاپا۔ ابھی تو امریکہ سے آیا ہوں۔ اتنی مشکل پڑھائی کے بعد اب کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ ذہنی تھکن کم ہو جائے تب ہی کوئی روٹین بنے گی۔" عرفان نے لاپروائی سے کہا۔ "تمہیں واپس لوٹے تین ماہ گزر چکے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم سارا سارا دن کمرے میں پڑے رہتے ہو۔ کہیں آنا جانا بھی نہیں ہے تمہارا ایسے تو تمہاری صلاحیتوں کو زنگ لگ جائے گا۔ تم ہفتے میں ایک آدھ دن میرے ساتھ آفس کا چکر کیوں نہیں لگا لیتے؟ کچھ تمہاری مصروفیت بھی بن جائے گی اور اسی بہانے کام بھی سمجھ لو گے۔" باقر صاحب نے غیر محسوس انداز میں عرفان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو رہنے دیں پاپا۔ کچھ روز میں دیکھیں گے۔" عرفان نے اس بار بیزاری سے کہا۔ جیسے اب وہ اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ باقر صاحب نے بھی اس کے موڈ کو بھانپتے ہوئے بات کا رخ تبدیل کر دیا۔ لیکن وہ اس صورت حال سے بہرحال مطمئن نہیں تھے۔ رات کو سونے سے قبل باقر صاحب نے ذکیہ بیگم سے اس صورت حال کے بارے میں تبادلہ خیال کرنا مناسب سمجھا۔ وہ بہرحال عرفان کی ماں تھیں اور عرفان کی طبیعت کو سمجھتی تھیں۔

"اب کاروبار کی ذمہ داریاں نبھانا زیادہ عرصے تک میرے بس کی بات نہیں۔" ساری صورت حال واضح کرنے کے بعد باقر صاحب نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "عرفان اگر یونہی لاابالی پن کا مظاہرہ کرتا رہے گا تو اپنا مستقبل بھی خراب کرے گا اور میری پچیس برسوں کی محنت بھی تباہ ہو جائے گی۔ جس کاروبار کو جمانے میں مجھے زندگی لگ گئی وہ کچھ ہی عرصے میں برباد ہو جائے گا۔" ذکیہ بیگم خاموشی سے شوہر کا شکوہ سنتی رہیں۔ انہوں نے باقر صاحب کے ساتھ زندگی کے سرد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وگرم دن سہے تھے۔ انہیں باقر صاحب کی پریشانی اور تکلیف کا اندازہ تھا۔ شوہر کی بات سن کر وہ کچھ دیر سوچتی رہیں پھر بولیں۔

"آپ کا شکوہ بجا ہے لیکن عرفان اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ البتہ امریکہ سے واپس آنے کے بعد میں اس میں کچھ عجیب سی تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ وہ کچھ چڑچڑا سا ہو گیا ہے۔ کھانا پینا بھی کم کر دیا ہے۔ نہ کہیں آتا جاتا ہے نہ کسی سے ملتا ہے بس کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ شاید اتنی سخت پڑھائی کے بعد واقعی وہ تھک گیا ہے۔" ذکیہ بیگم نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"اکیلا امریکہ میں رہ کر آیا ہے۔ کہیں خدانخواستہ نشہ وغیرہ....." باقر صاحب بات مکمل کرتے کرتے رک گئے۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ہمارا عرفان ایسا نہیں ہے۔" ذکیہ بیگم تڑپ کر بولیں۔

"تو پھر کہیں امریکہ میں کسی لڑکی وغیرہ کا مسئلہ نہ ہو۔" باقر صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔ ذکیہ بیگم کچھ دیر تو خاموش رہیں۔ پھر انہوں نے کہا۔

"دیکھیے۔ مجھے اپنی ربیت پر بھروسہ ہے۔ لیکن آپ کی باتوں نے میرے دل میں بھی خدشہ پیدا کر دیا ہے۔ مجھے تھوڑا وقت دیں۔ میں موقع دیکھ کر عرفان سے خود بات کرتی ہوں۔" یہ سن کر باقر صاحب نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا لیکن ان کے چہرے پر تفکرات کے آثار نمایاں تھے۔

اگلے روز ذکیہ بیگم خاص طور پر بادام کا حلوہ تیار کر کے عرفان کے کمرے میں لے گئیں۔ عرفان نے کمرے میں اندھیرا کیا ہوا تھا۔ کھڑکی کے پردے برابر تھے اور بتی بجھی ہوئی تھی۔ عرفان بستر پر نیم دراز ٹی وی پر کوئی کرکٹ میچ دیکھ رہا تھا۔ البتہ سائیڈ ٹیبل پر موجود وہ لیمپ روشن تھا جو خاور نے اسے تحفے میں دیا تھا۔ ذکیہ بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو سب سے پہلے ان کی نظر لیمپ پر پڑی۔ لیمپ کو دیکھتے ہی ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمایاں ہو گئے۔

"عرفان۔ کتنی بار کہا ہے ایسی منحوس شکل والی چیزیں کمرے میں مت رکھا کرو۔ رحمت کے فرشتے نازل نہیں ہوتے۔" انہوں نے کمرے کی بتی روشن کرتے ہوئے کہا۔ عرفان، ذکیہ بیگم کو دیکھتے ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر ٹیبل لیمپ آف کر دیا۔

"مما آپ بھی ایسے توہمات وغیرہ پر یقین رکھتی ہیں۔ ایسے جان پتھر کا لیمپ ہے۔ اس سے رحمت یا زحمت کا کیا تعلق؟" عرفان نے مذاق اڑانے والے لہجے میں کہا۔

"اچھا چھا۔ زیادہ بحث نہ کرو۔ دیکھو میں تمہارے لئے بادام کا حلوہ لائی ہوں۔" انہوں نے پلیٹ عرفان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ عرفان نے خاموشی سے پلیٹ لے لی اور بے رغبتی سے حلوہ کھانے لگا۔ ذکیہ بیگم کچھ دیر عرفان کا ردعمل دیکھتی رہیں، پھر گلا کھنکار کر بولیں۔

"کل میں ساجدہ آپا کے گھر گئی تھی۔ ان کی بیٹی الماس نے ایم اے میں دوسری پوزیشن حاصل کی ہے۔ میں نے سوچا مبارکباد دے آؤں۔" عرفان کی نظریں ٹی وی پر جمی رہیں۔

"آں..... ہاں۔ اچھی بات ہے۔" اس نے بے دھیانی کے عالم میں کہا۔

"بھئی مجھے تو الماس بہت اچھی لگی۔ پڑھائی میں تو آگے ہے ہی۔ ساتھ ہی کھانا بھی بہت عمدہ بناتی ہے۔ شکل صورت کی بھی پیاری ہے۔ میں تو سوچ رہی تھی کہ ساجدہ آپا سے تمہارے لئے بات کروں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" انہوں نے عرفان کو کریدتے ہوئے کہا۔

"کس بارے میں؟" عرفان نے اس بار چونک کر کہا۔

"افوہ عرفان! دھیان کہاں ہے تمہارا؟ میں الماس سے تمہارے رشتے کی بات کر رہی ہوں۔" ذکیہ بیگم نے اس بار جھنجھلا کر کہا۔

"کیا ہو گیا ہے مما آپ کو؟ آپ ابھی سے میری شادی کرنا چاہتی ہیں؟" عرفان نے حیرت سے

آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں برائی کیا ہے؟ ہاں کسی اور لڑکی کو پسند کرتے ہو تو ابھی سے بتا دو۔ بعد میں جیسی خاندان میں شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" ذکیہ بیگم نے ناراض لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں ہے مما۔ ابھی تو میں واپس آیا ہوں۔ مجھے کیریئر بنانا ہے۔ کچھ حاصل کرنا ہے۔ میرے سامنے پوری جوانی پڑی ہے۔ میں ابھی سے شادی کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہتا۔" عرفان نے تیز لہجے میں کہا۔

"تو کب بناؤ گے کیریئر؟ کب کرو گے محنت؟ کب حاصل کرو گے اپنا مقصد؟ کیا اس وقت جب باپ کام کرتے کرتے بستر پکڑ لے گا یا تمہاری ماں تمہارے سر پر سہرا دیکھنے کی آس میں قبر میں جا لیٹے گی؟ یا تب بھی تمہیں آرام اور سوچنے کے لئے مزید وقت درکار ہوگا؟" ذکیہ بیگم نے اس بار جلالی لہجے میں کہا۔

"آپ لوگ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں؟ کون سی ایسی آفت سر پر آ پڑی ہے جو سب مل کر مجھے کام کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ میں جو کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا۔ اگر آپ لوگوں سے میرا گھر میں رہنا برداشت نہیں ہو رہا تو بتا دیں۔ میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا جاؤں گا۔" عرفان نے بھی غصے سے چیختے ہوئے کہا اور جھٹکے سے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ دیوار پر دے ماری۔ پلیٹ دیوار سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئی۔ ذکیہ بیگم سکتے میں آ گئیں۔ انہیں عرفان سے اس ردعمل کی امید نہیں تھی۔ عرفان کی تربیت میں انہوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ غصے کی حالت میں بھی وہ کوئی غیر اخلاقی قدم نہ اٹھائے۔ غصے میں چیخنا چلانا، بڑوں کو جواب دینا اور خاص طور پر اپنا غصہ برتنوں پر نکالنا انہیں سخت ناپسند تھا۔ ساری زندگی وہ عرفان کو سمجھاتی آئی تھیں کہ ایسے لوگ جو غصے میں برتن توڑتے ہوں گھر کی چیزیں تباہ و برباد کرتے ہوں وہ اخلاقی طور پر کمزور ہوتے ہیں اور یہ عمل مذہبی اعتبار سے بھی قابل مذمت ہے۔ آج عرفان کے ایک پلیٹ توڑنے سے انہیں اپنی زندگی بھر کی تربیت خاک میں ملتی نظر آ رہی تھی۔ وہ کچھ دیر دکھ بھری نظروں سے عرفان کو دیکھتی رہیں۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ عرفان کافی دیر تک سر تھامے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے احساس تھا کہ اس نے غلط رویے کا مظاہرہ کیا ہے اور سے اپنی ماں سے معافی مانگنی چاہئے۔ لیکن پھر اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے اس رویے کے لئے مجبور بھی تو انہی نے کیا تھا۔ یہ سوچ کر اس نے معافی مانگنے کا ارادہ ترک کر دیا اور کروٹ بدل کر آنکھیں موند لیں۔

اس روز کے بعد ذکیہ بیگم نے بھی بیٹے کے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر اسے سمجھانا بجھانا چھوڑ دیا۔ البتہ دونوں میاں بیوی کی فکر میں دو چند اضافہ ہو گیا تھا۔ عرفان ان کے بڑھاپے کی واحد لاٹھی تھی اور اب یہ سہارا انہیں دور جاتا نظر آ رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی روز سر جوڑ کر بیٹھتے یہی سوچتے رہتے کہ آخر عرفان کو ہوا کیا ہے اور آخر وہ کھل کر بتاتا کیوں نہیں کہ اس کے دماغ میں کیا ہے۔ وہ اپریل کی ایک چمکیلی دوپہر تھی جب گھر کے فون کی گھنٹی بجی۔ ذکیہ بیگم نے فون اٹھایا تو دوسری طرف شائلہ تھی۔ "السلام علیکم آنٹی کیسی ہیں آپ؟" اس نے سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا۔ میں تو ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟" انہوں نے جواباً پوچھا۔

"اللہ کا شکر ہے آنٹی۔ لیکن مجھے آپ سے ایک شکایت ہے۔ بیٹے کے آنے کے بعد آپ ہمیں تو بھول ہی گئی ہیں۔ نہ ہی گھر کا چکر لگایا نہ ہی کوئی فون وغیرہ۔ حد تو یہ ہے کہ عرفان نے بھی واپس آنے کے بعد کوئی فون یا ایس ایم ایس تک نہیں کیا۔ اس سے زیادہ بات چیت تو وہ امریکہ رہتے ہوئے کر لیتا تھا۔" شائلہ نے شکایتوں کا دفتر کھولتے ہوئے کہا۔

"کیا کہوں بیٹا۔ عرفان کی وجہ سے تو ہم سب پریشان ہیں۔ نہ کھانا پیتا ہے، نہ کسی سے بات چیت کرتا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ بس ہر وقت کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ نہ جانے کون سا روگ لگالیا ہے۔ اس نے اپنی جان کو۔ ہمیں تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" کہتے کہتے ذکیہ بیگم کی آواز بھرا گئی۔ دوسری طرف کچھ دیر تو خاموشی رہی، پھر شمائلہ نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"میں شام کو امی ابو کے ساتھ آتی ہوں آنٹی۔ پھر میں خود عرفان سے بات کروں گی۔ آپ فکر نہ کریں۔" اس نے کہا تو ذکیہ بیگم کے چہرے پر کسی قدر طمانیت کے آثار نظر آنے لگے۔

"ضرور آؤ بیٹا۔ تمہاری بات تو وہ مانتا ہے۔ ذرا اس سے پوچھو کہ ہمیں کیوں پریشان کررہا ہے۔" انہوں نے ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

"آپ پریشان نہ ہوں آنٹی۔ میں ذرا آجاؤں پھر اس کے کان کھینچتی ہوں۔ اللہ حافظ۔" شمائلہ نے تسلی دینے کے انداز میں کہا اور فون بند کردیا۔ ذکیہ بیگم نے بھی ایک گہری سانس لیتے ہوئے ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ شام کو حسب وعدہ شمائلہ اپنے امی ابو کے ساتھ ان کے گھر پہنچ گئی۔ باقی لوگ تو باتوں میں مصروف ہوگئے جبکہ شمائلہ عرفان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرے میں حسب معمول اندھیرا تھا۔ عرفان بستر پر نیم دراز ویڈیو گیم کھیلنے میں مصروف تھا۔

"اچھا! تو جناب یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔ اچھے میزبان ہو۔ مہمان کی کوئی خبر ہی نہیں۔" شمائلہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی اونچی آواز میں کہا۔ شمائلہ کو دیکھ کر عرفان چونک پڑا۔

"اتنا اندھیرا کیوں ہے بھئی؟ کیا کوئی مراقبہ وغیرہ ہورہا ہے؟" شمائلہ نے کمرے کی بتی روشن کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ بس وہ روشنی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ تم کھڑی کیوں ہو آؤ بیٹھو۔" عرفان نے ویڈیو گیم کی جوائے اسٹک ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ شمائلہ نے اب کمرہ روشن ہونے کے بعد عرفان کو غور سے دیکھا۔ عرفان دبلا اور کمزور ہوگیا تھا۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ شیو بڑھی ہوئی تھی۔ مجموعی طور پر وہ ایسا شخص لگ رہا تھا جسے زندگی میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ یہ عرفان اس عرفان سے بہت مختلف تھا جس سے شمائلہ دعوت کے روز ملی تھی۔

"واہ بھئی۔ عیش ہورہے ہیں۔ تم تو آنے کے بعد ہمیں بھول ہی گئے۔" شمائلہ نے اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔

"نہیں یار۔ ایسی بات نہیں ہے۔ بچپن سے اب تک پڑھائی میں مصروف رہا۔ امریکہ میں بھی دن رات محنت کرکے پوزیشن حاصل کی۔ اب عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے کچھ عرصہ آرام کرنا چاہتا ہوں۔ پھر تو ساری زندگی ہی بھاگ دوڑ کرنی ہے۔" عرفان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ شمائلہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ کیونکہ دوران تعلیم جب وہ امریکہ سے اسے فون کرتا یا انٹرنیٹ پر رابطہ کرتا تو ہمیشہ اپنے مستقبل کی باتیں کرتا۔ اس کی گفتگو میں ایک عزم اور کچھ کر گزرنے کی لگن موجود ہوتی۔ آج وہی عرفان مستقبل اور عملی زندگی سے بیزار نظر آرہا تھا۔ بہرحال شمائلہ نے اس پر اپنا ردعمل ظاہر نہیں ہونے دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ باتیں کرتے کرتے اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے لیمپ پر پڑی۔ لیمپ کو دیکھتے ہی اسے بے اختیار جھرجھری سی آگئی۔

"یہ کیسی چیز ہے عرفان؟" اس نے پوچھا۔

"یہ ٹیبل لیمپ ہے۔ کیوں؟ عرفان نے اچانک جارحانہ لہجے میں کہا۔ شمائلہ اس کے اس اچانک جارحانہ رویے سے سہم گئی۔

"کچھ نہیں۔ بڑی منفرد چیز ہے۔ مجھے اچھی لگی۔" اس نے گھبرا کر جواب دیا۔

"ہے ناں اچھی چیز؟" عرفان نے خوش ہوکر کہا۔ "یہ مجھے گفٹ میں ملا تھا۔ مجھے بھی یہ بہت پسند ہے۔" یہ کہہ کر اسے عجیب بے ڈھنگے انداز میں ہو ہو کرکے ہنسنا شروع کردیا۔ شمائلہ کے جسم میں بے اختیار ایک سرد لہر سی دوڑ گئی۔ عرفان کے انداز میں ایک عجیب

ہذیانی پن تھا۔ جیسے وہ کوئی ذہنی مریض ہو۔ شمائلہ کو اس سے خوف محسوس ہونے لگا۔ ایک آدھ منٹ ادھر ادھر کی بات کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچی تو ذکیہ بیگم نے اس کی طرف بے اختیار سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ شمائلہ نے ذکیہ بیگم سے نظریں چرالیں اور خاموشی سے جاکر صوفے پر بیٹھ گئی۔ ذکیہ بیگم سمجھ گئیں کہ وہ بھی ناکام رہی ہے۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس چلے گئے۔ ذکیہ بیگم کی رہی سہی آس بھی ڈوب گئی۔ گھر جاکر شمائلہ بہت دیر تک عرفان کے بارے میں سوچتی رہی۔ کچھ ہی مہینوں میں عرفان کی طبیعت میں اتنا بدلاؤ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ کافی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد اچانک اس کے ذہن میں فہیم کا نام آیا۔ فہیم اس کی بہن افشاں کا منگیتر تھا۔ اور کراچی یونیورسٹی میں نفسیات کا طالب علم تھا۔ وہ بظاہر سست اور کم گو انسان نظر آتا تھا لیکن اس کا مطالعہ اور معلومات انتہائی حیرت انگیز تھیں۔ جب کسی محفل میں وہ بولنا شروع کرتا تو بڑے بڑے تجربہ کار لوگ کان دبا کر ادھر ادھر ہوجاتے۔ شمائلہ نے فہیم سے عرفان کے بارے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے فون اٹھایا اور فہیم کا نمبر ڈائل کیا۔ سلام دعا کے بعد اس نے عرفان کی ساری کیفیت اور اس کی حالت تفصیل سے فہیم کو بتائی۔ ساری بات سننے کے بعد اس نے سکون سے کہا۔

"اسے اس کے کمرے سے نکالو اور ماحول تبدیل کرو۔ پھر مجھے بتانا کیا رہا۔" اتنا کہہ کر اس نے فون بند کردیا۔ شمائلہ فہیم کی اس عادت سے واقف تھی۔ اس نے برا منائے بغیر ریسیور واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ اسے بہرحال ایک لائحہ عمل مل گیا تھا۔ اگلے روز وہ تیار ہوکر پھر عرفان کے پاس جا پہنچی۔

"چلو اٹھو تیار ہوجاؤ۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ (ایٹریم میں نکولس کیج کی نئی تھری ڈی فلم لگی ہے) ایک سہیلی کے ساتھ جانا تھا مگر وہ بیمار پڑگئی۔" شمائلہ نے مسکراتے ہوئے عرفان سے کہا۔

"اچھا؟ نکولس کیج؟ کون سی فلم ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔ شمائلہ جانتی تھی کہ نکولس کیج عرفان کا پسندیدہ اداکار ہے اور عرفان اس کی فلمیں جنون کی حد تک شوق سے دیکھتا ہے۔

"بھئی فلم کا نام سرپرائز ہے۔ اب جلدی تیار ہوجاؤ۔" شمائلہ نے اکساتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی آیا۔" عرفان اچھل کر بستر سے کھڑا ہوگیا۔ پانچ منٹ بعد جب وہ باتھ روم سے باہر آیا تو اس کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

"میں نہیں جا پاؤں گا شمائلہ۔ میرے سر میں اچانک شدید درد شروع ہوگیا ہے۔" اس نے مردہ لہجے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو عرفان؟ ابھی تو تم چلنے کے لئے تیار تھے اور ابھی منع کررہے ہو۔" شمائلہ نے حیرت سے کہا۔ "کہہ تو دیا سر میں درد ہے۔ اب کیا الٹا لٹک کر یقین دلاؤں؟" عرفان نے اچانک گرج کر کہا۔ اس کا لب و لہجہ اچانک تبدیل ہوگیا تھا اور آنکھوں میں وحشت کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔ شمائلہ اس کا یہ انداز دیکھ کر خوفزدہ ہوگئی اور تیزی سے مڑ کر کمرے سے نکل گئی۔ واپس گھر پہنچ کر اس نے فہیم کو دوبارہ فون کرکے ساری صورتحال بتائی۔

"کسی حاسد نے اس پر عمل کیا ہوا ہے۔ کسی مولوی یا عامل کو دکھاؤ۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ تم بھی ان چیزوں پر یقین رکھتے ہو! شمائلہ نے تعجب سے پوچھا۔ لیکن دوسری طرف سے فون بند ہوچکا تھا۔ شمائلہ نے گہری سانس لے کر دوبارہ نمبر ڈائل کئے لیکن اس بار وہ ذکیہ بیگم کو فون کررہی تھی۔ ذکیہ بیگم کو فون کرکے اس نے ڈھکے چھپے لفظوں میں اندیشہ ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے کہ عرفان کسی عمل کے زیر اثر ہو۔ یہ سنتے ہی ذکیہ بیگم نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ "ہائے ہائے۔ کس نے جادو کرادیا میرے بچے پر۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔ اب میں کیا کروں؟" ذکیہ بیگم یہ سنتے ہی گھبرا گئیں۔

"پریشان نہ ہوں آنٹی۔ کسی اچھے روحانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بزرگ سے رجوع کریں۔ اگر عمل ہوا ہے تو اس کا توڑ بھی لازماً ہوگا۔ میں بھی کوشش کرتی ہوں۔'' شائکہ نے ذکیہ بیگم کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ ذکیہ بیگم کا تو یہ سن کر ہی دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ فون رکھتے ہی انہوں نے ملازموں اور جاننے والوں سے کہہ کر کسی عامل کی تلاش شروع کروادی۔ نتیجتاً کچھ روز بعد ایک لمبی سفید داڑھی اور گلے میں منکوں کی مالا ڈالے ایک بابا ان کے گھر بیٹھا تھا۔

''جی مما۔ کیوں بلایا مجھے؟'' عرفان نے ڈھیلے قدموں سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''بیٹا۔ یہ بابا جی تم سے ملنے آئے ہیں۔ ان کو سلام کرو۔'' ذکیہ بیگم نے عرفان سے کہا۔

''آ جا بچہ۔ تیرے سر پر مجھے شیطان کا سایہ منڈلاتا ہوا نظر آرہا ہے۔ آ یہاں بیٹھ ہمارے پاس۔''

بابا جی نے گرج دار آواز میں کہا۔ عرفان نے اکتائی ہوئی نظروں سے بابا جی کو دیکھا، پھر اچانک اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔

''کیوں اپنی موت کو دعوت دیتا ہے بڈھے۔ چلا جا نہیں تو تجھے کچا کھا جاؤں گا۔'' عرفان نے اچانک بدلی ہوئی کھردری آواز میں غراتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر ذکیہ بیگم بھی دنگ رہ گئیں۔

''مجھے دھمکی دیتا ہے ناہنجار! تجھے اس لڑکے کا جسم چھوڑنا ہوگا۔ نہیں تو میں تجھے قیامت تک کے لئے پاتال میں قید کردوں گا۔'' بابا جی نے للکار کر کہا۔ عرفان نے کوئی جواب دینے کے بجائے اپنی جگہ سے ایک لمبی زقند بھری اور بابا جی کے پاس پہنچ کر ایک ہاتھ سے ان کی داڑھی کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے ایک زور دار گھونسا بابا جی کے گال پر رسید کیا۔ بابا جی کی آنکھوں کے گرد تارے ناچنے لگے۔ عرفان نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس نے لات مار کر بابا جی کو گرایا اور ان کے سینے پر چڑھ کر دونوں ہاتھوں سے ان کا گلا دبانے لگا۔ بابا جی کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابلنے لگیں۔ ''اب بتا۔ یہاں سے جائے گا یا تیری گردن توڑ دوں۔'' عرفان نے غیر انسانی آواز میں غراتے ہوئے کہا۔

بابا جی کی آواز تو کیا نکلتی، انہوں نے اشارے سے ہاتھ جوڑے اور معافی مانگنی شروع کردی۔ عرفان نے مزید دو تین جھٹکے دینے کے بعد بابا جی کو چھوڑ دیا اور اطمینان سے ایک طرف صوفے پر بیٹھ گیا۔ بابا جی جیسے تیسے اٹھے اور دروازے کی طرف بھاگے۔ ان کے جاتے ہی عرفان نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔

''مما آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ کیسے کیسے ڈھونگی لوگوں کی باتوں میں آجاتی ہیں۔ دیکھا کیسا مزہ چکھایا۔ یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر کوئی آسیب وغیرہ ہے۔'' عرفان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اب اس کی حالت دوبارہ پہلے کی طرح ہوگئی تھی۔ ذکیہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ عرفان نے وہ سب کچھ کسی طاقت کے زیر اثر کیا یا پھر وہ محض ایکٹنگ تھی۔ لیکن بہرحال اس واقعے کے بعد انہوں نے پھر کسی عامل کو نہیں بلایا کہ مبادا کوئی بڑا نقصان نہ ہوجائے۔ البتہ انہوں نے شائکہ کو فون کرکے ساری تفصیل بتادی تھی۔ شائکہ نے یہ ساری تفصیل من وعن فہیم کو بتادی۔

''مسئلہ ٹیڑھا ہے۔ مجھے ایک بار خود ملنا پڑے گا۔'' اس بار فہیم نے ساری بات سننے کے بعد سنجیدہ لہجے میں کہا۔ دو روز بعد شائکہ فہیم کو لے کر عرفان کے گھر پہنچ گئی۔ فہیم نے شائکہ کو ساری بات سمجھادی تھی۔ دونوں عرفان کے کمرے میں پہنچے تو وہ حسب معمول اندھیرا کئے لیٹا تھا اور سی ڈی پلیئر پر کوئی انگریزی گانا سن رہا تھا۔ شائکہ کے ساتھ ایک اجنبی شخص کو آتے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شائکہ نے آگے بڑھ کر کمرے کی بتی روشن کردی۔

''تم تو ملنے آؤ گے نہیں۔ میں نے سوچا میں ہی ملتی چلوں۔'' شائکہ نے چہک کر کہا تو عرفان کوئی جواب دینے کے بجائے صرف پھیکے انداز میں مسکرادیا۔

''ان کی تعریف؟'' اس نے فہیم کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔

''ارے تم ان سے نہیں ملے؟ یہ افغان باجی کے منگیتر فہیم ہیں۔ دعوت میں تم ان سے ملے تو تھے۔'' شائکہ نے چونک کر کہا۔

''اچھا؟ آں! یاد نہیں رہا۔'' عرفان نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور پھر ہاتھ ملا کر فوراً ہی واپس کھینچ لیا۔ فہیم اس دوران گہری نظروں سے عرفان اور کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پانچ منٹ تک کپ شپ کرنے کے بعد شائکہ نے کہا۔

''اچھا عرفان! اب ہم چلتے ہیں۔ دراصل میں ان کے ساتھ سائرہ خالہ کے گھر جارہی تھی۔ سارے گھر والے وہیں ہیں۔ سوچا راستے میں تم سے ملتی چلوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عرفان سلام دعا کے بعد دوبارہ بستر پر نیم دراز ہوگیا۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی شائکہ نے فہیم سے کچھ پوچھنا چاہا لیکن فہیم نے اشارے سے اسے خاموش کرادیا۔ واپس گھر پہنچنے کے بعد اس نے صرف اتنا کہا۔

''کمرے میں ایک غلط چیز موجود ہے۔ عرفان کو اس کمرے سے باہر نکالنا ہوگا۔ اس کی غیر موجودگی میں ہی کچھ ہوسکتا ہے۔ اس کے گھر والوں کو بتادو اور ساتھ ہی یہ بھی بتادو کہ عرفان کی خیریت کے لئے انہیں کچھ مالی نقصان برداشت کرنا ہوگا۔'' اتنا کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھا اور روانہ ہوگیا۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک ہفتے کی بات ہے۔ ذکیہ بیگم ایک منصوبے کے تحت اسپتال میں داخل تھیں اور عرفان ان کی دیکھ بھال کے لئے وہیں موجود تھا۔ فہیم باقر صاحب کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ رنگ کا بیگ بھی موجود تھا۔ وہ سیدھا جا کر بستر پر بیٹھ گیا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ کافی دیر تک پڑھنے کے بعد اس نے بیگ سے ایک پانی کی بوتل نکالی اور اس میں سات بار پھونک ماری۔ اچانک سائیڈ ٹیبل پر رکھے پتھر پر لیپ کی آنکھیں خود بخود روشن ہوگئیں۔ فہیم نے مسکرا کر لیپ کی طرف دیکھا اور پھر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کردیا۔ اچانک پورا کمرہ لرزنے لگا۔ شیلف اور الماری پر رکھی چیزیں گرنے لگیں۔ اور کمرے میں عجیب پر ہول آوازیں ابھرنے لگیں۔ باقر صاحب کی حالت خوف سے غیر ہوگئی۔ فہیم نے بوتل کا ڈھکن کھولا اور چلو میں پانی لے کر اس لیپ کی روشن آنکھوں پر چھڑک دیا۔ پانی کے چھینٹے پڑتے ہی لیپ سے دھواں سا اٹھا اور اس کی آنکھیں تاریک ہوگئیں۔ اس کی آنکھیں بجھتے ہی فہیم نے جھپٹ کر لیپ اٹھایا اور اپنے بیگ میں ڈال کر زپ بند کردی۔ بیگ میں اس طرح ہلچل مچنے لگی جیسے اس میں کوئی جانور بند ہو۔ فہیم اٹھ کر کھڑا ہوا اور جیب سے ایک کپڑا اور لائٹر نکالا اور کپڑے کو آگ لگا کر بستر پر پھینک دیا۔ کپڑا بستر پر گرتے ہی بستر میں یوں آگ بھڑک اٹھی جیسے وہ پیٹرول میں بھیگا ہوا ہو۔ فہیم نے پھرتی سے باقر صاحب کا ہاتھ پکڑا اور کمرے سے باہر آگیا۔ کمرے سے باہر آکر اس نے باہر سے دروازے کی کنڈی لگائی اور باقر صاحب کو لے کر گھر سے باہر آگیا۔ بیگ میں ابھی تک ہلچل ہورہی تھی۔ عرفان کو جس نے یہ لیپ تحفے کے طور پر دیا اس نے سفلی عمل کے ذریعے عرفان کی زندگی برباد کرنا چاہی تھی۔ اس لیپ کو جلاتے ہی اس کے اثرات پھیلنا شروع ہوجاتے تھے۔ کمرے کی آگ کچھ دیر میں بجھ جائے گی البتہ تھوڑا نقصان ضرور ہوگا۔ عرفان کو یہی بتایا جائے کہ حادثے کی وجہ سے آگ لگی تھی۔ لیپ کا کوئی ذکر نہ کیجئے گا۔ اسے تباہ کردیا جائے گا اور عمل ناکام ہونے کی وجہ سے اس کا الٹا اثر کرانے والے پر پڑے گا۔ اس بوتل کا پانی وقفے وقفے سے عرفان کو پلاتے رہیں۔ آہستہ آہستہ عمل کے اثرات ختم ہوجائیں گے۔'' اتنا کہہ کر فہیم نے پانی کی بوتل باقر صاحب کی طرف بڑھائی اور بیگ کندھے پر ڈال کر باہر کی طرف بڑھ گیا۔ باقر صاحب حیرانی اور احسان مندی کے ملے جلے جذبات سے اس عظیم انسان کو جاتا دیکھتے رہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہر وحشت

ایم اے راحت

آخری قسط

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا، پرھول ماحول، ویران اجاڑ علاقہ اور وحشت و دھشت طاری کرتا وقت، جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتا لرزیدہ لرزیدہ سناٹا، نادیدہ قوتوں کی عشوہ طرازیاں، نیکی بدی کا ٹکراؤ، کالی طاقتوں کی خونی لرزہ بر اندام کرتی لن ترانیاں اور ماورائی مخلوق کی دیدہ دلیری جسے ہڑھ کر پورے وجود پر کپکپی طاری ہوجائے گی، برسوں ذھن سے محو نہ ہونے والی اپنی مثال آپ کھانی۔

دل و دماغ کو بہبوت کرتی خوف و حیرت کے سمندر میں غوطہ زن خیر و شر کی انوکھی کہانی

بوڑھا آھورہ ان کی توقع سے کہیں زیادہ خطرناک اور چالاک شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اپنے مہرے بڑی ہوشیاری سے استعمال کرنا جانتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ پاتال نگری کی کہانیاں دنیا کی کہانیوں سے بہت مختلف تھیں۔ راجہ پرمیت سنگھ اپنے گروپ دھان سنگھ کے ساتھ بڑے اطمینان سے پرتیاریاں کر کے پاتال نگری تک پہنچا تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد گرو مہاراج اور چیلے کی سختی گم ہوگئی تھی۔ آہورہ ان کی شخصیت پر بھاری تھا۔

اب تک..... جو کچھ ہوتا رہا تھا۔ وہ ایک خواب کی مانند تھا۔ اور ان سب ہی کے دلوں میں نجانے کیسے کیسے تاثرات تھے۔ اس طرح نعمت علی اپنی زندگی کے اہم ترین وقت سے گزر رہا تھا۔

اور ادھر راجہ پرمیت سنگھ کرناوتی اور دوسرے لوگ زندگی کی مشکلات کا شکار تھے۔ اس وقت راجہ پرمیت سنگھ اپنی بہن سے کافی بددل ہوگیا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ”تم نے بہت برا عمل کیا ہے کرناوتی۔! تم نہیں جانتیں کہ وہ شخص ہمارے لئے کتنا قیمتی تھا۔ وہ سارے کام بخوبی کرسکتا تھا۔“

”ہاں یہ حقیقت ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ وحشت ناک جگہ جسے پاتال نگری کا نام دیا گیا ہے۔ کیسی عجیب دنیا ہے کہ مہذب دنیا میں رہنے والوں نے کبھی خواب میں بھی اس کے بارے میں نہیں سوچا ہوگا۔ کوئی بھی اگر اس کہانی کے بارے میں سنے گا تو یقین نہیں کرے گا۔ اور یہ ہی کہا جائے گا کہ یہ ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ لیکن وہ لوگ حقیقت جانتے تھے۔ آخر کار ایک شخص ان کے پاس پہنچا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

”میرا نام ہنگارا ہے۔ اور میں یہاں کا سردار ہوں۔ ہمارے مقدس پیشوا آہورہ نے کچھ ذمہ داریاں میرے سپرد کی ہیں۔ جنہیں میں سرانجام دے رہا ہوں۔ آہورہ کی گہری نگاہوں نے یہ جائزہ لے لیا ہے کہ یہ لڑکی جس کا تمہاری دنیا میں نام کرناوتی ہے۔ آہورہ کی تحویل میں آرہی ہے۔ وہ اسے دیوی اڈینا کی حیثیت دینا چاہتا ہے۔ دیوی اڈینا اور ہابون ہماری ایک قدیم رسم کے مطابق پاتال نگری کے قدیم دیوی اور دیوتا ہیں۔ ایک شخص کو تم میں شامل کیا جائے گا۔ جو بڑی حیثیت کا حامل ہے۔

لیکن وہ جو ہمارا پیشوائے اعظم اور آہورہ کا خاص آدمی ہوگا۔ وہ تمہارا ہی آدمی ہے۔ اس کا اصل نام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نعمت علی ہے۔ اور وہ وکرم راج کی حیثیت سے تمہارے ساتھ تھا۔" سارے کے سارے یہ نام سن کر اچھل پڑے تھے۔ راجہ پرمیت سنگھ نے بے صبری سے پوچھا۔

"تمہارا نام ہنگارا ہے ناں؟"

"ہاں۔"

"تو عظیم ہنگارا بتاؤ کہ کیا نعمت علی نام کے شخص کو یا وکرم راج نام کے شخص کو تم جانتے ہو؟"

"ہاں......وہ ہمارے پاس ہے اور بہت جلد تم میں شامل ہو جائے گا۔ لیکن خبردار کبھی اس سے کوئی بات نہ کرنا۔"

ادھر یہ ساری باتیں ہو رہی تھیں اور ادھر جہاں نعمت علی موجود تھا۔ وہاں بڑے عجیب وغریب حالات پیش آ رہے تھے۔ نعمت علی اس وقت ایک خوبصورت سی کھلی جگہ میں موجود تھا۔ اور پاتال نگری کے راز اس پر منکشف ہوتے جا رہے تھے کہ اچانک ہی ایک فاختہ اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ پھر اس نے انسانی آواز میں کہا۔

"میں پورن وتی ہوں۔ یہ لوگ اپنا کام کر رہے ہیں اور میں اپنا کام کروں گی۔ وہ لوگ کرناوتی کو اپنی دیوی اڈینا کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔

اور میں کرناوتی کے بدن پر قبضہ جما رہی ہوں۔ اب وکرم راج، میں پھر تمہارا اصل نام کیوں نہ لوں۔ نعمت علی۔ تم لوگوں کو ایک انوکھا کھیل کھیلنا ہوگا۔ ہابون نامی جو شخص تمہارے پاس پہنچے گا وہ تمہارے عقیدت مندوں میں سے ہوگا اور تم یوں محسوس کرو گے جیسے وہ صدیوں سے تمہارا غلام ہے۔

اور تمہاری بات ماننے والا بے شک وہ یہاں کا انسان ہوگا اور پوری طرح میرے قبضے میں ہوگا اور تم سے ذرا بھی اجنبیت کا اظہار نہیں کرے گا۔

یہ ہی کام تمہیں بھی کرنا ہے۔ ابھی آہورہ تمہیں ان کے ساتھ شامل کر دے گا۔ اور کرناوتی میرے قبضے میں ہوگی۔ یعنی یہ ہی سمجھ لو کہ کرناوتی کی حیثیت سے میں خود ہوں گی۔ وہ لوگ تمہیں اور مجھے دیوی اڈینا کی حیثیت سے پیش کریں گے۔

اور ہابون جو یہاں کا ایک قدیم دیوتا تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن جو ایک انسانی شکل میں ہے اور آہورہ کی سازشوں کے ساتھ پرورش پا رہا ہے۔ اب تمہارا ساتھی ہوگا۔" اور یہ ہی ہوا۔

ہابون نامی شخص نعمت علی کے پاس پہنچ گیا۔ بلاشبہ یہ ایک عجیب وغریب شخصیت کا مالک تھا۔ لیکن اس نے نعمت علی کے سامنے سر خم کرتے ہوئے کہا۔

"میں تیرے قدموں میں تیرے غلام کی حیثیت سے ہوں۔ مقدس دیوتا!" نعمت علی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن اس نے خاموشی اختیار کی۔

ادھر سردار نے نعمت علی کو ساتھ لیا اور ان لوگوں کے درمیان پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے کرناوتی اور نعمت علی کے سامنے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"بڑے دیوتا تم ہو؟ اور ہابون وہ جوان دیوتاؤں کو اپنے قبضے میں رکھے گا۔ بہت ساری کہانیاں تمہیں سنانی ہیں اور بہت ساری تم سنو گے۔ لیکن مقدس اڈینا اور مقدس دیوتا۔ میں تیرا غلام تجھ پر اپنی اطاعت ظاہر کرنے آیا ہوں۔ اور کبھی ایسا نہ ہوگا کہ میرا سر تیرے سامنے اٹھے اور میں ہمیشہ تیرے قدموں میں سر جھکائے رہوں گا۔ اور تو حکم دے گا تو میں اپنے سر پر سرداری کا تاج رکھوں گا۔ ورنہ جب بھی تیرا حکم ہوگا۔ میں اسے اتار کر کسی اور کے حوالے کر دوں گا۔

مقدس دیوی! اور دیوتا میں یہ ہی عرض کرنے کے لئے تیری خدمت میں حاضر ہوا تھا کہ اگر کوئی کسی وقت کوئی ایسی بات تیرے کانوں تک پہنچائے۔ جو میرے خلاف ہو۔ تو......تو میری اس اطاعت کو ذہن میں رکھنا۔ اور میرے لئے کوئی ایسا حکم نہ دینا جو میری زندگی کا چراغ گل کر دے۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی کو بہت کم دیکھا ہے۔

بس یہ ہی کہنے کیلئے میں حاضر ہوا تھا۔ اور اس کے بعد وہ چلے گئے۔ لیکن نہ تو نعمت علی اور نہ ہی کرناوتی اس کے الفاظ کو سمجھ سکے تھے۔ بلکہ پورن وتی نے نعمت علی کے کان میں کہا تھا۔

"میں واقعی خود بھی حیران ہوں۔ لیکن کوئی بات نہیں ہم جتنے لوگ یہاں موجود ہیں۔ وہ سب کے سب ان حالات سے ناواقف ہیں۔ بہر حال میرا مقصد پاتال سنگھاسن تک پہنچنا ہے۔ راجہ پرمیت سنگھ بھی یہ ہی چاہتا ہے۔"

نعمت علی نے حیرت سے کہا۔ "کرناوتی۔ تم واقعی اس وقت اپنے بھائی کی بہن نہیں ہو۔"

"نہیں۔"

"پھر......پھر......تم......؟"

"میں......اس وقت صرف اور صرف پورن وتی ہوں۔" کرناوتی نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اور نعمت علی متحیرانہ انداز میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔

اور اس کے بعد پراسرار واقعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ انتظار کرتے رہے، پھر کچھ اور وقت گزرا، سردار ہنگارا کے الفاظ نے انہیں حیران کر دیا تھا لیکن پھر بات آہستہ آہستہ انکی سمجھ میں آ گئی اور اس وقت انہیں احساس ہوا کہ واقعہ کیا ہے، ہوا یوں کہ جس جگہ وہ فروکش تھے، یہ ایک بڑا سا کمرا تھا کمرا کیا زمانہ قدیم میں کوئی غار تھا جسے انسانی ہاتھوں کی تراش نے سپاٹ اور سیدھی دیواروں کی شکل میں چکنا کیا تھا اور اسے خوبصورت ترین بنا دیا تھا، اور اس میں نہایت قیمتی اشیاء سجاوٹ کیلئے رکھی تھیں اور کہیں سے بھی کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا یعنی وہ جگہ جہاں خاص قسم کے جنگلی پودوں کی بیلوں سے سجانے کی کوشش کی گئی تھی اور جو عجیب وغریب معلوم ہوتی تھی جب یہ لوگ آپس میں بیٹھے مشورے میں مصروف تھے اور سردار ہنگارا جا چکا تھا اور بہت وقت ہو گیا تھا اسے گئے ہوئے تو اچانک، انہوں نے کچھ سرسراہٹیں محسوس کیں اور حیران ہو کر اس دیوار کی جانب دیکھنے لگے جہاں کچھ سرسراہٹیں نمودار ہوئیں تھیں۔ اور ان سرسراہٹوں کے نمودار ہونے کے بعد وہاں ایک دیوار شق ہو گئی اور اس میں ایک گول دروازہ پیدا ہو گیا جیسے کوئی چیز اس کی جگہ سے ہٹا دی گئی ہو غالباً یہ کوئی خاص طریقے سے بنائی گئی دیوار تھی اور جس میں جو چٹان پتھر کی تھی اور جس کے رخنے ان جنگل بیلوں میں چھپے ہوئے تھے اپنی جگہ سے گھوم گئی تھی اور درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی تھی گویا اسے گھمانے کیلئے پتھر میں سوراخ کر کے اس طرح سے اس چٹان کو پھنسایا گیا تھا کہ اگر کوئی دوسری جانب سے بھی اسے گھمائے تو گھوم سکتی ہے ورنہ نئے آنے والے اجنبیوں کو تو پتا بھی نہیں چل سکتا تھا کہ اس کے پیچھے بھی کوئی دیوار ہے اور یہ لوگ حیران ہو کر اس طرف دیکھنے لگے جو سوراخ پیدا ہوا تھا وہ تاریک تھا اور اس سے کوئی روشنی نہیں آ رہی تھی وہ حیران نگاہوں سے ادھر دیکھتے رہے پھر لحہ لحہ سوراخ آہستہ آہستہ روشن ہونے لگا اور تھوڑی دیر بعد یوں محسوس ہوا جیسے ایک روشنی متحرک ہے اور کوئی آ رہا ہے پھر انہوں نے حیرانی سے دو مشعلیں دیکھیں جو انسانی ہاتھوں میں تھیں۔ اور ان مشعلوں کو جو اٹھائے ہوئے تھے وہ یہاں کے مقامی باشندے تھے۔ اور ان کے چہروں پر ایک خوف سا چھایا ہوا تھا اور انکی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ مشعل لئے آ رہے تھے۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور یہ لوگ ساکت نگاہوں سے انہیں دیکھ رہے تھے کہ یہ ایک حیرت ناک واقعہ تھا اور دیکھنا یہ تھا کہ ان مشعل برادروں کو جو اس جگہ سے نمودار ہوئے تھے ان سے کیا کام ہے یا وہ کس مقصد کے تحت آئے ہیں تب وہ دونوں سمت کے دروازے سے نکل کر اس کے کنارے پر کھڑے ہو گئے اور پھر کوئی اور نظر آیا جو آہستہ آہستہ ادھر آ رہا تھا جگہ اتنی بڑی تھی کہ ایک آدمی باآسانی وہاں سے گزر سکے۔ تو جو شخص وہاں سے گذر کر اندر آیا اسے دیکھ کر ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں وہ بڑا اپجاری اور دیوتاؤں کا چہیتا آہورہ تھا جو بہت ضعیف اور بوڑھا تھا لیکن اس وقت جب وہ انسانوں کے شانوں پر سوار ہو کر وہاں پہنچا تھا۔ اور اس نے ان کی تصدیق کی تھی نجانے کیوں اس وقت بھی نعمت علی کو محسوس ہوا کہ بوڑھے شخص کی آنکھوں میں شدید مکاری چھپی ہوئی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور وہ ذرا مختلف قسم کا آدمی نظر آتا تھا لیکن وہ ان کا محسن بھی تھا کہ اس نے ان کے دیوی دیوتا ہونے کی تصدیق کی تھی بات اگر وہیں سے خراب ہو جاتی تو صورت حال مشکل ہو جاتی کیونکہ اس وقت بہت تھوڑے افراد تھے جوان کے عقیدت مند اس وقت تک نہیں تھے جب تک کہ بوڑھے نے ان کی تصدیق نہیں کر دی تھی اور اس وقت بھی بوڑھا آہورہ اپنے قدموں سے چل کر آ رہا تھا اور اس قدر لاغر نہیں نظر آیا تھا جتنا اس وقت نظر آ رہا تھا، اور جب وہ انکے درمیان پہنچا تو وہ دونوں مشعل بردار کھڑے ہوئے تھے واپس اس سوراخ سے اندر داخل ہوئے اور چٹان ایک بار پھر اپنی جگہ سے گھوم کر ہموار ہوگئی اور تعجب کی بات یہ تھی کہ اس عجیب وغریب جگہ یعنی مہذب انسانوں کی اس بستی میں ایسی کوئی جگہ بھی بنائی گئی تھی جسے بڑی شان کے ساتھ یہ کہا جاسکتا کہ وہ جدید ترین تھا اور ایسی جگہ کا تصور نہیں کیا جاسکتا آہورہ نیچے اترا اور آہستہ سے چلتا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے کر کے اپنی گردن خم کی اور خاصا نیچے تک جھکتا چلا گیا اس کے بعد سیدھا ہو گیا اور اس نے کہا۔

"یہ وہ وقت ہے کہ اب یہاں میرے سوا کوئی نہیں آئے گا اور میں جانتا ہوں کہ ایسا ہی ہوگا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم لوگ میرے آنے سے حیران ہو لیکن بہتر ہے کہ مجھے بیٹھنے کی پیشکش کرو، میں تمہارے سامنے اونچی جگہ نہیں بیٹھ سکتا بلکہ نیچے زمین پر بیٹھ کر تمہاری تعظیم کرنا چاہتا ہوں۔"

پھر وہ خود ہی ایک جگہ منتخب کر کے بیٹھ گیا ان سب پر سکتہ طاری تھا۔ آہورہ کا اس طرح آ جانا ان کے لئے تعجب کی بات تھی لیکن بہر حال وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے تب آہورہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی اور اس نے کہا۔

"تم۔ اس نے انگلی اٹھا کر کناوتی کی طرف اشارہ کیا تھا سب سے پہلے تم سے مخاطب ہوں اور تم اگر یہ کہتی ہو کہ تم اڈیا ہو تو بتاؤ کہ پاتال نگری میں کیا ہے۔"

نعمت علی کو ایک لمحے کے اندر یہ احساس ہو گیا ہو گیا تھا کہ بوڑھا بیچارہ آہورہ شیطانی قوتوں کا مالک ہے اور اس کے دل میں ایسی کوئی بات ہے جو بڑی پر اسرار حیثیت رکھتی ہے تو کناوتی نے خاموش نگاہوں سے آہورہ کو دیکھا اور پھر جو کچھ اس نے کہا وہ نعمت علی کے لئے حیران کن بھی تھا اور تسلی بخش بھی، اس نے کہا۔

"دیوتا کے پجاری آذن کے قدموں کی خاک، مجھ سے سوال کرنے سے پہلے کیا تو نے مقدس دیوتا یعنی آذن سے اس بارے میں پوچھا کہ مجھ سے کوئی سوال کرے....؟"

تو اس کے الفاظ پر آہورہ مسکرایا اور پھر اسکی نگاہیں ہابون کی طرف اٹھ گئیں۔

"اور مقدس دیوتا تو کیا یہی بات تو بتا سکتا ہے.....؟"

"اور میں جو کچھ بتا سکتا ہوں اس کے لئے آسانوں سے حکم ہے کہ اپنے سینے میں رکھوں اور سوال کا جواب اسی وقت دیا جاتا ہے جب روشن اجالوں سے اس کا حکم ہو۔"

"اور اے شخص تو جو سفید چمڑی والا ہے کیا تو یہ بتا سکتا ہے، اور اے عورت تو اور اے کالی شکل والے تو بتا کہ پاتال نگری میں کیا ہے؟"

"جو بات مقدس دیوتا اپنی زبان سے ادا نہ کرنا چاہے اس کا جواب ہم اس کے خادم اور معمولی لوگ بھلا کیسے دیں گے۔؟"

نعمت علی نے ترش لہجے میں کہا اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ آہورہ کو دیکھ کر خاص طور سے پرد ھان سنگھ کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے اور وہ پتھر اسا گیا ہے اور نہ اسکے بدن میں جنبش ہے نہ وہ ہل جل رہا ہے مگر یہ صورت حال خاصی خطرناک تھی اور مقدس پجاری کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اس نے گردن خم کر کے کہا۔

"دیوی اڈیا مقدس آذن اور اے لوگو، تم جو سب ساتھ آئے ہو میں یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ تم

عزت والے ہو لیکن ذرا یہ سوچو اس وقت اس جگہ جب تم پہلی بار یہاں داخل ہوئے تھے ہم تمہارے بارے میں یہ یقین نہ رکھتے تھے کہ تم آگے ہو اور جب مجھے میرے مسکن سے بلایا گیا تو میں حیران ہوا لیکن وہاں پہنچا اور پھر میں نے تمہاری زندگیاں اس سے بچالیں کیوں جانتے ہو کیوں؟"

جو کچھ تو کہنا چاہتا ہے آہورہ صاف اور واضح الفاظ میں کہہ اور تیرا انداز گفتگو کچھ گستاخانہ ہے۔"

ہابون نے کہا۔

"نہیں مقدس دیوی اور مقدس دیوتا! ایسی بات نہیں ہے میں تمہارا احترام کرتا ہوں اور ہمیشہ ہی تمہارا احترام کرتا رہوں گا لیکن سنو، جو آسمانوں سے اترتے ہیں اور پاتال نگری میں پہنچتے ہیں وہ اپنے ساتھ معلومات کے بہت سے خزانے لاتے ہیں اور جو خزانے میری عمر نے میرے پاس جمع کر دیئے ہیں تم ان سے واقف نہیں اور نہ ہی ان سے واقف ہونا کوئی آسان کام ہے لیکن میں جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنی دنیا سے آئے ہو اور اے شخص، نہ تو آذن ہے اور عورت، نہ تو اڈیا، آذن اور اڈیا جو بھی ہیں میں انہیں کسی بھی وقت پاتال نگری والوں کے حوالے کر سکتا ہوں لیکن یہ کہانیاں یہ واقعات تو تاریخ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہیں اور وقت جانتا ہے کہ دیوی اور دیوتا کون تھے اور کہاں ہیں اور میں وقت کا ساتھی ہوں سنو، میں تمہیں جو کچھ کہہ رہا ہوں غور سے سنو اور خبردار میرے مدمقابل آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ وہ تمہارے لئے نقصان دہ ثابت ہوگی اور اس وقت بھی میں جانتا تھا کہ نہ یہ شخص آذن ہے اور نہ یہ اڈیا اور نہ یہ سب جو تم دونوں کے ساتھ ہیں وہ ہیں جو پاتال نگری والے سمجھتے ہیں لیکن میں نے تصدیق کی اور دیوی دیوتا بنا ڈالے تمہیں ان لوگوں کے سامنے گویا یہ میرا عمل تھا اگر تم جادو کی قوت رکھتے ہو تو اسی لمحے مجھے فنا کر دو کیونکہ تمہارے پاس آسمانوں کی طاقت ہے اور میں جانتا ہوں تم ایسا نہیں کر سکو گے کیونکہ تم وہ ہو ہی نہیں جو کوئی بھی نہیں ہے۔"

"تو جو کچھ کہہ رہا ہے وہ نا قابل یقین ہے لیکن

"مطلب.....؟" نعمت علی نے سوال کیا۔

"تمہارے سامنے یہ کہنے میں مجھے کوئی عار نہیں ہے کہ ہزاروں سال سے میں اور میرے خاندان کے وہ لوگ جواب اس دنیا سے چلے گئے آذن اور اڈیا کا کھیل رچائے ہوئے ہیں اور اسی میں ہماری بقاء ہے اور یہی ہماری حکومت کا راز اور جب کوئی ہم سے ٹکرانے کی کوشش کرتا ہے تو ہم اسے خاک کر دیتے ہیں اور پھر انتظار کرتے ہیں کہ دیوی دیوتا کا طلسم، اور صدیوں سے وہ کہانیاں سنتے آئے ہیں جن سے وہ بھی مخرف نہیں ہوں گے لیکن اگر انہیں یہ پتا چل جائے کہ تم لوگوں میں نہ کوئی دیوی ہے نہ دیوتا تو پھر ان کا غبرو غضب دیکھنے کے قابل ہوگا اور تم لوگ اس بات کو تسلیم کرو کہ حقیقت وہی ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ یعنی کہ کچھ بھی نہیں اور وہ کچھ نہ ہونا بہت کچھ ہو سکتا ہے بشرطیکہ میں چاہوں....."

"گویا تم ہم سے کوئی ایسی بات منوانا چاہتے ہو جو تمہارے خیال میں نہ ماننے کے قابل ہو۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ بات تو یہ ہے کہ جب بھی دیوی اور دیوتا ظہور میں آتے ہیں تو ان کا سب سے بڑا عقیدت مند آہورہ ہوتا ہے۔ لیکن ہوتا یوں ہے کہ وہ بھی آہورہ کی عزت کرتے ہیں اس کی قدر کرتے ہیں اور وہی کرتے ہیں جو آہورہ کی خواہش کے مطابق ہو اور اس سے زیادہ تو میں کچھ چاہتا بھی نہیں اور وہ بھی نہیں جو تمہارے لئے نا قابل عمل ہو۔"

"آہورہ تو جو کچھ کہہ رہا ہے جانتا ہے، اگر ہم پاتال نگری والے کے سامنے وہ دہرا دیں تو تیرے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" جواب میں آہورہ ہنسنے لگا اور کہنے لگا۔

"لیکن حالات، ماحول اور وقت کے متعلق، میں تم سے بھی سوالات کر سکتا ہوں اور ایسی باتیں پوچھ سکتا ہوں تم سے، جن کا تم جواب نہ دے پاؤ، اسی کو میں بنیاد بنا سکتا ہوں۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر بھی وہ کہہ جو تیری خواہش ہے اور جو کچھ تو اہے۔"

"میری خواہش اور میری چاہت، تو سنو! میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ دیوتا آذن ہے، اور تو دیوی اڈینا۔ لیکن آہورہ کے تعاون کیساتھ، اور یہ تعاون جب بھی ختم ہوا تو یوں سمجھ لے کہ صورت حال خراب ہو جائے گی مجھ سے منحرف نہ ہونا اور وہ نہ کرنا جو میں نہیں چاہتا میرا خیال ہے اتنا کہنا میرے لئے کافی ہے میں تم سے کسی بات کا انکار یا اقرار نہیں لیتا لیکن ابھی میں تمہارا دوست ہوں اور جو کچھ تمہیں سمجھانے آیا ہوں اسے ہی سمجھنے کی کوشش کرنا تمہارے حق میں بھی بہتر ہوگا اور میرے حق میں بھی۔" پھر وہ اپنی جگہ سے خود بخود اٹھ گیا اور آہستہ سے چلتا ہوا دیوار کے پاس پہنچا۔ اور جیسے ہی وہ دیوار کے قریب پہنچا وہ چٹان پھر اپنی جگہ سے ہلی اور اس میں دروازہ نمودار ہوگیا تب وہ اس دروازے سے اندر داخل ہوگیا اور چٹان اپنی جگہ برابر ہوگئی اور یہ سب سحر زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتے رہ گئے اور یہ سحر نا جانے کب تک ان پر طاری رہا اور وقت گذرتا چلا گیا، بہت دیر کے بعد پردھان سنگھ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوہ! سارا تصور ہی بدل گیا، سارا خیال ہی بدل گیا اور جو علم ہمیں حاصل ہوا شاید یہاں موجود کسی ایک انسان کو بھی حاصل نہ ہو اور میں خوفزدہ تھا کہ یہ شیطان بوڑھا جسے اب میں شیطان کہنے سے گریز نہیں کرتا، لیکن اب سے کچھ وقت پہلے اگر کوئی میری گردن بھی کاٹ دیتا تو میں یہ لفظ اس کے لئے اپنے منہ سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہتا کیونکہ بچپن سے میں نے اس کے تقدس کی عبادت کی ہے اور اسے بڑا مانا ہے اور اس وقت بھی تم لوگ یقین کرو پرمیت سنگھ اور تم عظیم آقا اور تو آقا زادی، اے کالے شخص، جو اس وقت ہمارا دیوتا بنا ہوا ہے کہ جب یہ شخص تصدیق کرنے آیا تھا اس وقت ہی میرا وجود پتھر بن گیا تھا چونکہ یہ ہی تو وہ تھا جو مجھے دیوتا کے قدموں میں قربان کرنا چاہتا تھا اور میں تو اسے پہچانتا ہوں لیکن اس وقت میں بچی تھی اور اب میں سوچتا ہوں شاید اس عمر میں آنے کے بعد یہ مجھے پہچان نہیں سکے گا اور اس خوف کا اس وقت مجھے احساس تھا کہ کہیں وہ میری شناخت نہ کرلے لیکن اگر وہ قوت والا ہوتا تب ایسا ہوتا اب میرا دل بہت مطمئن ہوگیا ہے کہ جو کچھ میں سوچتی رہی ہوں وہ غلط ہے۔"

"ٹھیک ہے وہ تجھے نہیں پہچان سکا لیکن وہ جو کچھ کہہ گیا ہے اس کے بارے میں تم لوگ کیا کہتے ہو؟"

"اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہو...... جو کچھ اس نے کہا وہ سچ ہے......" ہابون نے کہا۔

"ہاں۔"

"اور کیا یہ بات ہمارے لئے پریشان کن نہیں ہے کہ یہاں ایک ایسا صاحب اقتدار شخص موجود ہے جو ہمارے بارے میں جانتا ہے۔" کرناوتی نے کہا۔

"لیکن ہم اس بات کا اقرار نہیں کرتے کرناوتی، اور اگر ہم نے اس بات کا اقرار کرلیا تو اس کا مقصد ہے کہ ہم اس کی مٹھی میں چلے جائیں گے۔"

"تو پھر۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ حالات کا تھوڑا سا جائزہ لو یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرو کہ وہ کیا چاہتا ہے وہ جو ہمارے لئے ممکن ہو تو میرے خیال میں ہمیں اس کی بات مان لینی چاہئے۔"

"کیا اس طرح کہ ہم اس کی برتری قبول کرلیں؟" کرناوتی نے سوال کیا۔

"نہیں پہلے عملی کوشش کرتے ہیں وہ جو، اپنی زبان سے ادا کرے وہ پاتال نگری والوں کے سامنے آجائے اور آہورہ کی طرف سے اختلاف نہ ہو اور اس کے بعد جب ہمیں یہاں اقتدار حاصل ہوجائے گا تو ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں گے کہ آہورہ ہمارا دشمن ہوسکتا ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔"

"مگر...... ہم اس سے تعاون کر بھی لیں تو کیا حرج ہے؟" ہابون نے کہا "دیکھنا تو یہی ہوگا کہ وہ کیا تعاون چاہتا ہے ہم سے۔" اور پھر اس کے بعد سب

گہری سوچ میں ڈوب گئے تھے یہ بڑا مشکل مرحلہ آگیا تھا اور حیرانی کی بات تھی کہ ایسے عقلمند ہر جگہ ہوتے ہیں جو اقتدار کو قبضے میں رکھنے کیلئے نجانے کیا کیا سوانگ رچا لیتے ہیں لیکن بہر حال یہ فکر کے لمحات تھے۔ اور وہ ان پر غور کررہے تھے۔ ہابون بھی بے وقوف نہیں تھا۔ بیشتر مواقع پر اس نے ناقابل یقین ذہانت کا ثبوت دیا تھا لیکن یہ مرحلہ ایسا آگیا تھا کہ وہ بھی کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔ پھر وہ الجھ کر بولا۔

"مجھے اجازت دو...... میں اسے ختم کردوں۔ اگر وہ ہماری کامیابی میں رکاوٹ بن رہا ہے تو اس کی زندگی خطرناک ہے۔"

نعمت علی مسکرایا۔ پھر اس نے کہا۔ "نہیں ہابون بے شک تم زندگی کی بازی لگا کر ایسا کرسکتے ہو کیا ہم ایسا نہیں کریں گے۔ وہ جو موت کے ہم آغوش ہوگیا۔ ہمارے لئے اتنا ہی قیمتی تھا جتنا دوسرے۔ میں سب کے ساتھ واپس جاؤں گا۔ یہ میرا عہد ہے۔"

نعمت علی ایک عجیب سی وحشت کا شکار تھا یہ ماحول اس کے سر میں ہتھوڑے کی طرح دھنک رہا تھا وہ باہر نکلا اور قرب و جوار کے ماحول کا جائزہ لینے لگا تھوڑے فاصلے پر اس عبادت گاہ کا بڑا دروازہ تھا دروازے کے دونوں طرف عظیم الشان اور مضبوط دیواریں کوئی پچاس فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی تھیں اور ان لوگوں کی زبردست کارکردگی دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ کسی بہت بڑے مذہبی رسم یا جشن کی تیاریاں زوروشور سے ہورہی ہیں لوگوں کے گروہ کے گروہ چاروں طرف مصروف عمل نظر آرہے تھے اس میں وہ پجاری بھی شامل تھے جو لمبے لمبے چوغوں والے تھے وہ ادھر سے ادھر آجارہے تھے اور انتظامی امور والے لوگ بھی، جن کے ہاتھوں میں چوڑے بھالے اور پیشانی پر سیاہ رنگ کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور یہ انہیں انتظامی امور کے ذمہ دار قرار دیتی تھیں۔ دروازے کے دوسری طرف بھی پہرہ تھا۔ وہ اس وقت سامنے کھڑا دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ سورج غروب ہورہا تھا۔ پھر دروازے کا پردہ ہٹا اور پجاریوں کا ایک گروہ کمرے میں داخل ہوا یہ تقریباً بارہ یا تیرہ افراد تھے اور ہر پجاری کے ہاتھ میں ایک لمبی سی موم بتی تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان سب کے پیچھے آہورہ بھی تھا اور اس وقت وہ تندرست و توانا آدمی لگ رہا تھا حالانکہ اس کا بدن بہت دبلا پتلا تھا۔ اور لمبی داڑھی اور بکھرے ہوئے بالوں کی وجہ سے وہ آسیب کی مانند لگ رہا تھا۔ بہرحال وہ لوگ اندر آئے اور سجدے میں گر گئے۔ پھر دیر تک وہ اس طرح خاموش پڑے رہے جیسے پتھر کے بت ہوں یہی کیفیت خود آہورہ کی تھی۔ نعمت علی دیکھ رہا تھا کہ آہورہ کتنا بڑا اداکار ہے اور کیا ہی عمدہ اداکاری کرنا جانتا ہے جبکہ نجانے کون کون سے راز اس کے دل کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھے، آخر کار ان میں سے ایک نے کہا۔

"کیا آپ تیار ہیں عظیم دیوتا، ہم آپ کو بڑی عبادت گاہ میں لے جانے کیلئے تیار ہوئے ہیں۔ اور اس وقت پاتال نگری والے اپنے دیوتاؤں کے درشن کیلئے بے چین ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی پرجلال صورتیں دیکھیں......

"ٹھیک ہے آہورہ ہم تیار ہیں......" کرناوتی نے جواب دیا۔ "تو پھر یہ لباس پہن لیجئے یہ عارضی لباس ہیں جو آپ کو دوسروں کی نگاہوں سے چھپا لیں گے کیونکہ آپ کی مقدس صورتیں اس وقت تک کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ جب تک کہ زیارت کا وقت نہ ہوجائے پھر لمبے لمبے چوغے انہیں دے دیئے گئے اور صرف ہابون اور کرناوتی کے لئے یہ چوغے لائے گئے تھے اور بڑے احترام سے ایک شخص اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر کی بنی ہوئی ایک تھالی میں رکھ کر لایا تھا۔ اور آہورہ نے یہ لباس جس میں تسموں کے بجائے سینگ کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے اور لمبے لبادے کو بکری کے بالوں سے بنایا گیا تھا اس میں بڑی بڑی آستینیں لگی ہوئی تھیں جو اتنی بڑی تھیں کہ پہننے والے کے ہاتھ بھی ان میں چھپ جائیں اور اس کے اوپری سرے پر ایک گول نوکدار ٹوپی سی نقاب لٹک رہی تھی جس میں تین

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سوراخ تھے دو آنکھوں کیلئے، اور ایک سانس لینے کیلئے۔ کرناوتی اور ہابون نے لباس اپنے جسموں پر پہنا اور وہ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی پراسرار بلائیں ہوں پھر انہی پجاریوں نے کرناوتی کے ہاتھ میں مجانے کونسی قسم کے پھول دیئے ان میں ایک سرخ تھا اور دوسرا سفید یہ پھول اسے دونوں ہاتھوں میں پکڑنے تھے گویا دیوی تیار ہوگئی تھی باہر جانے کیلئے، اس کے بعد پجاری ہابون کے پاس پہنچے اور اسی طرح اسے بھی سجایا گیا اور اس کے ہاتھ میں سفید ہاتھی دانت کی ایک چھڑی دی گئی جو سانپ کی شکل کی تھی اور کافی قدیم معلوم ہوتی تھی اس کی آنکھوں کی جگہ ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ ہابون نے یہ چھڑی اپنے ہاتھ میں لے لی تو آہو رہ نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا.....

"دیوی اور دیوتا تیار ہوگئے ہیں اب ہمیں چلنا ہے اور اب آپ کو چلنا ہے۔"

"ہاں لیکن ہمارے خادم بھی ہمارے ساتھ آئیں گے وہ بھی جو اس کمرے میں ہیں اور وہ بھی جنہیں دوسری جگہ رکھا گیا ہے اور یہ عورتیں یہیں رہے گی کہ جب ہم واپس آئیں تو ہمیں اپنی ضرورت کی چیزیں تیار مل جائیں کرناوتی خودہی فیصلے کررہی تھی اور یہ بات اس نے اس لئے کہی تھی کہ خود پردھان سنگھ نے خوف کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اس کا عبادت گاہ میں جانا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں کسی کو کوئی اعتراض ہوسکتا تھا خصوصاً نعمت علی کو، کیوں کہ نعمت علی نے بھی کرناوتی کی ذہانت سے پورا پورا اتفاق کیا تھا اور واقعی اس وقت پردھان سنگھ کی حالت کافی خراب تھی تو آہو رہ نے پرادب لہجے میں کہا۔

"آپ کے سب خادم باہر کھڑے ہیں دیوی، اور ان کیلئے بھی تیاریاں کرلی گئی ہیں لیکن یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے جھریوں پڑے چہرے پر نہایت ہی معنی خیز مسکراہٹ پھیل گئی اور نا جانے کیوں نعمت علی کو اس کی مسکراہٹ میں ایک شیطان کی سی عیاری اور مکاری محسوس ہوئی پھر اس نے سوچا کہ کیا کہنا چاہئے یہ بوڑھا مکار اس کے الفاظ میں جو خاص بات تھی اس نے نعمت علی کو کسی حد تک مضطرب کردیا تھا آخر کیا تیاریاں کرلی ہیں، اس نے اس، یہ تمام باتیں سوچنے کا وقت نہیں تھا وہ لوگ ہر آمدے میں آگے جہاں مسلح سپاہی ڈولیاں لئے کھڑے ہوئے تھے اور یہیں پر انہوں نے اپنے ساتھ آنے والے سیاہ فاموں کو بھی دیکھا جن کے چہرے پر خوف وہراس طاری تھا کیونکہ بہت سے افراد انہیں اپنے نرغے میں لیے ہوئے تھے جن کے پاس ہتھیار موجود تھے۔ صرف ہابون اور کرناوتی کو ڈولیوں میں بٹھایا گیا اور ڈولیوں کے پیچھے چھوٹے سے گروہ کی صف تھی اور پرمیت سنگھ سب سے آگے آگے چل رہا تھا انہیں خاص طور پر ہتھیار بھی دیئے گئے تھے۔ یعنی نعمت علی کو اور پرمیت سنگھ کو اور یہ لوگ بڑی احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے اور ان کے خصوصی ہتھیار بھی ان کے لباسوں میں چھپے ہوئے تھے کہ اب تک جس چیز کی خاص طور پر حفاظت کی گئی تھی وہ بارود اور دھماکے کرنے والے ہتھیار تھے۔ اور یہی ایک ایسا سہارا کارڈ تھا نعمت علی کے ہاتھ میں جس سے وہ کسی کسی لمحے حالات پر قابو پاسکتے تھے کیونکہ اس کے لئے خاص طور سے ہدایات کی گئی تھی البتہ یہ بات انہیں معلوم نہیں تھی کہ بارود کے استعمال اور آتشی ہتھیاروں کے استعمال سے خود اس بوڑھے شیطان کو واقفیت ہے یا نہیں، لیکن جو کچھ انہوں نے اپنے جسموں پر سجایا تھا اس پر اس نے غور نہیں کیا تھا اور انہیں ان کا مخصوص ہتھیار ہی سمجھا تھا لیکن بہرحال ہر چیز کارآمد تھی اور خصوصی طور پر پستول جو چھوٹے ہوتے تھے لیکن موقع پر کام آنے والے چنانچہ یہ سب آگے بڑھ گئے وہ اس بات کا تھوڑا بہت اندازہ لگا چکے تھے کہ اگر یہ لوگ ان ہتھیاروں کی جانب توجہ نہیں دیتے تو وہ انہیں صرف ان کا زیور سمجھتے ہیں پھر یہ گروہ آگے بڑھا اور عجیب سی بے ہنگم آوازیں فضا میں گونجنے لگیں یہ ان کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں چلنے والے پجاری تھے جو کوئی مقدس گیت گا رہے تھے۔

سپاہیوں کی قطاروں کی قطاریں بھالوں کے

پھلوں پر موم بتیاں روشن کئے آگے بڑھ رہی تھیں اور جب وہ عظیم الشان دروازے کے پاس پہنچے تو دروازہ کھول دیا گیا اور اس سے وہ باہر آئے چنانچہ اب وہ اس بلندی پر چڑھ گئے تھے جو اس رہائش گاہ یعنی محل اور اس بڑی اور عظیم الشان عبادت گاہ کے درمیان تھی جو انتہائی ہیبت ناک تھی اور بلندی پر نظر آرہی تھی اور یہ فاصلے طے کرنے کے بعد وہ عبادت گاہ کے سامنے پہنچ گئے جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور یہاں ڈولیاں رکھ دی گئیں۔

کرناوتی اور ہابون سے نیچے اتر آنے کو کہا گیا، جیسے ہی وہ نیچے اترے ساری روشنیاں بجھادی گئیں موم بتیاں اور مشعلیں دھواں دے رہی تھیں اور قرب وجوار میں مکمل اندھیرا چھا گیا تھا، اندھیرا بڑا خوف ناک اور دل لرزا دینے والا تھا اور پتہ نہیں اس کی کیا وجہ تھی۔ اچانک کسی نے نعمت علی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے گھسیٹ کر ایک طرف چلا، نعمت علی کچھ ایسی کیفیت میں تھا کہ مدافعت بھی نہیں کرسکا اور اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ خدا جانے گھسیٹنے والا کون تھا اور اسے کہاں لئے جارہا تھا اندھیرا اتنا گہرا تھا کہ وہ معلوم نہ کرسکا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا تھا؟ یہاں تک کہ اسے یہ احساس ہوا کہ جو شخص اسے گھسیٹ رہا ہے وہ کوئی پجاری ہی ہے اسے اس کے لباس کی وجہ سے اندازہ ہوا تھا۔ پھر خاصا فاصلہ طے ہوگیا۔ آوازوں سے اس نے اندازہ لگایا کہ صرف اس کے ساتھ ہی ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ دوسرے لوگوں کو بھی اس طرح گھسیٹ کر لے جایا جارہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی آوازیں بھی سنیں جو اس کے اپنے ساتھی تھے وہ خوف سے بڑبڑا رہے تھے اور پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہیں اور انہیں کہاں لے جایا جارہا ہے؟ اچانک ہی ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے ان کے ساتھ سختی کی جارہی ہو کچھ گھونسوں اور تھپڑوں کی آوازیں تھیں چنانچہ یہ ظاہر ہوا کہ انہیں خاموش ہی رہنا ہے پھر اچانک ہی نعمت علی کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ کھلی فضا میں سے نکل کر کسی تنگ جگہ پر آگئے ہوں کیونکہ ہوا بدلی ہوگئی تھی اور پتھریلے فرش ان کے پیروں کی آواز چاپ پیدا کررہی تھی۔ "ہم شائد کسی سرنگ سے گزر رہے ہیں۔" یہ سرگوشی پرمیت سنگھ کی تھی۔

"خاموش اگر دوسری بار تو نے زبان کھولی تو تیری گردن دبادی جائے گی، یہ مقدس مقام ہے اور یہاں خاموش رہنا ضروری ہے۔ بولنے والے موت کی نیند سلا دیئے جاتے ہیں....." وہ لوگ خاموش ہوگئے انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ صورت حال ان کے حق میں کافی سنگین ہے اور بہرحال یہ ایک حقیقت تھی کہ اس وقت جو حیثیت ہابون اور کرناوتی کو حاصل تھی وہ کسی اور کو نہیں یہ الگ بات ہے کہ وہ دیوی دیوتا کے ساتھی تھے لیکن اس کا مقصد یہ بھی نہیں تھا کہ وہ یہاں کے قانون کی خلاف ورزی کریں البتہ نعمت علی نے اپنی پستول کو بہت ٹٹولا تھا اور نجانے کیوں اس کی چھٹی حس اسے یہ احساس دلا رہی تھی، کہ صورت حال غیر محفوظ ہے پتہ نہیں یہ لوگ اسے کہاں لے جارہے ہیں کہیں ایسا تو نہیں کہ اس تاریکی سے فائدہ اٹھا کر کسی زیر زمین قید خانے میں بہرحال انتا اطمینان ضرور تھا کہ اب کرناوتی کیلئے کوئی خطرہ نہیں تھا اور نہ ہی ہابون کیلئے۔ وہ ایک لمبی سرنگ میں چلتے رہے شروع میں یہ سرنگ ڈھلان میں اتر رہی ہے اور اس کے بعد سیدھی سیدھی اتر رہی ہے لیکن آگے چل کر کچھ سیڑھیاں آگئی تھیں وہ ان سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے البتہ سیڑھیاں اتنی تھیں کہ چڑھتے چڑھتے ان کے پنجے چڑھنے لگے اور ہر سیڑھی ایک دوسرے سے خاصی اونچی تھی جب یہ سیڑھیاں ختم ہوئیں اور وہ لوگ دس قدم تک سرنگ میں چلتے رہے یہ سرنگ پہلے سے بھی زیادہ تنگ تھی اور اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ انہیں جھک کر چلنا پڑ رہا تھا اس سرنگ میں سے نکل کر پتھر کے ایک چبوترے پر پہنچ گئے اور یہاں تھوڑے تھوڑے حالات سمجھ آرہے تھے اس کے اطراف میں سرد ہوائیں ان کے رخساروں کو چھوتی ہوئی گذر رہی تھیں لیکن بہرطور اندھیرا اتنا ضرور تھا کہ یہ اندازہ نہیں ہو پارہا تھا کہ وہ کہاں ہیں اور انکے اردگرد

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا ہے البتہ نیچے سے پانی بہنے کی آواز آرہی تھی اور اس کے ساتھ ہی دوسری آوازیں بھی جو انسانی آوازیں ہی تھیں، یوں لگ رہا تھا جیسے بے شمار افراد ایک دوسرے سے سرگوشیاں کررہے ہیں، عجیب سی سرسراہٹیں فضا میں گونج رہی تھیں۔ جیسے ہوا کے جھونکے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزر رہی ہوں یا پھر یہ ان بے شمار عورتوں کے لباس کی سرسراہٹ ہو۔ نظر نہ آنے والا پانی اور نظر نہ آنے والے ہجوم کی موجودگی کا احساس ہولناک اور بے چین کردینے والا تھا بس یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ روحوں کے جال میں آپھنسے ہوں اور سینکڑوں روحیں ان کے گرد رقصاں ہوں وہ نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے انہیں چھورہی تھیں بغیر الفاظ کے بول رہی تھیں بغیر آنکھوں کے دیکھ رہی تھیں عجیب ہولناک سا ماحول تھا جو بدن میں سرد لہروں کی طرح اتر رہا تھا، دہشت ناک پراسرار اور لرزہ خیز اعصاب اسقدر تن گئے تھے کہ نعمت علی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور سے چیخ پڑے اس سے پہلے کبھی کسی ایسی حالت سے نہیں گزرا تھا اور جانتا تھا کہ ان لوگوں کی حالت اس سے بھی زیادہ بدتر ہوگی۔ دفعتاً ایک گہرائی میں سے آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت ہی خوفناک لہجے میں چیخ رہا ہو، پھر فوراً ہی ایک آواز ابھری۔

"خاموش رہو کتو، خاموش رہو، دیوی سے پہلے کسی کو بولنے کی اجازت نہیں ہے، خاموش رہو اگر موت کو اپنانا نہیں چاہتے......" آواز خاموش نہ ہوئی یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ہچکیاں لے کر رو رہا ہو پھر ایک بھیانک چیخ سنائی دی چیخ کی آواز کے ساتھ ایک زور......کی آواز پھر کسی کے گرنے کا دھماکہ ایک بار پھر نظر نہ آنے والا ہجوم بھنبھنا اٹھا پھر ایک سرسراہٹ سی سنائی دی اور نعمت علی کے کان کے قریب پرمیت سنگھ کی آواز ابھری۔

"یوں لگتا ہے جیسے کسی کو قتل کردیا ہو پتہ نہیں کون ہوگا بیچارہ......" نعمت علی کانپ کر رہ گیا اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا شاید جواب دے نہیں سکتا تھا کیونکہ پر میت سنگھ کی آواز کے ساتھ ہی ایک کھردرا اور بڑا سا ہاتھ اس کے منہ پر آپڑا تھا خیریت اسی میں تھی کہ اس وقت خاموشی اختیار کی جائے نجانے یہ خاموشی کتنی دیر طاری رہی اور آخر کار پاگل کردینے والی خاموشی ٹوٹی اور پھر ایک مدہم سی منمناتی ہوئی آواز ابھری یہ آواز بے شک سمجھ آرہی تھی اور اندازہ ہورہا تھا کہ کس کی آواز ہے آہورہ کے علاوہ کوئی نہیں تھا خاموشی اتنی گہری تھی کہ مدہم آواز کے باوجود آہورہ جو کچھ کہہ رہا تھا ایک ایک لفظ صاف طور سے سمجھ آرہا تھا حالانکہ یہ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کافی دیر سے محسوس کررہے تھے کہ وہ کافی دور سے بول رہا ہے یا پھر نجانے اس وقت ان کی یہ کیفیت تھی جو یہ ایسی بات محسوس کررہے تھے نعمت علی نے اس آواز پر کان لگادیئے تو اس کے کانوں میں یہ آواز ابھری......

"مقدس اڈینا کے پجاریو! عظیم آذن کے پیروکارو سنو، پاتال نگری کی آبادیوں میں رہنے والوں میری آواز سنو! میں جو عظیم گہرائیوں والے کا مذہبی پیشوا ہوں اور میں جو تمہیں تاحیات روشنی کے راستے دکھاتا رہا ہوں اور گہرائیوں والا تمہارے اوپر سایہ فگن رہے، جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ سنو اور اسے اپنے ذہن میں محفوظ رکھو جیسا کہ پاتال نگری والے جانتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے دیوی اڈینا جسے ہماری قوم ہمیشہ ہمیشہ سے پوجتی چلی آئی ہے آسمانوں سے اتر کر ہماری قوم میں آئی اور اس کے ساتھ ہی دیوتا، جو اسکا منظور نظر تھا یعنی آذن اور جب وہ اس دنیا میں رہتی تھی تو ایسا گناہ کیا جو گناہوں کا باپ ہے۔ ہوا یوں کہ پاتال نے اجالے کو قتل کردیا اور دیوی ہم سے روٹھ گئی وہ ہماری سرزمین سے چلی گئی اور ہم نہیں جانتے اور نہ کبھی جان سکیں گے کہ وہ کہاں گئی لیکن میں جانتا ہوں اور وقت جانتا ہے یا گذری ہوئی صدیاں کہ اس کے بعد ہم پاتال میں رہنے لگے اور یہ سرزمین روشنی سے محروم ہوگئی کیونکہ اجالے کو ختم کردیا گیا تھا اور اس وقت سے اندھیرا ہم پر طاری تھا اور یہ اندھیرا لوگوں کی عبادت کا جواب موت سے دیتا تھا اور گہرائیوں میں رہنے والا اس بات کا

احسان ہے کہ اس نے ہم پر کرم کیا کہ ہماری قوم تباہ نہیں ہوئی اور اندھیرے نے جس طرح اجالے کو قتل کیا اس کا کفارہ یہ تھا کہ اسے انسان کا روپ دھار کر اس جگہ اترنا ہے جہاں پانی ہے اور جہاں کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہمارا دیوتا جو ہمیشہ سے اس پانی میں رہتا ہے وہ جو ہم پر زندگی نازل کرتا ہے اور موت سے ہمیں بچاتا ہے وہی ہمیشہ سے یہاں مقیم ہے اور خیال یہ کیا گیا تھا کہ آذن اور اڈینا ایک بار اس دنیا میں آئیں گے اور سنو میری بات کہ اس گناہ کے بعد دیوی اڈینا نے ایک وعدہ کیا تھا اور کہا تھا کہ میں آؤں گی اس کے ساتھ جس نے میرے وجود سے جنم لیا اور جو میرا ساتھی بنا اور سنو میں تمہیں ہمیشہ کیلئے چھوڑ کر نہیں جارہی ہوں نسلوں کے بعد نسلیں گذر جائیں گی اور تب آذن اور ہم واپس آئیں گے اور پھر تم پر ہماری حکومت ہوگی اور تب اندھیرا تمہاری سرزمین سے ہٹ جائے گا اور تم دنیا کی عظیم ترین قوم بن جاؤ گے چنانچہ اس وقت تک جب تک ہم واپس نہیں آتے تم اپنے لئے سردار منتخب کرتے جاؤ جو تمہاری دیکھ بھال کریں اور ایسا تمہیں اس لئے کرنا ہے کہ تم منتشر نہ ہوجاؤ اور تم پر کمزوری طاری نہ ہوجائے دیکھو اس کے علاوہ میری پوجا کرنا نہ بھولنا اور اس بات کا خیال رکھنا مقدس گہرائیوں میں رہنے والے کو انسانی خون مہیا ہوتا رہے اور اسے اس کی غذا ملتی رہے جو اس کی پسند ہے اور جب میرے واپس آنے کا زمانہ آئے گا تو میں تمہیں ایک نشان دکھاؤں گی جس کے ذریعے تم مجھے اور میرے ساتھی آذن کو پہچان لوگے۔ سنو میں اندھیرے میں روشنی بن کر آؤں گی حسین اور سفید دودھ جیسی ہوں گی میری رنگت، اور چاند جیسا ہوگا میرا حسن اور ایسی بن کر آؤں گی کہ مجھے دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہوجائیں گی لیکن میرا ساتھی یعنی آذن اپنے گناہ کی وجہ سے اس بت کی طرح زمین پر اترے گا جو تمہارے مندر میں بیٹھا ہوا ہے اس کا رنگ کالا ہوگا اور صورت اس کی گھناؤنی ہوگی ہم تمہیں پکاریں گے اور تم ہمیں پہچان لوگے اور پھر ہم تمہیں اپنے وہ مقدس نام بتائیں گے جو اس وقت سے ہمارے واپس آنے تک ننگے سر اور اونچی آواز میں بولے جائیں گے اور ہوشیار، جھوٹے دیوتا تمہارے درمیان نہ آنے پائیں اور ایسا نہ ہو کہ تم انہیں پوجنے لگ جاؤ اور اگر ایسا ہوا تو تم پر عذاب نازل ہوگا اور سورج اپنا منہ چھپالے گا تو اندھیرے کے باسیوں۔۔۔۔۔۔ کہا تھا دیوی اڈینا نے، اور جو شخص صدیوں پہلے موجود۔۔۔۔۔۔ تھا اس نے ہر بات لوہے کے ٹکڑے سے پتھر پر تحریر کردی تھی اس پتھر پر جس پر میں اس وقت کھڑا ہوں لیکن کوئی اس تحریر کو نہیں پڑھ سکتا کیونکہ میں صدیوں سے اس نسل کا روحانی پیشوا چلا آرہا ہوں اب مجھے خوشی ہے کہ اس وقت میں موجود ہوں جب میری پیشن گوئی یعنی میرے اجداد کی میری زندگی میں پوری ہورہی ہے۔ اور وقت آگیا ہے۔ آج رات وہ پیشن گوئی پوری ہوگی۔ اور وہ وقت آگیا ہے، آج رات، اندھیرے کے باشندو! وہ لافانی دیوتا جو اس وقت سرزمین سے رخصت ہوگئے تھے واپس آگئے ہیں۔ اور ہم نے انہیں دیکھا اور ہمارے کانوں میں انہوں نے اپنے مقدس نام کہے یعنی آذن اور اڈینا، حسین اور سفید خاتون اور یہی وہ ہیں جو ہمارے درمیان آنے والے تھے۔"

اس کی یہ طویل تقریر ختم ہوئی اور اس طرح خاموشی طاری ہوگئی جیسے وہاں کوئی انسانی وجود ہی نہ ہو اس خاموشی میں صرف بہتے پانی کی کچھ آواز تھی اور یہ آواز کہیں گہرائی سے آرہی تھی۔ اور کہیں کہیں ہجوم کی بھنبھناہٹ البتہ سنائی دیتی تھی۔ نعمت علی کی کنپٹیاں چیخ رہی تھیں۔ اور وہ عجیب سی کیفیت کا شکار تھا جو مسلسل اس کا تعاقب کررہی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی کے بعد بے حس وحرکت ٹھہرا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کس جگہ ہے اور اطراف میں کیا کچھ ہے۔ لیکن یہ بھی تقدیر ہی تھی کہ وہ عین وقت پر سنبھل گیا۔ ورنہ اس شوق اور تجسس کا انجام برا ہوتا۔ ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اس کا اگلا قدم خلا میں پڑا اور وہ ڈگمگاتا آگے کی طرف جھکا اور اگر بڑی کوشش سے اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

توازن قائم کر کے سنبھل نہ جاتا تو گر پڑتا خدا جانے کہاں۔ وہ پیچھے ہٹا اور فوراً ہی پرمیت سنگھ کی آواز سنائی دی۔

''آگے نہ بڑھو میں یہ سب کچھ کر کے دیکھ چکا ہوں۔''

''کیسی جگہ ہے یہ۔''

''بلندی اور ہمارے اطراف کوئی دیوار نہیں ہے.....''

''اوہ.....'' نعت علی کے منہ سے آہستہ سے نکلا پھر نجانے کیا ہوا کہ اس نے دیکھا کہ رات کا اندھیرا ہلکی ہلکی روشنی میں تبدیل ہونے لگا اور بلندیوں میں ایک بہت بڑا پتھر آہستہ آہستہ روشن ہو رہا تھا جیسے چھوٹے قد و قامت کا چاند۔ سب سے انوکھی اور تعجب خیز چیز اس زمین کی چھت ہی تھی۔ وہ جگہ جو اوپر سے نیچے کی سمت ہوگی یہ ایک انوکھی طلسم کدہ کا اظہار کرتی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے شعاعوں نے آسمان کے نیچے ان پہاڑوں کو روشن کیا ہوا ہے۔ روشنی مدھم مدھم تھی لیکن پھیلتی جا رہی تھی اور پھر وہ اتنی تیز ہوگئی کہ اس میں بخوبی دیکھا جائے اور نعت علی نے دیکھا کہ بائیں طرف ایک سیاہ مینار سا بلند ہو رہا ہے اور نیچے کوئی چیز چمک رہی ہے جس سے ہلکی ہلکی آوازیں ابھر رہی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے چٹانوں سے ٹکرائی ہوئی موجیں۔ حیرت انگیز منظر روشن ہوا تھا۔ وہ عجیب و غریب تھا۔ نعت علی کے عین سامنے نشیب میں چھت کے بغیر ایک وسیع و عریض عمارت تھی۔ جو انتہائی طویل رقبے میں تھی۔ یہ عمارت ایک سمت سے کھلی ہوئی تھی۔ اور اس کی تین طرف پتھر کی دیواریں کوئی پچاس فٹ تک بلند ہوتی چلی گئی تھیں۔ ایک عجیب سی جگہ تھی۔ جیسے، زمانہ قدیم میں وہ کھیل کے میدان بنائے جاتے ہوں۔ جہاں زندگی زندگی کے کھیل کھیلے جاتے ہوں۔ ادھر فلموں میں اکثر ایسے مناظر نظر آجایا کرتے تھے۔ اور پتھر کی نشستیں قطار کی شکل میں تھیں۔ اور ان نشستوں پر لاتعداد انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ عورتیں مرد بچے۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے سارا شہر امڈ آیا ہو۔

تمام نشستیں بھری ہوئی تھیں۔ سوائے آخری چند نشستوں کے مغربی سرے پر ایک عظیم الشان بت نصب تھا۔ جو ستر اسی فٹ تک فضا میں بلند ہوتا چلا گیا تھا۔ اور معوم ہوتا تھا۔ جیسے صرف ایک کالی چٹان کو تراشا گیا ہو۔ اس بت کے عقب میں اس سے تقریباً سو فٹ دور ایک پہاڑی چٹان تھی۔ جو اس چوٹی تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ جو برف پوش تھی۔ اور جسے نعت علی اور اس کے ساتھیوں نے جب وہ اس شہر میں داخل ہوئے تھے تو بہت دور سے دیکھ لیا تھا۔

یہ بت بالکل بابون کی مانند تھا۔ بھیانک صورت کا مالک دونوں بازو جھکائے۔ اور کہنیوں میں دونوں ہاتھ لمبے کئے بیٹھا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں اوپر کو تھیں۔ جیسے وہ آسمان کو اپنی ہتھیلیوں پر رود کے ہوئے ہو۔ یہ محسوس ہوتا تھا۔ جیسے پتھر کی وہ چوکی جس پر بت بیٹھا ہوا ہے۔ ایک گہری کھائی یا گہرا کنواں تھا۔ اس کھائی کا طول عرض اس سرے سے اس سرے تک تقریباً تیس گز ہوگا۔ اور اسی کھائی میں پانی شور مچا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے نیچے گند حک کے پہاڑ ہوں۔ کیونکہ اس سے بلکا بلکا دھواں بھی نکل رہا تھا۔

بت کے دونوں ہاتھ کھائی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ خود ذرا سا سر جھکائے جیسے کھائی میں جھانک رہا ہو ..... نعت علی یہ نہ دیکھ سکا کہ یہ پانی کہاں سے آرہا ہے۔ اور کہاں جا رہا ہے۔ لیکن بہرحال ان لوگوں نے جو کچھ بھی دیکھا تھا۔ وہ اتنا پر اسرار تھا کہ دیکھنے سے دل پر دہشت طاری ہوتی تھی۔

چٹان کے تمام پہلوؤں اور بت کی ٹانگوں کے درمیان قربان گاہ تھی۔ اور اس میں وہ پتھر نظر آرہا تھا۔ جس پر انسانوں کو ذبح کیا جاتا تھا۔ وہ چٹان جو طول و عرض میں کافی بڑی تھی۔ اور جو سب سے اہم چیز اس وقت دیکھی گئی۔ وہ قربانی کے پتھر کے عین سامنے ایک شخص کھڑا تھا۔ جسے رسیوں سے جکڑ دیا گیا تھا۔ اور اسے دیکھ کر نعت علی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیونکہ اس

نے ایک لمحے کے اندر اندر ہنگارہ کو صاف پہچان لیا تھا۔

پاتال نگری کا سردار ہنگارا جس کے دونوں طرف جنات نما لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ اور ان کا اوپری بدن برہنہ اور وہ لمبے لمبے کھانڈوں سے مسلح تھے ان کے پیچھے جو لوگ نظر آئے۔ انہیں دیکھ کر ہی نعت علی کے ہوش و حواس جواب دے گئے تھے۔ یہ وہ غلام تھے جنہوں نے ان کے ساتھ زندگی کے سب سے طویل سفر کا شروع کیا تھا۔ اور اس وقت ان کی حالت قابل دید تھی۔

وہ پتے کی طرح کانپ رہے تھے۔ اور افسوس کی بات یہ تھی۔ کہ ان میں سے ایک سنگین فرش پر مردہ پڑا ہوا تھا۔ اور شاید یہ ہی وہ آدمی تھا جو اندھیرے میں گر گیا تھا۔ اور اس کی چیخ سنائی دی تھی۔ لیکن یہ بڑا دکھ بھرا منظر تھا۔ جسے دیکھ کر وہ دہشت سے کانپ گیا۔ اور اگر اپنے آپ کو سہارا نہ دیا جاتا۔ تو یقینی طور پر نیچے گرنے کے امکانات واضح ہو سکتے تھے نعت علی انہیں دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کہ اب کیا کرے۔ یہ تو انتہائی خوفناک بات تھی۔

اس نے دیکھا کہ کھولتے ہوئے پانی کے چشمے سے کوئی سوفٹ اوپر کرنا وئی ہاتھی دانت سے بنی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہے اب اس کا سیاہ لبادہ اتار دیا گیا تھا۔ اور وہ ایک سفید عباء میں ملبوس تھی۔ اس کی پتلی کمرے کے گرد ایک پٹکا بندھا ہوا تھا۔ جو اصل لباس کو اس کے بدن پر روکے ہوئے تھا۔ اس کے کالے بال اس کے گورے گورے کندھوں پر ناگنوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں پھول تھے۔ دائیں میں سفید اور بائیں میں سرخ اور اس کے ماتھے پر ایک عجیب و غریب چیز چمک رہی تھی۔ جسے دیکھ کر نعت علی کی آنکھوں میں سرخ روشنی اتر آئی۔ آہ، یہ ایک سرخ پتھر تھا۔ ایک انتہائی سرخ پتھر..... جس سے روشنی اس طرح پھوٹ رہی تھی۔ جیسے سرخ چنگاریاں چل رہی ہوں۔ یہ پتھر اس کے ماتھے پر چمک رہا تھا۔ اور اسے ایک پٹی کے ذریعے اس کے چہرے پر باندھا گیا تھا۔ وہ پتھر انتہائی ہولی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور روشنی کی کرنیں اس کے ماتھے پر بندھے ہوئے لعل پر منعکس ہو رہی تھیں۔ اور اس کا چہرہ اس وقت ایسا عجیب لگ رہا تھا۔ کہ دیکھنے والی آنکھ اگر اسے دیکھے تو اس کے بعد کچھ دیکھنے کی آرزو نہ کر سکے۔ اس کے حسن کے بارے میں صحیح الفاظ کی تراش مشکل تھی۔ اسے کوہ قاف کی کوئی پری یا آسمانی روح بھی اتنی حسین نہیں رہی ہوگی۔ جو اس وقت وہ نظر آرہی تھی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس بلندی پر اس چاندنی میں وہ ایک انسان سے زیادہ ایک روح ہی معلوم ہو رہی تھی۔ جو حیات کی دیوی ہو۔ اور یقینی طور وہی جو یہ لوگ سمجھ رہے تھے۔ اور وہاں موجود لوگ دوسری دنیا کی اس مخلوق کو دیکھ کر بچھڑ گئے ہیں۔

پھر نعت علی کی نگاہیں گھومیں اور اس نے بابون کو بھی ایک عجیب رنگ میں دیکھا۔ پتہ نہیں کب، اور کس وقت، اور کس طرح بابون کا حلیہ بھی تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اور اب وہ صرف نچلے بدن کو ڈھکنے والے لباس میں تھا۔ اور اس کے ماتھے پر ایک عجیب سی جھالر بندھی ہوئی تھی۔ البتہ ہاتھ میں ہاتھی دانت کا وہ عصا پکڑے ہوئے بیٹھا ہوا تھا۔ اور اس کا تخت بھی آبنوس کا تھا۔ اور اس خوفناک بت کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔

کیفیت یہ تھی کہ بابون اس وقت کرناوتی سے کوئی چالیس فٹ نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ اور بے حد عجیب لگ رہا تھا۔ پرمیت سنگھ، نعت علی کے قریب ہی موجود تھا۔ اور یہ دیکھ کر اس کا دم اور نکلنے لگا کہ وہ بت کی دائیں ہتھیلی پر کھڑے ہوئے تھے۔ بت کی یہ ہتھیلی کوئی چھ مربع فٹ کا پلیٹ فارم بنا رہی تھی۔ اور بت کے بازوؤں کو اندر اندر کاٹ کر سرنگ بنائی گئی تھی۔ اور اسی سرنگ میں سے انہیں لایا گیا تھا۔ اور وہ دونوں اس وقت گویا ایک ایسی بلند جگہ کھڑے تھے۔ جس کے کسی طرف کوئی روک نہیں تھی۔ اور اگر ذرا بھی کوئی گڑبڑ ہو جاتی یا ان کا توازن بگڑ جاتا تو وہ خلاء میں گہرائیوں میں جا پڑتے۔ اور کوئی نوے فٹ نیچے اس کھائی میں جہاں زندگی سب سے زیادہ غیر محفوظ تھی۔ تب نعت علی کو پرمیت سنگھ کی آواز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنائی دی۔

"مجھے سنبھالو میں...... چکرا رہا ہوں۔ میں نیچے گر پڑوں گا۔ مجھے سنبھالو اور نعمت علی اس کی جانب لپکا۔ اس نے پرمیت سنگھ کو سہارا دیا۔ اور تسلی دیتا ہوا بولا۔

"خود کو سنبھالو پرمیت سنگھ!" اس نے پرمیت سنگھ کو نیچے بٹھا دیا۔ تو پرمیت سنگھ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مجھے لگتا ہے کہ موت کا خونی کھیل شروع ہونے والا ہو اور وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ آہ۔ وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔" پرمیت سنگھ کی آواز نعمت علی کو ڈوبتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور پھر پرمیت سنگھ نے گردن ڈال دی۔

نعمت علی گھبرا گیا تھا۔ اس نے جھک کر پرمیت سنگھ کو دیکھا لیکن یہ دیکھ کر اسے قدرے اطمینان ہوا۔ کہ پرمیت سنگھ بیہوش ہو گیا تھا۔ لیکن خود نعمت علی کی کیفیت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔ کیا ہونے والا ہے۔ نجانے کیا ہونے والا ہے۔

رگوں میں خون منجمد کر دینے والا ماحول در حقیقت ایسا تھا کہ اگر اس ماحول کو دیکھنے کے باوجود کوئی اپنے دل و دماغ پر قابو پا سکے تو اسے انتہائی مضبوط اعصاب کا مالک کہا جا سکتا تھا۔ پرمیت سنگھ تو بے ہوش ہو چکا تھا۔ لیکن نعمت علی اپنے آپ کو سنبھال کر ایک بار پھر نگاہیں دوڑانے لگا تھا۔ اس نے دیکھا۔ کہ کچھ فاصلے پر اس بت کے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر آہورہ کھڑا ہوا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ اور وہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"تو...... پاتال نگری...... میں بسنے والو! دیکھا تم نے درشن کر لئے عظیم اڈینا کے اور مقدس دیوتا آذن کے، اور اب وہ ہمارے درمیان آ گئے ہیں اور صدیوں پہلے کی پیشن گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ تو تم انہیں خوش آمدید کہو اور اس کے بعد ایک زبردست شور برپا ہو گیا۔ وہ سب اپنی اپنی آواز میں کچھ نہ کچھ کہنے لگے۔ جس کا مفہوم تھا کہ مقدس دیوتا ہم پر برکتیں نازل کرو۔ ہم تمہاری اطاعت کیلئے حاضر ہیں۔ تو پھر آہورہ نے کہا۔

"اور عظیم دیوتاؤں اپنے خادموں پر اپنے پجاریوں پر اپنی محبت قائم کرو۔ اور پاتال نگری کی حکومت قبول کرو۔ ہم پر حکمرانی کرو۔ ہماری قربانیاں قبول کرو۔ ہم اپنا تمام اختیار تمہیں دیتے ہیں۔ ہمارے مویشی ہماری بھیڑیں تمہاری ہیں۔ اور تمہاری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربان گاہ کو سرخ کر دیں گے۔ اور قربان ہونے والوں کی چیخیں تمہارے لئے حسین نعمتوں کی طرح ہوں گی۔ دیوتاؤ۔! فتح ہو تمہاری۔ چاروں طرف سے وہی آوازیں ابھرنے لگیں۔ اور جب آوازوں کا شور دبا تو آہورہ نے کہا۔

"لاؤ ان مقدس عورتوں کو جنہیں دیوتا کی آمد کی خوشی میں پہلی قربانی کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔" فوراً ہی کچھ پجاری دو عورتوں کو لے کر سامنے آ گئے۔ اور ایک خونی منظر کا آغاز ہو گیا۔ عورتوں کو اس ہولناک مجسمے کی ٹانگوں کے پاس کوڑ کے کنارے کھڑا کر دیا گیا اور وہ دونوں خوبصورت عورتیں تھیں۔ اور انہیں خاص طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ ان کے بدن پر لباس بہت مختصر تھا۔ اور سروں پر پھول سجے ہوئے تھے۔ بہر حال انہوں نے انہیں دیکھا عورتوں کے چہرے خوف سے پھیلے پڑے ہوئے تھے۔ اور وہ کانپ رہی تھیں۔ اور ان کی حالت نا قابل بیان تھی۔

مجمع میں خاموشی طاری ہو گئی۔ اور بہت ہی عجیب سی کیفیت تھی۔ ان عورتوں کی۔ پھر اسے ہجوم کی طرف رخ کر کے کھڑا کر دیا گیا۔ اور ہجوم نے ایک بار پھر ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"قربان ہونے والی پہلی عورت قابل مبارکباد ہے۔ پھر پیچھے کھڑے ہوئے پجاری آگے بڑھے انہوں نے ان میں سے ایک عورت کی ٹانگیں اور دوسرے نے اس کے ہاتھ پکڑے اور دوسرے لمحے اسے کھائی میں پھینک دیا۔ ایک فلک شگاف چیخ کے ساتھ پانی میں چھپا کا سنائی دیا اور نعمت علی نے دیکھا کہ عورت سطح آب پر

ہچکولے کھا رہی تھی۔ اور روشنی اس جگہ کو منور کر رہی تھی۔

جو لوگ آگے موجود تھے جھک جھک کر اسے دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور تجسس سے مجبور ہو کر نعمت علی نے بھی اپنے آپ کو بت کی ہتھیلی پر اوندھے منہ لٹا دیا۔ وہ بھی نیچے جھانک رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بت کے عین قدموں تلے پانی میں ایک ہلچل سی مچی اور پھر ایک انتہائی زبردست اور گھناؤنی شکل کا مگرمچھ تھوتھنی کھولے آگے بڑھا۔

اور نعمت علی کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ مگرمچھ کا سر اتنا بڑا تھا کہ کبھی تصور میں بھی نہ آ سکے۔ اس کے دانت لمبے لمبے اور تقریباً آدھے ہاتھ کے برابر تھے۔ گلے کا گوشت تھیلے کی طرح لٹک رہا تھا۔ اور اس کی لمبائی کا اندازہ صحیح طرح نہیں ہو سکتا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ وہ اوپر ابھرا اور اپنے شکار کی طرف لپکا۔ پھر عورت سالم اس کے منہ میں چلی گئی۔ اور نعمت علی پتے کی طرح تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ اس نے خوفزدہ نگاہوں سے کرناوتی کو دیکھا۔ اسے خطرہ ہوا کہ کرناوتی کہیں اس خوفناک منظر کو دیکھ کر زندگی ہی نہ کھو بیٹھے۔

ہابون اور سب اس طرح بے حس و حرکت تھے۔ کہ بس یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے ان کی روح بدن سے نکل گئی ہو۔ پھر اس بدبخت آہورہ نے مسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"مبارک ہو، مبارک ہو سب کو۔ اور آج کی رات قربانی کی رات میں بدل دو۔ اور اب اس کے بعد دوسری لڑکی کو قربان کرو۔ پھر ہنگارا کو...... کہ جب بادشاہ آ جاتا ہے۔ تو دوسرے بادشاہ کی زندگی ایک نحوست ہوتی ہے۔ اور اسے کسی بھی طرح زندہ نہیں رکھا جا سکتا پھر اس کے بعد ان غلاموں کو لاؤ۔ جو آج تک دیوی اڈینا کے قدموں میں رہے ہیں اور انہیں بھی عزت بخشو! قربانیاں پوری کرو۔ ہر ایک کو قربان کر دو۔

صرف دیوی اڈینا کو اور آذن کو ہم لوگوں پر بادشاہت کیلئے قائم رہنے دو۔ اور یہ الفاظ ایسے تھے۔ کہ اگر دلوں میں دھڑکن باقی رہ بھی گئی ہو تو جلد از جلد اس کا خاتمہ ہو جائے۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ ان سب کو جنہیں آہستہ آہستہ قربان گاہ کے قریب لے آیا گیا تھا۔ یعنی انہیں جو پاتال نگری کے غلام تھے اور ان لوگوں کے ساتھ آئے تھے اور پرمیت سنگھ کو بھی اور ہنگارا کو بھی جو یہاں کا سردار تھا۔ لیکن کرناوتی کی مترنم اور خوبصورت آواز ابھری۔

"پاتال نگری کے باشندو! سنو جو کچھ میں کہہ رہی ہوں۔ سنو، میں تمہارے درمیان واپس آ گئی ہوں اور پاتال نگری کی اجارہ داری ختم ہو گئی ہے۔ اب اس شہر میں روشنی چلے گی۔ کیونکہ میں جس شکل میں تمہارے درمیان آئی ہوں۔ وہ روشنی کی شکل ہے۔ اور میں نے ایک پر نور دل دیا ہے۔ تمہارے دیوتا۔ آذن کو۔، اور سنو، برائیوں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ اور وہ جو قربانیاں قبول کرتا ہے۔ اب اپنی فطرت بدل دے گا۔ لیکن سنو تم اس سرزمین پر موت کی آغوش میں جانے کیلئے نہیں ہو۔ میں پرانی رسم منسوخ کرتی ہوں۔ اور تمہیں نیا قانون دیتی ہوں۔ اس قانون میں خون بہانے کا دور ختم ہوتا ہے۔ محبت اور پیار کے پھول ہر طرف کھلائے جائیں گے۔ مجھے اب گوشت اور خون کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم حسین پھول اور تازہ پھل قبول کریں گے۔ دیکھو! میں خون اور قربانی کی علامت کو اس پانی میں پھینک رہی ہوں۔ اور اب پاتال نگری کے باشندو! جو میں کہوں وہ ہوگا۔ چونکہ میری آمد کو قبول کر لیا گیا ہے۔"

نعمت علی نے حیرانی سے کرناوتی کو دیکھا۔ اور کرناوتی نے سرخ پھول کھائی میں پھینک دیا۔ اور پھر سفید پھول اپنے ہاتھ میں اٹھا کر کہا۔

"سفیدی محبت کی علامت ہوتی ہے۔ لوگ ایک بار پھر شور مچانے لگے۔ دیوی کے الفاظ ان کے لئے بڑی حیرت کا باعث تھے۔ قربانی کی رسم ختم کر دی گئی تھی اور یہ بہتر تو نہیں تھا۔ لیکن جو ہوتا آہورہ کے حکم سے ہوتا تھا۔ اور آہورہ نے خود اپنی زبان سے دیوی اور دیوتا کو تسلیم کیا تھا۔ اور کرایا تھا۔ لیکن آہورہ بھی چالاک تھا۔ اس نے جو پیشکش کی تھی۔ اس کا مطلب کچھ اور تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

۔چنانچہ وہ سرد لہجے میں بولا۔

”نہیں پاتال نگری کے رہنے والو ایسا تو کبھی نہیں ہوسکتا۔تم جانتے ہو کہ دیوتا بھی ان رسومات کو، جو صدیوں سے چلی آرہی ہوں۔منسوخ نہیں کرسکتے۔ انہیں اس کا اختیار نہیں ہوتا۔ یہ میں تم سے کہہ رہا ہو چلو پجاریو! جن کی قربانی مخصوص کی گئی۔انہیں قربان گاہ پر لاؤ.....اور وہ لوگ متحرک ہوگئے۔اور انہوں نے اس عورت کو اور اس کے بعد ہنگارا کو جو یہاں کا سردار تھا۔ پتھر پر جھکا دیا۔تو اس وقت کرناوتی نے چیخ کر نعمت علی کو مخاطب کیا اور کہا۔

”نعمت علی تمہیں اندازہ ہے۔کہ یہ لوگ ہم دونوں کے علاوہ سب کو قتل کردینا چاہتے ہیں۔اب اس وقت تمہاری ہمت کی ضرورت ہے۔جب میں اشارہ کروں تو تم ان پجاریوں کو گولی مار دینا۔جو ہنگارا اور اس عورت کو قتل کرنے والے ہیں۔اور اس وقت تمہاری ہمت کی ضرورت ہے۔اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں۔“نعمت علی ایکدم سنبھل گیا۔

یہ ایک رسک تھا جو اسے لینا تھا۔یعنی اس بات سے فائدہ اٹھانا تھا کہ یہ لوگ بارود کے جادو سے ناواقف تھے۔اور اس وقت جو کیفیت آہورہ کی اندر سے ہوگی۔اس کا انہیں اندازہ تھا۔اس نے غرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”دیر نہ کرو۔قربان کرو۔انہیں کہ پانی میں رہنے والا ہمارا دیوتا ان کا منتظر ہے۔تو پجاریوں نے اپنے خنجر اٹھائے۔اور ان میں سے ایک نے اس دوسری عورت کو اور دوسرے نے سردار ہنگارا کو قتل کرنے کیلئے ہاتھ جھکائے۔

”اور نعمت علی کی پستول سے دو شعلے نکلے۔اور پجاریوں کے سینوں میں سوراخ ہوگئے۔اور ان سے ابلنے والا خون نیچے گرنے لگا۔تو وہ اپنی جگہ سے ہٹے اور کھائی میں آگرے۔اور بدصورت مگرمچھ نے انہیں بھی لپک لیا۔اور مجمع میں ایک کہرام مچ گیا۔تو انتہائی خوفزدہ انداز میں آہورہ نے دیکھا۔اور اسی وقت کرناوتی کی آواز پھر ابھری۔

”نافرمانی کرنے والو! تم نے دیکھا نافرمانوں کو اور اگر ہماری نافرمانی کی گئی۔تو اس کے بعد آسمانوں سے شعلے برسیں گے۔اور ایسی ہی آوازیں ابھریں گی۔ اور بہت سے لوگ خون میں نہا جائیں گے۔ہم امن کا پیغام لائے ہیں۔اور تم یہ سب کچھ کررہے ہو۔اور اے شخص! تو اب اس قابل نہیں رہا۔کہ ہماری پیروی کرے ۔اور ہمارے احکامات دوسروں تک پہنچائے۔لیکن اب بھی وقت ہے۔جا اپنی اصلاح کر۔،،

اس کے بعد ایک شور برپا ہوگیا۔اور یہ رسم فوراً منسوخ کردی گئی۔میں خوفزدہ تھا۔اور خوشی کے نعرے لگا رہا تھا۔اور آہورہ ایک طرف چل پڑا۔اس کے بعد وہ پجاری یہاں آئے تھے۔واپس پلٹے اور انہوں نے دیوی اڈینا، اور دیوتا آذن! کو واپس چلنے کیلئے کہا۔تب یہ سب اسی محل میں یکجا ہوگئے۔جہاں سے گذر کر یہاں تک پہنچے تھے۔اور اس وقت کرناوتی نے وہ کارنامہ دکھایا تھا۔جسے زندگی کی آخری سانس تک فراموش نہیں کیا جاسکتا تھا۔اور سب اس بات کے معترف تھے کہ کرناوتی ایسا جرأت مندانہ اقدام نہ کرتی تو یہ سارے کے سارے مارے جاتے۔اب سب ہی اپنی جگہ جمع ہوگئے تھے۔اور اس بات پر ایک دوسرے سے اظہار خیال کررہے تھے۔نعمت علی نے کہا۔

”یہ سب کچھ تو ہو چکا ہے۔لیکن اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ایک دشمن تعمیر کرلیا ہے اور وہ یقینی طور پر ہماری گھات میں لگ جائے گا۔

”تمہاری آواز پر میں اپنی آواز بلند نہیں کرسکتا تھا۔میری تو دلی آرزو یہ تھی۔کہ اس طرح اس ایک نافرمان کی حیثیت سے قتل کردیا جاتا۔اور یہ زیادہ بہتر ہوتا۔

”ہاں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟“

”فی الحال تو وقت کا انتظار اور اس کے بعد دیکھنا ہوگا۔کہ آگے کیا کیا جائے؟“

”صورتحال واقعی بے حد خوفناک تھی۔تنہائی میں نعمت علی اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔وہ موقع نہایت ہی مناسب تھا۔جب نافرمانی کے جرم میں آہورہ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔آہورہ کی شکل میں ایک شیطان تھا۔جو ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے تھا۔وہ جانتے تھے کہ شیطان صفت کاہن نے ان کی حقیقت جان لی ہے۔اور وہ ضرورت سے زیادہ چالاک ہے۔جبکہ اس کی نسبت سردار ہنگارا ایک معصوم صفت آدمی تھا۔اور اس نے انہیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔

چنانچہ اس وقت جو کچھ کرنا تھا۔بہت سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ظاہر ہے آہورہ اپنا اقتدار ختم ہوتے دیکھنا پسند نہیں کرے گا۔تو اس وقت نعمت علی نے تنہائی میں جو کچھ سوچا وہ بڑے کام کی باتیں تھیں۔پرمیت سنگھ اس کے پاس موجود تھا۔اور پردھان سنگھ بھی اور ساری صورت حال پرمیت سنگھ اور پردھان سنگھ کے علم میں آچکی تھی۔پردھان سنگھ نے آہستہ کہا۔

”اور تم لوگ نہیں جانتے کہ یہ بوڑھا پجاری کس قدر خوفناک شخصیت کا مالک ہے۔میں اس وقت بے شک بچی تھی۔لیکن یہ یہاں جو کچھ کرتا تھا۔اس کا تھوڑا بہت علم مجھے بھی ہے۔اور میں تم لوگوں کو ہوشیار کررہی ہوں۔کہ اس کینہ پرور سے بچنے کی کوشش کرنا۔

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔کہ ہم کیا کریں۔وہ بیچارے غلام تو ایک طرح سے سمجھو کہ اپنی زندگی کے بہت بڑے عذاب میں گرفتار ہیں۔

”بہت سی باتیں سوچنے کیلئے ہیں۔مثلاً یہ کہ ان پہاڑوں میں سرنگوں کے جال بچھے ہوئے ہیں۔اور سرنگوں کے اس جال سے صرف آہورہ ہی واقف ہے۔ جس طرح وہ کرناوتی کے کمرے میں گھس آیا۔

”ہاں واقعی ہمیں بہت غور وخوض کرکے سارے کام کرنے ہیں تو پھر بہت سے مشوروں کیلئے سوچا گیا۔ اور ہابون اور کرناوتی کو بھی اس میں شامل کیا گیا۔جو بہت ضروری تھا۔لیکن بہرحال یہاں کے رسم ورواج کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔کیونکہ یہ لوگوں کا طریقہ زندگی تھا۔پھر دوسرے دن سب ایک ہوگئے۔پجاری وہاں موجود تھے۔اور انہیں ہر طرح کی سہولتیں فراہم کررہے تھے۔اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا۔کہ یہاں کیا ہوسکتا ہے۔یا کیا ہونا چاہئے۔جب سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور کرناوتی نے کہا۔

”مسٹر نعمت علی حالات واقعی سنگین نوعیت اختیار کرچکے ہیں۔اور ہم اس مسئلے میں واقعی پریشان ہیں۔ اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے۔وہ تو خیر ہر حال میں ایک مناسب قدم تھا۔اور کچھ نہیں۔تو ہم ان چند لوگوں کی زندگی بچانے میں تو کامیاب ہوگئے۔لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔کہ اب کیا کیا جائے۔“

میں خود پریشان ہوں۔بہرحال میں یہ سمجھتا ہوں۔کہ یہ جگہ ہمارے لئے سب سے زیادہ مخدوش ہے ۔کیونکہ یہاں ان پجاریوں کی اجارہ داری ہے۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان سرنگوں میں کون کہاں سے کہاں تک آجاسکتا ہے۔جس کے بارے میں ہمیں کچھ نہیں معلوم۔“

”میں اس سے اتفاق کرتی ہوں۔“

”کوئی ایسی تدبیر، کوئی ایسی ترکیب ہو۔جس سے ہم سب سے پہلے یہاں اپنا اور“اپنے ساتھیوں کا تحفظ کرسکیں۔“

”یہ تو بے حد ضروری ہے۔“

”کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس جگہ کے بجائے ہم کہیں اور قیام کرنے کے بارے میں سوچیں۔“

”کیا یہ مشکل نہیں ہوگا؟“

”دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آہورہ اب ہمارے خلاف کیا طریقہ کار اختیار کرے گا۔“

”یہ سب سوچنا ہوگا۔“

”میں صرف ایک تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ ہابون نے کہا۔

”بولو......کیا۔؟“

”یہ تو تم نے دیکھا کہ تمہارے پستول سے نکلی ہوئی دو گولیوں نے حالات کا نقشہ بدل دیا۔اور یہ بات

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

خوشی کی ہے۔ یہاں کے لوگ بارود سے واقف نہیں ہیں ۔ ہمارے ساتھ جو بارود یہاں تک پہنچا ہے۔ یوں سمجھ لو کہ اس وقت ہماری زندگی کا ضامن ہے۔"

"بے شک ایسا ہے۔"

"تو پھر ۔ سب سے پہلے اس کے تحفظ کا بندوبست کیا جائے۔"

"مگر یہاں پجاریوں کی جو اجارہ داری ہے۔ کیا وہ ہمیں ایسا کرنے کا موقع دیں گے۔ اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ اس وقت ہمارے خلاف کیا سازش ہورہی ہوگی۔"

"پھر بھی بارود کا ذخیرہ ابھی میری تحویل میں ہے۔ اور یہ تمام ہتھیار جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ ان کا تحفظ سب سے پہلے کرلیا جائے۔" لیکن پھر کوئی فیصلہ بھی نہیں کر پاتے تھے۔ کہ پجاری نے آ کر اطلاع دی۔

"سردار ہنگارا باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔" اور یہ سب چونک پڑے...... نعمت علی نے فوراً کہا۔

"اسے ہمارے پاس لایا جائے ......" پھر پجاری جب باہر نکل گیا۔ تو نعمت علی نے کہا۔

"یہ ایک نام تو ہمارے ذہن سے نکل گیا تھا۔ اگر ہم اسے قبضے میں کرلیں تو کم از کم عارضی طور پر ہمیں سہولتیں حاصل ہوسکیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایسا کرلیا جائے۔" اور پھر زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی چونکہ سردار ہنگارا اندر داخل ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر ایک عجیب سی کیفیت تھی اندر داخل ہونے کے بعد وہ ان کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا۔ اور دیر تک سجدے میں پڑا رہا۔ تو۔ کرناوتی نے کہا۔

"اٹھو ہنگارا، تم ہمارے لئے باعث پسندیدگی ہو اور سب مناسب وقت میں تم نے یہاں آنے کا فیصلہ کیا۔"

ہنگارا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عقیدت نظر آرہی تھی۔ تب اس نے کہا۔

"دیوی کون کہتا ہے ۔ کہ تیری آمد باعث برکت نہیں میں تو ان لوگوں کی زندگی بچ جانے پر ہی اس بات کا قائل ہوگیا ۔ پاتال نگری سے اندھیرا دور ہو جائے گا۔

"ہنگارا تیری زندگی بھی بچ گئی ۔ مگر تو اگر مناسب سمجھے تو مجھے کچھ سوالات کے جوابات دے۔" کرناوتی نے کہا۔

"دیوی اپنی زبان سے کچھ کہے تو ہنگارا کی مجال کہ وہ اس سے منحرف ہوجائے۔"

"پہلے یہ بتا ہنگارا کہ یہاں اس کمرے میں کتنے ایسے دروازے ہیں جہاں سے پجاری اندر داخل ہوسکتے ہیں۔"

"صرف یہ......" ہنگارا نے جواب دیا۔

"کہاں ہے۔ وہ؟"

"اس طرح ۔" ہنگارا نے اسی طرح اشارہ کیا جدھر وہ پتھر کی گول چٹان دروازے کی مانند کھل جاتی تھی۔

"کوئی ایسا عمل جس کے ذریعے دروازہ نہ کھلے۔"

"ہاں ۔ ہے۔" ہنگارا نے کہا۔ اور اس کے بعد چٹان کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس نے ایک ایسی جگہ ہاتھ رکھ کر دبایا جو ان کے علم میں پہلے نہیں تھی۔ اور اس کے بعد وہ واپس آ گیا۔

"اب یہ جگہ اندر سے کھولنے کی کوشش کی جائے گی تب بھی نہیں کھلے گی۔"

"اس کمرے میں اور کوئی ایسی جگہ۔"

"نہیں جہاں تک میرے علم میں ہے۔"

"تو پھر ہنگارا ہم تجھ سے بہت سے سوالات کرنا چاہتے ہیں۔ اصل میں قربانی کی جو رسم منسوخ ہوئی ہے ۔ اس کے بارے میں یہ سوچا اور دیکھا گیا ہے۔ کہ آہورہ نے اسے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ ہوسکتا ہے کہ آہورہ کوئی غلط عمل کرنے کی کوشش کرے۔" ہنگارا نے گردن خم کرلی اور آہستہ سے بولا۔

"دیوی سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ آہورہ کیا

ہے؟"

"لیکن ہم صدیوں سے یہاں دور ہیں ۔ اور اب ہم واپس آئے ہیں تو آہورہ ہماری آواز پر اپنی آواز بلند کرنا چاہتا ہے۔"

"دیوی آپ کو بہت سی باتوں کا علم نہیں ہوگا۔ لیکن آپ کا یہ غلام حاضر ہے۔ اور سب سے پہلے میں شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں اپنی جان کے بچ جانے کا۔ اور یہ حیرت انگیز اتفاق ہے ۔ کہ اس سے پہلے آہورہ میرے قتل میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ لیکن یہ ایک ایسا موقع تھا۔ اور اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ کہہ کر کہ جب دیوی اور دیوتا خود پاتال نگری میں حکمرانی کرنے آ گئے۔ تو پھر کسی سردار کی ضرورت نہیں اور سردار کو قربان کردیا جائے۔ وہ اپنی کوشش میں یقینی طور پر کامیاب ہوجاتا۔ اگر دیوی میری جان بخشی نہ کرتی اور اس کے ساتھ ہی ان تمام افراد کی جو کچھ وقت کے بعد زندگی سے محروم ہونے والے تھے۔

"سن ہنگارا۔ کیا پانی میں رہنے والے کیلئے۔ قربانیاں ضروری ہوتی ہیں۔"

"ہاں ۔ مقدس دیوتا! ہزاروں سال سے اس پانی کا کلیس ہے۔ اور یہ روایت پجاریوں ہی نے مشہور کی ہوئی ہے کہ کہ اگر اسکے حضور قربانیاں نہ دی جائیں۔ تو تباہی اور بربادی نازل ہوتی ہے۔"

"کیا کبھی ایسا ہوا کہ یہ قربانیاں نہ دی گئی ہوں۔"

"بھلا کس کی مجال تھی۔"

"گویا، قربانیوں کی یہ رسم ہزاروں سال سے جاری ہے۔"

"ہاں...... دیوی اسے کون منسوخ کرسکتا تھا۔"

"اچھا اب ایک اور خاص بات بتا ۔ آہورہ کہاں رہتا ہے؟"

"وہ بہت سی جگہوں پر رہتا ہے۔ دیوی۔ اسکے ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی عبادت گاہ میں پایا جاتا ہے۔ اور کبھی ایسے ویرانوں میں جہاں اس کی موجودگی کا تصور بھی نہ کیا جاسکے۔ حالانکہ وہ لاغر اور ضعیف ہے لیکن اس کی طاقت ناقابل یقین ہے ۔ اور اسی لئے اسے سب سے برتر اور اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔"

"کیا پجاریوں کا یہ خاندان ہمیشہ سے اس شکل میں چلا آیا ہے؟"

وہاں...... آہورہ سے پہلے اس کا باپ اس سے پہلے اس کا باپ اور اس سے پہلے اس کا باپ، اس طرح صدیوں سے یہ سلسلہ چلتا چلا آرہا ہے۔"

"کیا۔ آہورہ کی بیوی بھی ہے؟"

"نہیں دیوی۔ پجاریوں کی بیویاں نہیں ہوتیں۔"

"تو ان کی نسلیں؟"

"وہ مقدس قربانیاں قبول کرتے ہیں اور اس وقت تک جب تک جوان رہتے ہیں۔ حسین عورتیں ان کی خدمت کے لئے موجود ہوا کرتی ہیں ۔ اور ان میں سے جو بھی حسین عورت بڑے پجاری کو پسند آتی ہے۔ وہ اس وقت تک اس کی تحویل میں رہتی ہے۔ جب تک اس سے مقصد پورا نہ ہو جائے، اور جب وہ کسی خوبصورت بچے کو جنم دے دیتی ہے۔ تو اس کی قربانی لازم ہوجاتی ہے۔ اور اس بچے کی پرورش مقدس پجاری کے بیٹے کی حیثیت سے ہوتی ہے۔"

"اور باقی عورتیں؟"

"نہیں ان کے ہاں اولاد نہیں ہوتی ۔" ہنگارا نے سادگی سے بتایا۔ اور یہ لوگ حیرت سے اس آفاقی کہانی کو سنتے رہے۔" پھر نعمت علی نے سوال کیا۔

"سردار ہنگارا یہ رسم شروع سے جاری ہے، کیا تو اس کا مقصد بتا سکتا ہے؟"

ہنگارا نے بے چین نگاہوں سے ان سب کو دیکھا۔ پھر بولا۔

"مقدس اڈینا کے ساتھ آنے والے تیرا احترام ویسے بھی میں کرتا ہوں ۔ لیکن تو نے ہی روشنی والی صورت بھیجی تھی۔ ان کاہنوں کیلئے جو میری زندگی لینے کے درپے تھے۔ چنانچہ میں تیری دل سے عزت اور قدر کرتا ہوں۔ آہ، تو مجھ سے وہ سوالات نہ کر جن کا جواب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دینے کے بعد میری زندگی کی ڈور تنگ ہو جائے۔ اور میں موت سے ہم آغوش ہو جاؤں۔"

"اگر تو دل سے یہ بات تسلیم نہیں کرتا کہ دیوی اڈینا اور دیوتا آذن تیرے درمیان موجود ہیں۔ تو پھر تو موت سے خوفزدہ ہو۔ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں کہ تیری موت اس طرح واقع نہیں ہوگی۔ اور ہم تیری حفاظت کریں گے سرخ شعلوں اور دھاکوں سے۔"

ہنگارا کے چہرے پر غور کے آثار پھیل گئے۔ پھر اس نے کہا۔

"عظیم دیوی! اور دیوتا۔ پاتال نگری کے اصل بادشاہ کالے لباس میں ہوتے ہیں۔ جو پجاریوں کا روپ دھارے ہوتے ہیں۔ اور وہ سردار جو حکمران ہوتا ہے۔ صرف نام کا سردار ہوتا ہے۔ ہر معاملے میں انہیں پجاریوں کا حکم چلتا ہے اور سب سے زیادہ طاقتور یہ ہی لوگ ہوتے ہیں۔ اور صدیوں سے ہی ایک خاندان بڑے پجاریوں کے عہدوں پر فائز ہوتا ہے۔ یعنی باپ کا بیٹا جیسا کہ میں نے تجھے بتایا۔ ہاں سردار کو خاص موقعوں پر اپنی ذمہ داریوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور یہی لوگ مل کر سردار منتخب کرتے ہیں۔ اور جب ایک سردار سے تھک جاتے ہیں۔ تو اسے بھینٹ چڑھا کر دوسرا منتخب کر لیتے ہیں۔ یہ پہلے سردار کے خاندان سے ہوتا ہے۔ یا اس خاندان سے جو ان پجاریوں کی باتیں مانتا ہے۔

اور یہ کشمکش تو ہمیشہ سے ہے کوئی سردار اگر پجاریوں کی قوت کو آنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کی موت بہت دردناک ہوتی ہے۔ اور کوئی حیثیت نہیں ہے۔ سردار کی۔ اور یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ اور پھر یہ لوگ فیصلہ کرتے ہیں کہ آبادی کتنی زیادہ ہوگئی ہے۔ اور اس آبادی کو کم کرنے کیلئے وہ پانی والے دیوتا کا حکم سنا کر کہ وہ قربانی چاہتا ہے اور اس کے بعد قربانی کے نام پر "پاتال نگری" والوں کے گروہ پانی میں پھینک دیئے جاتے ہیں اور ان کا مال و دولت اور ان کا ارباب سب کچھ عبادت گاہ کی تحویل میں آجاتا ہے۔ اور یہ سب سے بہتر اور بڑے لوگ ہیں کہ ایسا ہوتا چلا آیا ہے۔"

یہ سب غور سے ہنگارا کی بات سن رہے تھے۔ اور غور کر رہے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ نعمت علی کے لئے خواب جیسا تھا۔ انسانی تصور سے دور اس پاتال نگری میں ایک خوفناک ہنگامہ ہوا۔ ہنگارا کی مدد سے نعمت علی بہت سے معاملات میں کامیاب ہوا۔ راجہ پرمیت سنگھ، کرناوتی اور پرداھن سنگھ اپنی چالیں چل رہے تھے۔ لیکن نعمت علی صدق دل سے صرف خیرالدین خیری کی رہائی کے لئے سرگرداں تھا۔ اور عین اس وقت جب پرداھن سنگھ کرناوتی کو دیوی کی حیثیت سے پاتال سنگھ گھاس پر بٹھانے والا تھا۔ تو پورن وتی نے پرداھن سنگھ اور کرناوتی کو پاتال کی گہرائیوں میں دھکیل دیا۔ اور خود پاتال سنگھ گھاس پر بیٹھ گئی اور پاتال نگری والے دیوی کے آگے سرنگوں ہو گئے۔ آہورہ اپنی موت مارا گیا۔ پورن وتی کی خواہش پوری ہوگئی۔ تو اس نے پاتال نگری پر اپنا اقتدار قائم کیا۔ اور اپنے محسن و کرم راج یا نعمت علی کو بیشکش کی کہ وہ اسے پاکستان کی سرحد کے دوسری طرف پہنچا دے گی۔ لیکن نعمت علی کا دل غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا کہ اب خیرالدین خیری کے لئے کیا کرے۔ اور جب اسے خیرالدین خیری کی آواز اپنے کانوں میں سنائی دی تو اس کا دل خوشی سے مسور ہوگیا۔ خیرالدین نے کہا۔

"پردھان سنگھ کی موت کے بعد میری روح اس کے تسلط سے آزاد ہوگئی۔ میری جان نعمت علی اب تمہیں کسی پورن وتی کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ ذرا آنکھیں بند کرو۔ اور جب نعمت علی نے آنکھیں کھولیں تو اپنے وطن پاکستان میں خود کو اپنے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے پایا۔ زندگی آگے تو بڑھے گی ایک بار پھر خیرالدین خیری اپنی آگے کی کارروائیوں کے لئے آزاد ہیں۔ اور اگر ان کی زندگی کے کچھ واقعات اور ہمارے علم میں آئے تو ہم آپ کو ان سے ضرور آگاہ کریں گے۔

ختم شد

(آئندہ ماہ ایک نئے سلسلے میں ملاقات ہوگی)

ہمزاد

محمد عمران قریشی۔ کوئٹہ

دوشیزہ اپنے منگیتر کے ساتھ شہر جاچکی تھی لیکن گاؤں والوں نے اس دوشیزہ کی موت کی تصدیق کردی کہ دوشیزہ اپنی طبعی موت مری ہے، ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ جسم میں خون بنانے والے خلیوں کی مقدار بہت تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔ رگ و پے میں سنسنی پھیلاتی ایک اچھوتی انوکھی دلفریب کشش اور پر بہار کہانی

گاڑی کی وصل کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ میں نے چونک کر کھڑکی سے باہر نگاہ دوڑائی۔ گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ بادلوں کی دولت کافی حد تک اندھیرا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ حالانکہ ابھی صرف سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں نے جسم پر موجود چادر کو اچھی طرح جسم کے گرد لپیٹا۔ اور بیگ اٹھا کر دروازے کی جانب چل دیا۔ سعید آباد کا اسٹیشن زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں گاڑیاں مختصر وقت کے لئے قیام کرتی تھیں۔ اس لئے اسٹیشن پر اترنے والا واحد مسافر میں ہی تھا۔ اسٹیشن پر قدم رکھتے ہی ماحول بادلوں کی گھن گرج سے گونج اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا۔ میں بھاگ کر ریلوے اسٹیشن کی عمارت سے باہر نکلتا چلا گیا۔ سعید آباد ایک پہاڑی بل اسٹیشن کا درجہ رکھتا تھا۔ سرسبز پہاڑوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھرا ہوا سعید آباد ہمیشہ سے میری یادوں کا مرکز رہا۔ کیونکہ یہ میری ہونے والی منگیتر کا گاؤں تھا۔ نین تارا جسے میں نے گزشتہ آٹھ سالوں کے دوران نہیں دیکھا تھا۔ لیکن پھر بھی میری سوچوں کا مرکز وہی رہی تھی۔

"اوئے....." مجھے درختوں کے جھنڈ کے درمیان سے مردانہ آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر درختوں کی جانب دیکھا۔ گھوڑا گاڑی پر بیٹھا کوچوان چلا چلا کر مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ بارش کا طوفان مزید سے مزید تر بڑھنے لگا تھا۔ میرے کپڑے اور چادر پانی سے شرابور ہو رہے تھے۔ میں نے چمڑے کے بیگ کو سنبھالا۔ اور دوڑتا ہوا گھوڑا گاڑی کے اندر جا بیٹھا۔ یہاں اطمینان و عافیت کا وہ عالم موجود تھا۔ جیسا مجھے نین تارا کے متعلق سوچتے ہوئے محسوس ہوتا تھا۔ کوچوان نے مسکراتے ہوئے..... میرے بھیگتے ہوئے وجود کی جانب دیکھا۔ پھر سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

"یقیناً تم نے سعید آباد جانا ہوگا؟ یہاں سے قریب ترین گاؤں میں ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بھیگی ہوئی چادر کو اتار کر ایک جانب رکھے ہوئے چمڑے کے بیگ پر پھیلا دیا۔ کوچوان نے گھوڑا گاڑی کی باگ کھینچی۔ گھوڑا ہنہناتے ہوئے سڑک کی جانب چل دیا۔ مجھے ایک ہفتہ پہلے کی وہ ملاقات یاد آنے لگی۔ والد صاحب بستر مرگ پر موجود تھے۔ اور ان کے آخری الفاظ یہ تھے۔

"میرے بچے .....سعید آباد میں تمہاری پھوپھی رہتی ہے۔ میرے مرنے کے بعد وہیں چلے جانا۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ نین تارا بچپن سے تمہارے ساتھ منسوب کر دی گئی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ طاہرہ کو اپنا وعدہ بھولا نہیں ہوگا۔ علاوہ ازیں وہ تمہارے مستقبل کے متعلق بھی تمہاری مدد گار ثابت ہوگی۔ طاہرہ کے شوہر کی گاؤں سے کچھ دور کریانے کی دکان ہے۔ دکان بہت اچھی چلتی ہے۔ اس لئے ان کی گزر بسر بھی بہترین ہی رہی ہے۔"

کہیں قریب نوّاح کی آواز کے ساتھ بگلی گری۔ اور میں چونک کر حقیقت کی دنیا میں واپس چلا آیا۔ گھوڑا گاڑی پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکی تھی۔ سوچوں کا تانا ختم ہونے والا سلسلہ دوبارہ چل نکلا۔ والد صاحب کی وفات کے بعد میرے لئے دو راستے باقی بچے تھے۔ ماموں کے پاس کویت جانے کا راستہ..... یا پھر اپنی سوچوں کے محور نین تارا کے پاس جانے کا ابدی راستہ..... یہ وہ راستہ تھا۔ جہاں تک جانے کے لئے میں ہمیشہ بے قرار رہا تھا۔ والد صاحب کے سوئم کے بعد میں نے ماموں کو خط لکھا۔ اور اپنی آمد کے متعلق آگاہی دی۔ تب ان کا محبت بھرا جواب موصول ہوا۔ جس کا خلاصہ یوں تھا۔

"برخوردار..... میں تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔ اگر مالی معاونت کی ضرورت ہو تو اگلے خط میں لکھ دینا میں رقم بھجوا دوں گا۔"

مجھے رقم کی ضرورت نہیں تھی۔ والد صاحب کا بنایا ہوا گھر اونے پونے داموں بیچنے کے بعد میری جیب نوٹوں کے بوجھ سے دوہری ہوئی چلی جا رہی تھی۔ اب دل میں ایک ہی خواہش پاتی بنی تھی۔ نین تارا سے ملاقات..... اور پھوپھی سے تفصیلی بات چیت..... میں نین تارا کو اپنانے سے پہلے اپنے اچھے مستقبل کا آغاز کر دینا چاہتا تھا۔ میری سعید آباد آمد کا مقصد یہی تھا۔ کہ میں پھوپھی کو پرانا وعدہ یاد دلا کر اس وعدے کو حتمی صورت دینا چاہتا تھا۔ تاکہ مطمئن ہو کر دیارِ غیر میں اپنے مستقبل کا آغاز کر سکوں۔ گھوڑا گاڑی جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ گاؤں قریب آ چکا تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ گھوڑا گاڑی پھوپھا کی صدیوں پرانی کریانے کی دکان کے بالکل سامنے رکی کھڑی تھی۔ دکان کی حالت میں رتی برابر بھی تبدیلی واقع نہیں ہو پائی تھی۔ ویسے کی ویسی ہی تھی۔ جیسی آٹھ سال پہلے تھی۔ مجھے پھوپھا کی سوچ کے متعلق سوچتے ہوئے ہنسی آ گئی۔ ان کا ہمیشہ سے یہی کہنا تھا۔

"جب جیسی اچھا خاصا دودھ دے رہی ہو تب اسے سجانے سنوارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ صرف پیسے

کا ضیاع ہو سکتا ہے۔ آپ کے منافع میں اضافے کا باعث نہیں بن سکتا۔" ان کی کرائے کی دوکان کا مالک گاؤں کا جاگیردار تھا۔ اس لئے پھوپھا کی سوچ کے مطابق کرائے کی دکان پر پیسہ لگانا وقت اور پیسے کے ضیاع کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔ اس لئے سوچ کے لحاظ سے ان کی دکان میں تبدیلی واقع نہیں ہو پائی تھی۔ بہرکیف دوکان کے باہر دو تین گاہک موجود تھے۔ ان کے فارغ ہونے کے بعد پھوپھا نے نظر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ دوکان میں تبدیلی بھلے نہ آئی ہو۔ لیکن ان آٹھ سالوں کے دوران میرے وجود میں نمایاں تبدیلی واقع ہوئی تھی۔ قد کاٹھ نکل آیا تھا۔ چہرے کی معصومیت کے بجائے سنجیدگی اور بردباری نے جگہ لے لی تھی۔ چہرے کے خطوط بھی تقریباً تبدیل ہو چکے ہونگے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ چچا کے ماتھے پر سوچ کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ پھر ان لکیروں کی جگہ فکر انگیز لکیریں نمودار ہوئیں۔ اور وہ پاٹ لہجے میں بولے۔

"میں نوکر کو تمہارے ہمراہ کر دیتا ہوں۔ وہ تمہیں گھر لے جائے گا۔" ان کی سرد مہری نے میری ان امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ جن کی توقع میں..... میں اپنا گھر بار تج کر چھوٹے سے پہاڑی گاؤں کی جانب کھنچا چلا آیا تھا۔ مجھے اپنے اقدام پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ اور میں بوجھل قدموں کے ساتھ نوکر کے ہمراہ گھر کی جانب چل دیا۔ پھوپھی کا گھر گاؤں کے پاس سرسبز کھیتوں کے سامنے بنا ہوا تھا۔ بچپن میں..... میں نین تارا کے ساتھ تمام دن ان کھیتوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتا تھا۔ وہ گندم کی فصل کے درمیان چھپ جایا کرتی تھی۔ اور میں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈتا رہتا تھا۔ اکثر ڈھونڈ لیتا تھا۔ لیکن زیادہ تر ناکامی حصے میں آتی تھی۔ گھر کا دروازہ پھوپھی نے کھولا۔ کچھ دیر ٹکٹکی باندھے میری جانب دیکھتی رہیں۔ پھر چہرے کے تاثرات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ حیرت و استعجاب نے سوالیہ نگاہوں کی جگہ لی۔ پھر بے اختیار پھوپھی میرے ساتھ لپٹتی چلی

سنہری چیزیں

☆ تین چیزیں حاصل کرو۔
علم، اخلاق، شرافت۔

☆ تین چیزوں سے پرہیز کرو۔
بداخلاقی، جھوٹ، غیبت۔

☆ تین چیزوں کا احترام کرو۔
والدین، اساتذہ، قانون

☆ تین چیزوں کو پسند کرو۔
رحمدلی، سچ گوئی، انکساری

☆ تین چیزوں پر ایمان رکھو۔
توحید، رسالت، جزا و سزا

☆ تین چیزوں کو کر کے بھول جاؤ۔
نیکی، احسان، خیرات

☆ تین چیزیں سمجھ کر اٹھانی چاہئیں۔
قسم، قدم، قلم

(محمد عثمان علی۔ میاں چنوں)

گئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور وہ پیار سے بولیں۔

"ناصر میرے بچے..... تمہاری شکل و صورت بھائی صاحب سے مشابہت رکھتی ہے۔ پہلی نظر میں مجھے یوں گمان ہوا۔ جیسے بھائی صاحب سامنے کھڑے ہوں۔ آؤ اندر آ جاؤ۔" انہوں نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ اور میں بے چین قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہو گیا۔ کمرے میں بٹھانے کے بعد پھوپھی میرے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرنے باورچی خانے کی جانب چل دیں۔ بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن بوندا باندی اب بھی ہو رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد سے اب تک نا جانے کیوں...... مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی مجھے گھور گھور کر دیکھ رہا ہو۔ میں نے کمرے میں نگاہ دوڑائی۔ کمرہ مختصر سامان سے مزین تھا۔ زمین پر دری بچھی ہوئی تھی۔ پرچھتی پر اسٹیل کے برتنوں کے علاوہ گلدان اور تبت پاؤڈر وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں چارپائی دھری ہوئی تھی۔ جس پر چادر بچھی ہوئی تھی۔ اچانک میری نگاہ دروازے کی جانب اٹھی۔ اور میں نے اسے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ لیا۔ کیا وہ نین تارا تھی۔ یا پھر گھر کی کوئی ملازمہ...... میں اندازہ نہیں لگا پایا۔ لیکن بہر حال وہاں کوئی موجود ضرور تھا۔ اب نہیں تھا۔ میں پھرتی کے ساتھ اٹھ کر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ پھر میں نے دروازے کے ساتھ کان لگا دیئے۔ زنانہ کپڑوں کی سرسراہٹ سن کر میرے لبوں پر خفیف مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اور میں نے جھٹکے کے ساتھ دروازے کا چوپٹ کھول دیا۔ وہ دروازے کے سامنے کھڑی حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھ رہی تھی۔ بے انتہا خوبصورتی کا مجموعہ...... سرو قد...... آنکھیں جھیل کی مانند...... اور ہونٹ سیب کی پتلی قاشوں کی طرح...... میں سب کچھ بھول بھال کر ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا چلا گیا یہ میری نگاہوں کی تپش سے گھبرا کر اس نے جسم پر موجود چادر کو درست کیا۔ پھر کسی ہرنی کی مانند قلانچیں بھرتی ہوئی سامنے موجود کمروں کی جانب بھاگتی چلی گئی۔ پھوپھی باورچی خانے سے نکل کر کمرے کی جانب آ رہی تھیں۔ وہ عجلت میں بھاگتے ہوئے انہیں نہیں دیکھ پائی۔ اور ٹکرا کر زمین پر گرتے گرتے بچی۔ پھوپھی نے جھنجھلائے ہوئے لہجے میں اسے برا بھلا کہا۔ پھر جب ان کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ تب وہ مسکراتے ہوئے میری جانب چلی آئیں۔ اور معنی خیز لہجے میں ہمکلام ہوئیں۔

"وہ نین تارا ہے۔ تمہاری منگیتر...... بچپن سے تمہارے نام کے ساتھ منسوب...... مجھے یقین ہے۔ کہ بھائی صاحب نے تمہیں نین تارا کے متعلق بتایا ہی ہوگا۔ اگر نہیں...... تو کان کھول کر سن لو۔ میں جلد از جلد اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہو۔ تو رات کو اپنے پھوپھا کے سامنے بیان کر دینا۔ بصورت دیگر بندھن میں بندھنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔" انہوں نے مختصر وقت کے لئے گفتگو کا سلسلہ منقطع کیا۔ پھر دوبارہ ہمکلام ہوئیں۔

"تمہارے لئے پانی کا بندوبست کر دیا ہے۔ نہا دھو کر سفر کی تھکن اتار لو۔ چھ بجنے والے ہیں یہ تمہارے پھوپھا رات کو آٹھ بجے تک دکان بند کر کے آتے ہیں۔ میرے خیال کے مطابق سوچنے کے لئے اتنا وقت کافی ہے۔" میری زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اس لئے جواب نہیں دے پایا۔ اور خاموشی کے ساتھ غسل خانے کی جانب چل دیا۔

رات کے کھانے پر پھوپھا اور پھوپھی کے علاوہ نین تارا بھی موجود تھی۔ کھانا نہایت خاموشی کے ساتھ تناول کیا گیا۔ کمرے میں عجب قسم کی بے چینی کا دور دورہ تھا۔ پھوپھا کا سرد مہرانہ رویہ اب بھی برقرار تھا۔ انہوں نے سوائے والد صاحب کی وفات پر تاسف و افسوس کرنے کے علاوہ مزید بات چیت سے پرہیز کیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد پھوپھی نے سر کے اشارے سے نین تارا کو کمرے سے باہر جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود برتن سمیٹنے لگیں۔ نین رانا نے شرارت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ پھر اٹھلاتے ہوئے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔ تب پھوپھی بولیں۔

"میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہوں۔ نین تارا کے متعلق......؟"

پھوپھا نے جیب میں سے بیڑی اور ماچس نکالی۔ پھر بیڑی سلگاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں بولی۔

"آج دکان میں کام بہت زیادہ تھا۔ میرا جسم تھک کر چکنا چور ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت کسی بھی گھمبیر موضوع پر بات چیت کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ پھر کبھی سہی۔" انہوں نے بات چیت ختم کی۔ اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ میں نے شرمندہ نگاہوں سے پھوپھی کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بھی افسوس و اضلال کی کفت نمایاں تھی۔ پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔

"تمہارے پھوپھا تمام دن کام کی بدولت تھک جاتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ اس وقت موضوع نہیں چھیڑنا چاہئے تھا۔ بہر حال جمعے کو بات کروں گی۔ جمعے والے دن دکان بند رہتی ہے۔ اور تمہارے پھوپھا تمام دن گھر پر ہوتے ہیں۔" یوں بات چیت ہوتے ہوتے رہ گئی۔

دوسرے دن پھوپھا کے دکان جانے کے بعد پھوپھی بھی برقعہ پہن کر سودا سلف لینے بازار چلی گئیں۔ میں ان کے ارادوں سے بخوبی باخبر تھا۔ انہوں نے ایسا کر کے ہم دونوں کو تنہائی میں بات چیت کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ تاکہ ہم مستقبل کے متعلق بات چیت کر سکیں۔ نین تارا چھت پر کپڑے سوکھنے کے لئے ڈال رہی تھی۔ موقع اچھا تھا میں بھی چھت پر جا پہنچا۔ چار دیواری کے دوسرے جانب سرسبز کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ اینٹوں کے بھٹوں سے سیاہ دھواں نکل کر آسمان کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ کھیتوں سے کچھ ہٹ کر درختوں کا وہ جھنڈ موجود تھا۔ جہاں بچپن میں نین تارا چھپ جایا کرتی تھی۔ پھر میری لاکھوں کوششوں کے باوجود بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے نین تارا کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔

"مجھے بچپن کے دن آج تک نہیں بھول پائے۔ کتنے خوبصورت اور بے فکری کے دن تھے۔ تمہارا اچانک چھپ جانا اور پھر نمودار ہو جانا۔ میرا کھیتوں میں بھاگتے پھرنا...... کیا تم ان دنوں کو یاد کرتی ہو۔ یا پھر بھول گئی ہو؟" نین تارا کے چہرے پر اچانک ہی گھمبیر اداسی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے۔ پھر وہ پریشان لہجے میں بولی۔

"ابا جان میری بات چیت جاگیردار کے لڑکے کے ساتھ طے کر چکے ہیں۔ امی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ لیکن میں نے چھپ کر جاگیردار اور ابا جان کی بات چیت سن لی ہے۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔ لیکن میرے یا پھر امی کے چاہنے سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے گھر میں ہمیشہ سے وہی ہوتا رہا ہے جو ابا جان چاہتے ہیں۔" میں ہکا بکا اس کے چہرے کی جانب دیکھتا جا رہا تھا۔ پھر ہڑبڑا کر بولا۔

"میں پھوپھا کے رویے کو دیکھ کر کچھ کچھ اندازہ لگا چکا ہوں۔ لیکن بات چیت کرنے کی ہمت نہیں ہو پائی۔ اس کے علاوہ میں تمہارے ارادوں سے بھی بے خبر تھا۔ اس لئے بھی میں نے بات چیت کرنا مناسب نہیں جانا۔ اب میرے خیال کے مطابق مجھے کھل کر بات چیت کا آغاز کر دینا چاہئے۔ میں تمہیں کسی بھی صورت کھونا نہیں چاہتا۔" نین تارا نے جواب دیئے بغیر سر جھکا لیا۔

پھر جمعہ بھی آ گیا۔ حسب دستور رات کا کھانا کھانے کے بعد پھوپھی نے موضوع چھیڑنے کے لئے لفظوں کا انتخاب کیا۔ اور گھمبیر لہجے میں بولیں۔

"میں نین تارا کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔" پھوپھا بیڑی سلگھاتے ہوئے بولے۔

"بات تو میں نے بھی کرنی ہے اور پھر بھی عجیب اتفاق ہے کہ بات کا موضوع نین تارا ہی ہے۔ میں جلد از جلد اپنے فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتا ہوں۔ دو تین رشتے میری نگاہوں میں ہیں۔ لیکن اگر وہ بات چیت آگے بڑھاتے تب بات بنتی جاگیردار کا لڑکا عقل الحق بی۔ اے پاس کر چکا ہے۔ جاگیردار بہت عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ میں ہاں ناں میں ٹالتا رہا...... لیکن اب ٹالنا ممکن نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر رشتہ نہیں دیا۔ تب دکان خالی کر دو۔ تم خود سوچو اگر دکان نہیں کھولی۔ تب ہم کھائیں پئیں گے کہاں سے......؟ اس کے علاوہ میں نے تمہیں بتایا نہیں۔ کہ کم و بیش پچیس ہزار روپے جاگیردار کا مقروض ہوں۔ وہ رشتہ نہ دینے کے بعد مطالبہ کرے گا کہ قرضہ فوری طور پر واپس کر دو میں تو لٹ جاؤنگا۔ اس لئے میں نے کل رات ہاں کر دی۔"

مجھے اپنے سر پر پہاڑ ٹوٹتا محسوس ہوا۔ قدرت کی ستم ظریفی...... میری محبت کاروبار کی بھینٹ چڑھنے لگی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ میری جیب میں لگ بھگ پندرہ ہزار روپے کی معمولی رقم موجود تھی۔ میں پھوپھا کو دے سکتا تھا۔ لیکن ان کی جدی پشتی دکان کو جاگیردار کی بھینٹ چڑھنے سے روکنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ پھوپھی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمایاں تھے۔ کمرے کے دروازے کے پیچھے نین تارا بھی شاید پتھر کے بت کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ کمرہ گھمبیر خاموشی کی لپیٹ میں تھا۔ پھوپھا نے دوبارہ خاموشی کو توڑا۔ اور اس دفعہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔

"مجھے معلوم ہے کہ ایسا کرنا تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن میں کیا کروں مجبور ہوں۔ دکان چھوڑنا میرے اختیار سے باہر ہے۔ نین تارا بچپن میں ہی تمہارے نام کے ساتھ منسوب کردی گئی تھی۔ اب بات کو ختم کرنا ناانصافی والی بات ہے۔ لیکن میں اپنی مجبوریاں تمہارے سامنے بیان کر چکا ہوں۔ اگر تمہارے دل میں اب بھی کسی قسم کی رنجش موجود ہے۔ تو میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگنے کے لئے بھی تیار ہوں۔" پھوپھا نے دونوں ہاتھ میرے آگے جوڑ دیئے۔ میں نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"آپ میرے والدین کی جگہ ہیں۔ اور والدین کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے مستقبل کے متعلق فیصلہ کرسکیں۔ ہاتھ جوڑنا انہیں زیب نہیں دیتا۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور پندرہ ہزار روپے کی وہ رقم جو مکان بیچنے کے بعد دستیاب ہوئی تھی۔ نکال کر پھوپھا کے سامنے رکھ دی۔ پھر ہمکلام ہوا۔

"یہ میرے کسی کام کی نہیں ہے آپ رکھ لیں نین تارا کے بیاہ میں کام آئے گی۔ رہی بات بچپن کی بات چیت کی تو اگر خدا کو ہی یہ رشتہ منظور نہیں...... تب میں یا آپ بھلا کیا کرسکتے ہیں۔ ماموں مجھے کویت بلا رہے ہیں اور ان کا اصرار ہے۔ کہ جلد از جلد کویت چلا آؤں۔ اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں کل ہی واپس شہر جانا چاہتا ہوں کہیں اس راستے میں بھی کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہوجائے۔"

پھوپھی میرے ساتھ لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ دروازے کے پیچھے کپڑوں کی خفیف سر سراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر سایہ سا دور جاتا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے اردگرد تنہائی کے سائے اُمڈتے محسوس کیے اور میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

دوسرے دن دوپہر کو پھوپھا اور پھوپھی چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ گاڑی اسٹیشن کی جانب آرہی تھی۔ پھوپھی کے چلانے پر ندامت کے آثار تھے۔ وہ اپنے بھائی سے کیا ہوا وعدہ پورا نہیں کر پائیں تھیں۔ اور پھوپھا کے چہرے پر بے بسی اور لاچارگیت کے نقوش نمایاں تھے۔ وہ ایسا نہ کرنے کے باوجود کر رہے تھے۔ لیکن مجھے اگر فکر تھی تو صرف نین تارا کی اس نے کل رات سے کچھ بھی نہیں کھایا پیا تھا۔ پتھر کے بت کی مانند اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی اس کی ہرن کی مانند غلافی آنکھیں کھلی تو ہوئیں تھی لیکن ان میں کسی بھی قسم کا کوئی تاثر موجود نہیں تھا۔ گاڑی اسٹیشن پر آکر رک گئی۔ میں نے اپنا مختصر سامان سنبھالا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھوپھا نے ایک دفعہ پھر میرے ساتھ معذرت کی میں نے انہیں دلاسہ دیا۔ گاڑی نے وسل دی اور پلیٹ فارم کو چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں موجود ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ والد کی وفات کے بعد آج میں دوسری دفعہ اپنے آپ کو اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ سب کچھ کھو گیا تھا سب کچھ لٹ گیا تھا۔

بہرحال میں شہر کیسے پہنچا مجھے کچھ معلوم نہیں۔ اسٹیشن کے پاس میں میرے دوست کا کوارٹر تھا۔ مکان فروخت کرنے کے بعد میں کچھ دن اس کے ہمراہ رہا تھا وہ غیر شادی شدہ تھا۔ اب بھی اس نے مجھے خوش آمدید کہا بلکہ یہ خوشخبری بھی سنائی۔ کہ وہ میرے لئے ریلوے کے محکمے میں نوکری کا بندوبست کر چکا ہے۔ مجھے اب ان باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن محتاج بن کر رہنا بھی قبول نہیں تھا۔ سو دوسرے دن کاغذات کے ہمراہ دفتر جا پہنچا۔ جن دنوں کی میں بات کر رہا ہوں۔ ان دنوں نوکری ملنا کچھ دشوار نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے جلد ہی کلرک کی نوکری مجھے مل گئی۔ میں نے پھوپھی کو مختصر خط لکھا۔ جس میں اپنی نوکری کے علاوہ کوارٹر ملنے کی اطلاع بھی دے دی۔ تاکہ نین تارا کے متعلق اطلاعات موصول ہوتی رہیں۔ لیکن خط کا جواب موصول نہیں ہوا۔ اور میں سب کچھ بھلانے کی جدوجہد میں کام میں مصروف ہوتا چلا گیا۔ ایک مہینہ یوں ہی گزر گیا۔ نین تارا کو بھلانا آسان نہیں تھا۔ میں جتنا اسے بھولنے کی کوششیں کرتا۔ وہ اتنا ہی شدت کے ساتھ مجھے یاد آتی تھی۔ ایک دن میں دفتر میں کام ختم کرنے کے بعد تھکا ہارا گھر جانے کے لئے نکلنے والا تھا۔ کہ ڈاکیہ کمرے میں داخل ہوا۔ اور چٹھی میرے ہاتھوں میں تھما کر باہر نکل گیا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے بھیجنے والے کا نام پڑھا۔ وہاں پھوپھا کا نام تحریر تھا۔ کانپتے ہاتھوں کے ساتھ میں نے خط پڑھنا شروع کردیا۔ ضبط کے مختصر مضمون میں صرف اتنا لکھا تھا۔ کہ تمہارے جانے کے بعد سے اب تک نین تارا کی طبیعت سنبھل نہیں پائی۔ شاید ایسا میرے غلط فیصلے کی بناء پر ہوا ہے۔ تم فوراً سعید آباد آنے کی کوششیں کرو۔ میرے خیال میں تمہیں قریب پاکر نین تارا کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ تمہاری پھوپھی کا بھی یہی خیال ہے۔

میں نے حیرت بھری نگاہوں سے خط کا مضمون پڑھا۔ پھر ایک ہفتے کی چھٹی کی درخواست لکھ کر میز پر رکھی۔ اور گھر کی جانب چل دیا۔ میں نے مختصر سامان چیک کیا۔ اور دوسرے دن ٹرین پکڑ کر سعید آباد کا رخ کیا۔ ایک دفعہ پھر امید کا چراغ جل اٹھا۔ نین تارا کی شادی نہیں ہو پائی تھی۔ اور پھوپھا کا مجھے خط لکھنا بھی میرے حق میں جاتا تھا۔ سوچوں کے ہجوم کے دوران سفر جلد ہی گذر گیا۔ جب میں نے سعید آباد کے اسٹیشن پر قدم رکھا۔ تب اس دفعہ پھوپھا اور پھوپھی کو اپنا منتظر پایا۔ اسٹیشن سے باہر گھوڑا گاڑی بھی موجود تھی۔ سامان گھوڑا گاڑی میں رکھنے کے بعد سعید آباد تک کا سفر خاموشی کی نظر ہوا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد میں نے بے تاب قدموں کے ساتھ نین تارا کے کمرے کا رخ کیا۔ نین تارا پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں چوپٹ کھلی ہوئیں تھیں۔ اور جسم سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ پھوپھا اور پھوپھی کی آنکھوں میں تعجب کا عنصر سمٹ آیا تھا۔ نین تارا نے میرے لئے چائے بنائی۔ اور ہم خوش گپیوں میں مصروف ہوگئے۔ میں نے انہیں اپنی نوکری کے متعلق بتایا۔ کوارٹر ملنے کی نوید سنائی۔ مجھے یقین تھا کہ اب پھوپھا کے سر سے جاگیردار کا بھوت اتر چکا ہوگا۔ شاید مناسب موقع محل دیکھ کر وہ خود ہی میرے ساتھ بات چیت کریں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دو دن انہوں نے اس موضوع پر بالکل بات چیت نہیں کی۔ نین تارا مکمل طور پر صحت یاب ہو چکی تھی۔ خوشی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ تیسرے دن رات کو کھانے کے بعد پھوپھا نے بات کا آغاز کچھ یوں کیا۔

"آج جاگیردار دکان پر آیا تھا۔ وہ اب جلد از جلد شادی کا تقاضا کر رہا ہے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہی ہماری تیاریاں نا ہونے کے برابر ہیں۔ پھر میرے خیال کے مطابق نین تارا ابھی تک مکمل طور پر صحت یاب نہیں ہوسکی۔ جاگیردار کا اصرار ہے کہ ایک دو دن کے اندر اسے تاریخ دے دی جائے۔ میرے خیال میں...... میں اس کے اصرار کے سامنے مزید نہیں رک پاؤنگا۔ تاریخ آج کی ہو یا پھر کل کی۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ بیاہ تو کرنا ہی ہے۔ سو کل میں اسے جواب دے دونگا۔" میں اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کاروبار کا تقاضا ابھی بھی میری محبت کے درمیان حائل تھا۔ میں دوبارہ زندگی سے بدظن ہوگیا۔ رات میں نے کڑھتے ہوئے گزاری۔ اور صبح منہ اندھیرے سامان پیک کرکے اسٹیشن کی جانب چل دیا۔ پھوپھی کے نام مختصر تحریر چھوڑی تھی۔ کہ مجھے اچانک ہی دفتر والوں کی جانب سے تار موصول ہوا ہے۔ جس کی بدولت مجھے بتائے بغیر جانا پڑ رہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آج پھر آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور بوندا باندی کا آغاز تھا۔ اسٹیشن کی مختصر عمارت حسب معمول سنسان پڑی تھی۔ میں بینچ پر بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ بوندا باندی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ دور کہیں تڑاخ کی آواز کے ساتھ بجلی گری۔ پھر انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ میں نے لائینوں کی جانب دیکھا۔ پہاڑوں کے پاس گاڑی کی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔

اچانک مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ برقعے میں ملبوس ایک لڑکی اسٹیشن کی عمارت سے نکل کر میری جانب چلی آ رہی تھی۔ گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ لڑکی میرے قریب پہنچ کر رک گئی۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ مجھے اس کا یوں اپنے قریب کھڑے ہونے کا مقصد سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جھجکتے کے ساتھ اپنے چہرے پر سے برقعہ اتار دیا۔ میں سکتے کی صورت میں اپنے سامنے کھڑی نین تارا کو دیکھنے لگا۔ میری زبان گنگ ہوئی تھی۔ ٹرین اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ اس کے شور کی آواز سے میں ہڑبڑا کر حقیقت کی دنیا میں واپس آ گیا۔

نین تارا کسی پتھر کی مورتی کی مانند میرے سامنے کھڑی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ سانس بھی نہ لے رہی ہو۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرتکز تھیں۔ گاڑی اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو کر رک گئی۔ مسافروں کا شور سنائی دینے لگا۔

"تم یہاں کیوں آئی ہو؟" میرے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"آپ کے ہمراہ جانے کے لئے..... میں ابا کی خودغرضی کی بھینٹ چڑھنا نہیں چاہتی ہوں۔ اپنی دکان کو بچانے کے لئے وہ اپنی اکلوتی لڑکی کو بھی داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کر پائے۔ تب میں بھلا کیوں ان کی خاطر اپنی محبت کی قربانی دینے کا اہتمام کروں۔ آپ جہاں جائیں گے میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ آپ جیسا رکھیں گے میں خوشی کے ساتھ ساتھ رہوں گی۔"

لیکن پھوپھا اور پھوپھی میرے متعلق غلط رائے قائم کریں گے۔ نہیں نین تارا..... میں ایسا نہیں کر سکتا۔ تم واپس چلی جاؤ۔ میں پھوپھا کی طرح خود غرض نہیں ہوں۔ اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کی خوشیوں کو قربان کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔ میں انہیں صدمہ نہیں دینا چاہتا۔" گاڑی نے روانگی کی وسل دی۔ تب نین تارا ہڑبڑا کر بولی۔

"گاڑی روانہ ہونے والی ہے۔ آپ دیر نہ کریں۔ رہی ابا اور امی کی بات..... تو میں وہاں اپنا ہمزاد چھوڑ آئی ہوں۔ انہیں میرے فرار کے متعلق رتی برابر بھی شک نہیں ہوگا۔" میں نے حیرت بھری نگاہوں سے نین تارا کی جانب دیکھا۔ لیکن اس نے مجھے ہاتھ سے تھام لیا۔ پھر کھینچتے ہوئے ٹرین کی جانب چل دی۔ اب مزید صبر کرنا میرے اختیار سے باہر ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے بھی بھاگتے ہوئے نین تارا کا ساتھ دینے میں بہتری جانی۔

ایک ہفتے کے بعد پھوپھا کا تار موصول ہوا۔ لکھا تھا۔

"برخوردار! تمہارے خاموشی سے چلے جانے کے بعد نین تارا کی طبیعت دوبارہ خراب ہو گئی۔ ہم نے بے شمار حکیموں کا علاج کروایا۔ ساتھ والے گاؤں میں موجود ڈاکٹر سے بھی رجوع کیا۔ لیکن بات نہ بن سکی۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ جسم میں خون بنانے والے خلیوں کی مقدار بہت تیزی کے ساتھ کم ہوتی جا رہی ہے۔ لڑکی کو فوراً شہر لے جایا جائے۔ لیکن شہر جانے سے پہلے ہی نین تارا نے دم توڑ دیا کل اس کا سوئم ہے ہو سکے تو گاؤں کا چکر لگا لینا۔ تمہاری پھوپھی کی طبیعت بھی ناساز ہے۔"

میں نے تار کو پڑھنے کے بعد ایک جانب رکھ دیا۔ اور مطمئن نگاہوں سے دلہن بنی نین تارا کی جانب دیکھا۔ اور اطمینان کا سانس لینے کے بعد کمرے کا دروازہ مضبوطی کے ساتھ بند کر دیا۔

دیوتا

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

رفتہ رفتہ نیند اس کی آنکھوں میں اترنے لگی مگر نہ تو وہ صحیح طور پر سو سکتی تھی اور نہ ہی مکمل بیدار تھی، نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی اور جب اس کی آنکھ لگی تو دیکھا سورج ایک سرخ گولے کی مانند چٹانوں کے عقب میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ اپنی زندگی بچانے کے لئے کہیں دور چلے جانا چاہتی تھی مگر اتنی دور اس نے سوچا بھی نہ تھا

"مجھے ایک ٹکٹ چاہئے....." مارگریٹ نے اپنے کریڈٹ کارڈ کے کونے سے کاؤنٹر بجاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنا کریڈٹ کارڈ استعمال کرنے سے ہچکچا رہی تھی کیونکہ اسے علم تھا کہ اس کا شوہر اس کے کریڈٹ کارڈ کی ادائیگی کی بنیاد پر اس کو تلاش کر سکتا ہے لیکن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس کے پاس مطلوبہ نقد رقم موجود نہیں تھی اور اسے ہر حال میں اس شہر سے نکلنا تھا۔ وہ یہاں سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔

"یقیناً میم....." کلرک نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک ٹھگنے قد کا آدمی تھا جس کی مونچھیں بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھیں اور ان کو شدت سے تراش خراش کی ضرورت تھی۔ اس کے چہرے سے یوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لگتا تھا جیسے وہ لمبی ڈیوٹی کر کے تھک چکا ہے اور اب آرام کرنے کا خواہشمند ہے۔

''آپ کو کہاں جانا ہے......؟'' کلرک بولا۔

مارگریٹ نے خوف زدہ انداز میں مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا اور پھر بے تابی سے بولی۔ ''کہیں بھی...... جہاں اگلی فلائیٹ جا رہی ہو...... مجھے وہیں جانا ہے۔''

وہ چند لمحوں کے لئے کچھ نہ بولا بس اسے گھورتا رہا۔ وہ اس کی آنکھوں پر لگے دھوپ کے چشمے کو دیکھ رہا تھا کیونکہ سیلا نے اس دھیمی روشنی والے ٹرمینل کے اندر بھی چشمہ لگا رکھا تھا، وہ کلرک اس کے گھبرائے ہوئے انداز پر حیران تھا۔ مارگریٹ نے اپنا کریڈٹ کارڈ کاؤنٹر پر رکھا تو وہ چونک گیا۔

''اگلی فلائیٹ ساڑھے نو بجے سان فرانسسکو جا رہی ہے۔'' کلرک نے کمپیوٹر کی اسکرین دیکھ کر بتایا، پھر اس نے ایک بٹن دبا کر پرنٹر پر ٹکٹ پرنٹ کیا اور اس کے کریڈٹ کارڈ کو مشین پر چارج کیا، مارگریٹ اپنا ہونٹ بے تابی سے چبا رہی تھی۔

''گیٹ نمبر 9A......'' ٹکٹ پکڑاتے ہوئے وہ بولا پھر اس سے پہلے کہ مارگریٹ ٹکٹ پکڑتی اس نے اچانک ٹکٹ واپس کھینچ لیا، کاؤنٹر کے نیچے جھکا اور ایک ربڑ کی مہر نکالی، اس مہر کی مدد سے کلرک نے اس کے بورڈنگ کارڈ پر سرخ رنگ کے ترچھے ستارے کا نشان بنا دیا۔

''یہ کیا ہے...... یہ کیسا نشان ہے......؟'' وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی۔

''اندرون ملک پرواز کے لئے یہ نشان استعمال ہوتا ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔'' وہ اسے ٹکٹ تھماتے ہوئے مسکرا دیا۔

ٹکٹ لے کر وہ اپنے مطلوبہ گیٹ کی طرف بڑھی۔ چونکہ اس کے پاس کوئی سامان نہ تھا لہٰذا سیکورٹی سے جلد ہی اس کی گلوخلاصی ہو گئی۔ اس نے اپنے آس پاس نظر دوڑائی اسے اب بھی خدشہ تھا کہ اس کا شوہر اس کو تلاش کرتا ہوا کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا، اس کا بورڈنگ کارڈ چیک ہوا اور وہ طیارے کے اندر پہنچ گئی۔

''سان فرانسسکو!......'' اس نے سکون کا سانس لیتے ہوئے سوچا۔ اس کے ہونٹ بالکل خشک ہو چکے تھے، ان پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور ان کی رنگت اس کی آنکھوں کی مانند سیاہ ہو چکی تھی اس کے رخساروں کے اندر جہاں زخم آئے تھے ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ سان فرانسسکو میں کسی کو بھی نہیں جانتی تھی مگر یہ کوئی مسئلہ نہ تھا اسے تو بس اس شہر سے نکلنا تھا۔

جب اس نے شادی کی تو اسے اپنے شوہر کی تیز مزاجی کا علم تھا مگر اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی اس عادت پر قابو پا لے گا اور کچھ عرصہ اس نے ایسا کیا بھی مگر پھر...... اس وقت یہ پہلا موقع نہیں تھا جب مارگریٹ نے بھاگنے کی کوشش کی ہو، وہ ہر بار اس کو تلاش کر کے واپس لے جاتا۔ اس نے اپنے اردگرد کے مسافروں کو دیکھا ہر شخص اجنبی تھا اور یہ اس کے لئے بہتر تھا وہ قدرے پرسکون ہو گئی۔ جہاز جلد ہی ہوا میں بلند ہو گیا۔ جہاز کے انجن کی گڑگڑاہٹ، مستقل ارتعاش اور ہوا کی گردش نے اس پر سحر طاری کر دیا اسے محسوس ہوا کہ وہ معمول سے زیادہ گہرے سانس لے رہی ہے۔ اس نے دیکھا کہ کچھ مسافر گہری نیند میں تھے اور کچھ اونگھ بھی رہے تھے۔ وہ بھی جلد ہی اونگھنے لگی اس کے لئے اپنے ذہن کو ایک نکتے پر مرکوز رکھنا مشکل ہو رہا تھا اس کا ذہن بھی دوسروں کی طرح نیند کی وادیوں میں اترنے لگا۔ اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں اور پھر ہر چیز نے تاریکی کا پردہ اوڑھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کا سر جھٹکے سے آگے گرا تو وہ ہڑبڑا کر بیدار ہو گئی اور اپنی آنکھوں کو تیزی سے جھپکانا شروع کر دیا۔ اس کو ہوا کی کمی اور گرمی کا احساس ہوا، گھٹن بھی محسوس ہو رہی تھی اسے یوں لگا جیسے کوئی اس کے گلے کو دبا رہا ہو۔

عقبی نشست سے اسے کسی کے ہچکیوں کے ساتھ رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا ہر شخص نیند میں تھا۔ فضائی میزبان بھی اپنے مخصوص کمرے میں دبکی ہوئی تھی جس کا پردہ پوری طرح برابر تھا۔ ہچکیوں کی آواز پھر ابھری،

...کی کھڑکی کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا جسے وہ سمجھ نہ پائی مگر ...ارادی طور پر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

نیچے بلند برفیلے چمکتے پہاڑ نظر آ رہے تھے، ...سان بالکل صاف تھا صرف افق پر سفید رنگ کا بہت ...مکمل چاند مسکرا رہا تھا، مگر اس کے علاوہ بھی وہاں کچھ ...... وہ کیا تھا...... اسے روشنی کا ایک گولا نظر آیا...... جو ...سلسل ان کے جہاز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے ...بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ ایک اور جہاز تھا۔ عجیب بات ...تھی کہ وہ جہاز بھی اسی جسامت اور شکل وصورت کا تھا ...جیسے جہاز میں وہ لوگ سفر کر رہے تھے۔ اس پر بھی اسی ...فضائی کمپنی کا نشان بنا ہوا تھا۔ وہ لحہ بہ لحہ قریب ہوتا گیا، ...بالکل سیدھا ان کی طرف آ رہا تھا یوں جیسے آ کر ان کے ...جہاز سے ٹکرا ہی جائے گا۔ مارگریٹ نے گھبرا کر اپنی نشست ...کو مضبوطی سے تھام لیا۔ اسے یوں لگا جیسے ابھی دونوں ...جہاز ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں گے مگر آخری لمحے پر ...سب کچھ ٹل گیا اور دونوں جہاز پہلو بہ پہلو اڑنے لگے۔ ...دونوں کے پر ایک دوسرے سے ٹکرانے سے بال بال بچ ...رہے تھے۔ اس نے ایسا نظارہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

مسافروں کے ایک اور جوڑے نے بھی اس منظر ...کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ کھسر پھسر کر رہے تھے، ان کے ...چہروں میں خوف سمایا ہوا تھا۔ اس نے دوسرے جہاز کو پھر ...غور سے دیکھا یوں جیسے محض اپنی قوت ارادی سے وہ اس ...کو اپنا رخ بدلنے پر مجبور کر دے گی، مگر وہ دیکھ کر حیران رہ ...گئی کہ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے جہاز نے فضا میں ایک غوطہ ...کھایا اور پھر وہ اپنی نوک کے بل زمین کی طرف جانے لگا۔

''اوہ میرے خدا......'' مارگریٹ چیخ اٹھی وہ لپکی اور ...ایئر ہوسٹس کو بلانے کے لئے بٹن دبانے لگی مگر اس کی ...آنکھیں گرتے ہوئے جہاز پر ہی جمی ہوئی تھیں جس کی رفتار ...تیز ہوتی جا رہی تھی اور وہ اپنی گردن اٹھائے اس گم ہوتے ...جہاز کو دیکھ رہی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ جہاز پہاڑوں ...سے ٹکراتے ہی آگ کے بگولے میں بدل گیا۔ مارگریٹ ...کے چہرے پر خوف اور دہشت کے سائے پھیل گئے تھے۔

''خدا رحم کرے......'' کسی کی آواز سنتے ہی وہ اپنی کرسی میں ڈھے گئی۔

''میں جہاز کا کیپٹن بول رہا ہوں......'' اسی وقت جہاز کے مائیک پر ایک آواز گونجی۔ ''......خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہو رہا ہے مگر حفاظتی نکتہ نگاہ سے ہمیں زمین پر اترنا ہوگا، براہ کرم آپ پرسکون رہیں، ہم کسی قریبی مقام پر جہاز کو اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

جہاز کے عملے نے سارے مسافروں کو بیدار کر دیا۔ دوسرے جہاز کی تباہی کے عمل کے دوران آدھے سے زیادہ مسافر سو رہے تھے۔

جہاز کو ایک فضائی پٹی پر اتار لیا گیا اور ایک ایک کر کے سارے مسافر جہاز سے باہر آ گئے۔ باہر بہت اندھیرا اور ٹھنڈک تھی، روشنی صرف ستاروں اور چاند کی تھی کوئی اور جہاز بھی نظر نہیں آ رہا تھا نہ ہی کوئی ٹرمینل تھا۔ یہ کوئی ویران سی جگہ تھی، شاید کوئی فوجی ایئر بیس کیونکہ کوئی آدھ میل دور کنکریٹ سے بنی نیچی چھت والی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ جہاز کے باہر مسلح سپاہی ان کے منتظر تھے اور ان کو ان عمارتوں کی طرف چلنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے......'' لائن میں مارگریٹ کے آگے کھڑے مرد کی خوف زدہ آواز سنائی دی، وہ شکن آلود لباس میں ملبوس ایک عام سا شخص تھا جس کے چہرے پر غصے کے آثار تھے۔

وہ عمارتیں بہت دور محسوس ہو رہی تھیں۔ ہوا یخ تھی مگر اب سانس لینا آسان محسوس ہو رہا تھا۔ مارگریٹ جہاز سے باہر نکلتے ہوئے اسی کے متعلق سوچ رہی تھی یہ بہت عجیب بات تھی کیونکہ جہاز کے اندر سانس لینے میں دشواری محسوس ہو رہی تھی شاید وہاں آکسیجن کی مطلوبہ مقدار مہیا نہیں کی جا رہی تھی جس کی وجہ سے بہت سے مسافر غنودگی کی حالت میں تھے۔

''مجھے صبح سات بجے سان فرانسسکو میں ایک بزنس میٹنگ میں لازمی شریک ہونا ہے۔'' وہ مخنی آدمی دوبارہ بولا۔ اس بار وہ ایک سپاہی سے مخاطب تھا اور اپنا بورڈنگ کارڈ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ مارگریٹ نے دیکھا اس پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی وہی سرخ ستارہ بنا ہوا تھا جیسا اس کے کارڈ پر مہر سے بنایا گیا تھا۔ اب تمام مسافروں کو ایک قطار کی شکل میں دو بنی عمارتوں کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ مسلح سپاہی ان کی نگرانی کرر ہے تھے، مارگریٹ کا دماغ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا کہ جہاز میں آکسیجن کیوں کم تھی حالانکہ اس کو درست رکھنا جہاز کے کپتان کی ذمہ داری تھی۔ کیا جہاز کے کپتان نے جان بوجھ کر آکسیجن کا لیول کم رکھا تھا تاکہ مسافر نیند کی حالت میں چلے جائیں؟ یقیناً کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ رہ کر اس نے بہت کچھ سیکھا بھی تھا۔ اب اس کو اندازہ ہوجاتا تھا اور اس کی چھٹی حس اس کو بتادیتی تھی کہ کب کچھ غلط ہونے والا ہے۔ گڑبڑ کی یہی خوشبو اس کو اب دوبارہ محسوس ہورہی تھی، اس کی چھٹی حس بیدار ہوگئی تھی اور اس کے جسم میں چیونٹیاں رینگنے لگی تھیں ویسی ہی چیونٹیاں جیسی اس کے شوہر کے بھڑکنے سے پہلے خطرے کا احساس کرکے اس کے جسم میں رینگنے لگتی تھیں۔

"کیا تم سن رہے ہو...... ہمارے ادا کردہ ٹیکس سے تمہیں تنخواہ ملتی ہے......" وہ منحنی شخص ابھی تک غصے سے بول رہا تھا۔

اس کے آگے چلنے والا سپاہی مڑا اور کچھ بولے بغیر اس نے نہایت مہارت اور صفائی سے اپنی بندوق کا بٹ اس مسافر کے عین منہ پر دے مارا۔ وہ شخص چیختا ہوا الٹ کر زمین پر گر گیا۔ دوسرے مسافر اس کی مدد کو دوڑے۔ کچھ نے اس سپاہی پر حملہ کردیا، دوسرے سپاہی اپنے ساتھی کی مدد کو لپکے۔ مارگریٹ کو احساس ہوگیا کہ اب کچھ غلط ہونے جارہا ہے جو اس کے لئے خطرناک ہوسکتا ہے، اس نے موقع غنیمت جانا، ادھر ادھر دیکھا کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا، مارگریٹ نے ایک طرف دوڑ لگادی، وہ جلد سے جلد اندھیرے میں غائب ہوجانا چاہتی تھی۔ وہ پیچھے دیکھے بغیر بھاگتی رہی، تھوڑی دیر بعد اس کا دم پھولنے لگا ہر لحہ اس کو ڈرتا تھا کہ ابھی کوئی گولی چلے گی اور اس کی پشت میں سوراخ بنادے گی، خوف کا بوجھ لیے وہ بھاگتی رہی جب اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئی، وہ بری طرح ہانپ رہی تھی، اس کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ آخر چالیس سال کی عمر میں وہ کتنی ہمت کرسکتی تھی۔

مارگریٹ نے بھاگنے کے بعد پہلی دفعہ مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا، اس نے کافی فاصلہ طے کرلیا تھا۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ پہاڑیوں کے اوپر جہاں تک ممکن ہو بھاگ کر چلی جائے وہ بہت زیادہ خوف زدہ تھی۔ اب وہ جہاز سے تقریباً ایک میل دور نکل آئی تھی اتنی ہی دور دوسری طرف کنکریٹ سے بنی عمارتیں تھیں۔ اس وقت وہ جہاں بیٹھی تھی وہاں سے اس کو ہر چیز صاف نظر آرہی تھی۔ پہاڑیوں اور عمارتوں کے بیچ ایک چھوٹی سی سڑک گزر رہی تھی جس کے کناروں پر جابجا روشنی کے لیمپ نصب تھے یہ سڑک دور جاکر ایک غار کے دہانے پر ختم ہورہی تھی جس کا کھلا منہ صاف نظر آرہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی کان ہو اس سڑک پر جہاز کے مسافروں کو قطار بنا کر بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکا جارہا تھا جن کے سائے لیمپوں کی پیلی پیلی روشنی میں عجیب سے لگ رہے تھے۔ وہ حیران تھی کہ جہاز کو دوسرے جہاز کے حادثے کے باعث ایمرجنسی میں حفاظتی اقدام کے تحت اس فوجی ایئربیس پر اتارا گیا تھا لیکن یوں لگتا تھا جیسے ان کو قیدی بنالیا گیا ہو۔ لیکن ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہورہا تھا کہ سپاہیوں کو اس کے فرار کا علم ہو چکا ہے۔ ان کے انداز سے صاف معلوم ہورہا تھا کہ وہ اس کے فرار سے لاعلم تھے۔

اس نے اسی سمت آگے بڑھنے کا فیصلہ کرلیا جس طرف وہ جارہی تھی۔ یہاں چٹانوں کا ایک ہجوم تھا جہاں وہ آسانی سے چھپ سکتی تھی۔ اس کے جوتے چٹانوں پر چڑھنے اور چلنے میں دشواری پیدا کررہے تھے مگر وہ چلتی گئی۔ رات کے اندھیرے میں اس کے قدموں کے نشانات تلاش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ بڑے محتاط انداز میں آگے بڑھ رہی تھی۔ اسکاؤٹنگ کا تجربہ اس کے کام آرہا تھا۔ چٹانوں کے عقب میں دو بڑے پتھروں کے درمیان ایک بہت بڑی دراڑ تھی وہ جگہ مارگریٹ کو چھپنے کے لئے نہایت موزوں محسوس ہوئی لہٰذا وہ اس دراڑ میں

گھس گئی اور بیٹھ کر سانس لینے لگی مگر پوری طرح چوکنا بھی تھی اس کی سماعتیں ہلکی سی آہٹ سننے کو بھی تیار تھیں۔ اس کو بھوک محسوس ہورہی تھی مگر اس کے پاس اور آس پاس کھانے کو کچھ بھی نہ تھا۔ چٹانوں پر جابجا کائی کے گچھے اُگے ہوئے تھے مگر وہ ان کو کیسے کھاسکتی تھی۔

اس کو ایک چٹان کے بیچ پانی کی دھار گرتی سنائی دی۔ جلد ہی اس نے اس پانی کو تلاش کرلیا۔ مارگریٹ نے زبان لگا کر اس کو ڈرتے ڈرتے چکھا۔ وہ برف کی طرح یخ ٹھنڈا مگر میٹھا تھا۔ پیٹ بھر کر وہ پانی پی گئی اور دوبارہ اپنی جگہ دبک گئی۔ اس کو سوائے ہوا کی سرسراہٹ کے کچھ اور سنائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ٹھنڈک سے بچنے کے لئے اپنی جیکٹ کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور سوچنے لگی یقیناً نیچے ان عمارتوں میں کھانا ہوگا، صاف پانی ہوگا بستر ملے گا، یقیناً اب تک وہاں حکومت یا متعلقہ ایئرلائن کا کوئی نمائندہ پہنچ گیا ہوگا جو پیش آنے والی ساری صورت حال کی وضاحت کرے گا اور سارے مسافروں کو ان کی منزل تک پہنچانے کی یقین دہانی کرائے گا۔ سپاہی مسافروں کی حفاظت کے لئے ہیں مگر وہ ایک سپاہی شاید جذباتی ہوگیا تھا۔

سابقہ تجربات کی روشنی میں مارگریٹ کو اندازہ تھا کہ جب کوئی غصیل مرد جذباتی ہوجائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ پھر وہ اس سرخ ستارے کے متعلق سوچنے لگی جو اس کے ٹکٹ پر بنایا گیا تھا۔ کیا وہ نشان طیارے پر سوار ہر مسافر کے ٹکٹ پر بنا تھا۔ پھر وہ جہاز پر آکسیجن کی کم سپلائی کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے اپنے فرار کی وجوہات درست نظر آنے لگیں۔ رفتہ رفتہ نیند اس کی آنکھوں میں اترنے لگی مگر نہ تو وہ صحیح طور سو سکتی تھی اور نہ ہی مکمل بیدار تھی۔ اونگھنے کی کیفیت کے درمیان نجانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔ اس کی آنکھ تب کھلی جب سورج کی مدھم پیلی روشنی اس کی آنکھوں میں اترنے لگی سورج ایک سرخ گولے کی مانند چٹانوں کے عقب سے نمودار ہورہا تھا۔ صبح ہوچکی تھی۔

مارگریٹ کو ان چٹانوں میں دبکے اپنا آپ نہایت احمق اور عجیب محسوس ہورہا تھا اب تو اس کے خالی پیٹ میں ٹیسیں بھی اٹھ رہی تھیں اور جسم میں اکڑن محسوس ہورہی تھی جسم کانپ رہا تھا اور منہ بھی خشک ہورہا تھا۔ وہ ایک اچھی اسکاؤٹ رہ چکی تھی اور جانتی تھی کہ ان علامات کا کیا مطلب ہے۔

اس کے ذہن میں بہت سارے خیال ابھر رہے تھے اور وہ آئندہ کے امکانات پر غور کررہی تھی، ان میں پہاڑ سے نیچے اترنا بھی شامل تھا مگر اس میں بہت ساری مشکلات تھیں کیونکہ اس کو تو یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ ہے کہاں۔ وہ سمتوں کا اندازہ بھی کھو چکی تھی۔ اس کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ تھا اور قریبی قصبہ بھی میلوں کے فاصلے پر ہوسکتا تھا۔

آخری امکان یہی تھا کہ وہ واپس چلی جائے۔ وہ ان فوجی عمارتوں کی طرف جائے جو اس نے دیکھی تھیں۔ ان میں سے ایک کے دروازے پر دستک دے، اپنی صورتحال پر ندامت اور پشیمانی کا اظہار کرے اور بتائے کہ وہ رات بھر پریشان رہی ہے اور بھٹکتی رہی ہے۔ وہ لوگ بہت سوالات کریں گے، وہ ان کا کچھ بھی مبہم گول مول جواب دے سکتی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اٹھی، اپنے بالوں کو ہاتھوں سے درست کیا کپڑوں کی شکنوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ اپنی جیکٹ کو دوبارہ پہنا اور اوپر جانے کے لئے مڑی۔

اسی لحہ اسے بندوق لوڈ کرنے کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ سمجھنے سے پہلے بندوق کی ایک نالی عین اس کے چہرے کے سامنے آگئی۔

"صبح بخیر خاتون......" ایک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تو وہ بمشکل اپنی چیخ روک پائی۔ وہ جانتی تھی کہ جب عورت چیختی ہے تو مرد اور زیادہ برانگیختہ ہوجاتا ہے۔ وہ تھوڑا سا مڑی تو اس کو اپنے آس پاس کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے نظر آئے وہ سب اس کو گھیرے ہوئے تھے۔ وہ ہیلمٹ پہنے ہوئے تھے صرف ایک پیلی کیپ میں تھا جس سے اس کو اندازہ ہوا کہ وہ ان کا آفیسر ہے۔ وہ اس کی طرف رحم طلب نگاہوں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیکھنے لگی۔ اس آفیسر نے اپنا ہاتھ دل پر رکھا تو اشارہ پاکر سب سپاہیوں نے اپنی بندوقوں کا رخ نیچے کرلیا۔

''مارگریٹ مانیگو!......'' آفیسر نے اپنے کلپ بورڈ پر لگے کاغذ پر سے اس کا نام پڑھ کر دہرایا۔ ''میرا نام کیپٹن آرمنڈ ہے۔ اب آپ کا کیا حال ہے؟''

''مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' وہ اپنے ہی بازوؤں میں سمٹنے کی کوشش کررہی تھی۔

''ایسا اس لئے کہ آپ نے رات کھلے آسمان تلے گزاری ہے۔ آپ شاید نہیں جانتی کہ آپ کی اس حرکت پر ہم کتنے پریشان تھے، ہم اپنے کسی ایک مسافر کو بھی کھونا برداشت نہیں کرسکتے اسی لئے ہم گھنٹوں سے آپ کو تلاش کررہے تھے......'' اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا'' ......آپ کی یہ حرکت......اس طرح بھاگ آنا آپ کی ذہانت کی دلیل ہے......مگر یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

''میں گھبرا گئی تھی......میں بہت زیادہ خوف زدہ ہوچکی تھی......مجھے افسوس ہے کہ......''

اس آفیسر نے اپنا سر جھٹکا، اس کا لہجہ بدل گیا تھا...... ''معصوم مت بنو......ہم جانتے ہیں کہ تمہیں شک ہوگیا تھا۔ اب براہ مہربانی تم ہمارے ساتھ چلو......'' مارگریٹ نے اپنے کندھے اچکا دیے کیونکہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

کیپٹن مڑا اور اس کے آگے آگے چلنے لگا وہ چٹانوں کے اوپر پہنچ گیا اس کے ہاتھ میں دوربین تھی جو اس نے مارگریٹ کو تھمادی۔

''دیکھو......تمہیں اجازت ہے کہ تم جان سکو کہ آگے کیا ہونے والا ہے یہ معاہدے کا حصہ ہے لیکن اگر تم جاننا نہ چاہو تو تمہاری مرضی ہوگی ......تمہیں اس کا ایک ذمے دار شہری ہونے کی حیثیت سے پورا حق ہے۔''

مارگریٹ نے دوربین اپنی آنکھوں سے لگالی، منظر کچھ زیادہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ اس کی فلائیٹ کے تقریباً پچاس مسافر ابھی تک اسی سڑک پر کھڑے تھے جو عمارتوں کی طرف جاتی تھی اور جس کا اختتام کان کے دہانے پر ہوتا تھا۔ مسافروں کی قطار میں سب سے آگے کھڑا مسافر کان کے دہانے سے چند قدم دور تھا۔ مسلح سپاہی ان پر پہرہ دے رہے تھے لیکن وہ زیادہ چوکس نظر نہیں آرہے تھے۔ مسافروں کی ایک ہی لمبی قطار تھی، زیادہ تر مسافروں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ صرف ایک ہی چیز مختلف تھی جس کو دیکھ کر اس کے ذہن کو جھٹکا لگا۔ قطار میں کھڑے سارے مسافر مادر زاد برہنہ تھے۔

''میرا خیال ہے......میں جاننا چاہوں گی......'' مارگریٹ نے حیرت اور گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

کیپٹن نے اپنا سر ہلادیا۔ ''میں جانتا تھا کہ تم ذہین عورت ہو......ہم ہمیشہ ان لوگوں کو حاصل کرتے ہیں جو مشکل میں ہوتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ یہی سچ ہے کہ تم شکاگو ایئرپورٹ پر ہی ایک خاص کام کے لئے چن لیا گیا تھا وہ خاص کام جو ہمارے عظیم ملک کو عظیم تر بنادے گا۔''

''لاٹری......سرخ ستارہ......'' وہ سوچنے لگی اور دوربین واپس تھمادی وہ اس کے بغیر بھی با آسانی دیکھ سکتی تھی۔

''دس سال سے ہر سال پچاس لوگ یہاں اس خاص خدمت سرانجام دینے کے لئے لائے جاتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب ہم یہاں چند مقامی باشندوں کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے لیکن سیاسی اعتبار سے یہ درست نہ تھا، لہٰذا سب مقامی باشندوں کو یہاں سے ہٹادیا گیا۔ پھر ہم نے مسلح افواج میں سے رضا کاروں کو بھرتی کرنے کا منصوبہ بنایا مگر اس کا بھی مثبت ردعمل سامنے نہ آیا۔ اس لیے اب ہم نے اس طریقے سے لوگوں کا انتخاب کرتے ہیں اور یہ طریقہ بہت کامیاب رہا ہے اور اس کے لئے ہم ایسا طریق کار اختیار کرتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کو تم لوگوں کی موت ایک حادثہ لگے۔''

''وہ دوسرا جہاز......؟'' مارگریٹ نے سوال کیا۔

''ہاں بالکل......اخبارات میں یہی خبر آئے گی کہ اس جہاز کے سب مسافر کریش میں مارے گئے ہیں۔ حالانکہ وہ جہاز خالی تھا اور اس کو ریموٹ کنٹرول ٹیکنالوجی کی مدد سے اڑایا جارہا تھا اور جو جہاز تم لوگوں کو لے کر یہاں اترا ہے وہ ہمارے ہینگر میں چلا جائے گا جہاں وہ اگلے سال تک کھڑا رہے گا پھر اس وقت ہم اس جہاز کو ریموٹ

کنٹرول کی مدد سے اڑا کر تباہ کردیں گے اور ایک اور نیا جہاز ہینگر میں آجائے گا۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔''

نیچے کان کے دہانے پر ایک مذہبی رہنما بھی موجود تھا اور وہ ہر مسافر کے قریب جاکر اس کے ماتھے پر مقدس تیل لگا رہا تھا۔ مارگریٹ گھبرا گئی۔

''ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔''

''جو تمہارے ساتھ ہوگا......یقیناً یہ آسان نہیں ہوگا مگر مجھے اس کا افسوس ہے کہ ہمیں یہ سب کرنا ہوگا، اگر ہم یہ نہیں کریں تو کان میں موجود قوتیں ناراض ہو جائیں گی اور اگر وہ ناراض ہو جائیں تو مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں مثلاً زلزلے، موسم کی تبدیلی وغیرہ اور تم یقیناً ایسا نہیں چاہو گی۔''

مارگریٹ نے تیزی سے اپنی آنکھیں جھپکیں وہ پریشان ہوگئی۔ ''کیا کوئی کان کے اندر موجود ہے ----؟''

''نہیں۔ شاید کوئی نہیں......'' کیپٹن اس کے قریب جھک آیا اور سرگوشی میں بولا۔ ''وہاں اندر دیوتا ہے......''

''یہ کیسے ممکن ہے......یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ مجھے اس پر یقین نہیں۔''

''مگر اسے تم پر یقین ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''یہ بہت شرم ناک ہے، کیا صدر مملکت کو اس حرکت کا علم ہے۔'' مارگریٹ نے سوال کیا۔

''یقیناً......کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم حکومت کے علم میں لائے بغیر اتنے بڑے جمبو جیٹ کو غائب کرسکتے ہیں۔ ہر صدر اپنے دور حکومت میں اس جگہ کا معائنہ کر چکا ہے۔ موجودہ صدر تو یہاں تقریباً ایک ہفتہ رکے تھے اور انہوں نے تفصیل سے ہر چیز کا معائنہ کیا تھا......'' آفیسر اس کو بتانے لگا۔

وہ آفیسر رکا پھر بولنے لگا۔ ''یہاں ہم اپنے ملک کو عظیم تر بنانے کے منصوبے پر کام کررہے ہیں۔ جب ہم یہاں اپنا سب کچھ لگا چکے، تیار کرچکے تو ہمیں پتہ چلا کہ اس کان کے اندر یہاں کے مقامی لوگوں کی روایت کے مطابق کوئی دیوتا ہے جسے انسانی خون اور گوشت کی سال میں ایک دفعہ ضرورت ہوتی ہے جسے وہ کان میں کام کرنے والوں سے پوری کرتا ہے، لیکن ہم اپنے ماہرین اور ہنرمندوں کو یوں ضائع نہیں کرسکتے۔ یہاں وہ کچھ تیار ہورہا ہے جس کی مدد سے جلد ہی پوری دنیا پر ہماری حکومت ہوگی کوئی ہمارا حریف نہ ہوگا دنیا کی دولت اور پیداوار پر صرف ہمارا اور ہمارے ملک کا حق ہوگا اور ہم اس دنیا کے وارث ہوں گے۔'' آفیسر کے چہرے پر تفاخر تھا۔

اس دوران مذہبی رہنما نے اپنا کام مکمل کرلیا تھا لہٰذا فوجی برہنہ مسافروں کو ہانکتے ہوئے کان کے اندر بھیج رہے تھے، مسافر زیادہ مزاحمت نہیں کررہے تھے سب سے اگلے مسافر کو مارگریٹ پہچان گئی یہ وہی سوٹ والا مسافر تھا جس نے سب سے پہلے احتجاج کیا تھا۔

''کچھ لوگ اس بارے میں جان کر پرسکون ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کے لئے قربانی دینے جارہے ہیں اور ان کا ذہن مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر تم نے مذہبی کتب پڑھی ہیں تو جانتی ہوگی کہ خدا نے انسان کو کیوں بنایا۔؟ تمہارا خیال ہوگا کہ شاید اس لئے کہ وہ کسی سے محبت کرے ......مگر نہیں!......انسان کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ کسی کے کام آئے......''

''میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا......'' مارگریٹ پھٹ پڑی۔

ہمیں ایسا سوچنا ہوگا، مجھے یہ سوچ کر اچھا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کوئی مقصد ہے اس دنیا میں۔''

مارگریٹ زور سے چیخی تھی کیونکہ اس نے لمبے روئیں دار لجلجے سے کیکڑے جیسے بازو جن کے سرے پر پنجے بنے ہوئے تھے کان کے اندھیرے سے نکلتے دیکھے اور سب سے آگے کھڑے آدمی کے گرد لپٹ گئے اور پھر مارگریٹ اس قدر زور سے چیخی کہ اسے اس بدنصیب کی چیخیں بھی سنائی نہ دیں جس کو کان کے اندر گھسیٹ لیا گیا تھا۔ ایک کے بعد ایک کو وہ کان نگلتی چلی گئی......اور مارگریٹ کی باری سب سے آخر میں آئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تاریک راہیں

محمد عرفان رامے-لاہور

اچانک کمرا پراسرار انسانی چیخوں سے گونجنے لگا، یوں محسوس ہورہا تھا جیسے فرش کے نیچے کسی شخص کو ذبح کیا جارہا ہو، ان چیخوں کے درمیان کسی کے شیطانی قہقہے بھی سنائی دینے لگے تھے اور پھر.....

دل ودماغ کو مبہوت کرتا اور جسم میں خون کو منجمد کرتا ایک عجیب وغریب شیطانی چپقلش

"**ہیلو**.....کوئی ہے.....؟"

استقبالیہ کمرے میں کسی کو نہ پا کر واجد نے زور سے کاؤنٹر بجایا۔ سخت سردی کے باوجود اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور وہ بہت گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے.....کیوں شور مچا رکھا ہے؟"

کاؤنٹر کے پیچھے سے نمودار ہونے والے بوڑھے شخص نے منہ بناتے ہوئے پوچھا۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے واجد کی بے وقت آمد اسے پسند نہ آئی ہو۔

"وہ میرے کمرے میں....." مارے خوف کے واجد سے بات کرنا مشکل ہورہی تھی۔

"کیا ہوا تمہارے کمرے میں.....چھت گر گئی ہے؟" بوڑھے نے چونک کر پوچھا۔

"نہیں.....وہ....."

"پانی نہیں آرہا....." بوڑھے نے پھر سوال کیا۔

"آرہا ہے.....لیکن وہ....."

"پھر یقیناً زلزلہ آگیا ہوگا۔" اس مرتبہ اس کے لہجے میں کرختگی تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ میرے کمرے میں فرش کے نیچے سے عجیب قسم کی آوازیں آرہی ہیں۔ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے کسی کو زدوکوب کیا جارہا ہو نیچے موجود تہ خانے میں۔" واجد نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی۔

"یہ وہم ہے تمہارا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ویسے بھی تمہارے کمرے کے نیچے کوئی تہ خانہ موجود نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے یہ شور شرابا صاف سنائی دے رہا ہے۔"

"دیکھو میاں! تم خوامخواہ گھبرا رہے ہو۔ شاید تم ذہنی طور پر پریشان ہو۔ اچھا یہ بتاؤ تم کیا چاہتے ہو مجھ سے؟" کاؤنٹر مین نے اکتائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"آپ میرا کمرا تبدیل کردیں۔"

"معافی چاہتا ہوں.....یہ ممکن نہیں ہے۔"

"مگر کیوں؟"

"اس لئے کہ سرائے میں کوئی دوسرا کمرا خالی نہیں ہے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے۔ شام کو مجھے چابی پکڑاتے ہوئے آپ نے خود بتایا تھا کہ آج سرائے میں میرے علاوہ کوئی دوسرا مسافر موجود نہیں ہے۔"

"ہاں میں نے درست کہا تھا۔ دراصل باقی کمرے مرمت کے لئے بند ہیں۔" اس نے جلدی سے

جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے پھر میں ابھی یہ سرائے چھوڑ رہا ہوں۔“ واجد نے دھمکی دی۔

”جیسے تمہاری مرضی......لیکن یاد رہے باہر گھنا جنگل ہے۔ خونخوار درندوں کے علاوہ لٹیروں کی بڑی تعداد بھی پولیس کے خوف سے اسی جنگل میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ اس لئے ان حالات میں منہ اٹھا کر باہر چلے جانا عقلمندی نہیں خودکشی کے زمرے میں آئے گی نوجوان۔ باقی تمہاری مرضی ہے۔“ کاونٹر مین کا عدم تعاون دیکھ کر واجد نے منہ بنایا اور اپنا جارحانہ فیصلہ واپس لے کر خاموشی سے کمرے کی جانب چل پڑا۔

اس شام وہ ایک ضروری کام کے سلسلے میں فتح آباد کے لئے روانہ ہوا تھا۔ لیکن سورج ڈھلتے ہی گھنے جنگل کے قریب اس کی گاری خراب ہوگئی۔ وہ اندھیرے میں مدد کا منتظر تھا کہ ایک راہ چلتے فقیر نے رات بسر کرنے کے لئے اس سرائے کی نشاندھی کردی۔ یہی واجد کی اس اجاڑ میں موجودگی کی وجہ تھی۔

استقبالیہ کمرے سے نکل کر وہ خود کو کوستا ہوا ایک مرتبہ پھر اپنے کمرے میں واپس لوٹ آیا اور سہمے ہوئے انداز میں چادر سے منہ سر لپیٹ کر بستر میں گھس گیا۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کمرا پراسرار انسانی چیخوں سے گونجنے لگا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے فرش کے نیچے کسی شخص ذبح کیا جارہا ہو۔ ان چیخوں کے درمیان کسی کے شیطانی قہقہے بھی سنائی دینے لگے۔

صورت حال کی سنگینی بھانپتے ہوئے اس نے وہاں سے بھاگنے کا ارادہ کیا اور بستر سے نکل کر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے کی جانب لپکا۔ ابھی اس نے بمشکل چند قدم اٹھائے تھے کہ ٹھوس زمین میں اس کا بھاری وجود یوں دھنسا شروع ہوگیا جیسے وہ پختہ فرش پر نہیں، دلدل کی سطح پر کھڑا ہو......اس سے قبل کہ واجد اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر سوچتا بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس کا جسم گردن تک زمین میں دھنس چکا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زمین کے نیچے کوئی اس کی ٹانگیں کھینچ رہا ہو۔ اسی دوران دروازہ کھلا اور کاونٹر مین شیطان کی مسکراہٹ سجائے اندر داخل ہوا۔

”مم......میری مدد کرو...... میں مر رہا ہوں۔“ اسے دیکھتے ہی واجد مدد کے لئے چلایا۔

”ہاں ہاں کیوں نہیں......اپنے گاہک کی مدد کرنا ہمارے فرائض میں شامل ہے۔“ بوڑھے نے قریب پہنچ کر اطمینان سے جواب دیا اور اپنا پاؤں واجد کے سر پر رکھ کر دباؤ بڑھا دیا۔ اس نئی مصیبت کے نازل ہوتے ہی واجد کے منہ سے آخری دردناک چیخ برآمد ہوئی اور کمرا ایک مرتبہ پھر جان لیوا خاموشی کی زد میں آگیا۔

☆......☆......☆

پندرہ منٹ کی تیز رفتاری کے بعد طاہر کی جیپ نے گھنے جنگل میں موجود خستہ حال عمارت کے سامنے پہنچ کر دم لیا تو کچھ فاصلے پر کھڑے دو فارسٹ گارڈ تیزی سے آگے بڑھے اور واجد کے قریب آن دھمکے۔

”ہاں بھئی کیا رپورٹ ہے؟“ طاہر نے ان کے سلام کا جواب دیتے ہی سوال داغا۔

”مسئلہ کافی حد تک حل ہو چکا ہے صاحب۔ بہت تلاش کے باوجود صبح ملنے والی لاوارث کار کا مالک نہیں ملا تو ہم ساتھ والے گاؤں سے ایک ماہر کھوجی کو بلا لائے جو سراغ لگاتا ہوا ہمیں اس عمارت تک لے آیا۔“ ایک گارڈ نے تفصیل بتائی۔

”تو کیا تم لوگوں نے عمارت کے اندر چیک نہیں کیا۔“ طاہر نے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

”جی نہیں سر۔“ گارڈ نے جواب دیا۔

”وجہ......؟“

”معافی چاہتے ہیں صاحب۔ لیکن یہ سچ ہے کہ اندر جانا کسی طور خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہمارے بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ عمارت انسانوں کے لئے بہت بھاری ہے۔“ دوسرے گارڈ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

”اکرم درست کہہ رہا ہے سر۔ اس جگہ واقعی سایہ ہے۔ آئے روز یہاں عجیب وغریب واقعات رونما

ہوتے رہتے ہیں۔“ دوسرے گارڈ نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے......تم لوگ یہیں رکو۔ میں خود اندر جا کر چیک کرتا ہوں۔ ان اوٹ پٹانگ قصے کہانیوں نے تم لوگوں کو بزدل بنا دیا ہے۔ دنیا مریخ پر پہنچنے کے چکر میں ہے اور تم لوگ جن بھوتوں کے قصے کہانیوں میں الجھے ہوئے ہو۔“ طاہر نے منہ بناتے ہوئے کہا اور بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھا ہی تھا کہ اس کی جیپ کا ڈرائیور ریاض جو کہ ان کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا اچانک بول پڑا:

”میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا صاحب۔“

”کیوں......کیا تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔“

”جی نہیں صاحب......موت کبھی بھی زندگی کو وقت سے پہلے نہیں دبوچتی۔“

شاباش......خوش کردیا تم نے ریاض۔“ طاہر نے مسکرا کر داد دی اور پھر اسے ہمراہ لے کر سرائے کے مین گیٹ میں داخل ہوگیا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں استقبالیہ کمرے میں موجود تھے۔

قدیم نقش ونگار سے آراستہ اس ویران کمرے کے در و دیوار سے ناقابل بیان وحشت ٹپک رہی تھی۔ رہی سہی کسر دیمک زدہ فرنیچر کی ابتر حالت اور نایاب فانوسوں کی مانند لٹکتے ہوئے مکڑی کے جالوں نے نکال دی تھی۔

”ارے بھائی کوئی ہے اس بھوت بنگلے میں......“ ریاض نے کمرے کے وسط میں پڑے خستہ حال کاونٹر کو بجا کر اس پر سوئی ہوئی برسوں پرانی مٹی کو بے آرام کر کے نفیس دھول میں بدل دیا۔ لیکن کوئی جواب سنائی نہ دیا۔

”اس کمرے میں کوئی موجود ہو نہ ہو لیکن عمارت میں ضرور کوئی موجود ہے۔“

”یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“ ریاض چونکا۔

”میرے پیچھے آؤ۔“ طاہر نے گرد سے اٹے فرش پر موجود قدموں کے نشانات کی جانب اشارہ کیا جو استقبالیہ کمرے سے شروع ہو کر عمارت کے اندرونی حصے میں غائب ہو رہے تھے۔ نشانات کا تعاقب کرتے ہوئے دونوں نے طویل راہداری پار کی اور پھر دروازہ کھول کر ایک کمرے میں داخل ہوگئے۔

”یقیناً وہ شخص اسی کمرے میں آیا ہوگا۔“ ریاض نے میز پر پڑے بریف کیس کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا۔

اسی لمحے طاہر چونک کر آگے بڑھا اور سامنے پڑا بریف کیس کھولا تو مارے حیرت کے دونوں کے ہوش اڑ گئے۔ بریف کیس کڑکتے ہوئے کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ساتھ موجود چند دیگر کاغذات سے معلوم ہوا کہ غائب ہونے والا کوئی بڑا صنعت کار تھا اور کسی اہم کاروباری ملاقات کے سلسلے میں فتح آباد جارہا تھا۔

”عجیب معاملہ ہے......اگر اسے اغوا کرنے والے ڈاکو تھے تو رقم کیوں چھوڑ گئے۔ جبکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی تک عمارت میں صرف ایک شخص کے قدموں کے نشانات دکھائی دیے ہیں۔“ یہ کہہ کر طاہر نے لاشعوری طور پر فرش کی جانب دیکھا تو اسے اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ کیوں کہ فرش پر اب دو لوگوں کے قدموں کے نشان تھے۔ ایک وہ جس کی انہیں تلاش تھی اور دوسرا خود طاہر۔ جبکہ ریاض کے جوتوں کے نشان کہیں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ حالانکہ وہ بھی اسی کے ساتھ چلتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ تیزی سے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی بدحواسی دیکھتے ہی ریاض نے بھرپور قسم کا قہقہہ لگایا اور اس کے جسمانی خدوخال کسی ڈرائی فلم کے منظر کی طرح تبدیل ہوگئے۔ اب طاہر کے سامنے ایک ایسا طویل قامد شخص کھڑا تھا جس نے اپنا پورا جسم سیاہ چوغے میں چھپار کھا تھا۔ جبکہ اس کا چہرہ انتہائی بھیانک اور مسخ شدہ تھا۔ رہی سہی کسر اس کی گہری سرخ آنکھوں نے نکال دی تھی۔ جن میں سے چھلکتی ہوئی شیطانیت ہر چیز کو اپنے سحر میں جکڑنے کے لئے بے چین تھی۔

”کون ہو تم......اور ریاض کہاں ہے؟“ طاہر نے اپنے حواس قابو میں رکھتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔

”میں کون ہوں یہ بعد کی بات ہے......باقی رہا ریاض، تو وہ خیریت سے ہے اور جیپ کے قریب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جھاڑیوں میں بے ہوش پڑا ہے۔ اس وقت تو مجھے تم پر افسوس ہو رہا ہے کہ اچھے خاصے سمجھ دار دکھائی دیتے ہو مگر پھر بھی حماقت کرنے سے باز نہیں آئے۔ کیا ضرورت تھی تمہیں یہاں آنے کی۔ لاوارث گاری دکھائی تھی تو پولیس کو اطلاع دے کر بھول جاتے۔ لیکن تم تو خود کو فارسٹ آفیسر کی بجائے ٹارزن سمجھنے لگے تھے اور بنا سوچے سمجھے کارنامہ دکھانے کیلئے یہاں آن پہنچے..... اب بھگتو۔"

اپنی بات مکمل کر کے اس نے سیاہ چوغہ ہوا میں پھڑپھڑایا اور کمرہ یکدم سیاہ آندھی کی لپیٹ میں آگیا۔ اس اچانک آفت سے نمٹنے کیلئے طاہر نے دروازے کی جانب بھاگنا چاہا۔ لیکن اسی لمحے کسی کے مضبوط ہاتھوں نے اسے اپنی گرفت میں لے کر ہوا میں اچھال دیا۔ کچھ دیر وہ کسی بے جان پتھر کی مانند ہوا میں بلند ہوا اور پھر بھیانک چیخ کے ساتھ قلابازیاں کھاتا ہوا کہیں گہرائی میں گرتا چلا گیا۔ اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی کی لپیٹ میں آگیا تھا۔

☆.....☆.....☆

جب طاہر کو ہوش آیا تو جانے کتنا وقت گزر چکا تھا۔ کچھ دیر تک وہ فرش پر پڑا خالی نظروں سے چھت کو گھورتا رہا اور پھر گزرے واقعات یاد آتے ہی بجلی کی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا جائزہ لینے پر معلوم ہوا کہ وہ بالکل صحیح سلامت ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود اسے خراش تک نہیں آئی تھی۔ حیران کن بات یہ کہ وہ اس کمرے کے فرش پر موجود تھا جہاں اس کے ساتھ حادثہ پیش آیا تھا۔ جبکہ ریاض کے بھیس میں دکھائی دینے والا شیطان غائب تھا۔

"میرا خیال ہے نوٹوں سے بھرا ہوا یہ بریف کیس خاموشی سے اس شخص کے گھر پہنچا دینا چاہیے۔ اگر میں پولیس کے چکر میں پڑا تو جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔" یہ سوچ کر طاہر نے بریف کیس اٹھایا اور سرائے سے باہر نکل آیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور اس کے تمام ساتھی غائب تھے۔ چنانچہ اس نے پیدل ہی اپنے ٹھکانے پر پہنچنے کا فیصلہ کیا اور آگے بڑھنے لگا۔ ابھی اس نے نصف فاصلہ طے کیا تھا کہ ریاض اور دونوں فارسٹ گارڈ واپس آتے دکھائی دیے۔ طاہر کو زندہ سلامت دیکھ کر ان کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے تھے۔

"یہ سب کسی شیطانی طاقت کی کارستانی ہے۔ مجھے ہوش آیا تو میں جھاڑیوں میں موجود تھا۔ مجھے یوں سرائے سے باہر پا کر دونوں گارڈز بھی ڈر گئے تھے۔ لیکن پھر بھی ہم نے بہت دیر تک آپ کا انتظار کیا اور پھر واپس چلے گئے۔ لیکن ہمیں سکون نہ ملا۔ اس لئے ایک مرتبہ پھر آپ کی تلاش میں سرائے کی طرف جا رہے تھے۔"

ریاض کی آنکھوں میں محبت کی نمی تھی۔ طاہر نے جواباً انہیں تسلی دی اور سرائے میں پیش آنے والا واقعہ مختصر طور پر بیان کیا۔

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے صاحب۔" ایک سیکورٹی گارڈ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں..... بس صحیح سلامت لوٹ آنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔" ریاض نے اسے گھورا۔

"ریاض ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آپ سب لوگ اس واقعے کو اپنے تک محدود رکھیں اور کسی سے ذکر نہ کریں۔" سب نے طاہر کی ہدایت سن کر اثبات میں سر ہلایا اور اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

انہیں رخصت کر کے طاہر بھی اپنی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ لیکن نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ اس نے ساری رات جاگتے ہوئے گزاری۔ سرائے میں پیش آنے والے واقعات بار بار اس کی آنکھوں کے سامنے منظر بدل رہے تھے۔

"مجھے سکون کی ضرورت ہے۔ اگر یہی حالات رہے تو میں بیمار پڑ جاؤں گا۔ اس لئے چند روز کے لئے یہاں سے چلے جانا بہتر رہے گا۔" صبح سویرے طاہر حتمی انداز میں بڑبڑایا اور ایک ہفتے کی رخصت پر شہر میں موجود اپنے آبائی گھر روانہ ہو گیا۔

☆.....☆.....☆

طاہر شہر پہنچا تو اس کے دل و دماغ پر بریف کیس

سوار تھا۔ چنانچہ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد وہ شہر کے پوش علاقے میں موجود ایک عالیشان بنگلے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور وہاں موجود باوردی چوکیدار سے پوچھا:

"واجد صاحب کا گھر یہی ہے۔"

"جی ہاں..... کس سے ملنا ہے آپ کو؟" استفسار پر چوکیدار نے سوال کیا۔

"میں ان کا دوست ہوں..... دوسرے شہر سے آیا ہوں۔"

"لیجیے واجد صاحب خود بھی آ گئے۔" اس سے قبل کہ بات مکمل ہوتی۔ چوکیدار نے گیٹ کی سامنے رکنے والی کار کی جانب اشارہ کیا اور جلدی سے گیٹ کھولنے کے لئے اندر کی جانب لپکا۔ طاہر نے پلٹ کر کار کی جانب دیکھا تو اس کی ٹانگیں لرز اٹھیں۔ ایک ایسا شخص جسے وہ مردہ سمجھ رہا تھا۔ گاڑی سے اتر کر مسکراتا ہوا اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

"ہیلو..... کیسے ہو طاہر؟" اس نے پرجوش انداز میں مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"مم..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ واجد صاحب ہیں ناں؟" طاہر نے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہاں..... بالکل۔ کوئی شک ہے تو شناختی کارڈ دکھا دوں۔" وہ اس کی بدحواسی پر محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے کیسے جانتے ہیں۔ جبکہ میرا خیال ہے کہ ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے کہ ہم پہلی مرتبہ مل رہے ہیں..... آؤ اندر چل کر گپ شپ کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ دونوں گھر کی اندرونی عمارت میں داخل ہوئے اور پھر ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔

"بیٹھو....." واجد نے صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

"جی شکریہ..... دراصل میں یہ بریف کیس واپس کرنے آیا تھا۔" طاہر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔" واجد کا فقرہ مکمل ہوتے ہی فضا میں ایک تیز سرسراہٹ گونجی اور پھر اس کے خدوخال بدلنے لگے۔ اب طاہر کے سامنے وہی مکروہ صورت والا شیطان بیٹھا تھا جو اسے سرائے میں ملا تھا۔

"کک..... کون ہو تم اور یہ کیا تماشہ ہے..... کیوں بھیس بدل بدل کر میرے سامنے آ رہے ہو۔" طاہر اسے دیکھتے ہی تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"گھبراؤ مت..... میں کوئی غیر نہیں تمہارا دوست ہوں۔ یقین مانو میرا مقصد تمہیں نقصان پہنچانا ہرگز نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو تم سرائے سے زندہ باہر نہ آتے۔"

"کیا نام ہے تمہارا؟" طاہر نے گہری سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"دجال....."

"یہ کیسا نام ہے؟ میری معلومات کے مطابق تو اسے قیامت کے نزدیک ظاہر ہونا ہے۔" طاہر حیرت سے بولا۔

"میں وہ نہیں ہوں۔ نام تو کسی کا بھی دوسرے سے مل سکتا ہے۔ ویسے مجھ میں اور اس دجال میں ایک بات مشترک ہے۔" وہ شیطانی انداز میں مسکرایا۔

"اچھا..... وہ کیا؟"

"یہ کہ لوگ ظاہری طور پر ہم دونوں سے نفرت کرتے ہیں لیکن درحقیقت ہمارے ہی نقش قدم پر چل کر دنیا فتح کرنا چاہتے ہیں۔" وہ فخر سے بولا۔

"مجھ سے کیا چاہتے ہو۔" طاہر نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"صرف دوستی..... دیکھنا کہ یہاں سے جانے کے بعد زندگی کس طرح مہربان ہو جائے گی تم پر۔ اب تم فارسٹ آفیسر جیسی معمولی نوکری کو بھول کر حکمرانی کے خواب دیکھو اور ہاں یہ بریف کیس بھی تمہارا ہے۔ جاؤ اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرو..... میں ہر وقت تمہارا محافظ بنا رہوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنا سیاہ چوغہ ہوا میں پھڑپھڑایا اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمرہ سیاہ دھویں سے بھر گیا۔ طاہر کو یوں محسوس ہوا جیسے راکھ کی ایک بڑی مقدار اس کے ناک اور گلے میں گھس گئی ہو۔ لیکن کچھ دیر بعد یہ گھٹا چھٹی تو کمرے کا منظر واضح ہوا۔ جس میں واجد صوفے پر بلند آواز میں خراٹے لے رہا تھا۔ طاہر نے اسے جگا کر بے آرام کرنا مناسب نہ سمجھا اور چپ چاپ کمرے سے باہر آگیا۔

☆......☆......☆

دجال سے ملاقات کے بعد طاہر کی زندگی میں کئی نئی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے بڑھنے لگے اور غیر معاشرے میں اس کا وقار غیر محسوس طریقے سے بلند ہونے لگا۔ اب اس کا دل اپنی ملازمت سے بھی اچاٹ ہوگیا تھا چنانچہ اس نے اس نے محکمے میں درخواست دے کر سال بھر کی رخصت لے لی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب ٹھیک نہیں ہے اور ڈھیروں کے حساب سے ملنے والی ناجائز دولت اس کے لئے وبال بن سکتی ہے۔ لیکن تکبر کے مسحور کن نشے نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کردی تھی۔ اس دوران دجال نے ہر لمحے اپنی دوستی کا حق ادا کیا تھا ۔جب کہ اس کی حمایت کر کے طاہر نے زندگی کی ہر آسائش حاصل کرلی تھی۔

وقت کا پرندہ اڑتا چلا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ ایک سال گزر گیا۔ طاہر اکثر سوچا کرتا تھا کہ ماہ و سال اتنے مختصر کیوں ہوگئے ہیں۔ شاید ازل سے جاری موت اور زندگی کے کھیل سے اکتا کر ماہ و سال نے ہم سے وہ جذباتی رشتہ منقطع کرلیا ہے جو ہمیں وقت کی اہمیت اور زندگی کی قدر و قیمت کا احساس دلاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ انسان نے چاند سورج کی آنکھ مچولی کو گھنٹوں اور منٹوں میں تقسیم کر کے اپنی گھڑیوں میں مقید تو کرلیا ہے لیکن اس پر گرفت حاصل کرنے میں ناکام رہا ہے۔

ایک دن طاہر اپنے دوست عاصم سے ملنے پوسٹ آفس گیا۔ عاصم وہاں پوسٹ ماسٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ دیر تک دونوں دوست ادھر ادھر کی گپیں ہانکتے رہے۔ ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ عاصم اسے نظر انداز کر کے کیبن سے باہر بیٹھے ایک ادھیڑ عمر کلرک کو دیکھنے لگا جس کے سامنے ڈاک کے لفافوں کا انبار تھا اور وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز اپنی ہی دھن میں مست کسی خودکار مشین کی طرح دھڑا دھڑ لفافوں پر مہریں لگائے چلا جارہا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو......کون ہے یہ شخص؟" طاہر نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ششش...... خاموشی سے دیکھو۔ آج تمہیں ایک حیرت انگیز چیز دکھاتا ہوں۔" اس نے جواب دیا اور دونوں بغور اس کلرک کو دیکھنے لگے۔ جو لفافوں پر مہریں ثبت کررہا تھا۔ پھر اچانک ٹھک ٹھک کا شور تھما اور اس کا ہاتھ لفافے سے چند انچ اوپر ہوا میں یوں معلق ہوگیا جیسے برقی رو معطل ہوگئی ہو۔ عاصم کے کان شاید اسی غیر متوقع خاموشی کے منتظر تھے سکوت طاری ہوتے ہی اس نے طاہر کا ہاتھ تھاما اور دونوں بلی کی طرح دبے پاؤں چلتے ہوئے کلرک کے عقب میں جا کھڑے ہوئے۔

"نیا لفافہ...... پرانا ٹکٹ...... بے وقوف بناتا ہے درویش کو۔"

کلرک کی دھیمی مگر کرخت آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتے اس کے ہاتھ میں موجود لفافہ پڑول کی طرح بھڑک اٹھا۔ اگلے ہی لمحے اسے اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو اس نے تیزی سے گردن گھمائی۔

"کک...... کیا ہوا حضرت صاحب؟" چوری پکڑے جانے پر عاصم کھسیانے لہجے میں بولا۔

"کچھ نہیں...... کوئی بار بار مجھے آزمانے کی کوشش کررہا ہے۔"

"کون ہے وہ...... کیا تم اسے جانتے ہو؟"

"جی ہاں جانتا ہوں...... آپ ہی ہیں۔" اس نے عاصم کو گھورتے ہوئے جواب دیا اور لاپروائی سے ہاتھ پر موجود راکھ کو پھونک مار کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ وہ دونوں بے وقوفوں کی طرح اس کے سرہانے کھڑے رہے اور پھر توجہ نہ ملنے پر چپ چاپ واپس

اپنے کیبن میں لوٹ آئے۔

"کیا نام ہے اس کا؟" کرسی سنبھالتے ہوئے طاہر نے پوچھا۔

"کریم بخش۔ ویسے یہاں سب لوگ اسے حضرت صاحب کہتے ہیں......کلرک ہے یہاں۔ اب تو ریٹائرڈ ہونے والا ہے۔"

"کوئی پہنچی ہوئی ہستی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہاں...... مجھے یقین ہے۔ اس کے پاس کوئی پراسرار طاقت موجود ہے۔ مگر وہ کسی کے ساتھ فری نہیں ہوتا۔ مطلب کی بات کرتا ہے یا پھر خاموش رہتا ہے۔ اسے آزمانے کے لئے میں نے کئی الٹی سیدھی حرکتیں بھی کیں مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آج اسے ملنے والا خط بھی میری ہی کارستانی تھا۔ جس کا نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔" عاصم نے جواب دیا۔

"کیا لکھا تھا تم نے خط میں؟"

"صرف یہ کہ میں تمہیں آزمانا چاہتا ہوں۔" ابھی وہ باتیں کررہے تھے کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کیبن کا دروازہ کھلا اور کریم بخش اندر داخل ہوا۔

"آئیں حضرت صاحب...... بیٹھیں۔" عاصم نے جلدی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں صاحب! میں یہاں بیٹھنے کیلئے نہیں آیا۔ آپ کے دوست سے ایک بات کہنی ہے۔"

"مجھ سے......" طاہر چونک کر اس کی جانب دیکھنے لگا۔

"جی۔"

"ہاں ہاں...... بولو؟"

"صرف یہ کہنا ہے کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوا کرتی۔ آپ جس راستے پر چل رہے ہیں وہ ذلت اور گناہ کے دہانے پر ختم ہوتا ہے۔ ابھی وقت ہے، واپس لوٹ آئیں۔ ورنہ آپ کی دنیا اور آخرت دونوں برباد ہو جائے گی۔" اپنی بات کہہ کر کریم بخش ان کا جواب سننے کے لئے وہاں رکا نہیں بلکہ فوراً کیبن سے باہر نکل گیا۔ عاصم بھی رحیم بخش کی بات سن کر حیران رہ گیا تھا۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ۔ تم یقیناً کسی مشکل میں گرفتار ہونے والے ہو۔ کیوں کہ کریم بخش کبھی فضول بات نہیں کرتا۔" اس کے جاتے ہی عاصم نے طاہر سے اگلوانے کی کوشش کی۔

کچھ دیر تک تو طاہر اسے ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن جب اصرار حد سے زیادہ بڑھا تو اس نے ساری صورت حال سچ سچ بتادی۔ کریم بخش کے چند ہی جملوں نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور دجال کی دی ہوئی تمام آسائشات اسے بے معنی محسوس ہونے لگی تھیں......ادھر ساری تفصیل سننے کے بعد عاصم گہری سوچ میں ڈوب گیا اور کافی دیر بعد اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"دیکھو طاہر! مان جاؤ۔ تم کسی بڑی مشکل میں پھنسنے والے ہو۔ دجال سے تمہارا تعلق زیادہ پرانا نہیں ہے ابھی وقت ہے چھوڑ دو اس کا ساتھ۔"

"میں تو اسے چھوڑنے کے لئے تیار ہوں مگر وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

"تم فکر مت کرو۔ ہم اس سلسلے میں کریم بخش سے مشورہ کریں گے۔ وہ ضرور کوئی راستہ نکال لے گا۔" عاصم نے اسے تسلی دی تو وہ کریم بخش سے ملاقات کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے کے بعد وہ دونوں کریم بخش سے ملنے گھر سے نکل پڑے۔

عاصم کی معلومات کے مطابق وہ اپنا زیادہ وقت شہر سے باہر موجود ایک پہاڑی پر موجود کٹیا میں گزارتا تھا۔ انہوں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کی اور ناہموار زمین پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے ایک گھنٹہ بعد اپنی منزل پر جا پہنچے۔ اندھیری رات میں کٹیا کے جھروں سے باہر آنے والی دیے کی مدھم روشنی نے ماحول کی پراسراریت میں کئی گنا اضافہ کردیا تھا۔ کچھ دیر وہیں اپنی جگہ پر دبکے رہنے کے بعد وہ دونوں حوصلہ کر کے آگے بڑھے اور کٹیا کے جھروکوں سے اندر جھانکا۔ لیکن اندرونی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منظر دیکھتے ہی ان کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے۔ اندر موجود کریم بخش زمین سے دو فٹ بلند ہوا میں معلق تھا اس کی آنکھیں بند اور سر جھکا ہوا تھا اور جسم سے پھوٹنے والی دودھیا روشنی نے کسی دائرے کی طرح اسے اپنے حصار میں جکڑ رکھا تھا۔

اچانک کچھ سوچ کر طاہر نے گردن گھمائی تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ کیوں کہ اس وقت وہ دونوں کٹیا کے باہر نہیں اندر موجود تھے۔ یہ منظر دیکھتے ہی وہ عاصم کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے واپس مڑا لیکن کریم بخش کی نرم آواز نے ان کے قدم جکڑ لیے۔

"واپس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ لوگ بالکل محفوظ ہیں۔"

"معافی چاہتے ہیں حضرت صاحب۔ ہم بنا اجازت چلے آئے۔ ایک ڈاکیہ نے بتایا تھا کہ آپ یہاں ہوتے ہیں۔" عاصم نے بنا پوچھے تفصیل سنائی جب کہ طاہر کو کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ ان دونوں کی بدحواسی دیکھ کر کریم بخش مسکرا دیا اور شفقت بھرے لہجے میں بولا:

"کوئی بات نہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھیں۔ مجھے آپ کی آمد سے خوشی ہوئی ہے۔"

"جی شکریہ۔" وہ دونوں فرمانبرادری سے زمین پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی ہانکنے کے بعد عاصم اصل بات کی طرف آیا۔

"حضرت صاحب! جیسا کہ آپ نے دفتر میں بتایا تھا کہ میرا دوست آج کل مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کی مدد اور راہنمائی کریں تاکہ اس میں برائی کا مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا ہو۔"

"عاصم درست کہہ رہا ہے حضرت صاحب! مجھے واقعی آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ جو کہیں گے میں کروں گا اور وہ سب کچھ چھوڑ دوں گا جس سے آپ منع فرمائیں گے۔" طاہر نے عاصم کی تائید کی۔

ان کی باتیں سن کر کریم بخش نے سر جھکا لیا اور مراقبہ میں چلا گیا۔ اس نے کافی دیر بعد آنکھیں کھولیں اور طاہر کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"عالم روحانیت ہماری جیتی جاگتی دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں وہ سب کچھ ممکن ہے جسے سائنسی اعتبار سے ناممکن قرار دیا جاتا ہے۔ آپ دنیادار لوگ ہیں۔ دوست احباب، گھربار، روپیہ پیسہ آپ کی زندگی کا حصہ ہے۔ یہ سب چھوڑنا عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جبکہ کسی بڑے مقصد کے حصول کے لئے دنیاوی خواہشات کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے اور اپنی ذہنی صلاحیت کو ایک نقطے پر مرکوز کرنے کے لئے قدم قدم پر قربانیاں دینی پڑتی ہیں...... سوچ لیں کیا آپ یہ سب کچھ کرسکیں گے۔"

"میرا فیصلہ جذباتی نہیں ہے حضرت صاحب۔ میں بہت سوچ سمجھ کر یہاں آیا ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دوں گا۔" طاہر نے پر عزم لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ میری دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔" یہ کہہ کر کریم بخش اپنی جگہ سے اٹھا اور طاہر کو گلے سے لگا لیا۔

☆......☆......☆

دن دھیرے دھیرے گزرنے لگے تھے۔ کریم بخش کی خاص توجہ اور راہنمائی کے باعث علم وآگہی کے کئی نئے در طاہر پر وا ہونے لگے تھے۔ اب کریم بخش کی بہت سی کرامات اس پر منکشف ہو چکی تھیں۔ یہ تمام سلسلہ باقی لوگوں سے راز رکھا گیا تھا حتا کہ عاصم سے بھی اس کی بہت کم ملاقات ہوتی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ جب سے وہ کریم بخش سے ملا تھا دجال اس کی زندگی سے غائب ہو گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ دجال کو دور سے دیکھا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ شدید غصے میں ہے اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ مگر کوئی طاقت اسے طاہر کے قریب نہیں آنے دے رہی ہے۔

پھر وہ وقت بھی آن پہنچا جب طاہر کی راتیں عبادت الٰہی میں گزرنے لگی اور نیند سمٹ کر چند گھنٹوں پر محیط ہو گئی۔ دنیاوی خواہشات اس کے ذہن سے غائب

ہونے لگیں اور روحانیت سے وابستگی گہری ہوتی چلی گئی۔ کریم بخش اکثر کہا کرتا تھا کہ دنیا میں میرا اپنا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے تمہارا یوں مل جانا اللہ کی خاص کرم نوزی ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ میرے بعد تم حق کا علم بلند رکھتے ہوئے بدی کے خلاف جہاد جاری رکھو۔"

شروع شروع میں یہ باتیں سن کر طاہر کے اندر ایک نیا ولولہ پیدا ہوتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے ماحول میں ایک یکسانیت سی محسوس ہونے لگی۔ اب علم روحانیت میں اس کی دلچسپی کم ہونے لگی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کڑی محنت کے باوجود نتائج حسب منشاء نہیں تھے۔ گو مسلسل عبادت کرنے سے اسے اپنی روح میں تازگی کا ایک نیا احساس محسوس ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ مطمئن نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ راتوں رات کریم بخش کے ہم پلہ بن جانا چاہتا تھا۔

ایک رات اسی مسئلے پر ان دونوں کے درمیان تلخ کلامی ہو گئی۔ طاہر کی بے دلی دیکھ کر کریم بخش نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے ایک نہ سنی اور ناراض ہو کر گھر جانے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچا تھا کہ کریم بخش کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔

"جانے سے پہلے میری ایک بات غور سے سن لو...... یاد رکھو اللہ کے نیک بندوں کی نشانی یہ نہیں ہوا کرتی کہ وہ ہوا میں اڑ سکیں، پانی پر چل سکیں یا پھر اپنی آنکھوں کی روشنی سے چیزوں کو بھسم کر دیں...... اللہ کے نیک بندے تو وہ ہوتے ہیں جو آنکھوں میں دیکھیں تو دل میں اتر جائیں۔ بگڑی ہوئی زندگی سنوارنے میں مدد دیں اور انسان کو اس کے اشرف المخلوقات ہونے کا احساس دلائیں۔ باقی چیزیں تو میرے اللہ کی دین ہیں جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔"

طاہر نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور غصے کی حالت میں کٹیا سے باہر نکل گیا۔ سارے راستے وہ کریم بخش کو کوستا رہا۔ گزرے دنوں کی محنت اسے وقت کا ضیاع محسوس ہونے لگی تھی۔

"بہت بنتا ہے۔ جانے کیا سمجھا ہے خود کو۔ کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا اس کا۔" گھر پہنچ کر وہ بڑبڑاتا ہوا سونے کیلئے بستر کی طرف بڑھا۔

☆......☆......☆

"میں بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ اس کی عیاریوں کو سمجھو۔ لیکن جانے کیوں تم مجھے اپنا نہیں سمجھتے۔" کونے سے ابھرنے والی دجال کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"تو...... تم پھر آ گئے" وہ حیرت سے بولا۔

"میں گیا ہی کب تھا...... دوستی کی تھی تم سے غداری کیسے کرسکتا تھا۔ کریم بخش نے تمہارے ساتھ جو کیا اس پر بحث فضول ہے دوست۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے دل میں کھوٹ ہے۔ وہ اندر سے خوفزدہ ہے کہ تم اس سے سبقت نہ لے جاؤ۔ لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں اس سے مقابلے کے لئے تیار کروں۔"

"تم یہ سب کیوں کرنا چاہتے ہو۔"

"تاکہ کریم بخش کا غرور توڑ سکوں اور یہ ثابت کر سکوں کہ اس سے قابل لوگ بھی موجود ہیں اس دنیا میں۔"

"اور اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تم ایک عقلمند آدمی ہو۔ اتنی بڑی حماقت کیسے کر سکتے ہو...... ویسے بھی تمہیں تو ابھی بہت ترقی کرنی ہے۔" دجال کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا۔ ان حالات میں وہی اس کی مدد کرسکتا تھا۔

"ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تمہاری راہ پر چل کر مجھے ہر قدم پر کامیابی حاصل ہوگی۔" کچھ دیر بعد طاہر نے سوچ کر کہا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے اس بارے سوچ کر عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ دیکھنا میں تمہیں مایوس نہیں کروں گا۔ میں تمہیں ان بہت سے لوگوں سے ملواؤں گا جو میرے اشاروں پر چلتے ہوئے آج اپنے اپنے شعبوں میں اہم مقام حاصل کر چکے ہیں۔ ہم اپنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سفر ابھی شروع کریں گے چلو میرے ساتھ اور تیار ہو جاؤ ایک ایسی دنیا دیکھنے کے لئے جہاں ہر قدم پر تمہارے لئے کامیابی اور شہرت ہے۔"

دجال نے پرجوش انداز میں جواب دیا اور اپنا چوغہ تیزی سے ہوا میں پھڑ پھڑایا۔ یکلخت کمرہ سیاہ غبار سے بھر گیا اور طاہر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا جسم بے وزنی کی حالت میں کسی نامعلوم منزل کی جانب محو پرواز ہے۔ کچھ دیر بعد سفر ختم ہوا تو اندھیرا خود بخود چھٹ گیا۔ وہ دونوں ایک نیم تاریک راہداری میں بند دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔

"اندر چلے جاؤ۔" دجال نے بند دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

"اور تم......؟"

"مجھے اجازت نہیں ہے...... تم یقیناً بہت خوش قسمت ہو۔"

جواب سن کر طاہر نے کاندھے اچکائے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ یہ ایک نیم تاریک کمرہ تھا۔ جس کی فضا میں عجیب سا بوجھل پن تھا۔ گھٹن کا احساس ہوتے ہی اس نے بے چینی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی لیکن کوئی دوسرا دکھائی نہ دیا۔

ابھی وہ حالات پر غور کر رہا تھا کہ ایک قدیم اور بوسیدہ کتاب اس کے سامنے موجود خالی میز پر آن گری۔ اس انوکھے استقبال پر وہ لحہ بھر کیلئے ٹھٹک گیا۔ پھر طاہر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"کالی دنیا......"

بوسیدہ ٹائٹل پر لکھے گہرے سرخ الفاظ نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کتاب اٹھائی اور پہلا صفحہ پلٹ کر اس پر موجود چھوٹا سا پیراگراف پڑھنے لگا۔

"یہ ایک ایسی کتاب ہے جو تمہاری زندگی کی کایا پلٹ سکتی ہے۔ زندگی کے روپ میں موت کا کھیل۔ اگر کچھ پانا چاہتے ہو تو اگلا صفحہ پلٹو۔ لیکن یاد رہے کہ اس سفر سے واپسی ممکن نہیں ہے۔" اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے دل اور دماغ اپنے اپنے دلائل دے کر اسے قائل کرنے کی کوشش میں تھے۔

"کہیں یہ سفر مجھے گمراہی کی دلدل میں تو نہیں دھکیل دے گا...... مجھے لوٹ جانا چاہیے۔" یہ سوچ کر اس نے کتاب واپس میز پر رکھی اور دروازے کی جانب پلٹا۔

"واپس جانا اتنا آسان نہیں ہے۔ ویسے بھی کیا کرو گے اپنی دنیا میں لوٹ کر۔ بہتر یہی ہے کہ اپنے فیصلے پر غور کرو۔ ہو سکتا ہے قسمت کی تمہارے دل کے بند دروازے پر یہ آخری دستک ہو۔" کمرے میں گونجنے والی آواز نے اس کی سوچوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔

"کون ہو تم...... سامنے آ کر بات کرو۔" طاہر نے مرعوب ہوئے بغیر اس نادیدہ آواز کو للکارا۔

"میں ہو اندھیروں کا بادشاہ، تمہارا دوست ابلیس۔" آواز کی گونج ختم ہوتے ہی چھت سے گہری سیاہ راکھ بارش کی صورت میں برسنے لگی اور پھر کمرے کی فضاء میں ایک غیر واضح شبیہ معلق ہو گئی۔

"کیوں بلایا ہے مجھے یہاں۔" طاہر نے جسم میں دوڑنے والی سردی کی تیز لہر پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا۔

"میں تمہیں اپنے خاص بندوں میں شامل کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ ناممکن ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہوں اور تم شیطان مردود پر لعنت بھیجتا ہوں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میرے دوستوں میں تو ہر مذہب اور ہر قوم کے لوگ شامل ہیں۔ ویسے بھی کیا دیا ہے مذہب نے تمہیں...... میری اطاعت قبول کر لو دیکھنا زندگی آسان ہو جائے گی تمہاری۔

"زندگی ہی آسان نہیں ہو گی...... آخرت بھی مشکل جائے گی میری۔" طاہر نے جواب دیا۔

"آخرت کس نے دیکھی ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچو نوجوان، زندگی بار بار نہیں ملتی......" ابلیس کی طنزیہ آواز سنائی دی۔

"میں لعنت بھیجتا ہوں تمہاری آسائشات اور تم پر۔"

"مجھے تمہاری بات پر ذرا غصہ نہیں آیا۔ کیوں کہ دنیا میں مجھ پر لعنت بھیجے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ تمام لوگ جو بظاہر مجھ سے نفرت کرتے ہیں دل ہی دل میں میری تعریف کرتے نہیں تھکتے اور پھر اسی چیز کو اسٹیٹس کا نام دیا جاتا ہے...... میں تمہیں ایک موقع اور دینا چاہتا ہوں تا کہ متاثر ہو کر تم خود بخود میرے غلام بن جاؤ۔"

اپنی بات مکمل کر کے ابلیس نے چٹکی بجائی اور حیرت انگیز طور پر طاہر کے ارد گرد کا منظر ہی بدل گیا۔ اب وہ ایک ایسے وسیع و عریض بنگلے کے لان میں موجود تھا جہاں قدم قدم پر مسلح سیکورٹی گارڈز کسی انجانے خطرے سے نمٹنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔

"گھبراؤ مت یہ لوگ تمہیں دیکھ نہیں سکتے۔ بلا خوف و خطر عمارت کے اندر داخل ہو جاؤ۔"

ابلیس کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ طاہر نے اثبات میں سر ہلایا اور اطمینان سے لان کے درمیان میں بنے سنگ مرمر کے راستے کو پار کر کے مرکزی عمارت میں داخل ہو گیا۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ مختلف کمروں سے ہوتا ہوا وہ ایک خوابگاہ میں پہنچا جہاں ایک پریشان حال شخص جس کے چہرے پر پھٹکار برس رہی تھی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اتنے میں ایک سیکورٹی افسر اندر داخل ہوا تو وہ شخص تیز لہجے میں بولا:

"کچھ معلوم ہوا......؟"

"سب ٹھیک ہے سر۔ ہر چیز کنٹرول میں ہے...... خطرے کا الارم صرف سسٹم کی جانچ کے لئے بجایا گیا تھا۔ ورنہ کسی مسلمان کی جرات نہیں کہ اندر داخل ہو۔"

"شکر ہے......" ٹہلنے والا شخص اطمینان کا سانس لیتے ہوئے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

"جانتے ہو اسے......" شیطان کی آواز سنائی دی۔

"شکل تو جانی پہچانی دکھائی دے رہی ہے...... مگر یاد نہیں آ رہا اس شخص کو کہاں دیکھا ہے۔"

"یہ میرا خاص آدمی ہے۔"

"نام کیا ہے اس کا؟"

"سلمان رشدی......"

"گستاخ رسول...... ملعون...... یہی نام بتایا تم نے۔" طاہر کو حیرت کا جھٹکا لگا اور پھر اس کے سینے میں بھڑکنے والی نفرت کے الاؤ نے سانسوں کو گرما دیا۔

"ہاں وہی رشدی جس نے تمہارے رسول کی شان میں گستاخی کی اور اپنی کتاب میں ایسے کلمات تحریر کیے جن سے مجھے راحت ملی۔"

"یہ ملعون ہے اور میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" طاہر پرجوش لہجے میں بولا۔

"اپنی نفرت کے اظہار کے لئے تم اسے کسی بھی نام سے پکارو کوئی فرق نہیں پڑتا...... حقیقت یہی ہے کہ مجھے خوش کرنے کے لئے اس نے مجھے کتاب کی شکل میں ایسا تحفہ پیش کیا جسے تمہارا عالم اسلام کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اسے پر انعام کی بارش کر دی ہے...... خود دیکھ لو یہ ایک عالیشان محل میں زندگی گزار رہا ہے اور اس کی حفاظت کے لئے دنیا کا جدید سیکورٹی سسٹم استعمال کیا جا رہا ہے۔" ابلیس فخریہ لہجے میں بولا۔

"یہ صرف تمہارے نزدیک پرسکون زندگی ہے۔ میرے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ہے اس ملعون پر کہ ہر آسائش میسر ہونے کے باوجود، وہ پرسکون زندگی کے احساس سے کوسوں دور ہے...... دنیا کے کروڑوں فرزندان توحید اس کے ناپاک وجود کو مٹانے کے لئے ہر لحہ بے چین ہیں۔ یہ تو وہ بدنصیب ہے جو اپنی مرضی سے پانی بھی نہیں پی سکتا کہ کہیں اس میں زہر نہ ہو۔"

"کیا بگاڑ لیا تمہارے لوگوں نے اس کا۔ میری مدد کے باعث آج بھی وہ طاقتور ہے۔" ابلیس کی باتوں میں طنز تھا۔

"اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں ہے۔ بلکہ یہ میرے اللہ کی حکمت ہے جس نے اِس ملعون کی موت کا دن مقرر کر کے اس کی رسی کو ڈھیل دے رکھی ہے تا کہ یہ موت سے پہلے دنیا میں جی بھر کر ذلیل ہو سکے۔ بالکل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری طرح۔" ملعون رشدی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر طاہر کے دل میں پھر سے جذبہ ایمان جاگ اٹھا تھا۔

"میری طرح کیسے......" ابلیس حیرت سے بولا۔

"کیونکہ تمہیں بھی تو قیامت تک دنیا میں ذلیل ہونا ہے۔" طاہر کی بات سن کر ابلیس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اور وہ کھسیانا ہو کر بولا:

"تم تو خوانخواہ اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہو۔ خیر تمہاری مرضی آؤ اب تمہاری ملاقات چند دوسرے کامیاب لوگوں سے کرواؤں۔" ابلیس نے کہا اور ایک مرتبہ پھر کمرے میں سیاہ غبار سا چھا گیا۔

"آنکھیں کھولو۔" ابلیس کی آواز سنائی دیتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں تو ایک نیا منظر اس کا منتظر تھا۔

تین لوگ ایک خوبصورت کمرے میں بیٹھے کسی بات پر قہقہے لگا رہے تھے۔ ان کے سامنے میز پر پینے پلانے کا وہ تمام سامان موجود تھا۔ جس کی اجازت نہ تو ہمارا مذہب دیتا ہے اور نہ قانون۔ لیکن یہ سب چل رہا تھا کیوں کہ مذہب ان کے نزدیک عوام کو جوش دلانے اور اپنے مقاصد کے حصول کا ایک آسان ذریعہ تھا جب کہ قانون مٹی کا وہ کھلونا جسے توڑنا اور بنانا وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔

"سیٹھ صاحب! اُس فائل کا بندوبست ہو گیا ہے۔"

"کونسی فائل......" سیٹھ صاحب چونکے۔

"وہی جو دشمن مانگ رہا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اس مرتبہ قیمت بھی منہ مانگی مل رہی ہے۔"

"بھئی مروانہ دینا...... آج کل سختی بھی بہت ہے۔"

"کوئی سختی نہیں ہے...... بس دکھاوا ہے۔ اندر ہی اندر سب نے لوٹ مچا رکھی ہے ہماری طرح۔ خود سوچیں جب سب چور ہوں گے تو پکڑے گا کون۔"

"تو یوں بولو ناں خوب گزرے گی جب مل بیٹھیں گے دیوانے بہت سے۔" سیٹھ صاحب نے باقاعدہ گنگناتے ہوئے جواب دیا اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"کیوں دیکھ لیا اپنے محب وطن لوگوں کا حال۔ سارے میرے دوست ہیں۔ ہر حکم مانتے ہیں میرا۔ ان کی فرمانبرداری کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ یہ لوگ اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین توڑ کر میری ہدایت کے مطابق مزے کر رہے ہیں۔" ابلیس کے لہجے میں فخر تھا۔

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ وہم ہے تمہارا۔ ملک کی ترقی اور سلامتی کا انحصار ان چند اوباش لوگوں پر نہیں بلکہ ان کروڑوں محب وطن لوگوں پر ہے جنہیں اپنی ذمہ داریوں کا مکمل احساس ہے۔ کیوں کہ یہ ملک انہیں اپنی جان سے بھی عزیز ہے۔" طاہر فخر سے بولا۔

"یہ سب جذباتی نعرے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی باگ ڈور انہیں طاقتور لوگوں کے ہاتھ میں ہے اور کوئی انہیں اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔"

"بھول ہے تمہاری۔ ان لوگوں کے بس میں کچھ نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اب تک دنیا کے نقشے سے ہمارا نام و نشان مٹ چکا ہوتا۔ دنیا میں نیکی اور بدی دونوں موجود ہیں لیکن بدی میں اتنی طاقت ہرگز نہیں ہے کہ نیکی کو مٹا سکے۔ ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اسلامی تعلیمات کا فروغ ہے۔ تاکہ لوگوں میں بھائی چارے کا رشتہ مستحکم ہو اور ہر شخص انفرادی طور پر اپنی ذمہ داری کا احساس کر سکے۔

"پتا نہیں تم کس دنیا کی باتیں کر رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں ان بھائی چارہ قائم کرنے والے لوگوں کا دیدار بھی کروا ہی دیا جائے تاکہ تمہارے کان اور آنکھیں اچھی طرح کھل جائیں۔"

ابلیس کا فقرہ مکمل ہوتے ہی ایک فلیش سا چمکا اور تیسرے منظر نے اس کی آنکھوں کے سامنے انگڑائی لی جس میں سرکردہ لوگ سر جوڑے بیٹھے تھے۔

"یہ سچ ہے کہ نماز روح کی غذا ہے لیکن پیٹ بھی تو پالنا ہے۔" ایک کی آواز سنائی دی۔

"لیکن یہ سب غلط ہے۔ قوم و ملک کی خدمت ایک مقدس فریضہ ہے، اسے کاروبار نہیں بنانا چاہیے...... سب جانتے ہیں لوگوں نے ملک و قوم کے لئے کیا کیا قربانیاں

دی ہیں۔ ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے تاکہ نئی نسل کو اصل مقصد حیات سے روشناس کروا سکیں۔" قریب بیٹھے نوجوان نے پرعزم لہجے میں کہا۔

"تم ابھی ناسمجھ ہو بچے...... اور دیکھو ان لوگوں کی مثالیں مت دیا کرو ہمیں۔ وہ سب بڑے لوگ تھے۔ ہم ان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں ویسے بھی انہیں وہ جھنجٹ کہاں تھے جو ہم نے پال رکھے ہیں۔ خود سوچو نہ تو ان کے بچے انگریزی اسکولوں میں پڑھتے تھے اور نہ ہی انہیں بجلی پانی کے بل ادا کرنے پڑتے تھے۔ نیک لوگ تھے روکھی سوکھی کھاتے تھے اور عبادت کرتے رہتے تھے...... جب کہ ہمارے سو بکھیڑے ہیں۔ عزیز و اقارب، دوست احباب سب کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور پھر جب سے سیاسی مصروفیات شروع ہوئی ہیں اخراجات مزید بڑھ گئے ہیں۔ ایک الیکشن لڑنا ہو تو کروڑوں کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اب خود بتاؤ ہم ادھر ادھر ہاتھ نہ ماریں تو کیا کریں۔" قریب بیٹھے دوسرے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن جناب اگر ہم یہ سب کریں گے تو روز حشر اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے۔"

"بھی اللہ کو منہ صرف ہم تو نہیں دکھانا اور بھی بہت لوگ ہوں گے۔ اس لئے برائے مہربانی قبل از وقت ایسی باتیں سوچنے سے گریز کرو۔" ایک سیاستدان نے اسے جھاڑا۔

"مگر ہمیں لوگوں کی بھلائی اور اصلاح کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ دین کو کاروبار بنانے کی نہیں۔" نوجوان اپنی بات پر ڈٹ گیا تھا۔

"یار خوانخواہ جذباتی ہو رہے ہو۔ اگر ہم سیاست میں آنا چاہتے ہیں تو اس میں کیا برائی ہے۔ میرا خیال ہے تم نے علامہ اقبال کا وہ شعر نہیں سنا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔" سیاست دان کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"جی ہاں سنا ہے۔ پر علامہ اقبال نے یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ آپ سیاسی اثر و رسوخ حاصل کرنے کیلئے خدا کے گھر کو سیاست کا گڑھ بنا دیں...... خدا کے لئے کچھ احساس کریں محترم، یہ کس سمت لے جا رہے ہیں آپ لوگوں کو۔"

جیسے ہی سیاست دان نے نوجوان کے نیک جذبات سنے اس نے سامنے کھڑے سیکورٹی گارڈ کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ حکم ملتے ہی سیکورٹی گارڈ کے ہاتھ میں موجود ریوالور نے شعلہ اگلا اور نوجوان زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

فائر کی آواز سنتے ہی باہر موجود لوگ بھی دروازہ کھول کر اندر آ گئے۔

"کچھ نہیں ہوا احباب سب خیریت ہے...... یہ نوجوان مخالف فرقے کا رکن تھا اور ہمیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہمارے قابل فخر سیکورتی گارڈ نے اپنی جان پر کھیل کر کمال بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو موت کی نیند سلا دیا۔" سیاست دان نے لوگوں کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"ہم اس حملے پر مخالف فرقے کے خلاف احتجاج کریں گے۔" ایک نوجوان جذباتی انداز میں چیخا۔

"ہاں ہاں ضرور احتجاج تم لوگوں کا حق ہے...... تم جلوس کا انتظام کرو اور کل شہر میں ہڑتال کا اعلان بھی کروا دو۔" مولانا نے لوگوں کو مزید اشتعال دلایا اور سب لوگ نعرے لگاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

ہاں اب بولو کیا یہی ہیں تمہارے قابل فخر سیاست دان......"

ابلیس کی طنزیہ سرگوشی نے طاہر کے کانوں کو گدگدایا۔

"ان چند مثالوں سے تم یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ تمام محب وطن سراط مستقیم سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ منافقین ہر دور میں موجود رہے ہیں اور ان کا ٹھکانا یقیناً جہنم ہے...... بس اب بہت ہو چکا۔ تم مجھے قائل کرنے میں ناکام رہے ہو۔ اس لئے میں واپس جا رہا ہوں۔" طاہر نے سخت لہجے میں جواب دیا اور واپس پلٹا۔

"مگر تمہیں تو کریم بخش سے مقابلہ کرنا ہے۔ اس سے آگے بڑھنا ہے۔" ابلیس نے آخری چال چلی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہرگز نہیں وہ اللہ کا نیک بندہ ہے۔ میں ایک شیطان سے مدد لے کر اس کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں غلطی پر تھا اور لاعلمی میں بھٹک گیا تھا..... لیکن اب میں جاگ گیا ہوں۔ اب مجھے واپس جانا ہے۔"

"میری نرمی سے ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ..... یہ میری سلطنت ہے یہاں سے واپس جانا اتنا آسان نہیں ہے۔"

"تم مجھے روک نہیں سکتے۔" طاہر پرعزم لہجے میں بولا۔

"ابھی پتا چل جائے گا۔"

یہ کہتے ہی ابلیس کسی نامانوس زبان میں دہاڑا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کمرے کی بائیں دیوار میں بڑا سا شگاف پیدا ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دجال سمیت کئی شیطانی چیلے تلواروں اور برچھیوں سے لیس کمرے میں داخل ہوئے اور شیطانی منتر پڑھتے ہوئے اس کی جانب بڑھنے لگے۔ یہ غیر متوقع منظر دیکھتے ہی طاہر تیزی سے دروازے کی جانب پلٹا لیکن دروازہ بند ہو چکا تھا۔ موت اسے سر پر محسوس ہو رہی تھی اور بچاؤ کے تمام راستے مسمار ہو چکے تھے۔

"گھبراؤ مت۔ تم ایک سچے مسلمان ہو۔ ابلیس کی جرات نہیں کہ تمہیں نقصان پہنچا سکے۔ اللہ کا نام لے کر آیت الکرسی کی تلاوت کرو۔"

مایوسی کے اس اندھیرے میں کریم بخش کی آواز امید کی کرن بن کر چمکی تو طاہر نے اثبات میں سر ہلایا اور ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے چاروں طرف پھونک ماری۔ جس سے پلک جھپکتے میں صورت حال بدل گئی۔ شیطانی ٹولہ جو کہ اس کی جانب بڑھتا چلا آ رہا تھا اچانک کسی غیر مرئی دیوار سے ٹکرا کر یوں دور جا گرا جیسے ان کے جسم بجلی کے ننگے تاروں سے چھو گئے ہوں۔

یہ منظر دیکھتے ہی ابلیس اول فول بکنے لگا اور اپنے ساتھیوں کو دوبارہ حملہ کرنے کا حکم دیا۔ لیکن اس مرتبہ انجام پہلے سے بھی زیادہ بھیانک تھا اور دیوار سے ٹکراتے ہی ان تمام شیطانوں کے پرخچے اڑنے لگے تھے اور کمرہ ان کے جسموں کے غلیظ لوتھڑوں سے بھر گیا تھا۔ لیکن حیران کن بات یہ تھی کہ طاہر کے جسم پر اس غلاظت کا ایک قطرہ بھی نہیں گرا تھا۔

"کریم بخش تم ایک مرتبہ پھر جیت گئے ہو اور اس نوجوان کو بھی بچا لیا ہے، لیکن کب تک..... یہ نہیں تو کوئی اور سہی۔ میں تمہارے لوگوں میں بدامنی اور بددیانتی پھیلاتا رہوں گا۔ کیوں کہ یہی میرا مشن ہے۔"

ابلیس کی نفرت بھری پھنکار سنائی دی، اس نفرت میں شکست کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ اگلے ہی لمحے کمرہ سیاہ غبار سے بھر گیا۔ کچھ دیر بعد فضا صاف ہوئی تو طاہر خلاف توقع کریم بخش کی کٹیا میں موجود تھا۔

"اس مشکل وقت میں مدد کا شکریہ حضرت صاحب..... میں اپنے غلط رویے پر آپ سے معافی مانگتا ہوں۔" حواس بحال ہونے پر اس نے کریم بخش سے معذرت کی۔

"میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل میں ایمان کی شمع بدستور روشن ہے۔ وقتی طور پر تم جذباتی ہو گئے تھے اسی لئے میں نے تمہاری مدد کی تاکہ تم بھٹک نہ جاؤ۔ امید کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں کرو گے۔"

"کیا ہم مستقل طور پر ابلیس کا خاتمہ نہیں کر سکتے۔" کچھ دیر بعد طاہر نے پوچھا۔

"نہیں..... وہ قیامت سے پہلے ختم نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے روز حشر تک ڈھیل دے رکھی ہے۔ تاکہ اس کا انجام بد سے بدتر ہو سکے..... جب کہ ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ احکام الٰہی پر عمل کرتے ہوئے اس کے شیطانی ہتھکنڈوں سے بچنے کی کوشش کریں۔ اسی میں ہماری نجات ہے۔" کریم بخش نے جواب دیا۔

اس واقعہ کے بعد طاہر کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس نے صدق دل سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور اپنے شب و روز کو انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔

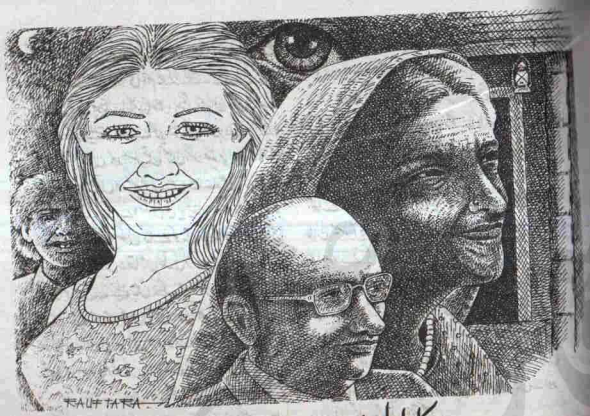

کایا پلٹ

عامر ملک۔ راولپنڈی

ایک طویل عرصہ بعد خاتون نے خواب میں دیکھا کہ سفید لباس میں ایک سایہ ان کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر صحن میں لے گیا اور یہی خواب متواتر کئی دن تک نظر آتا رہا، اور جب اس خواب کی تعبیر سامنے آئی تو لوگ حیران رہ گئے۔

ایک سبق آموز کہانی ان لوگوں کے لئے جو کہ صبر و قناعت کا دامن چھوڑ بیٹھتے ہیں

میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو نہایت ہی کسمپرسی کی حالت میں پایا۔ ایک پرانے اور بوسیدہ سے گھر میں دادی اماں۔ والدہ اور ایک بہن اور بھائی کے ساتھ میں بھی سانسیں لے رہی تھی۔ "میں بچپن میں ہی باپ کی شفقت سے محروم ہو گئی تھی۔ بہن اور بھائی مجھ سے چھوٹے تھے گھر میں کمانے والا کوئی بھی نہ تھا۔ دادی ماں بہت بوڑھی ہو گئی تھیں۔ وہ سوائے اللہ اللہ کرنے کے کچھ نہ کرتی تھیں۔ لے دے کر گھر کا سارا بوجھ میری ماں پر تھا۔ جو لوگوں کے گھروں میں کام کر کے ہمارا پیٹ بھرتی تھیں۔ مگر ان بڑے گھروں سے معمولی تنخواہ..... جھوٹے کھانے اور اترن کے سوا کچھ نہ ملتا تھا۔ نہایت ہی مشکل سے وقت گذر رہا تھا۔ غریبی اور مفلسی ہمارا مقدر بن گئی تھی۔ ہم زکوٰۃ صدقات اور خیرات کے سہارے زندگی کے دن گزار رہے تھے۔ اپنی مرضی کا کھانا اور اپنی مرضی کے کپڑے خرید کے سلائی کروا کے پہننا ہمارے نصیب میں ہی نہ تھا۔ کبھی صدقے یا خیرات کا گوشت ہمارے گھر آ جاتا تو ہم تینوں بہن بھائی اس پر چیلوں کی مانند جھپٹ پڑتے۔ اور پھر بوٹی کم یا زیادہ ملنے پر آپس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دست وگریبان ہو جاتے۔ کپڑے بھی ہم لوگوں کے دیئے ہوئے پہنتے اور کبھی ہم جو کر لگتے۔ کیونکہ کوئی کپڑا، سوٹ یا تو بڑا ہوتا۔ یا پھر چھوٹا...... مگر ہم ان کو ہی غنیمت جان کر پہن لیتے۔ ہمارے من میں بھی ڈھیروں خواہشیں تھیں۔ امنگیں اور مسرتیں تھیں مگر تقدیر نے ہماری خواہشوں، امنگوں اور مسرتوں کو غربت کے کفن میں لپیٹ کر دفنا دیا تھا۔ میرے اسکول کی یونیفارم پہن کر اور بستہ گلے میں ڈال کر اسکول جانے کو جی چاہتا تھا۔ مگر یہ بھی میرے نصیب میں نہ تھا میں محلہ کی لڑکیوں کو اسکول جاتے دیکھتی تو میرے سینے میں ہوک سی اٹھتی اور آنکھیں بھر آتیں۔ اور میں سسکیاں بھرتی ہوئی گھر کے اندر آ جاتی۔ اور دادی جان کی گود میں سر رکھ کر رونے لگتی۔ دادی اماں مجھے ڈھیروں پیار کرتیں۔ دلاسہ دیتیں اور کہتیں۔

"بیٹی...... مایوس ہونا کفر ہے۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وقت ایک سا نہیں رہتا۔ یہ شاہوں کو گدا اور گداؤں کو شہنشاہ بنا دیتا ہے۔ ہمارے دن بھی ضرور بدلیں گے۔"

"مگر کب دادی جان! کب......؟ تب جب ہم سب گھٹ گھٹ کر مر جائیں گے"

میں شکوہ بھرے انداز میں کہتی۔ اور ان کی گود سے نکل کر دوسرے کمرے میں آ جاتی۔

☆......☆......☆

ان دنوں ہمارے علاقہ میں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ روزانہ کوئی نہ کوئی انسانی زندگی ہار جاتا تھا۔ ہر طرف خوف سا طاری تھا۔ ڈاکٹر اور حکیم کہتے تھے کہ پرہیز کریں۔ خاص کر گوشت وغیرہ سے۔ ان ہی دنوں ہمارے گھر میں صدقہ کا گوشت آ گیا۔ تو ہم نے فوراً ہی اسے پکا کر کھا لیا۔ کھانے کے کچھ دیر بعد ہم تینوں بہن بھائیوں کی حالت بگڑ گئی...... مگر اب دوا کہاں سے آتی۔ ہمارے پاس تو زہر کھانے کے لئے بھی رقم نہ تھی۔ بہر حال ہمیں سرکاری ڈسپنسری لے جایا گیا...... جہاں سے دوا ملنے پر میری زندگی تو بچ گئی۔ مگر دونوں بہن بھائی زندگی سے ناطہ توڑ گئے...... اس روز میں بہت روئی تھی اور اوپر والے سے شکوہ کیا تھا...... کہ تو ہمیں پیدا ہی نہ کرتا تو بھی تمہاری دنیا کا نظام چلتا رہتا۔

بعد میں پتہ چلا کہ جس شخص نے خیرات کی تھی۔ اس کی گائے بیمار تھی۔ اس نے بیمار گائے کا صدقہ دے دیا۔ کیونکہ اس کے بچنے کی امید نہ تھی...... میں سوچنے لگی کیا اس کی خیرات قبول ہوگئی ہوگی؟ اس گائے کا گوشت کھانے سے کئی اور لوگ بھی بیمار ہوئے تھے۔ جن کو بہتر علاج میسر آیا۔ وہ تو بچ گئے۔ مگر میرے بہن اور بھائی اس صدقے کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اب تو میں اور بھی پریشان اور اداس رہنے لگی۔ مگر سوائے کڑھنے کے اب میں کر بھی کیا سکتی تھی۔ اب امی اور دادی جان ہی میرا واحد سہارا تھیں...... امی لوگوں کے گھروں میں کام کرنے چلی جائیں اور میں اپنے گھر کے کام کاج کر کے دادی کے پاس آ بیٹھتی...... دادی جان پکی نمازی تھیں۔ اور درود پاک کا ورد کرتی رہتی تھیں۔

دادی جان نے ایک بار مجھے بتایا تھا...... کہ وہ تقسیم ہند و پاک سے قبل میرٹھ میں رہتی تھیں۔ دادا جان ایک سرکاری ادارے میں درجہ چہارم کے ملازم تھے۔ مگر نہایت ہی ایماندار اور پرہیزگار انسان تھے۔ گھر اپنا تھا۔ اس لئے گزر بسر بہتر انداز میں ہو رہی تھی میرے ابا جان کے علاوہ ان کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی تھا۔ دادی جان خود دستکاری کا کام جانتی تھیں گھر میں کام آ جاتا تھا۔ جس سے آمدن میں کچھ اضافہ ہو جاتا تھا۔ گھر میں ضروریات زندگی کی ہر چیز میسر تھی۔ جب ملک تقسیم ہوا۔ تو فسادات میں دادا جان کے علاوہ ان کا بیٹا اور بیٹی بھی مارے گئے۔ دادی جان اپنے ایک بیٹے کے علاوہ سب کچھ گنوا کر اور لٹوا کر پاکستان آ گئیں۔ وہ ماضی کو یاد کر کے اکثر رو دیتی تھیں اور کہتی تھیں کہ انہوں نے آزادی کی بہت بھاری قیمت ادا کی ہے۔ وہ اپنے وطن پاکستان سے بہت محبت کرتی تھیں۔ مگر آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی محبت کم ہوتی گئی۔ کیونکہ یہاں آ کر انہیں دکھوں سے ہی واسطہ رہا تھا۔ انہیں پاکستان آنے کے بعد ایک قصبہ نما شہر میں حکیم کا ایک مکان مل گیا۔ جوان کے لئے سائبان بن گیا ہم سب اسی مکان میں رہتے تھے۔ دادی جان نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خاطر بہت محنت کی اور اسے ماں ہی نہیں باپ کا بھی پیار دیا۔ ان کا بیٹا جب جوان ہوا تو انہوں نے اپنے جیسے ہی ایک خاندان میں اس کی شادی کر دی۔ میں اسی بیٹے کی اولاد ہوں۔

میرے ابا جان زیادہ پڑھ لکھ نہ سکے تھے۔ وہ کپڑا بنانے والی ایک مل میں کام کرتے تھے۔ شادی کے دو سال بعد میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد میرا بھائی اور میری بہن اس دنیا میں آئے...... جب میری پیدائش ہوئی تو ان دنوں ابا جان کچھ بیمار سے تھے۔ پھر ان کی بیماری طول پکڑ گئی۔ ان کو ٹی۔ بی ہوگئی۔ جب میں آٹھ سال کی تھی تو وہ فوت ہو گئے۔ ابا جان اس دنیا سے کیا گئے۔ خوشیاں اور ہنسی ہم سے اوٹھ گئیں۔ دکھوں اور آہوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ ہمارا گھر ہر قسم کی پریشانیوں اور تکلیفوں کی آماجگاہ بن گیا...... تب احساس ہوا کہ یتیم ہونا ایک جرم ہے۔ یتیمی ایک ایسی پیاس ہے کہ اس کو سات سمندروں کا پانی بھی نہیں بجھا سکتا۔

میں جب اپنی محرومیوں کو کوستی تو دادی جان ہی میری ڈھارس بندھاتی تھیں۔ وہ مجھے نماز پڑھنے کی تلقین کرتیں۔ مگر میں ان کی ایسی نصیحتوں پر کان نہ دھرتی۔ میں ہر لمحہ اوپر والے سے شکوہ کناں ہی رہتی۔ کہ اس نے ہمارے مقدر میں اندھیرے ہی کیوں لکھ دیئے ہیں۔ ہماری سحر کب ہوگی؟ کب ہمارے لیے سکھوں کا سورج طلوع ہوگا۔؟"

دادی جان کہتیں۔ "بیٹی صبر کرو...... ایک دن آئے گا دکھوں کی چادر ہمارے سروں سے اتر جائے گی۔ ہمارے دامن میں بھی خوشیاں ہوں گی۔ تم بھی مسکراؤ گی۔ بس اللہ کو یاد کرو اور اس سے ہی مانگو۔ نبی پاک پر درود پڑھا کرو۔"

دادی جان کے کہنے پر نماز شروع کرتی۔ پروردگار سے رو رو کر دعائیں مانگتی...... مگر جب میری دعائیں منظور نہ ہوتیں تو میں نماز پڑھنی چھوڑ دیتی۔ دادی جان خود بھی روزانہ ہزار مرتبہ درود پاک پڑھتی تھیں۔ اور مجھے بھی تاکید کرتی تھیں...... مگر میں ایک تسبیح پڑھ کر چھوڑ دیتی۔ تو دادی جان کی ڈانٹ سننی پڑتی۔

ایک صبح دادی جان جب سو کر اٹھیں تو وہ بہت ہی خوش تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کو آج رات خواب میں نبی پاک کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ میں اور امی بہت خوش ہوئیں اور ان سے لپٹ گئیں۔ بس اس دن میں نے اور امی نے بھی نماز پابندی سے پڑھنی شروع کر دی۔ ساتھ ہی درود پاک کا ورد بھی زبان پر رہنے لگا۔ اور یہ یقین ہو گیا کہ اب ہمارے حالات ضرور بدلیں گے۔ مگر کئی ماہ بیت گئے۔ حالات جوں کے توں ہی رہے۔ مگر پھر بھی ہم رب کی رحمت سے مایوس نہ تھیں۔

ہمارے گھر کے آدھے حصے پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ اور آدھا حصہ خالی تھا۔ وہاں پر پانی کا ایک کنواں تھا۔ اور باقی جگہ پر کچھ پھلوں اور پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ میں نے کئی بار دادی جان کو کہا کہ اس خالی زمین کو فروخت کر دیں۔ تاکہ ہماری مالی حالت بہتر ہو جائے۔ مگر وہ زمین کو فروخت کرنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

ایک بار گرمیوں کے موسم میں تمام قصبہ میں پانی کی قلت ہوگئی۔ کیونکہ بارش کم ہوئی تھی۔ اکثر لوگوں کے کنویں سوکھ گئے اور پانی کا نام و نشان نہ رہا۔ اس میں ہمارا کنواں بھی شامل تھا۔ مکان سے باہر کافی فاصلے پر کمیٹی کا نلکا لگا ہوا تھا۔ اس میں پانی دور سے آتا تھا۔ میں بھی وہاں سے ہی پانی بھر کر لاتی تھی۔ یوں ہی دو تین سال گزر گئے۔ کنوؤں میں پانی نہ آیا۔ لوگوں نے جگہ بدل کر کنویں کھدوائے۔ لیکن کنویں خشک ہی نکلتے اور پانی کا نشان تک نہ ملتا۔

☆......☆......☆

میں اب جوان ہوگئی تھی۔ دادی جان اور امی جان اب جلد از جلد میری رخصتی چاہتی تھیں میری شادی اور رخصتی کے لئے رقم اور جہیز کی ضرورت تھی۔ اس لئے دادی جان نے گھر کا آدھا حصہ جو خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کو فروخت کرنے کا ارادہ کر لیا۔ میرے رشتے کی بات ایک دو جگہوں پر چل رہی تھی۔ مگر کہیں بات پکی نہ ہو پا رہی تھی۔ کیونکہ لڑکے والے جہیز میں بہت کچھ ملنے کی امید نہ پا رہے تھے۔ دادی جان اور امی جان اپنے جیسے ہی غریب لوگوں میں میرا رشتہ دینے کی خواہش مند تھیں۔ پھر مکان کا آدھا حصہ تو فروخت کرنا ہی پڑتا تھا۔ کچھ لوگ مکان کا وہ حصہ خریدنے کے خواہش

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مند تھے۔ مگر دادی جان کا کہنا تھا کہ وہ مکان کا سودا تب ہی کریں گی۔ جب میری بات پکی ہوجائے گی۔

ایک رات خواب میں دادی جان کو یہ اشارہ ملا کہ جائیداد فروخت مت کرو۔ نقصان میں رہو گی ...... انہوں نے اس کا ذکر امی سے اور مجھ سے بھی کیا۔ مگر ہم نے اس پر زیادہ توجہ نہ دی۔ اور اس خواب کو بھول گئیں۔ کہ یہ اشارہ کیوں ملا۔

کچھ عرصہ بعد دادی جان نے خواب میں دیکھا کہ ایک سفید لباس میں ملبوس سایہ ان کے بستر کے قریب آیا اور ان کا ہاتھ تھام کر ان کو مکان کے خالی حصہ کی طرف لے گیا۔ وہاں پہنچ کر سائے نے زمین کو چھوا۔ تو اس کے چھوتے ہی پانی کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ اس کے بعد سائے نے دادی جان کا ہاتھ پکڑا۔ اور واپس بستر پر لٹا دیا ...... دادی جان نے اس کو اہمیت نہ دی اور نہ ہی اس کا ذکر کیا ...... اگلی رات انہوں نے پھر وہی خواب دیکھا ...... مگر دادی جان نے اس طرف توجہ نہ دی۔ تیسری رات وہ سایہ پھر آیا دادی جان کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اسی جگہ پر لے گیا۔ اس نے پہلے کی طرح زمین کو چھوا۔ جس میں سے ایک چشمہ پھوٹ نکلا۔ لیکن اس دفعہ وہ ان کو بستر پر چھوڑنے کی بجائے انہیں وہیں پودوں میں چھوڑ کر غائب ہوگیا۔

دادی جان کی ایک دم آنکھ کھل گئی ...... وہ تاریکی میں زمین پر پڑی تھیں۔ انہوں نے خوف سے چیخنا چلانا شروع کیا تو میری اور امی کی آنکھ کھل گئی۔ ہم فوراً ان کے پاس پہنچیں ...... اور ان کو بڑی مشکل سے کمرے میں لائیں۔ ان کے کچھ حواس بحال ہوئے تو انہوں نے ہمیں اس خواب کے مسلسل آنے کے بارے میں بتایا ...... اور کہنے لگیں ...... "ہمیں اس جگہ زمین کھودنی ہوگی ......"

ہم نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور اگلے دن ایک مزدور بلا کر اسے اس جگہ سے زمین کھودنے کا کہا۔ اس نے دو فٹ ہی زمین کھودی تھی کہ وہاں پانی کا ایک چشمہ پھوٹ نکلا پانی بالکل صاف تھا اور بلبلوں کی شکل میں نکل رہا تھا۔ جب ہم نے اس پانی کا ذائقہ چکھا تو ہمیں مایوسی سی ہوگئی۔ کیونکہ پانی کا ذائقہ کچھ عجیب اور تیز قسم کا تھا۔ پھر بھی ہم نے اس کا استعمال شروع کردیا اور اس کے عادی ہوگئے ...... وہ پانی دادی جان کے لئے بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوا۔ اور ان کی صحت دن بدن بہتر ہونے لگی۔ ان کے جوڑوں کے درد میں بھی نمایاں کمی آگئی کمزوری بھی دور ہونے لگی۔ انہوں نے وہ پانی محلہ کے ایک ڈاکٹر کو دکھایا۔ اس نے سونگھا پھر چکھا اور یہ رائے دی کہ ...... "یہ معدنی پانی ہے۔"

پھر اس ڈاکٹر نے وہ پانی لیبارٹری میں بھیجا تو وہاں سے بھی یہ رپورٹ آئی کہ یہ معدنی پانی ہے اور اس سے کئی بیماریوں کا علاج کیا جاسکتا ہے۔

جب اور لوگوں کو اس عجیب وغریب پانی کے متعلق معلوم ہوا تو لوگ پانی لینے کے لئے ہمارے گھر آنے لگے۔ لوگوں نے پانی کے معض ہمیں رقم دینا چاہی۔ مگر دادی جان نے منع کردیا ...... اس پانی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ...... ایک دن ایک بڑا سائنسدان نما ڈاکٹر ہمارے گھر آگیا وہ اس پانی کی خاصیت سے بے حد متاثر ہوا ...... اس نے ایک بھاری رقم کے معض (جو ہمارے تصور سے بھی زیادہ تھی) ہم سے وہ گھر خرید لیا۔ اور اس نے وہاں ایکٹرسٹ اور لیبارٹری قائم کرلی۔

اسی ڈاکٹر نے ہمیں ...... شہر میں ایک خوبصورت مکان خرید کردیا بینک اکاؤنٹ میرے نام سے کھلوایا گیا۔ جس میں ساری رقم جمع کرائی گئی ...... مہینوں میں ہماری زندگی بدل گئی۔ زندگی کی ہر آسائش میسر آگئی۔ میری شادی بھی ہوگئی۔

برسوں بیت گئے ہیں۔ میں اب دو بچوں کی ماں ہوں۔ دادی اور امی اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں شوہر اور بچوں کے ہمراہ مدینہ منورہ میں رہتی ہوں ...... کیونکہ ہمارے پیارے نبی پاکؐ ...... کا روضہ مبارک ہے ...... ان ہی کے طفیل تو مجھے زندگی کی خوشیاں ملی ہیں۔ میں اب روزانہ ہزاروں بار درود شریف پڑھتی ہوں۔ اور مرتے دم تک پڑھتی رہوں گی۔ قارئین آپ بھی درود پاک پڑھ کر تو دیکھیں۔؟

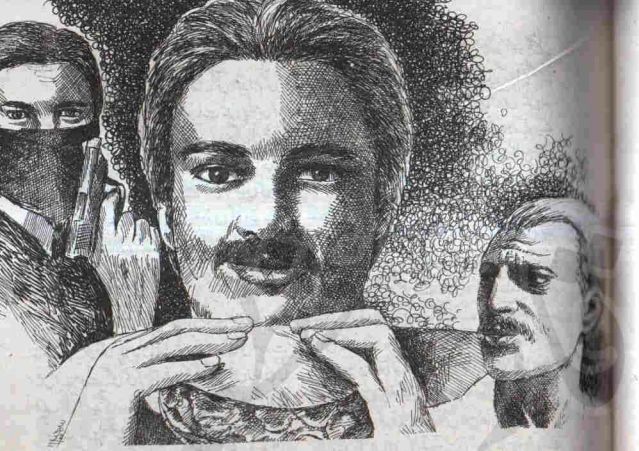

عبرتناک سفر

محمد سلیم کرد

اچانک شیر کے نوکیلے اور سفاک دانت منگل سنگھ کے نرخرے میں پیوست ہوگئے گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی، ایک ناقابل برداشت درد کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی اور رفتہ رفتہ اس کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

اپنے دام میں خود صیاد آ گیا، اس حقیقت کا پتہ تو کہانی پڑھ کر ہی چلے گا ایک سچا واقعہ

سولھویں تاریخ کا چاند آسمان کی وسعتوں میں محو سفر تھا، چند گھنٹے بعد چاند کا یہ سفر حسب معمول ختم ہونے والا تھا۔ مگر بلند و بالا پہاڑوں میں محو سفر مفرور مجرم منگل سنگھ کا یہ کٹھن سفر ختم ہونا اب امکانات میں سے تھا۔ اپنی منزل کی راہوں کو منگل سنگھ عجلت و گھبراہٹ میں کھو بیٹھا تھا۔ اور اب بھٹکنے کا نتیجہ ایک ایسے سفر کی صورت میں سامنے آرہی تھی جو جان لینے کے درپے تھی۔

منگل سنگھ کو اب یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا یہ سفر اس کی موت پر ختم ہوگا منگل سنگھ کا یہ سفر پچھلی رات کو اس وقت شروع ہوا تھا۔ جب جیل سے فرار کا منصوبہ اپنے آخری مرحلے میں پہنچ گیا تھا۔ اس منصوبے کا آغاز منگل سنگھ نے کئی دن پہلے کیا تھا۔ بالآخر ایک بڑی کٹھن و صبر آزما جہد کے بعد منگل سنگھ کو کامیابی فرار کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صورت میں پچھلی رات کو ملی تھی۔

منگل سنگھ ایک عادی مجرم تھا۔ قتل اقدام قتل ڈکیتی اغواء برائے تاوان کے کئی مقدمات میں پولیس کو مطلوب تھا۔ ایک سفاک گروہ جو اس کے زیر نگرانی شہر میں سرگرم عمل تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد بالآخر پولیس کو ایک دن اس سفاک مجرم کو دھر لینے میں کامیابی ملی۔ جرائم کی لمبی فہرست اور تمام ٹھوس ثبوتوں کی وجہ سے عدالت نے جلد منگل سنگھ کو پھانسی کا حکم سنایا۔ سزائے موت کے حکم کے خلاف منگل سنگھ کی رحم کی تمام اپیل و کوششیں مسترد ہو گئیں۔

جیل میں مقید منگل سنگھ اور موت کے درمیان فاصلہ لمحہ بہ لمحہ گھٹتا چلا جا رہا تھا۔ فرار نہ ہونے کی صورت میں اب موت یقینی تھی۔ جبکہ فرار کی کوشش میں زندگی کی ایک ہلکی امید تھی۔ زندگی کی ایک ہلکی سی کرن فرار کی صورت میں منگل سنگھ کے سامنے لہرا رہی تھی۔ فرار ہونے میں موت کا بھی خدشہ تھا۔ لیکن یہ محض خدشہ تھا، جو امکانات میں سے تھا۔ لیکن ہاتھ پر ہاتھ دھر کر موت کا انتظار کرنے کے بعد پھانسی کے پھندے کو گلے میں ڈال کر مرنا منگل سنگھ کی مزاج کے بھی خلاف تھا، ایسی موت سے تو منگل سنگھ کو دوران فرار پولیس کی گولی سے جان گنوانا بہتر محسوس ہو رہا تھا۔ ایسے ہی ان گنت خیالات نے اسے فرار کے لئے آمادہ کیا۔ پھر وہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ جیل سے فرار کے منصوبے پر کام کرنے لگا، اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ منصوبہ ایسا بے داغ تھا کہ جیل انتظامیہ کو بھی چکرا کر رکھ دیا۔ جیل سے فرار کے لئے منگل سنگھ نے کیا کیا جتن کئے تھے وہ اس کے دل کو معلوم تھا۔

جیل انتظامیہ کو منگل سنگھ کے فرار کا علم فجر کے وقت ہوا۔ لیکن منگل سنگھ نصب شب کے وقت جیل کے احاطے سے باہر قدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس وقت جیل انتظامیہ منگل سنگھ کے فرار سے باخبر ہوئی، اس وقت تک منگل سنگھ کافی فاصلہ طے کر گیا تھا۔

وہ شمال کی جانب پہاڑی سلسلوں میں پہنچ گیا تھا۔ جیل کے باقی تین اطراف میں تا حد نگاہ چٹیل میدان پھیلا ہوا تھا، جہاں سے دھر لینا یا مار گرانا پولیس کے لئے نہایت ہی آسان تھا۔ جبکہ پہاڑوں میں یہ خدشہ بے حد کم تھا۔ پولیس کا فرار سے باخبر ہونے کے بعد بھی منگل سنگھ کا سامنا پولیس سے نہیں ہوا۔ لیکن شومئی قسمت سے وہ مخصوص راستہ عجلت میں کھو بیٹھا جو اس کے خیال کے مطابق بہ آسانی منزل تک پہنچا سکتا تھا۔ جیل سے فرار ہوتے وقت منگل سنگھ نے بچھی کچھی چند روٹیاں اور ایک عدد دو لیٹر والی بوتل پانی اپنے ساتھ لایا تھا جو جیل اور منگل سنگھل کے مابین فاصلے کے لئے وافر خوراک کا کوٹہ تھا۔ لیکن راہ بھٹکنے کے باعث وقت کے ضیاع کے ساتھ ساتھ یہ کوٹہ بھی ختم ہو کر رہ گیا۔ اگر منگل سنگھ راستہ نہ بھٹکتا تو کب کا اپنی منزل پر پہنچ چکا ہوتا۔ کھانے پینے کا یہ مختصر کوٹہ آج شام ختم ہو گیا تھا۔

منگل سنگھ ایک سخت کوش مجرم تھا، بھوک و پیاس کے معاملے میں اس کی قوت برداشت عام آدمی کے مقابلے میں کافی زیادہ تھی۔ مگر پہاڑوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے اور دشوار گزار راہوں پر اترنے چڑھنے کے باعث اس کی جسمانی و ذہنی توانائی سلب ہو کے رہ گئی تھی۔ اب شدید پیاس کے باعث حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ وہ نڈھال قدموں کے ساتھ ہانپتا ہوا چل رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ خواہ مخواہ اور اندھا دھند چلنے سے بہتر ہے کہ سورج طلوع ہونے تک آرام کیا جائے تا کہ جو توانائی باقی بچ گئی ہے وہ ضائع نہ ہو جائے۔ اس خیال کے تحت وہ تقریباً اپنے قدموں کو سست روی کے ساتھ گھسیٹتا ہوا سامنے واقع ایک دیوہیکل چٹان کی طرف بڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد وہ چٹان کے بالکل قریب پہنچ گیا اور دوسرے لمحے دھڑام سے ڈھیر ہو گیا۔ پیٹھ کو سنگی دیوار سے لگا کر دونوں پیر سامنے پھیلانے کے بعد لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا۔

یہ دیوہیکل چٹان منگل سنگھ کے خیال کے مطابق اس کے لئے کئی لحاظ سے ایک محفوظ و مناسب ڈھال اور سہارا تھی۔ اول یہ کہ کوئی جنگلی درندہ بہ آسانی حملہ نہ کر سکتا تھا بالخصوص عقب سے حملہ ناممکن تھا۔ دوم یہ کہ تکیہ لگا کر آرام کیا جا سکتا، جیسا کہ اب وہ دیوہیکل پتھر سے کمر لگا کر آرام کر رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا توں توں منگل سنگھ کے اعصاب بحال ہو رہے تھے۔ آئندہ تقریباً ایک گھنٹہ اس طرح پڑا رہنے کے بعد اس کے حواس اعتدال پر آ گئے۔ ذہنی و جسمانی تھکاوٹ کی جو کیفیت تھی کسی حد تک رفع ہو گئی۔

آسمان صاف تھا۔ چاند مغربی افق کے کنارے کی سمت رواں دواں تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ خنک ہوائیں وقفے وقفے سے چل رہی تھیں۔ اعصاب کے اعتدال پر آتے ہی منگل سنگھ کو خنکی کا احساس ہونے لگا۔ لیکن فضاء میں ایسی بھی یخ بستگی نہ تھی کہ منگل سنگھ جیسے سخت جان مجرم کی برداشت سے باہر ہوتا۔ فرار ہونے سے قبل منگل سنگھ بیرک میں جیل کی مخصوص لباس سے جان چھڑا چکا تھا اور اب عام سا لباس میں ملبوس تھا۔ منگل سنگھ کی گرفتاری کے بعد منگل سنگھ کا گروہ تتر بتر ہو کر ختم ہو گیا تھا۔ چٹان سے ٹیک لگائے وہ پہاڑوں کی بھول بھلیوں سے نکلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ خوش بھی تھا کہ فی الحال موت کے منہ سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی کئی خدشات اسے ستا رہے تھے۔ واپس پولیس کے ہاتھوں دھر لینے کا خوف یا اس جنگل و بیابان میں بھوکا پیاسا تڑپ تڑپ کر مرنے کا اندیشہ پھر بھی دل میں ایک موہوم سی امید باقی تھی، جو اس کے بھوکا، پیاسا اور تھکاوٹ بھرے جسم کو توانائی فراہم کر رہی تھی، پہاڑی سلسلے سے کامیابی سے نکلنے کی امید۔ منگل سنگھ سرد دماغی سے آئندہ آنے والے حالات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ہر سو سناٹے کا راج تھا۔ دفعتاً منگل سنگھ کو ایک نہایت دھیمی آواز کا احساس ہوا۔ وہ ہمہ تن گوش ہو کر سناٹے میں آواز سننے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک بار اسے یہ خیال آیا کہ ذہنی و جسمانی کمزوری کے باعث اس کے کان بج رہے ہیں یا محض اس کا وہم ہے۔ مگر آئندہ چند ثانیے ہمہ تن گوش ہونے کے باوجود "گھرر گھرر" کی دھیمی آواز مسلسل اس کے کانوں میں بجتی رہی تو پوری طرح اسے یقین ہو گیا کہ یہ اس کے کانوں کا دھوکہ ہرگز نہیں۔ دور کہیں سے یہ پر اسرار آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی آ رہی تھی۔ گویا کوئی انجن یا جنریٹر چلنے کی آواز ہو۔

"یہ آواز پہلے مجھے، کیوں سنائی نہیں دے رہی تھی، اب کیوں سنائی دے رہی ہے؟ منگل سنگھ بڑبڑانے لگا۔ "ہو سکتا ہے ابھی سے یہ شروع ہو گئی ہے...... اور یہ بھی ہو سکتا ہے تھکاوٹ کی وجہ سے پہلے میری قوت سماعت کمزور ہو گئی تھی یا میں ماحول کو دھیان دینے کے بس میں نہیں تھا، جس کی وجہ سے میں پہلے یہ آواز نہ سن سکا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ کو جواب دینے لگا۔

"کہیں قانون کے رکھوالے یہاں تک تو نہیں پہنچ گے۔؟" اس کے ذہن میں فطری طور پر یہ ڈراونا خیال ابھرا۔

"نہیں پولیس، یہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ اگر پہنچ جاتی تو کب کا پہنچتی۔" احتیاط لازمی تھا۔ لیکن منگل سنگھ کو ان سوالات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اسے فکر و حیرانگی اس بات پر تھی کہ آخر کار اس ویرانی میں یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے اور کس شے سے پھوٹ رہی ہے۔

منگل سنگھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور انگڑائی لینے لگا۔

دوسرے لمحے وہ پھرتی سے اچک کر چٹان پر کھڑا ہو گیا۔ دراصل وہ اس وقت کسی قدر اونچے پہاڑ کی چوٹی پر موجود تھا۔ پھر چٹان پر کھڑا ہونے کے باعث اسے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر پہاڑ کا آخری سرا چاند کی روشنی میں واضح دکھائی دینے لگا۔ وہ نظریں گھما کر پر اسرار آواز کا تعاقب کرنے لگا۔ کوشش بار آور ہونے میں دیر نہیں لگی۔ نیچے کہیں دور جنوب مغرب میں روشنیوں کا ایک مختصر جھمگھٹا دکھائی دینے لگا۔ یہ دیکھ کر منگل سنگھ کے چہرے پر خوشی و تعجب کا ملا جلا تاثر بیک وقت جھلکنے لگا۔

خوشی اس بات کی کہ کھانے پینے کی چیزیں ملنے کی امید تھی اور تعجب اس بات کا تھا کہ آخر اس سنگلاخ چٹانوں کے دامن میں یہ روشنیاں کس لئے تھیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لمحہ بہ لمحہ منگل سنگھ کے ذہن میں ان گنت خیالات ابھرنے لگے۔ لیکن چند خیالات خوش کن بھی تھے۔ جن کے تحت منگل سنگھ کی امیدیں بندھنے لگیں کہ شاید اب ان پہاڑی بھول بھلیوں سے نکلنے میں اسے مدد و رہنمائی مل سکے اور کھانے پینے کے لئے بھی کچھ دستیاب ہو سکے جو اس وقت اس کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لیکن اسے حیرانگی ساتھ ساتھ اس بات پر تھی کہ اس بیاباں میں یہ روشنیاں کس لئے، کس مقصد کے تحت، یعنی کس نے کس غرض سے پڑاؤ ڈالا ہے؟ کوئی شکاری کیمپ ہے یا پولیس کے خیمے یا اسمگلروں کا یا جرائم پیشہ کوئی گروہ غیر قانونی سرگرمیوں کو سرانجام دینے کی غرض سے یہاں موجود ہے۔ پہلے وہ آواز منگل سنگھ کے لئے پراسرار تھی اور اب یہ روشنیاں اس کے لئے پر اسرار تھیں۔ فضاء میں آواز اب بھی مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ مگر اب آواز کے اسرار سے پردہ روشنیوں کی صورت میں ہٹ گیا تھا۔ جو یقیناً کسی بجلی پیدا کرنے والے انجن یا جنریٹر کی آواز تھی۔

خواہ ان پر اسرار روشنیوں کا تعلق کسی بھی حلقے سے ہو، منگل سنگھ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتے تھے۔ بھوک اور بالخصوص پیاس کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی۔ منگل سنگھ نے سوچا سرکار بھی ایک مجرم کو بھوکا پیاسا پھانسی پر نہیں لٹکاتا۔ وہ موت کو پھانسی کے پھندے کی شکل میں پیچھے چھوڑ گیا اور زندگی کی سمت گامزن تھا مگر یہاں موت بھوک و پیاس کی شکل میں پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اور لمحہ بہ لمحہ موت اور اس کے درمیان حائل فاصلہ گھٹ رہا تھا۔ موت نے اگر بھوک و پیاس کی صورت میں جالیا تو یقیناً یہ موت پھانسی کے پھندے سے لٹک لٹک کر مرجانے سے بدتر ہوگی۔ نہ کفن نصیب ہوگا اور نہ دو گز زمین، بلکہ گدھ اور جنگلی جانوروں کا خوراک بنے گا۔

ایسے ہی ان گنت خیالات کے باعث پر اسرار روشنیوں کی اہمیت اس کی نظروں میں بڑھنے لگی، اور وہاں تک جانے کا ارادہ پختہ ہوگیا۔

چاند کی دودھیا روشنی کی وجہ سے ہر شے اپنے خدوخال میں واضح تھا۔ پہاڑ سے اترنا اور ان پراسرار روشنیوں تک پہنچنے میں کوئی دقت نہ تھی۔ پھر وہ چٹان سے اتر کر پہاڑ کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔

☆......☆......☆

مطلوبہ جگہ اور منگل سنگھ کے درمیان اب محض دو فرلانگ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ آواز اب واضح طور پر سنائی دے رہی تھی جو کسی جنریٹر کے چلنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھی۔ اور فضاء میں رچی اس آواز کی بدولت سامنے واقع چھوٹا سا بنگلہ چاند کی دودھیا اور برقی فانوسوں کی ملگجی روشنی میں نہایا ہوا نہایت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ بنگلہ لمبی دیواروں کے حصار میں تھا۔ جن کی اونچائی تقریباً تیس فٹ تھی۔ بناء کسی سیڑھی سہارے کے انہیں پھلانگنا کسی تربیت یافتہ کمانڈو کے بس سے بھی باہر تھا۔ یہ پر اسرار بنگلہ پہاڑوں کے درمیان ایک وادی نما سی جگہ پر واقع تھا۔

بالآخر منگل سنگھ بوجھل قدموں کے ساتھ بنگلے کے پھاٹک کے سامنے پہنچ گیا۔ چاردیواری پختہ تھی اور پھاٹک آہنی تھا جو بند دکھائی دے رہا تھا۔ کہیں کوئی نقل و حرکت تھی نہ کسی ذی نفس کی موجودگی کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑ کی چوٹی سے پراسرار بنگلے کا سفر منگل سنگھ نے بڑی مشکلوں سے طے کیا تھا، کیونکہ نشیب میں اترنے کے باعث اس کے کمزور پیر بے حد لڑکھڑا گئے تھے، ایک دفعہ تو نیچے گرتے گرتے بچا تھا۔

''یہاں سیاح تو نہیں آسکتے...... یہ واحد بنگلہ ہے یہاں۔ یہ یہ کرایہ کا ہو ہی نہیں سکتا...... ضرور کسی امیر زادے یا دیوانے قسم کے دولت مند شخص نے عیش و عشرت یا شکار کھیلنے کی شوق کی خاطر تعمیر کرایا ہو...... یہ بنگلہ کسی کی ذاتی ملکیت ہوگی۔ وہ چھٹیاں گزارنے کے لئے اپنے من پسند شوق یہاں پورا کرتا ہوگا۔'' منگل سنگھ زیرلب بڑبڑاتے ہوئے پراسرار بنگلے کے ضمن میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے لگا۔ کیونکہ بار بار اس کے ذہن میں یہ سوال ابھر رہا تھا کہ ''یہاں اس ویران جگہ پر آخر یہ بنگلہ کیوں؟''

''کہیں یہ بھوتوں کا مسکن تو نہیں؟'' اچانک منگل سنگھ کے ذہن میں یہ سوال بھی ابھرا۔

منگل سنگھ اگر ایک خطرناک مجرم تھا تو ساتھ ساتھ ایک باہوش انسان بھی تھا۔ آدھی رات کو سنگلاخ چٹانوں کے دامن میں تنہا انسان کا ایک واحد بنگلے کے بارے اس طرح کی سوچ فطری تھی۔ منگل سنگھ شہر میں وارداتیں کرنے والا مجرم تھا، اس کا کبھی ویراں علاقوں سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ ''اوکھلی میں سر دراتوں موسموں سے کیا ڈر، بھوت ہوں چاہے انسان کوئی معنی اب نہیں رکھتے مجھے چند گھونٹ پانی سے سروکار ہے اس وقت۔'' وہ ایک دفعہ پھر بڑبڑا کر خود کو مطمئن کرنے لگا۔

اب سوال چاردیواری میں داخل ہونے کا تھا۔ پھاٹک بند تھا۔ دیواریں اونچی تھیں۔ اور آہنی پھاٹک بھی دیوار کے برابر برابر اونچا تھا۔ شاید یہ سب انتظام اس لئے کیا گیا تھا کہ جنگلی درندے دیوار پھلانگ کر چاردیواری میں داخل نہ ہوں۔ احتیاطی تدابیر سے ظاہر ہو رہا تھا کہ بنگلے کے مکین انسان ہی ہونگے۔ غیر مرئی مخلوق نہیں ہرگز نہیں۔

چند ثانیے سوچ و بچار کی کیفیت میں گزارنے کے بعد منگل سنگھ نے سامنے مزید دو تین قدم بڑھا کر بند آہنی پھاٹک کو اندر کی جانب دھکیلنا شروع کیا تو خلاف توقع آہنی پھاٹک کا وہ پٹ گڑگڑا کر کھلنے لگا جسے منگل سنگھ دھکیل رہا تھا۔ دراصل آہنی پھاٹک اندر سے بند نہیں تھا بلکہ بھڑا ہوا تھا۔ اب منگل سنگھ کے سامنے چاردیواری کے اندر ایک جدید طرز کا دو منزلہ بنگلہ واضح ایستادہ تھا۔ چاردیواری کے اندر ایک چمن آباد تھا۔ مختلف انواع و اقسام کے پھول ہوا کے ساتھ سرگوشیاں کرنے میں مصروف تھے۔ دلفریب و خود سے بیگانی کرنے والی ایک مختصر مگر حسین دنیا آباد تھی، جہاں کی فضاؤں میں خوشبوؤں ہی خوشبوؤں کی مہک تھی۔ گویا جنگل میں ''منگل'' اس چاردیواری میں قید تھی۔ پھولوں کی مہک منگل سنگھ نے باہر بھی محسوس کی تھی مگر اندر تو ہر سانس کے ساتھ پھولوں کی مہک شامل تھی۔ آہنی پھاٹک سے لے کر بنگلے تک ایک پختہ روش چمن کے وسط میں بچھی ہوئی تھی۔

منگل سنگھ کا استقبال پھولوں کی مہک نے کیا، لیکن اسے اس وقت پھولوں کی مہک سے کوئی دلچسپی نہ

فائدہ......!

فائدہ، ایک مختصر لفظ ہے، مگر انسان نے اسے اپنی زندگی میں حد سے زیادہ شامل کرلیا ہے۔ ہر بات ہر کام میں صرف فائدے کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر محلے میں کسی کا جنازہ پڑھنے جانا ہو تو بھی یہی سوچا جاتا ہے کہ اس کا مجھے کیا فائدہ ہے۔ اس شخص کے بعد وہاں پر ملنے والا کون ہے، جس سے مجھے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ کیا اس مالک نے ہمیں بے شمار نعمتیں دیتے وقت سوچا تھا کہ اس انسان کو اتنی نعمتیں عطا کرنے سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ تو پھر انسان ایسا کیوں سوچتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے لئے ہر کام میں اجر رکھا ہے یعنی (فائدہ) اگر ہم اپنے کسی بھائی کے ساتھ بغیر مطلب کے بھلائی کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کا اجر (فائدہ) دیتا ہے۔ جب اجر و ثواب اس اعلیٰ ہستی کے اختیار میں ہے تو انسان دوسرے انسانوں سے فائدے کی امید و آس کیوں لگاتا ہے۔ دور حاضر میں انسانیت کے وجود کو توانا کرنے کے لئے ہر ایک کے کام آنا چاہئے اور یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اس کام سے بھلا مجھے کیا فائدہ ہوگا۔

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی، اسے ضرورت تھی تو صرف چند گھونٹ پانی کی، جو خشک حلق کو تر کر سکے۔ منگل سنگھ کی حالت انتہائی دگرگوں تھی اگر وہ کوئی عام آدمی ہوتا تو یقیناً ہمت ہار بیٹھتا۔ بھوک، پیاس اور پاؤں کے چھالے لحہ بہ لحہ ستا رہے تھے۔ جیل سے فرار ہوتے وقت منگل سنگھ پہاڑوں کی سمت بے تحاشا دوڑا تھا۔ جس کے سبب چپلوں نے پیر کاٹنے شروع کیے، بعد ازاں راہ بھٹکنے کے باعث مسلسل چلنے سے پیروں میں چھالے پڑنے شروع ہوگئے تھے۔ منگل سنگھ چند قدم چلنے کے بعد ایک طرف مڑ گیا۔ اسے پانی کی تلاش تھی۔ سبزہ زار میں پانی کی امید تھی مگر پورا چمن چھان مارنے کے باوجود بھی اسے پانی نہ ملا۔ سوائے چند ایک پلاسٹک کے پائپوں کے جو سبزہ زار پر پڑے ہوئے تھے جن سے حلق تر کرنے کے لئے چند قطرے پانی کی امید تھی لیکن پائپ خشک تھے ایک قطرہ پانی بھی موجود نہ تھا۔ لگ رہا تھا کئی دن ہوئے یہ پائپ استعمال نہیں ہوئے تھے، پھولوں کی کیاریاں اور سبزہ زار بھی شاید منگل سنگھ کی طرح پیاسے تھے۔

منگل سنگھ نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا۔ بظاہر بنگلے پر پانی ذخیرہ کرنے والی ٹینکی نظر نہیں آ رہی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ اوپر کہیں نہ کہیں پانی کی ٹینکی موجود ہوگی۔

منگل سنگھ بنگلے کی سمت بڑھنے لگا۔ چند ثانیے بعد برآمدے میں پہنچ گیا۔ بنگلے کے گراؤنڈ فلور اور بالائی منزل پر دونوں جانب دو دو کمرے واقع تھے۔ ایک طرف چوبی سیڑھی نظر آ رہی تھی جس کا اختتام بالائی منزل تک تھی۔ منگل سنگھ بناء آہٹ پیدا کئے راہداری میں ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ اور آہٹ لینے کی غرض سے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سننے کی سعی کرنے لگا۔ چند ثانیے کی کوشش کے بعد اندر سے کوئی آہٹ یا کوئی ایسی آواز جو اندر کسی کی موجودگی کا احساس دلائے نہ سنائی دی۔ صرف جنریٹر کی آواز فضاء میں تسلسل کے ساتھ گونج رہی تھی۔ دروازے کے نیچے روشنی کی ایک پتلی سی لکیر چمک رہی تھی جو کمرے کے اندر لائٹ آن ہونے کو ظاہر کر رہی تھی۔ منگل سنگھ ہول سے آنکھ لگا کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر یہ کوشش بھی ناکام ہوئی۔ کیونکہ ننھے سے سوراخ سے کمرے کے اندر کا مکمل جائزہ لینا نہ ممکن تھا۔ ننھے سے سوراخ کی سیدھ میں صرف کمرے کا ایک کونا نظر آ رہا تھا، اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ جس دروازے سے منگل سنگھ تانک جھانک کی کوشش کر رہا تھا وہ دروازہ کمرے کے وسط میں نہیں بلکہ ایک کونے میں نصب تھا۔ اندر کے مکمل نظارے میں ایک وقت دروازے کے کونے میں نصب ہونے کی وجہ تھی۔

سوراخ کی سیدھ میں کمرے کے اندر جو چیزیں منگل سنگھ کو نظر آ رہی تھیں وہ دیوار کے ساتھ ایک میز چند کرسیاں اور ایک الماری کے سوا کچھ نہ تھا۔

منگل سنگھ جو جھکا ہوا کی ہول سے اندر کا جائزہ لے رہا تھا، سیدھا ہو گیا اور لاشعوری طور پر دروازے کا لٹو گھمایا۔ دروازہ ایک ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ غیر متوقع طور پر کھل گیا۔

"لگتا ہے یہاں غیر ذمہ دار اور لاپرواہ لوگ بستے ہیں۔" منگل سنگھ توقع کے برخلاف دروازہ کھلتا دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے نہ رہ سکا۔ پھر محتاط قدموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گیا۔ کچھ دیر قبل منگل سنگھ سامنے کے جس حصے کو کمرے کی لمبائی سمجھا تھا۔ درحقیقت وہ کمرے کی چوڑائی تھی اور راہداری میں جن دو برابر برابر دروازوں کو دو کمروں کا دروازہ سمجھ رہا تھا دراصل وہ دونوں دروازے ایک ہی کمرے کے تھے، جس میں اس وقت وہ خود موجود تھا۔ کمرے کے وسط میں چوبی چھت سے ایک جدید قسم کی مختصر ٹیوب لائٹ نصب تھی۔ جس کی دودھیا روشنی کمرے کے گوشے گوشے تک پھیلی تھی۔ سب سے قابل توجہ بات یہ تھی کہ منگل سنگھ جہاں موجود تھا وہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر بائیں جانب ایک نہایت دلکش مسہری بچھی ہوئی تھی۔ جس پر ایک جواں سال لڑکا پڑا محو خواب تھا۔ مسہری کے قریب ایک میز پڑی ہوئی تھی، جس پر پانی سے بھرا ہوا شیشے کا ایک جگ، دو گلاس اور

بدیسی شراب کی ایک بوتل موجود تھی۔ کمرہ کافی لمبا تھا۔ کمرے کے آخری سرے کی دیوار آہنی جالیوں پر مشتمل تھی۔ یہ راز کیا تھا؟ منگل نے سوچا "تو اس ساری غیر ذمہ داری کی وجہ یہ بوتل ہے۔" منگل سنگھ نے شراب کی بوتل دیکھ کر سوچا۔

منگل سنگھ کے لئے یہ بنگلہ اور اس کا محو خواب باسی ایک عجوبہ سے کہیں کم نہ تھے۔ اس نے اپنی جرائم بھری زندگی میں بارہا خطرناک سے خطرناک تر حالات کا سامنا کیا تھا۔ مگر ایسے پراسرار حالات سے واسطہ آج پڑ رہا تھا۔

پہاڑوں کے دامن میں واقع یہ بنگلہ اور اس کا نوجوان مکین اسرار کے پردے میں چھپے کسی دیو مالائی کہانی کے کردار و مقام سے کم نہ تھے۔ بھوک و پیاس کی طلب، پراسرار مکان اور اس کے پراسرار مکین کی بابت غور کرنے پر غالب آ رہی تھی۔ پانی سامنے موجود تھا، اور منگل سنگھ شدید پیاسا تھا۔ پیاسے کی اولین ضرورت پانی ہوتی ہے، یہی حال منگل سنگھ کا تھا۔ منگل سنگھ چور قدموں کے ساتھ قدم اٹھاتا مسہری کی دوسری طرف میز کے قریب پہنچ گیا اور محتاط طریقے سے جگ اٹھا کر ایک خالی گلاس میں پانی انڈیل لیا۔ گلاس لبالب پانی سے بھر گیا تھا۔ اب صرف پینے کی دیر تھی، منگل سنگھ کو لگ رہا تھا گویا اس گلاس میں محض پانی کے چند گھونٹ نہیں بلکہ اس کی زندگی کی بقیہ تمام سانسیں اس گلاس میں موجود ہیں پانی سے بھرا ہوا گلاس پیاسے لبوں کے قریب تھا کہ دفعتاً پورے کا پورا بنگلہ ایک دل دہلانے والی تیز دھاڑ سے لرز اٹھا۔

☆......☆......☆

پانی سے بھرا ہوا گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر چکنا چور ہو گیا۔ محو خواب نوجوان ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ گیا۔ یہ کون سی افتاد ٹوٹ پڑی، منگل سنگھ کا تھکا ماندہ دماغ ایک لمحے کے لئے گھوم کر رہ گیا اور دل سینے کے پنجر میں بے تحاشا دھڑکنے لگا۔ اچانک اور غیر متوقع تیز دہاڑ نے منگل سنگھ جیسے قوی اعصاب کے حامل انسان کے حواس مضمحل کر کے رکھ دیئے تھے۔ دہاڑ کی آواز عقب سے آتی ہوئی سنائی دی تھی۔ جہاں آہنی جالیوں کی دیوار کھڑی تھی۔ منگل سنگھ دہاڑ کی آواز کے ساتھ تقریباً پیچھے گھوم کر رہ گیا تھا۔ اب اس کی نظریں وہاں مرکوز تھیں۔ جب دماغ نے کام کرنا شروع کیا تو منگل سنگھ آہنی جالیوں کے راز سے جلد آگاہ ہوا۔ آہنی جالیاں دراصل ایک یا دو پنجروں پر مشتمل تھیں۔ جس کے بالشت بھر سوراخوں کے پیچھے کوئی شیر یا چیتا موجود تھا۔ یعنی پنجرے میں کوئی درندہ بند تھا۔ جو خود تو دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کمرے میں دیکھ سکتا تھا۔ کمرے میں منگل سنگھ کی موجودگی پا کر دہاڑا تھا۔ منگل سنگھ نے اپنے منتشر حواس مجتمع کئے اور نوجوان کی طرف متوجہ ہو گیا، نوجوان بھی پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا، جس کا رخ منگل سنگھ کی طرف تھا۔

"ہینڈز اپ...... ورنہ گولی بھیجے کے آر پار ہو جائے گی۔" نوجوان نے درشت لہجے میں خبردار کرتے ہوئے کہا۔

منگل سنگھ نے نوجوان کے چہرے سے اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

آگے موت۔ پیچھے موت۔ ہر سمت موت، گویا موت نے منگل سنگھ کو چاروں اور گھیر رکھا تھا۔

"پیچھے چلتے رہو...... پیچھے دفعہ ہوتے رہو۔" پراسرار نوجوان کا دوسرا حکم بھی منگل سنگھ کی سماعت سے آ ٹکرائی۔

منگل سنگھ مضبوط قد کاٹھ کا انسان تھا، جبکہ اس کے مقابلے میں یہ نوجوان لاغر اور مریل سا تھا۔ لیکن اس وقت یہ مریل سا نوجوان ہر لحاظ سے اس پر بھاری تھا۔ دشوار گزار اور انجانی راہوں پر پیدل سفر اور بھوک و پیاس نے منگل سنگھ کو کافی کمزور کر دیا تھا، اور سب سے بڑی اہم بات یہ تھی کہ نوجوان مسلح تھا جبکہ منگل سنگھ نہتا تھا۔ اس لئے فی الوقت پراسرار نوجوان سے الجھنا اس کے حق میں بہتر ثابت نہ ہو سکتا۔

حکم کی تعمیل میں اسے اپنی عافیت محسوس ہو رہی تھی۔ نوجوان کے تیور انتہائی جارحانہ تھے کوئی بھی غلط

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قدم منگل سنگھ کو موت کے منہ میں دھکیل سکتا تھا۔ موافق حالات کی امید میں منگل سنگھ خاموشی کے ساتھ پیچھے کی جانب قدم اٹھانے لگا۔

''چلتے جاؤ۔'' منگل سنگھ چند قدم چلنے کے بعد لاشعوری طور پر رک گیا تھا، یہ دیکھ کر نوجوان نے جارحانہ انداز میں حکم صادر کیا۔

اس دوران میں پراسرار نوجوان مسہری سے اتر گیا اور پھر مسہری کے سرہانے پہنچ کر رک گیا۔ لیکن پستول کی نال کا رخ بدستور منگل سنگھ کی طرف تھا۔ جب نوجوان مسہری سے اترنے لگا تھا تو اس سمے یکدم منگل سنگھ کے دل میں یہ خیال آیا کہ وہ دروازے کی سمت چھلانگ لگائے، لیکن بدن کی کمزوری اور شل ہوتے ہوئے پیر ساتھ دینے سے بے بس تھے۔ منگل سنگھ لڑائی بھڑائی میں تاک رکھتا تھا لیکن یہاں توانائی سے محروم جسم نے اس کی تمام حربی صلاحیتیں چھین لی تھیں اور وہ کچھ کر گزرنے سے محروم تھا۔

منگل سنگھ اسی انداز میں چلتے ہوئے کمرے کے کونے تک پہنچ گیا۔ آہنی جالیوں اور منگل سنگھ کے درمیان اب چند ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

آسمان پر چاند کا سفر جاری تھا۔ بادلوں میں گھرا ہوا چاند لحہ بہ لحہ مغرب کی سمت محو سفر تھا۔ جبکہ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان واقع پراسرار بنگلے میں افتاد میں گھرے منگل سنگھ کا سفر بھی جاری تھا۔

''رک جاؤ ...... قمیض اتار کر نیچے رکھو۔'' نوجوان کی آواز گونجی نوجوان کی شعلہ بار نگاہیں منگل سنگھ پر مرکوز تھیں۔ منگل سنگھ کو بار بار یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ نگاہیں اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہی ہیں۔ منگل سنگھ رک گیا اور بادل نخواستہ قمیض اتار کر نیچے فرش پر رکھ دیا۔

''اب گھوم جاؤ۔'' منگل سنگھ ننگا دھڑ کے ساتھ گھوم گیا۔ اب اس کے سامنے سوراخ سے بھری ہوئی ایک سیاہ آہنی دیوار کھڑی تھی۔ جو دراصل پنجرہ تھا اور سوراخوں کے پار پنجرے میں ایک ببر شیر کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ اور شیر کی دھاڑ کے باعث پھانسہ پلٹ گیا تھا، منگل سنگھ ایک مغرور قیدی سے ایک یرغمالی بن گیا تھا۔

سامنے ایک خونخوار درندہ اور پیچھے ایک مسلح نوجوان۔ موت اور منگل سنگھ کے مابین صرف ایک آہنی دیوار تھی۔ پراسرار نوجوان کے اگلے حکم کے بارے سوچتے ہوئے منگل سنگھ کے جسم میں کپکپی طاری ہونے لگی۔ حالات نوجوان کے آئندہ ارادوں کی خود عکاسی کر رہے تھے۔

عقب میں نوجوان کیا کرنے میں مصروف تھا یہ دیکھنے سے منگل سنگھ تو قاصر تھا۔ دوسری طرف نوجوان مسہری کے سرہانے نصب ایک مخصوص سوئچ بورڈ کے بٹن دبانے لگا۔ بٹن دبانے کا ردعمل ایک تیز کڑک دار آواز کی صورت میں سامنے کھڑی آہنی دیوار سے گونجنے لگی۔ جیسے کوئی لاک کھلنے کی آواز ہو۔ منگل سنگھ آئندہ کے بھیانک انجام کے بارے میں سوچ کر لرزنے لگا اور بچ بچاؤ کی غرض سے منہ کھولے بنا نہیں رہ سکا ''بھائی میرے آپ یہ کیا کر رہے ہو آپ کا اور میرا کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں ایک بھولا بھٹکا شکاری ہوں۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلنے آیا تھا۔ ان سے بچھڑ گیا ہوں۔ پچھلی رات سے بھوکا پیاسا مارا مارا پھر رہا ہوں۔ آپ کے بنگلے کو دیکھ کر امید بندھی کہ بھوک و پیاس سے جان چھوٹ جائے گی۔ بالکل ایک بے ضرر سا انسان ہو۔'' منگل سنگھ کے ذہن میں جو آیا ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔ ''بکومت۔'' نوجوان نے کہا۔ پھر ایک ''شٹ'' کی آواز کے ساتھ آہنی دیوار کا ایک حصہ فرش کے اندر غائب ہو گیا۔

شٹ کی تیز آواز کے ساتھ منگل سنگھ کا کلیجہ منہ کو آیا، اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک لمحے کے لئے ایک بھیانک موت کے لئے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔ چند ثانیے بعد خلاف توقع کوئی ناخوشگوار حالات سامنے نہ آئے۔ نہ ببر شیر پنجرے سے نکل کر منگل سنگھ پر جھپٹا تھا، پر منگل سنگھ کے لہو سے فرش گلنار ہو گیا تھا۔ آہنی پنجرے کا ایک

پٹ صرف فرش کے اندر غائب ہو گیا۔

''اب چلو اس کے اندر۔'' عقب سے آواز گونجی

''لیکن۔'' منگل سنگھ نے کہا۔

''اندر نہیں جاؤ گے تو گولی سے مرو گے۔'' نوجوان نے سفاک لہجے میں کہا منگل سنگھ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ پستول کی زد میں ہے کسی طرح کی بھی غلط حرکت یا حکم کی عدولی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس لئے وہ دونوں ہاتھ اٹھائے سامنے کھلے ہوئے پنجرے کے دہانے کی طرف دھڑکتے دل کے ساتھ قدم بڑھانے لگا۔ ایک ایسے پنجرے میں جس میں ایک شیر موجود ہو داخل ہونا سوہان روح سے کم نہ تھی۔ جائے بھی موت نہ جائے بھی موت۔ پسینے میں شرابور وہ بالآخر پنجرے کے اندر پہنچ گیا۔ لیکن ایک دفعہ پھر خلاف توقع کسی ناخوشگوار واقعہ سے واسطہ نہ پڑا۔ ببر شیر موجود تھا۔ لیکن وہ منگل سنگھ پر حملہ کرنے سے بے بس تھا۔ کیونکہ منگل سنگھ اور ببر شیر کے درمیان آہنی سلاخوں کی ایک ایسی مضبوط دیوار کھڑی تھی۔ جس نے پنجرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یہ دیکھ کر منگل سنگھ نے سکون کا سانس لیا۔ ''گھوم جاؤ۔'' عقب سے آواز آئی۔

منگل سنگھ ایک دفعہ پھر گھوم گیا۔ اب اس کے سامنے کچھ دور مسہری کے قریب پراسرار نوجوان کھڑا تھا، جس کے بائیں ہاتھ میں پستول تھا جس کا رخ منگل سنگھ کی طرف تھا اور دایاں ہاتھ مسہری کے سرہانے پر نصب کسی بورڈ پر ٹکے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ پھر گڑگڑاہٹ سی آواز پنجرے سے گونجنے لگی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پنجرے کا وہ پٹ فرش سے نمودار ہونے لگا جو تھوڑی دیر پہلے ایک ایسی گڑگڑاہٹ کی سی آواز کے بعد شٹ کی آواز کے ساتھ فرش میں غائب ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹک کی آواز کے ساتھ پنجرہ بند ہو گیا۔ پنجرے کے ایک حصے میں بھوکا پیاسا منگل سنگھ بے یار و مددگار کھڑا ہوتا جبکہ دوسرے حصے میں ایک ببر شیر بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔ اور پنجرے کے باہر ایک پراسرار مسلح نوجوان کھڑا تھا۔

منگل سنگھ نے مسہری کے قریب میز پر پانی سے بھرا ہوا ایک جگ۔ دو گلاس اور بدیسی شراب کی بوتل دیکھے تھے۔ پستول یا کوئی اسلحہ وغیرہ موجود نہ تھا۔ یقیناً پستول پراسرار نوجوان کے تکئے کے نیچے اس وقت موجود ہو گا۔ منگل سنگھ سوچنے لگا کہ کاش نوجوان پستول کو بھی میز پر چھوڑتا تو اس وقت ضرور حالات اس کے حق میں ہوتے۔

مضبوط آہنی دیوار کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے کمرے کے اندر کا منظر منگل سنگھ کو واضح نظر آ رہا تھا۔ اس وقت نوجوان سکون کے ساتھ ٹہلتا ہوا پنجرے کی طرف آ رہا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں موجود تھا، جس کا رخ نیچے تھا۔ منگل سنگھ کے پنجرے میں مقید ہونے کے بعد نوجوان کے اعصاب پرسکون ہو گئے تھے، پہلے جیسے مستعدی اب اس میں نظر نہیں آ رہی تھی۔ چند ساعتوں کے بعد وہ پنجرے کے سامنے پہنچ گیا۔

''اچھا اگر تم شکاری ہو، تو تمہاری رائفل کہاں ہے؟'' نوجوان نے پنجرے کے چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے جھانکتے ہوئے منگل سنگھ سے پوچھا۔

منگل سنگھ اور پراسرار نوجوان کے مابین چھید سے بھری ہوئی دیوار کھڑی تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے، درمیان میں آہنی دیوار حائل تھی۔ نوجوان کا چہرہ ان چھیدوں سے واضح نظر آ رہا تھا۔ ہلکی داڑھی اور مونچھوں والا نوجوان بائیس، تیئس سال کا لگ رہا تھا۔

''ہماری ٹیم مجھ سمیت پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ تین دن قبل ہم شکار کھیلنے یہاں چلے آئے تھے۔ شام کو جب ہم اپنے کیمپ سے خرگوش کے شکار کے لئے نکلے تو ہم تتر بتر ہو گئے، اس دوران شومئی قسمت سے مجھے ایک پہاڑی بکرا نظر آیا، میں اسے مار گرانے کے جنون میں اس کے پیچھے اتنی دور نکل گیا کہ مجھے بالکل وقت گزرنے اور دور نکل آنے کا احساس نہیں ہوا۔ اس وقت شام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھل چکی تھی اور رات اتر آئی تھی۔ میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا اور واپس میں کسی مناسب موقع کی تاک میں تھا لیکن موقع نہیں مل رہا تھا۔ شکار کی امید و آس میں، میں پہاڑی بھول بھلیوں میں......"

"بکواس بند کرو ...... جو پوچھا وہ بتاؤ۔" نوجوان نے منگل سنگھ کی بات کاٹتے ہوئے گرج کر کہا۔

"میرے پاس رائفل تھی۔ کارتوس تھے۔ ٹارچ تھی۔ بھٹکتے بھٹکتے میں تھک چکا تھا اور دوپہر کے وقت میں آرام کرنے کی غرض سے پہاڑ کے کنارے پر لیٹ گیا۔ کیونکہ وہ جگہ ہوادار تھی اور میں بے حد تھکا ہوا تھا۔ کارتوس سے بھری ہوئی تھیلی رائفل کے نال سے اڑسی ہوئی تھی، جس میں ٹارچ اور چند بسکٹ بھی موجود تھے۔ میں نیند پوری کرنے کی غرض سے نہیں لیٹا تھا بلکہ چند وقت کے لئے بیدار ہو کے آرام کرنا چاہتا تھا۔ رائفل کنارے کی طرف میرے پیروں کے قریب رکھی ہوئی تھی۔ لیٹنے کے باعث میرے اعصاب کو سکون میسر ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگا، کہ غنودگی کی کیفیت میں میرے پورے بدن کو ایک جھٹکا لگا، اسی جھٹکے کے باعث میرے پیر کی ٹھوکر سے رائفل، کارتوسوں کی تھیلی سمیت یہ گیا وہ گیا ہوا یعنی نیچے کھائی میں جا گری۔ میرا بدن تھکن سے چور چور تھا، کھائی گہری تھی، میں نیچے اتر کر رائفل حاصل کرنے سے بالکل محروم تھا۔ اس طرح رائفل میرے ہاتھوں سے بھی نکل گئی۔ جب میں نے آپ کے بنگلے سے آتی ہوئی جنریٹر کی آواز سنی تو میں اس طرف متوجہ ہو گیا، جب روشنیاں دیکھیں تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور ساتھ ساتھ تعجب اس بات پر ہوا کہ سنگلاخ چٹانوں کے درمیان یہ روشنیاں کیسی؟ یوں میں آپ کے بنگلے تک پہنچ گیا، آہنی پھاٹک بھی کھلا ہوا تھا اور اس کمرے کا دروازہ بھی۔ میری یہاں آمد کا مقصد آپ کو نقصان نہیں پہنچانا تھا، بلکہ اپنی بھوک و پیاس مٹانا تھا۔"

منگل سنگھ نے قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

جنریٹر کی آواز کے سوا ماحول میں اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے میں روشن ٹیوب لائٹ کی روشنی اتنی تیز تھی کہ پنجرے میں بھی روشنی کافی تھی۔ ببر شیر خونخوار نگاہوں سے منگل سنگھ کو گھورنے لگا اور دھیمے انداز میں دہاڑنے لگا۔ لیکن خونخوار نظروں سے گھورنے اور دہاڑنے کے سوا ببر شیر کچھ کرنے سے بے بس تھا۔ منگل سنگھ تقدیر کی ستم ظریفی پر سخت نالاں تھا۔ وہ زندگی کی سانسوں کو قائم و دائم رکھنے کی امید میں ایک مضبوط قید توڑ کر فرار ہوا تھا، لیکن قسمت کی ستم ظریفی نے اسے ایک ایسے عجیب و غریب آہنی قید میں لا کر مقید کر دیا تھا۔ جہاں ایک خونخوار ببر شیر اس کے قریب قید تھا اور قید بان ایک خبطی نوجوان تھا۔ جس سے کوئی بعید نہ تھا کہ وہ کب اس کی موت کا پروانہ جاری کرتا۔ یہ سب کچھ چند منٹوں میں ہو گیا تھا۔ پنجرے میں قید بھوکا پیاسا اور ننگا دھڑ منگل سنگھ بے بسی کی صورت لئے اپنی قسمت کو بے تحاشا کوس رہا تھا۔ شیر نے سست انداز میں دہاڑنے کے بعد خاموشی اختیار کی تھی۔ ماحول پر جنریٹر کی آواز کا راج تھا اب یہ آواز اسے بے حد منحوس محسوس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اسی آواز کے تعاقب نے اسے اس قید تک پہنچایا تھا۔ قمیض ہنوز فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ "شاید یہ نوجوان قمیض اتروا کر مجھے نہتا کرنا چاہتا تھا۔" منگل سنگھ سوچنے لگا۔ "لیکن میرے پاس ایک چاقو تک نہیں۔ یقیناً اس نے احتیاط کے طور پر ایسا کیا ہے۔ ایک اجنبی جو آدھی رات کے وقت ویراں و سنسان جگہ پر واقع بنگلے میں گھس آئے، مکین ایسا ہی سلوک روا رکھتے ہیں۔ مہمان نوازی تو نہیں کرتے۔" موت کے خوف کا احساس ہر حس پر غالب ہوتا ہے۔ چند ثانیے قبل موت کے خوف کے عالم میں منگل سنگھ کو پنجرے کے اندر بساند کی بو محسوس نہ ہوئی تھی مگر یہ خدشہ اعصاب سے چھٹنے کے بعد اب اسے بساند کی بو محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے گوشت کی بساند پنجرے میں پھیلی ہوئی۔ لیکن یہ حیرانگی کی بات نہ تھی کیونکہ جب ایک شیر پنجرے میں موجود ہو تو ظاہر ہے کہ گھاس کی مہک نہیں آئی گی بلکہ گوشت کی بساند ہی محسوس ہو گی۔

"کس شہر سے تمہارا تعلق ہے؟" نوجوان نے استفسار کیا۔

"دہلی سے۔" منگل سنگھ نے کہا۔

"میرا تعلق بھی دہلی سے ہے۔" نوجوان نے کہا۔ "میں مانتا ہوں کہ تم ایک شکار ہو...... مگر......! مگر...... جانوروں کے نہیں بلکہ انسانوں کے شکاری ہو۔ معصوم اور بے قصور انسانوں کے۔" نوجوان کی آواز گونجی۔ منگل سنگھ یہ سب سنتے ہوئے سٹپٹا رہ گیا۔

"میں سمجھا نہیں؟" منگل سنگھ نے ناسمجھی انداز میں کہا۔

"سب سمجھ جاؤ گے پیارے تھوڑی دیر تو صبر کر لو۔" نوجوان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ اور پھر فرش پر موجود منگل سنگھ کی قمیض کو اٹھا کر چیک کرنے لگا۔ چند لمحے تک چیک کرنے کے بعد جب قمیض کی جیبوں سے کچھ برآمد نہ ہوا تو اسے ایک طرف پھینک کر گویا ہوا۔

"میں تمہارے لئے اجنبی ہوں۔ مگر تم میرے لئے پہلی نظر میں تو اجنبی تھے۔ لیکن اب اجنبی نہیں رہے۔ جو میری ماں تھی وہ بھی تمہارے لئے اجنبی تھی۔

تمہاری اندھی گولیوں نے ہمیشہ کے لئے اسے ختم کر ڈالا تمہاری گولی سے کون مرا، کون بچا اس بات سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ غرض ہے تجھے اور تجھ جیسے درندوں کو صرف حرام کی دولت کی اور اپنے زندہ سلامت بچ نکلنے کا۔ تم بے رحم اور سفاک شکاری ہو۔ ایک درندے ہو تم۔ تم اشتہاری مجرم تھے اور اب اپنی اسی حیثیت میں اس وقت میرے سامنے موجود ہو۔ تم منگل سنگھ ہو۔"

یہ سنتے ہی منگل سنگھ کو گویا ہزار واٹ کا جھٹکا لگا۔ اور وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "میں اور منگل سنگھ!!؟ کیسا مذاق آپ مجھ سے کر رہے ہیں؟"

"میری نگاہوں کے سامنے ہمہ وقت دو چہرے گھومتے رہتے ہیں۔ جو مجھے بے چین کئے رہتے ہیں۔ ایک چہرہ ممتا کا پیکر ہے اور دوسرا نفرت انگیز ہے۔ ایک بچپن کی حسین یادوں میں کھو جانے پر مجبور کرتا ہے اور دوسرا انتقام کی آگ دل میں بھڑکاتا ہے۔ ایک چہرہ میری ماں کا ہے اور دوسرا تیسرا منحوس چہرہ ہے۔ جسے اب عبرت تک پہنچانا ناممکن نہیں، تو جتنا بھی انکار کر لے منگل سنگھ...... مگر میرے ذہن میں تیرے مختلف انداز کا جو عکس محفوظ ہیں وہ مجھے تیری شناخت کرانے سے قطعی دھوکہ نہیں دے سکتے چاہے تیرا منحوس خلیہ کتنا ہی بدلہ کیوں نہ ہو۔ میں نے آج سے پہلے کبھی تمہیں روبرو نہ دیکھا تھا۔ لیکن تیری تصویریں پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا وغیرہ دیکھنے کو ضرور ملی تھیں۔ جب سے تو نے میری ماں کا خون کر دیا اسی دن سے تیرا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے ہمہ وقت گھومنے لگا اور پوری طرح میرے ذہن میں محفوظ ہوتا چلا گیا۔ اگر اس بات کی اطلاع مجھ تک نہ بھی پہنچتی کہ تم جیل توڑ کر فرار ہو گئے ہو، تب بھی مجھے شناخت میں بالکل دقت نہ ہوتی کہ تم ہی منگل سنگھ ہو۔" نوجوان نے آخری میں منگل سنگھ کی طرف سے متوقع تمام جواز کے در بند کرتے ہوئے کہا۔ چند ثانیے خاموش رہنے کے بعد نوجوان دوبارہ گویا ہوا۔

"وہ دن بھی یاد ہے مجھے اور تاریخ بھی یاد ہے۔ میں یونیورسٹی کے کینٹین میں بیٹھا اپنے دوستوں کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ میرا سیل فون بجنے لگا۔ اٹھا کر دیکھا تو خالہ زاد بھائی کا نمبر تھا۔ کان سے لگایا تو دوسری جانب ایک بری خبر میری سماعت سے آ ٹکرائی۔ میرا خالہ زاد بھائی مجھے میری ماں کے زخمی ہونے کی اطلاع دے رہا تھا۔ شاپنگ سینٹر کو پولیس نے چاروں اور تیری گرفتاری کے لئے گھیر رکھا تھا تم اس وقت اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شاپنگ سینٹر میں موجود تھے۔ بہر کیف تم نے اپنے ساتھیوں سمیت پولیس فورس کا گھیرا توڑ کر نکل جانے کی کوشش میں پولیس پر فائر کھول دیا۔ شاپنگ سینٹر میں چہل پہل تھی۔ پولیس فورس تم لوگوں کے خلاف براہ راست کوئی جارحانہ اقدام کرنے سے بے بس تھی۔ بھیڑ کو ہٹانے کے لئے پولیس فورس کو کافی وقت کی ضرورت درپیش تھی۔ تم لوگوں نے یقیناً پولیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھا کر فائر کھول دیا پولیس فورس نے دفاعی پوزیشن اختیار کرلی ۔تم لوگوں نے اندھادھند فائرنگ کا سلسلہ جاری رکھا۔شاپنگ سینٹر میں بھگدڑ مچ گئی۔ کئی لوگ گرتے کچلتے زخمی ہوگئے ۔لیکن ایک شدید زخمی ہوگئی ۔گرنے یا کچلنے سے نہیں بلکہ تم لوگوں کی اندھادھند فائرنگ کی وجہ سے ۔ تین گولیاں میری ماں کے سینے میں اتر گئیں۔ وہ جان کنی کے عالم میں پڑی رہی اور تم لوگ فرار ہوگئے ۔میری ماں کو بعد میں اسپتال منتقل کردیا گیا۔وہ شدید زخمی تھی۔

میرا خالہ زاد بھائی مجھے یہ اندوہناک خبر سنا رہا تھا۔بعض باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئیں ۔ میں اس دن عجلت وافراتفری کے عالم میں یونیورسٹی سے نکل پڑا، لیکن میرے اسپتال پہنچنے سے قبل وہ زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسی تھی۔

میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہوں ۔والد صاحب ایک بڑے بزنس مین ہیں روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔والد اکثر کاروبار میں مصروف رہتے ہیں اس لئے فیملی کو کم وقت دے سکتے ہیں ۔اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے ماں کی تمام محبتیں میرے لئے وقف تھیں۔ جس دن میری ماں جہان فانی سے کوچ کرگئیں اسی دن میرا دل زندگی سے اچاٹ ہوگیا۔میری گویا دنیا تاریک ہوگئی ۔زندگی کی تمام شمعیں بجھ گئیں ۔ میں دنیا سے لاتعلق ہوکر رہ گیا۔میں شہروں کی رونقیں چھوڑ کر ویران و بیاباں جگہوں پر رہنے لگا ۔والد صاحب کی نصیحتیں ۔ دوستوں کے مشورے مجھے زندگی کی سمت دوبارہ لوٹ آنے میں ناکام ہوگئیں ۔رفتہ رفتہ وہ بھی گویا میری اس کیفیت کے عادی ہوگئے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ، میں یہاں آ کر رہنے لگا یعنی اس ویرانے میں بنگلہ تعمیر کروا کر اس میں رہنے لگا۔شراب کا نشہ بھی میرے غم کے سامنے بے بس نکلا۔شراب نے بھی گویا میرے غم کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ۔مگر ایک ایسی خواہش میرے من میں مچلنے لگی کہ جس کے برآنے سے زندگی کی طرف میرے لوٹ آنے کی امید یقینی تھی۔ وہ خواہش تجھے موت کے گھاٹ اتارنے کا تھا ۔مجھے عبرت ناک انجام تک پہنچانے کا تھا۔ میں اندر ہی اندر محسوس کررہا تھا کہ تجھے اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد میں دوبارہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ سکتا ہوں۔لیکن تم جیسے خطرناک مجرم تک پہنچنا میرے لئے مشکل تھا ۔" نوجوان ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔شاید وہ ماضی میں غوطہ زن ہوکر چند اہم باتیں ڈھونڈ لانے میں کوشاں تھا ۔ چند ثانیوں بعد وہ ایک دفعہ پھر گویا ہوا۔

"ماں کو دنیا سے گئے ہوئے تین سال ہوچکے ہیں ۔میں تقریباً ایک سال سے یہاں مقیم ہوں ۔والد۔ دوست واحباب ہر پانچ چھ دن بعد میرے ہاں آتے رہتے ہیں ۔اور ویسے بھی روزانہ وہ مجھ سے رابطہ کرتے ہیں ۔جیل سے فرار کی خبر مجھے میرے ایک دوست نے سیٹلائٹ فون کے ذریعے دی تھی ۔یقین کر تیرے فرار کی خبر سن کر میں بے حد خوش ہوا۔میرے دل میں گویا تازگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی ۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تو پھانسی کے پھندے پر لٹک کر مرجائے یا پولیس کی گولی سے مارا جائے۔میری تو یہ خواہش ہے کہ تو میرے ہی ہاتھوں سے اپنے کیفر کردار تک پہنچ جائے ۔تاکہ میں زندگی کی رنگینیوں کی طرف لوٹ سکوں ۔ میں اپنی بساط کے تحت تیری ٹوہ میں لگ گیا۔رفتہ رفتہ تیرے گروہ پر زوال آنا شروع ہوگیا۔ تیرے بندے مارے جانے لگے ۔تیرا گینگ مختصر ہوگیا۔پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ پولیس تجھے دھر لینے میں کامیاب ہوگئی۔

پولیس فورس کے کئی اہلکار اس معرکے میں کام آگئے، تیرے بھی چار پانچ کے قریب ساتھی ہلاک ہوگئے۔میرے دل میں ہمیشہ یہ دھڑکا لگا رہتا کہ کہیں تم پولیس یا کسی اور دشمن کی گولی سے نہ مارا جائے ۔یوں قانون کے محافظوں نے تجھے زندہ گرفتار کرکے قانون کے سامنے پیش کیا اور تجھے پھانسی کی سزا ہوگئی۔

اس تمام دورانیے میں، میں تجھ سے باخبر تھا، لیکن تیرے خلاف کوئی قدم اٹھانا میرے لئے مشکل تھا

۔تو ایک عادی مجرم اور میں ایک بے ضرر طالب علم۔ صرف ایک اندھی امید تھی کہ زندگی میں ایک نہ ایک دن ہم ضرور آمنے سامنے ہونگے ۔وہ دن میرے لئے ایک نئی زندگی کی شروعات ہوگی اور تیری زندگی کا آخری دن ہوگا ۔" ایک دفعہ پھر نوجوان خاموش ہوگیا اور اپنے بے ربط سانسوں کو اعتدال پر لانے لگا ۔ پنجرے میں بند منگل سنگھ بے بسی وناامیدی کی صورت لئے نوجوان کو دیکھ رہا تھا ۔"میرے والد سمیت میرے دوست و احباب اور بنگلے کی صفائی ستھرائی کرنے والے ملازم کل آئے تھے ۔اب وہ پانچ دن بعد دوبارہ یہاں آئیں گے ۔ مجھے اپنے کام سرانجام دینے میں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ہے۔ ہمارے درمیان کسی کے مخل ہونے کا اندیشہ نہیں ۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے چند ایک ہمراز دوستوں کے علاوہ کسی اور کو میرے اس اقدام کا علم ہو۔ اور یہ بھی سن لے میری ماں تیرے کسی ساتھی کی بندوق کی گولیوں سے نہیں بلکہ تیری چلائی ہوئی گولیوں سے مر گئی تھی ۔ شاپنگ سینٹر میں نصب کلوز سرکٹ کیمرے نے فائرنگ کی ریکارڈ محفوظ کی ہے اور پولیس ہیڈ کوارٹر میں میں نے یہ ریکارڈ خود دیکھی ہے، جس میں بہت کچھ واضح ہے ۔اب تو مرنے کے لئے تیار ہوجا کہانی تو تو نے اچھی سی گھڑلی ہے یہاں تک آنے کی ۔یہ اتفاق کی بات ہے یا قدرت کی رضا کہ آج شراب کا نشہ مجھے چڑھ گیا۔ نشے میں دھت میں پھاٹک کا کنڈا چڑھانا اور کمرے کے دروازے کا لاک لگانا بھول گیا۔آج پینے کے بعد کسی چیز کا ہوش نہیں رہا، حالانکہ اس سے قبل مجھے نشہ اتنا چڑھتا بھی نہ تھا۔میری یہ غفلت میرے کام آگئی ۔تجھے میرے چنگل میں پھانس لینے کا سبب بن گئی۔اگر دونوں در، وا، نہ ہوتے تو معاملہ نہ جانے کیا سے کیا ہوتے ۔ آج تو کمزور ہے میں طاقتور ہوں ۔تم بے اختیار ہو میں بااختیار ہوں ۔کل میں تمہیں کوئی گزند پہنچانے سے محروم تھا اور آج تو میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے بے بس ہے۔اب تو مرنے سے قبل اپنے اس انجانے دشمن کا نام بھی سن لے۔میرا نام شہریار خان ہے۔" یہ کہتے ہی نوجوان جس نے اپنا نام شہریار خان بتایا تھا۔اچانک کمرے سے نکل گیا اور پھر دروازہ بند ہونے کی آواز گونجی ببر شیر للچائی ہوئی نگاہوں سے منگل سنگھ کو گھور رہا تھا۔ جیسے اس بات کی توقع تھی کہ چند ساعتوں بعد وہ اس کی دعوت اڑائے گا۔

منگل سنگھ نے بارہا موت کو ان گنت روپ میں سامنے دیکھا تھا۔منگل سنگھ ایک جہاندیدہ مجرم تھا۔اپنے مدمقابل کے خیالات کا بھانپنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ حالات اس کے لئے بالکل نئے تھے اور موت نے جو روپ دھار کر آج اس کے سامنے کھڑی تھی، موت کا یہ روپ بھی بالکل نیا اور بھیانک تھا۔منگل سنگھ کو یقین تھا کہ اب بچنا محال ہے۔نوجوان جس نے اپنا نام پرکاش کمار بتایا تھا جو کہانی بیان کی تھی وہ سو فیصد درست تھی۔ اب منگل سنگھ کو سب کچھ یاد آرہا تھا۔

لیکن اب انہیں یاد کرنا فضول تھا۔ببر شیر موت کے روپ میں سامنے موجود تھا۔موت اور منگل سنگھ کے مابین محض آہنی سلاخوں کی ایک دیوار حائل تھی اگر یہ دیوار کہیں سرک جائے تو شیر اس کا وہ حشر کرے گا جو ایک ہرن کے ساتھ کرتا ہے۔ بھیانک خیالات منگل سنگھ کے ذہن میں ابھرنے لگے ۔اور رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی، خوف دل ودماغ پر چھانے لگا۔ بدن میں رعشہ طاری ہونے لگا ۔اب تو عذر بہانے کی گنجائش بھی ختم ہوگئی تھی ۔زندہ بچ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہوگئے تھے۔

منگل سنگھ زندگی بچانے کی امید میں موت کے نرغے میں آن پہنچا تھا۔دفعتاً کمرے کا دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز کمرے میں گونجنے لگی ۔شہریار موت کا پروانہ جاری کرنے کے لئے واپس آگیا ۔"میں نے چار دیواری کے پھاٹک اور دروازے کو لاک کیا۔ مجھے یقین ہے کہ پولیس کتوں کی طرح تیری بو سونگھتی پھر رہی ہوگی ۔اس سے قبل کہ پولیس فورس بنگلے تک پہنچ جائے میں تیرا کام تمام کردونگا۔تیرے مرنے کے بعد تیری گندی باقیات پنجرے سے اٹھا کر یہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہیں دور پھینک دونگا اگر پولیس تیری گندی باقیات تک پہنچ گئی تو وہ ضرور اس بات پر مطمئن ہوگی کہ تیرا کام کسی جنگلی درندے نے تمام کیا ہوگا۔ اس کے بعد پولیس فورس یعنی تیرے مرنے کے بعد یا تیری باقیات کی برآمدگی کے بعد بنگلے تک پہنچ گئی تو میں تیرے متعلق پولیس کو یہ بیان دونگا کہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑا، بھٹکا ایک بھوکا پیاسا شکاری میرے بنگلے تک آیا تھا۔ جس کا خاطر تواضع کرنے اور یہاں سے نکلنے کے راستوں کے بارے میں رہنمائی کرنے کے بعد رخصت کردیا۔ مطلب جو جھوٹی کہانی تو نے اپنے دفاع کی خاطر مجھے سنائی وہ میں اپنے دفاع کے لئے استعمال کرونگا۔ میں تیری اصل حیثیت کے بارے خود کو بالکل انجان ظاہر کرونگا۔ پنجرے کے جس حصے میں تو اس وقت موجود ہے اس میں ایک شیرنی رہتی تھی جو مرگئی۔ اس لئے یہ حصہ خالی ہے۔ یہ پنجرہ ایک میکینزم سسٹم کے تحت کام کرتا ہے۔ یعنی کھل جاتا اور بند ہوجاتا ہے۔ اور یہ آہنی سلاخوں کی دیوار تیرے اور ہر شیر کے درمیان کھڑی ہے اسی سسٹم کے تحت خود بخود فرش کے اندر غائب ہو جاتا ہے۔ یہ سب انتظام میں نے اپنی حفاظت کے لئے کیا ہے۔ چار دیواری کے پھاٹک سے لے کر بنگلے کے تمام کمروں سے پنجرے کو مانیٹر کیا جاسکتا ہے یعنی کہ مذکورہ جگہوں پر ایسے مخصوص سوئچ بورڈ نصب ہیں جن کے بٹنوں کو مقررہ کوڈ کے تحت دبانے سے پنجرے کے دروازے بند اور کھل جاتے ہیں۔ تمام پٹ کے کوڈ بھی الگ الگ ہیں اور ان مخصوص کوڈز کا علم مجھے ہے۔ یہ شیر میرا محافظ ہے۔ مجھ سے مانوس ہے لیکن کہیں کوئی خطرہ مجھے محسوس ہوا تو میں چند بٹن دبا کر اسے پنجرے سے آزاد کرا سکتا ہوں۔ ویرانے میں اس طرح کے حفاظتی انتظامات لازمی ہیں۔ یہ آہنی دیوار جو شیر اور تیرے درمیان موجود ہے جس کا تذکرہ میں نے پہلے بھی تجھ سے کیا تھا، جب شیرنی زندہ تھی اپنے حصے میں موجود ہوتی۔ تو میں شیر اور شیرنی کا ملاپ بھی سوئچ بورڈ کے بٹن دبا کر کراتا۔ یہ تمام نظام بیٹری سے فعال ہے، اب میرے پاس وقت کم ہے۔ اس لئے اب اپنے انجام کے لئے تیار رہو۔ یہ آہنی سلاخوں کی دیوار جس کے ہٹ جانے سے شیر سے شیرنی کی ملاقات تھی۔ اب فرش میں غائب ہونے سے تیرا وجود غائب ہوجائے گا۔ یہ کہتے ہی شہریار مسہری کی جانب بڑھنے لگا اور مسہری کے سرہانے کے قریب پہنچ کر سوئچ بورڈ سے چھیڑ خانی کرنے لگا۔

منگل سنگھ ایک کال کوٹھری سے دوسری کال کوٹھری تک پہنچ گیا تھا۔ مگر اس کال کوٹھری کے قریب پھانسی گھاٹ نہ تھا بلکہ ایک بھیانک موت اس کے سامنے کال کوٹھری میں ہی موجود تھی جو اسے آدبوچنے کے لئے تیار تھی۔

"پہلے میری ایک بات تو سن لو۔" منگل سنگھ نے ہذیانی انداز میں چیخ کر کہا "فونو" دوسری جانب انکار سنائی دی، اور دوسرے لمحے "شٹ" کی آواز پنجرے میں سنائی دی۔ وہ آہنی سلاخوں کی مضبوط دیوار جو منگل سنگھ کی زندگی کی ضامن تھی۔ گویا اسے فرش بے رحمی سے نگل گئی ہو۔ بے چین شیر لپکائی ہوئی نگاہوں سے منگل سنگھ کے ننگے دھڑ کو چند لمحے کے لئے گھورتا رہا پھر ایک رقتی بھری اور سامنے کھڑے کانپتے ہوئے منگل سنگھ کو جالیا۔ بھوکا۔ پیاسا تھکا ماندہ منگل سنگھ کوئی مزاحمت بھی نہ کرسکا اور شیر کے بوجھ تلے تقریباً دب کے رہ گیا۔ چند لمحے بعد شیر کے تیز نوکیلے اور سفاک دانت منگل سنگھ کے نرخرے میں پیوست ہوگئے۔ گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دینے لگی۔ ایک ناقابل برداشت درد کی لہر منگل سنگھ کے پورے بدن میں دوڑنے لگی۔ رفتہ رفتہ منگل سنگھ کا ذہن تاریکی میں ڈوبنے لگا۔

افق پر چاند کا سفر ختم ہوگیا۔ چاند مغرب کی طرف ڈوب گیا ہنگلاج چٹانوں کے درمیان مفرور مجرم منگل سنگھ کے آغاز سے انجام تک کا عبرتناک سفر بھی ختم ہوگیا تھا۔

بھٹکتی روح

خلیل جبار۔ حیدرآباد

مٹی کھود کر قبر میں انڈے کا ڈالنا تھا کہ اچانک ایک وجود قبر میں سے باہر کو نکلتا نظر آیا، وہ وجود بغیر سر کے تھا، اس کی گردن سے بھل بھل تازہ خون نکل کر نیچے گر رہا تھا کہ پھر اچانک ایک لرزا دینے والا منظر رونما ہوا۔

خوف و دہشت کے شکنجے میں جکڑنے والی ایک ماورائی مخلوق کی لرزہ خیز داستان

شمع اس وقت بچن میں کھانا تیار کررہی تھی۔ جونہی اس کی نظر بچن کی کھڑکی پر پڑی تو بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ باہر ایک ایسا وجود کھڑا تھا جس کا سر نہیں تھا۔ اس کی گردن سے سرخ سرخ لہو نکل رہا تھا۔

"کیا..... کیا ہوا شمع؟" چیخ سن کر ساس گلشن بیگم بچن میں بدحواسی سے داخل ہوئیں۔

"وہ..... وہ..... سر کٹا..... خوف کے مارے شمع کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ ساس نے اس کے ہاتھوں کے اشارے کی طرف دیکھا۔ لیکن وہاں سوائے کھلی کھڑکی کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"کیا ہے وہاں، تم نے کیا دیکھ لیا ہے جو اتنی خوف زدہ ہو۔" شمع نے حیرت سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ وہاں اب کچھ بھی نہیں تھا۔ سر کٹا غائب تھا۔

"امی..... امی..... آ..... ابھی کچھ..... دیر پہلے..... سر کٹا۔"

"سر کٹا نظر آیا تمہیں۔" ساس نے لفظ..... سر کٹا..... دہرایا۔ "ہاں، ہاں۔" شمع نے کہا۔

"اگر سر کٹا یہاں تھا تو پھر کہاں غائب ہوگیا؟" ساس نے پوچھا۔ "پتا نہیں"

"دیکھو شمع تم نے نذیر کی بات کو سر پر سوار کرلیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ نذیر میرا بیٹا ہے اُسے میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ بہت غصے میں آجاتا ہے لیکن دل کا برا نہیں ہے۔ تم خود سوچو اگر اس کی جگہ تم ہوتی تو کیا کرتی، دس سال تمہاری شادی کو ہوچکے ہیں ابھی تک تمہاری گود ہری نہیں ہوئی۔ نذیر مرد ہے غصے میں آکر اس نے یہ کہہ دیا ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے گا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ واقعی دوسری شادی کرلے گا۔" ساس نے اُسے سمجھایا۔

"وہ پہلے بھی کئی بار دوسری شادی کرنے کا کہہ چکے ہیں لیکن وہ اب بہت زیادہ غصے سے کہہ رہے تھے کہ اگر ایک سال کے اندر، اندر اولاد نہیں ہوئی تو وہ لازمی دوسری شادی کرلیں گے۔" شمع نے کہا۔

"نذیر دوسری شادی کس طرح کرسکتا ہے، کیا وہ آفیسر لگا ہوا ہے جو دو بیویوں کا خرچہ اٹھالے گا۔ کلرک ہے کلرک، ایک بیوی کا خرچہ اٹھانا ہی اس کے لیے بڑی بات ہے۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کررہی ہے۔ لوگوں کو سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہوگا، دو، بیویوں کا خرچ صرف پیسے والے ہی اٹھاسکتے ہیں۔" ساس نے کہا۔

"پہلے وہ کہتے تھے کہ میں دوسری بیوی بیاہ کرلے آؤں گا لیکن اب کہتے ہیں کہ تمہیں طلاق دے دوں گا پھر دوسری شادی کروں گا۔" شمع نے بتایا۔

"تم فکر نہ کرو، میں نذیر کو سمجھادوں گی کہ آئندہ ایسی باتیں نہ کرے جس سے تمہارا دل دکھی ہو۔" ساس نے کہا۔ "جی۔"

"تم پریشان نہ ہو، ورنہ پھر سے سرکٹا اور ڈرائیور کے خیالات تمہیں پریشان کریں گے۔"

"لیکن امی میں سچ کہہ رہی ہوں مجھے واقعی سرکٹا نظر آتا ہے۔" شمع نے کہا۔

"شمع اگر اس گھر میں آسیب ہوتا تو پھر وہ سب کو نظر آتا۔ صرف تمہیں کیوں نظر آئے گا۔" ساس نے کہا۔

"اچھا میں پوری کوشش کروں گی پھر ایسا نہ ہو۔"

"شاباش! تم اپنے سر پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔" ساس نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد شمع کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بیڈ پر لیٹ جاتی تھی آج بھی وہ آرام کرنے کی نیت سے آنکھیں بند کیے لیٹی ہوئی تھی کہ اُسے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ بے اختیار اس نے آنکھیں کھول دیں مگر کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنا وہم سمجھ کر دوبارہ آنکھیں بند کرلیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی اُسے محسوس ہوا کہ جیسے کسی نے اپنا سرد ہاتھ اس کے ماتھے پر پھیرا ہے، گھبرا کر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا وہ خوف زدہ سی ہوگئی اور بیڈ کے نیچے جھانکا۔ بیڈ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔

"اف میرے خدا! یہ سب کیا ہورہا ہے؟ آسیب مجھے ہی پریشان کررہا ہے کسی اور کو کیوں تنگ نہیں کررہا ہے؟ شمع نے خود کلامی کی۔ وہ خوف زدہ حالت میں بیڈ پر بیٹھی سوچ رہی تھی۔ اچانک پھر اسے محسوس ہوا کمرے میں کوئی ہے۔ اس نے جو نظریں اٹھا کر اوپر دیکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ سرکٹا کمرے کے ایک کونے میں موجود تھا۔ اس کا ایک ہاتھ تو خالی تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں انسانی سر تھا۔ یہ منظر دیکھ کر شمع کے جسم میں کپکپی سی طاری ہوگئی، اور وہ بے ہوش ہوکر بیڈ پر گر پڑی۔ شام کے وقت ساس کے جگانے پر خوفزدہ سی بیڈ پر سٹ کر ایسے بیٹھ گئی جیسے اسے کسی سے جان کا خطرہ ہو۔

"کیا بات ہے شمع؟ کیا پھر تمہیں کچھ نظر آیا ہے؟" ساس نے پوچھا۔ شمع نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کمرے میں سرکٹا کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"اس وقت کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔" شمع نے کہا۔ "پھر تم میرے جگانے پر بری طرح سے چونکی کیوں تھی؟"

"امی میرے بے ہوش ہونے سے پہلے سرکٹا نظر آرہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں ایک کٹا ہوا سر تھا۔

"تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے اب اٹھ جاؤ اور شام کی چائے تیار کرو، نذیر آفس سے آنے والا ہے۔" ساس نے کہا۔

"جی اچھا۔" یہ کہتے ہوئے شمع بیڈ سے اٹھ گئی۔

نذیر کی شادی کو دس سال ہوچکے تھے نذیر کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے گھر میں بچوں کے قہقہے گونجیں۔ بچے گھر میں کھیلتے کودتے نظر آئیں۔ مگر اس کا آنگن ابھی تک سونا تھا۔ نذیر نے اپنی بیوی شمع اور خود کو ہر اچھے ڈاکٹر کو دکھایا تھا ڈاکٹر نے دونوں کو فٹ قرار دے دیا تھا اس کے باوجود ان کا گھر بچوں سے محروم تھا۔ وہ مزید چیک اپ کرانا چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر نے اسے سختی سے منع کردیا تھا کہ وہ اب کوئی چیک اپ نہ کرائے اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرلے جب قسمت میں اولاد ہونا لکھی ہے تو ہوجائے گی مگر نذیر بے چین طبیعت کا مالک تھا وہ خاموشی سے کہاں بیٹھ سکتا تھا۔ اس نے اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور شمع پر زور دے رہا تھا کہ اُسے دوسری شادی کی اجازت دے، ورنہ بصورت دیگر وہ شمع کو طلاق دے کر دوسری شادی کرے گا۔ شمع کسی طور پر نذیر کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی یہ شادی بھی ان دونوں کی پسند کے نتیجے میں ہوئی تھی۔ پھر وہ کس طرح طلاق لے کر گھر جاسکتی تھی۔

وہ طلاق لے کر بدنامی کا داغ لے کر گھر جانا نہیں چاہتی تھی اس لیے نذیر کی دوسری شادی کی بھرپور مخالفت کررہی تھی مگر نذیر کا اصرار دن بدن بڑھ رہا تھا۔ دوسری طرف آئے دن سرکٹا نظر آنے کے واقعات نے شمع کو پریشان کردیا تھا۔ یہ واقعات اتنے عام ہوگئے تھے کہ جہاں بھی اُسے دوسری شادی کی بات چلائی ہوتی وہ یہی کہتے تھے کہ نذیر نے اپنی پہلی بیوی کو ذہنی ٹارچر دے دے کر نفسیاتی مریض بنادیا ہے، پھر ایسے شخص سے کیا امید رکھی جاسکتی ہے کہ وہ دوسری بیوی کو بھی خوشیاں دے سکے۔ نذیر شب وروز اس سوچ میں غرق رہتا تھا کہ کسی طرح شمع کی ذہنی حالت درست ہوجائے نذیر آسیب وغیرہ پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے اپنی والدہ کے اصرار کے باوجود وہ شمع کو کسی عامل کے پاس لے کر نہیں گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ماہر نفسیات سے رجوع کیا جائے وہی اس مسئلے کا حل نکال سکتا ہے۔ وہ اپنے کئی ماہر نفسیات سے ملاقات کے لئے شمع کو ان کے پاس لے کر گیا۔ انہوں نے اسے ذہنی دباؤ قرار دے کر شمع کو آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا خیال یہی تھا کہ شمع کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہے اس لیے اس طرح کی حرکتیں کررہی ہے۔ جب ذہنی دباؤ ختم ہوجائے گا تو وہ خود ہی نارمل ہوجائے گی۔ اب نذیر کی یہی کوشش تھی کہ وہ شمع کو خوش رکھے تاکہ وہ نارمل ہوجائے۔ کئی ہفتے گزر گئے اس نے دوسری شادی کی بات کرنا بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کے باوجود شمع کی حالت بہتر ہونے کے بجائے مزید خراب ہونے لگی تھی۔

وہ ہر وقت خوف زدہ رہنے لگی تھی اُسے سوتے جاگتے سرکٹا نظر آتا تھا۔ شمع سوکھ کر کانٹا ہوچکی تھی۔ جمال الدین جنہیں لوگ شاہ صاحب کہتے تھے، وہ اللہ والے تھے، شمع کی ساس گلشن کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے ساس نے شمع کی حالت بہتر نہ ہونے پر ان سے ذکر کردیا۔ قریبی رشتہ دار ہونے پر ان کا گھر آنا ضروری ہوگیا تھا۔ شمع کی یہ حالت دیکھ کر انہیں بھی بہت دکھ ہورہا تھا۔ گلشن یہ تم نے بہو کی کیا حالت بنادی۔ تم کیا مجھے غیر سمجھتی ہو۔ مجھے اطلاع کیوں نہ دی۔ جمال الدین نے شمع کو بستر پر لیٹے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاہ صاحب ہم سمجھ رہے تھے کہ شمع کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے اس لیے ہم ڈاکٹر سے چیک کرارہے تھے۔"

"تم نے نفسیاتی ڈاکٹر کے چکر میں شمع کی کیا حالت بناڈالی، میں لوگوں کا روحانی علاج کرتا ہوں، تم نے مجھے آگاہ نہیں کیا اور شمع کی یہ حالت بنادی ہے۔" شاہ صاحب نے کہا۔ گلشن بیگم جیسے ہی شاہ صاحب کے لیے کچن میں چائے بنانے گئیں اتنی دیر میں شاہ صاحب نے پانی پر دم کیا اور پھر کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

"شمع بیٹی وہ بھٹکی ہوئی روح ہے جو تمہیں تنگ کررہی ہے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ وہ صرف تمہیں ہی کیوں تنگ کررہی ہے؟ گھر میں دوسرے بھی افراد ہیں۔ ضرور کوئی نہ کوئی ایسا عمل ہوا ہے، جس سے یہ روح تمہیں تنگ کررہی ہے۔ مجھے بالکل صاف صاف بتاؤ اس صورت میں تمہارا علاج ہوسکتا ہے۔" شاہ صاحب نے کہا۔

"شاہ صاحب" میں آپ سے کچھ بھی نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھپاؤں گی، بالکل صاف صاف بتاؤں گی لیکن میری اس سرکٹے سے جان چھڑادیں۔" شمع نے سسکتے ہوئے کہا۔

"شمع بیٹی مجھے تمہارے بارے میں علم نہیں تھا، ورنہ میں بہت پہلے ہی تمہاری اس روح سے جان چھڑادیتا۔"

"شاہ صاحب میری شادی کودس سال ہوچکے ہیں لیکن میری گود ہری نہیں ہوئی نذیر کو بچے کی بڑی خواہش ہے۔ اس لیے وہ اولاد کی خاطر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ میری ایک سہیلی نازش نے مجھے بتایا۔

"میں ایک ہندو عامل کے پاس جاؤں، وہ بہت پہنچاہواعامل ہے۔ اس کے پاس جو بھی جاتا ہے اس کی مراد برآتی ہے۔ ہوسکتا ہے تمہارا مسئلہ بھی حل ہوجائے" میں پریشان تھی جیسے ہی اس کے منہ سے ہندو عامل کا پتا معلوم کرکے اس کے آستانے پر پہنچ گئی۔ آستانے پرآنے والے لوگوں کا ہجوم دیکھ کر میرے دل میں ہندو عامل کی عقیدت اور بڑھ گئی میرا نمبر آنے پر ہندو عامل نے بتایا کہ "کسی نے بچپن میں میرے کپڑے کسی طرح حاصل کرکے عمل کیا ہے اس عمل سے میری کوکھ بندھ گئی ہے اور جس عورت کے لیے پڑھائی کی گئی ہے اس عورت کا بانجھ پن دور ہوگیا تھا۔ اس کی یہ بات مجھے اس لیے درست لگی کہ بچپن میں میرے کپڑے چھت پر سکھانے کے لیے ڈالے گئے تھے اتفاق سے ہوا تیز چلنے پر کسی نے ارادے کے تحت میرے کپڑے لے لیے تھے۔ ایک ہفتے بعد وہ کپڑے گلی میں ملے تھے۔ کپڑے کی شلوار میں سگریٹ سے سوراخ کیے ہوئے تھے گھر والوں نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اس عامل سے وہ بات سن کر مجھے پکا یقین ہوگیا تھا کہ وہ درست کہہ رہا ہے۔ اس نے مجھے کچھ لفظ لکھ دیے کہ یہ تمہیں پڑھنا ہے اور پھر ایک قبرستان میں جاکر کسی قبر کے اندر انڈے کو ڈال دینا اور خبردار جس چیز سے بھی قبر میں سوراخ کرو وہ چیز گھر کے اندر لے کر مت آنا" (میں نے صبح کے وقت انڈے پر دم کرلیا تھا لیکن مجھے اب اس انڈے کو فوری طور پر کسی قبر کے اندر ڈال کر آنا تھا۔ میں سبزی لانے کے بہانے گھر سے نکلی تو میری ساس نے کہا کہ "چاقو خراب ہوگیا ہے ایک بڑا سا چاقو بھی لے آنا۔" میں اچھا کہہ کر بازار چلی گئی۔ سبزی اور چاقو خرید کر میں نے قبرستان کا رخ کیا۔ قبرستان بازار سے قریب ہی ہے، میں بے حد گھبرائی ہوئی تھی۔ ایک خوف قبرستان جانے کا اور دوسرا خوف یہ تھا کہ مجھے قبرستان میں کوئی دیکھ نہ لے۔ اگر کسی نے قبرستان میں دیکھ لیا تو میرے متعلق من گھڑت باتیں گھڑلی جائیں گی۔ رشتہ دار موقع کی تلاش میں رہتے ہیں ذرا سا موقع ملنے پر چھوٹی چھوٹی باتوں کے افسانے گھڑ لیتے ہیں۔ مجھے یہی خوف تھا جس کے سبب میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ انڈا ابھی کسی قبر میں ڈالنا ضروری تھا۔ قبرستان میں داخل ہوکر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ اتفاق سے قبرستان میں کوئی نہیں تھا قبرستان میں سناٹا تھا۔ خوف سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ میں اکثر قبرستان کے سامنے سے گزرتی تھی لیکن کبھی قبرستان میں داخل نہیں ہوئی تھی اس لیے اکیلے قبرستان میں مجھے ایک انجانا سا خوف آرہا تھا۔ میں ہمت کرکے ایک قبر کو کھودنے بیٹھی تو یاد آیا میں جلدی جلدی میں قبر کھودنے کے لیے کچھ بھی نہیں لائی تھی۔ گھر پر ہی لکڑی بھول آئی تھی۔ میں نے قبرستان میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں لیکن اس وقت اتفاق سے کوئی بھی ایسی چیز یں ملی جس سے قبر کے اندر سوراخ ہوسکتا تھا۔ میں نے فوراً پرس سے چاقو نکالا اور قبر کی مٹی کھودنے لگی ایک بڑا سا پتھر چاقو سے ٹکرانے پر میں نے ہاتھ سے ہٹایا۔ پھر جیسے ہی میرے ہاتھ میں آیا تو خوف سے میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور میں بھاگ کھڑی ہوئی دراصل میرے ہاتھ میں جو پتھر آیا تھا وہ پتھر نہیں انسانی کھوپڑی تھی میں خوف سے تھر تھر کانپتی ہوئی قبرستان سے فوری نکل جانے کی کوشش میں تھی اچانک میرے قدم رک گئے۔ مجھے یاد آیا انڈا قبر میں ڈالنا ضروری ہے ورنہ بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔ میں ڈرتے ڈرتے دوبارہ کوئی دوسری قبر کھود کر انڈا ڈالنے کو مڑی۔ ایک قبر کا انتخاب کرکے میں نے چاقو سے قبر کی مٹی کھودنے لگی کافی مٹی کھودنے کے بعد اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے انڈا قبر کے اندر ڈال دیا۔ اور پھرتی سے اوپر مٹی ڈال دی۔ چاقو میں نے پرس میں واپس ڈالا اور تقریباً دوڑتے ہوئے

قبرستان سے اندر سے باہر نکل گئی۔ میرا دل زور، زور سے دھڑک رہا تھا مجھے کچھ ہوش نہیں رہا تھا میں جلد سے جلد گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ گھر پہنچ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ مجھے اپنے آپ پر خود حیرت ہورہی تھی کہ میں یہ کام کیسے کرآئی۔ ویسے کوئی مجھے لاکھ روپے دے کر یہ کام کرنے کا کہتا تو بھی میں یہ کام ہرگز نہیں کرتی لیکن اپنے گھر کے اجڑنے کے ڈر نے مجھ سے کام کرادیا تھا۔ میں نے اس چاقو کو اچھی طرح سے پانی سے دھو کر استعمال کے لیے رکھ لیا تھا۔ ابھی مشکل سے ایک دن ہی گزرا تھا کہ مجھے وہ سرکٹا نظر آنے لگا۔ میں نے جب اس عامل کو سرکٹے کے بارے میں بتایا تو وہ مجھے غصے سے دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

"تجھے میں نے کہا تھا نہ کہ جس چیز سے قبر کی مٹی کھودنا اُسے گھر میں لے کر نہیں جانا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا تو ضرور وہ چیز گھر لے کر چلی گئی ہے۔"

"بابا مجھے کوئی ایسی چیز ملی نہیں تھی جس سے مٹی کھودتی اس لیے چاقو سے مٹی کھودنی پڑی۔"

"تو اسے گھر لے جانے کی کیا ضرورت تھی وہیں قبر میں ڈال دیتی۔"

"بابا مجھ سے غلطی ہوگئی ہے ایک ایسا عمل کریں کہ میری اس سرکٹے سے جان چھوٹ جائے۔" میں نے التجا کی۔

"تم نے جس قبر میں انڈا ڈالا تھا میرا علم بتارہا ہے کہ جس شخص کی وہ قبر ہے، زندگی میں اس نے لوگوں کو بہت ستایا تھا، قتل وغارت گری اس کے لیے معمولی بات تھی کسی نے دھوکے سے اُسے اس طرح قتل کیا تھا کہ اس کی گردن ہی دھڑ سے الگ ہوگئی تھی تم نے اس کی قبر میں جان بوجھ کر انڈا نہیں ڈالا یہ اتفاق ہے کہ تم نے ڈالنے کو جس قبر کا انتخاب کیا وہ اس کی بھٹکی ہوئی روح ہے، میرے پاس اتنی شکتی نہیں ہے کہ اس آتما کا مقابلہ کرسکوں۔ اس لیے اب تم بھگتو۔" عامل نے غصے سے کہا۔

"بابا آپ کچھ کریں۔" میں نے پھر التجا کی۔

"دیکھو۔ بی بی میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اتنا ہی عمل کرتا ہوں جتنی مجھ میں شکتی ہے اس سے زیادہ عمل کرنے پر یہ روح مجھ پر حملہ کرکے مجھے مار سکتی ہے، اس لیے مجھے معاف رکھو، ہاں اگر کوئی اور ایسا عامل تمہیں مل جائے جو اس بھٹکی روح کو قابو رکھنے کی شکتی رکھتا ہو، اس سے اپنا علاج کرالینا۔" عامل کا صاف دوٹوک جواب سن کر میں خاموش چلی آئی میں کر بھی کیا سکتی تھی غلطی میری اپنی تھی۔ میں نے لالچ میں خود برائی مول لی تھی۔ میں مختلف عاملوں کے پاس گئی لیکن کسی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا پھر میں نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا کہ جو قسمت میں ہے وہی ہوگا۔ شاید میری قسمت میں ایسے ہی مرنا لکھا ہو۔" شمع نے اپنی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"شمع تم مایوس نہ ہو کیوں کہ مایوسی کفر ہوتی ہے میں جیسا کہوں وہی کرنا میں آج پینے کے لیے یہ دم کیا ہوا پانی دے کر جارہا ہوں اس پانی کو پینا بھی ہے اور گھر کے چاروں کونوں میں چھڑکنا بھی ہے۔" شاہ صاحب نے دم کیا ہوا پانی شمع کو پکڑادیا۔

شمع نے بوتل سنبھال کر رکھ لی اور شاہ صاحب کی ہدایت پر مکمل عمل کیا جس سے اس کی طبیعت میں خاصی بہتری آگئی تھی۔ ایک ہفتے بعد جب شاہ صاحب گھر آئے اور پھر چند نقش گھر میں لگانے کے لیے دیے گھر میں نقش لگانے پر وہ سرکٹا شمع کو نظر آنا بند ہوگیا اور شمع کی طبیعت اب بہت اچھی ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب کا دم کیا ہوا پانی پابندی سے شمع پی رہی تھی اور گھر میں چھڑک رہی تھی۔ اس طرح ایک ماہ کے اندر وہ بالکل صحت مند ہوگئی تھی اور وہ بالکل بھی نہیں لگتی تھی کہ وہ بیمار تھی۔ اس کے صحت یاب ہونے پر نذیر بہت خوش تھا۔ ایک دن وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"شمع تم فکر نہ کرو میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔ قسمت میں جب اولاد ہوگی تو ہوجائے گی۔"

"ہاں میں بھی تم کو یہی سمجھاتی تھی لیکن تم پر دوسری شادی کا دورہ پڑا تھا۔"

"ہاں اب وہ دورہ ختم ہوگیا۔ تمہیں آئندہ مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" نذیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

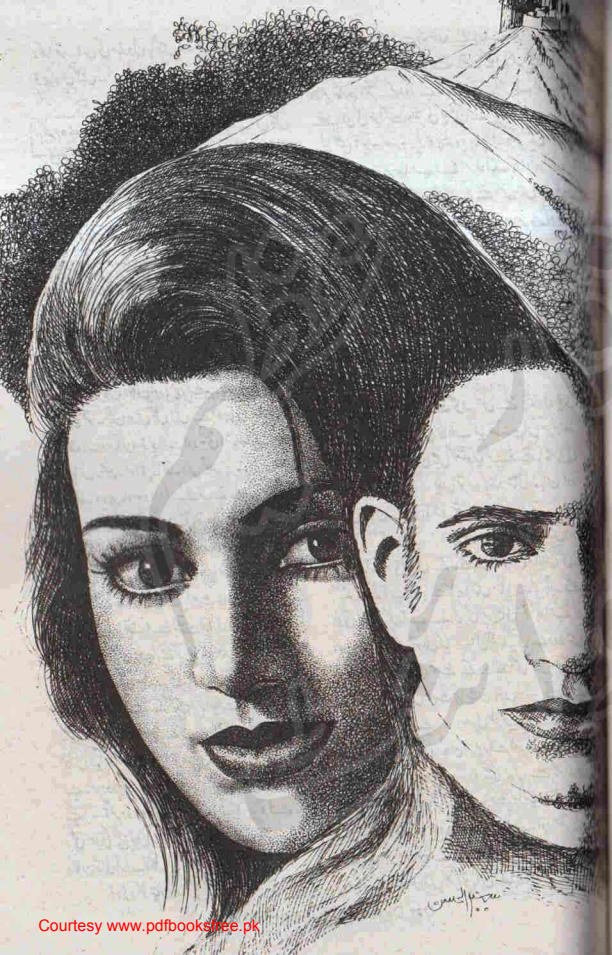

چندرا دیوی

ایم الیاس

تیرہویں قسط

خوف و ہراس پھیلاتی، ذہن پر سکتہ طاری کرتی، حیرت انگیزی کی دھوم مچاتی، جور و ستم کی بجلی گراتی، کالی شکتیوں میں تھلکہ مچاتی، لولہان وادی کی پگڈنڈیوں پر دوڑتی بھاگتی، جادوئی کرشمہ سازیاں دکھلاتی، دل و دماغ پر ڈر کا سکہ بٹھاتی، گھٹا ٹوپ اندھیرے میں چنگھاڑتی، ہر پل ہر سو ہیبت ڈھاتی، اپنی نوعیت کی انوکھی کہانی۔

پرتحیر کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے ذہن سے محو نہ ہونے والی ایک اچھوتی کہانی

چندرا دیوی پال کیلئے کی سیر کے لئے صبح مسافر بس میں سوار ہوئی۔ وہ کولمبو شہر کی طرف جارہی تھی۔ کولمبو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سری لنکا بہت ہی خوب صورت اور سرسبز و شاداب ملک ہے۔ یہاں سپاری، ناریل اور انناس کے درختوں کی بہتات ہے۔ کاجو کے علاوہ چائے اور کافی کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ یہ ایک زرعی ملک ہے۔ حکومت چائے، کافی، پان، کاجو، ناریل کا تیل اور بھی بہت ساری اشیاء ایکسپورٹ کرتی ہے..... اس کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ غیر ملکی سیاحوں سے بھی ہے۔ حکومت ہر صورت میں غیر ملکی کرنسی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے سیاحوں کو ہر قسم کی سہولتیں اور مراعات حاصل تھیں۔ سیاحوں کی سری لنکا کی سیر و سیاحت میں دلچسپی اس لئے زیادہ تھی کہ اس ملک کی کرنسی بہت ہی کم تھی۔ شراب، شباب، جوئے اور ہوٹل کے کرایوں میں ان کے لئے خصوصی رعایت ہوتی تھی..... ہر سال موسم گرما میں یورپ، امریکہ سے گوری چمڑی کی لڑکیاں، عورتیں اور مرد اپنی گوری رنگت کو سانولی کرنے آتے تھے۔ عورتیں دھوپ میں سمندر کے کنارے روزانہ سن باتھ لیتی تھیں..... سمندر میں نہاتی اور تیرتی تھیں۔ وہ پیراکی کے مختصر لباس میں ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ساحل سمندر کسی یورپی ملک کا ہے۔ ان دنوں ہوٹلوں میں مردوں سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں ٹھہرتی تھیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ ایک پس ماندہ ملک تھا جو جزیروں کا تھا۔ تنگ دستی، غربت و افلاس اور احساس محرومیاں بہت زیادہ تھیں، لڑکیاں اور عورتیں فیکٹریوں، کارخانوں، ہوٹلوں میں کام کرتی تھیں۔ دکانوں میں سیلز گرل تھیں۔ یہ بدھسٹ تھے۔ مسلمانوں کی بھی بڑی اکثریت تھی۔ سری لنکا نے کرکٹ میں بڑا نام پیدا کیا ہوا تھا۔

بس میں اس کی برابر سیٹ پر ایک عورت جو بیالیس برس کی عمر کی تھی بیٹھی تھی۔ وہ متناسب اور چھریرے بدن کی عورت تھی..... بے حد پرکشش تھی۔ وہ عام عورتوں کے مقابلے میں دراز قد تھی۔ چندرا دیوی نے بہت کم عورتوں کو اس قامت کی پایا تھا۔ اس کی قامت نے اس کے جسم کی دل کشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا..... سرخ کناروں والی سفید ساڑھی اور سرخ بلاؤز میں وہ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ گو کہ اس کی رنگت سانولی سی تھی لیکن اس میں نمک تھا۔ اس نے فیشن کے مطابق انتہائی مختصر سا بلاؤز جو بغیر آستینوں کا تھا پہن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رکھا تھا۔ اس کی سڈول بانہیں اور کھلا گریبان قیامت ڈھا رہی تھیں۔

چندرا دیوی نے اس کے بشرے سے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان اور افسردہ سی ہے۔ جب بس چل پڑی تو اس نے اپنے چرمی پرس سے ایک جیبی سائز کا کلکولیٹر نکالا۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے منہا کی جانے والی رقم کا حساب لگا رہی تھی۔ آج جولائی کی سات تاریخ تھی۔ وہ کولمبو اس لئے جا رہی تھی کہ پانچ برسوں سے اس کی ترقی التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے وزارت تعلیم کے محکمے میں کام کرتے ہوئے بیس برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ گزشتہ پانچ برسوں میں مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہوگیا تھا۔ اس مہنگائی نے ملازمت پیشہ لوگوں کی کمر توڑ رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس عورت درگا کو اپنے گھر کے سامان مکان اور زیورات کے رہن کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ تین برس قبل اس کے شوہر کی بیماری کے باعث اسے مکان، زیورات اور قیمتی اشیاء ایک سود خور کے پاس رہن رکھوانا پڑا تھا۔ دس فیصد ہر ماہ اسے ادا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہر ماہ سود ادا کرتے کرتے عاجز آچکی تھی۔ اگر وہ یہ رہن رکھ کر قرض نہ لیتی تو بیوہ ہو جاتی...... اس کا خیال تھا کہ شوہر صحت یابی کے بعد ملازمت کرکے اصل رقم واپس کردے گا...... لیکن جو سوچا تھا وہ نہ ہوسکا۔ اس کا شوہر بے حد کمزوری کے باعث ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی کالج میں داخل ہو جائے تو چھ ماہ بعد اسے کہیں بھی جز وقتی ملازمت مل جائے گی۔ اس کی ترقی سے تنخواہ اتنی ہو جائے گی کہ بیٹے کے تعلیمی اخراجات اور سود کی ادائیگی میں بڑی سہولت ہو جائے گی...... اس سود خور نے درگا کو نوٹس دیا ہوا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سود ادا نہیں کر رہی ہے۔ سود در سود سے قرض کی رقم میں بے پناہ اضافہ ہوگیا ہے...... اگر دو ماہ میں تمام سود ادا نہ کیا گیا تو اسے رہن رکھی ہوئی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا...... اور وہ مکان خالی کرالے گا۔

عمومی کٹوتیاں واضح تھیں۔ مگر پھر بھی تین سو روپے کم تھے۔ پھر اسے وہ سو روپے یاد آئے جو اس نے دفتر کے کیشیئر سے ادھار لئے تھے۔ کیوں کہ پچھلے ماہ وزیر خارجہ دفتر کے دورے اور معائنہ پر تشریف لائے تھے۔ ان کی سواگت دفتر کی یونین نے کیا تھا۔ اس کے لئے بھی ڈیڑھ سو روپے کا چندہ دینا پڑا۔ دفتر میں سبھی نے دیا تھا۔ وزیر صاحب اپنے ہمراہ ایک بڑا وفد جس میں زیادہ تر حفاظتی افسر تھے لائے تھے جس میں ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو وہ شان دار ناشتا اڑا اور سبز باغ دکھا کر دفع ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے آپ بہت پریشان اور خوف زدہ دکھائی دے رہی ہیں۔" چندرا دیوی نے بڑی شائستگی سے کہا۔ "معاف کیجئے گا...... میں نے آپ سے ایک ذاتی سوال کیا ہے......؟ اس بات کا کچھ خیال مت کریں۔"

یہ سری لنکن عورت تھی۔ اس لئے چندرا دیوی نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا تھا۔ یہاں مرد اور عورتیں انگریزی زبان میں گفتگو کیا کرتے تھے یا پھر اپنی مقامی زبان میں...... یوں تو وہ ہندوستانی زبان اور مدراسی زبان سے بھی آشنا تھے۔

"جی ہاں......" اس عورت نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو اس کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔ "میں نے آپ کی بات کا برا نہیں منایا ہے۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میری پریشانی کو بھانپ کر ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا...... اس نفسا نفسی کے دور میں خون اور رشتے بھی محبت کے دو لفظ بھی نہیں بولتے ہیں...... واقعی میں بہت پریشان ہوں...... مجھے بچے کے داخلے کی فکر ہے...... دوسری طرف میں نے شوہر کے علاج کے لئے جو مکان، زیورات اور قیمتی اشیا رہن رکھ کر قرض لیا سود پر...... وہ تین برس سے بھر رہی ہوں...... اس گراں فروشی کے باعث درمیان میں کچھ مہینے بھر نہ سکی...... سود در سود ایک عذاب اور عفریت ہے...... اس سود خور نے مجھے نوٹس دیا ہے کہ اگر میں نے دو ماہ کے اندر سود نہیں بھرا تو رہن رکھا ہوا سب کچھ ضبط

کرلوں گا...... میرے پاس جو کاغذات اور معاہدہ ہے عدالت اس کی رو سے صرف ایک ماہ کے نوٹس پر مکان خالی کروادے گی۔ پھر وہ زیورات اور قیمتی اشیاء بھی ضبط کرلے گا...... میں نے اس سے کہا کہ زیورات دے دو تاکہ میں انہیں فروخت کرکے تمام قرض اور سود ادا کروں...... جب سے سونے کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس خبیث کی نیت میں فرق آگیا ہے...... میں نے رشتہ داروں سے بھی کہا کہ...... وہ قرض اور سود ادا کردیں۔ میں زیورات فروخت کرکے ان کی رقم دے دوں گی...... لیکن اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا...... دوسری طرف میری ترقی پانچ برس پہلے ہوئی تھی۔ لیکن اس پر اب تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ سمری التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ ترقی ہو جانے کی صورت میں میرے پاس اتنی رقم آجائے گی کہ تمام سود اور آدھا قرض بھی ادا ہو جائے گا...... اور پھر لڑکے کو کالج میں داخلہ دلوادوں گی۔ چھ ماہ بعد اسے جز وقتی ملازمت مل جائے گی تو سال بھر میں قرض اور سود بھی ادا ہو جائے گا۔ اب میرے پاس دو سو ساٹھ روپے بچے ہیں۔"

نصف گھنٹے کے اس سفر میں ان کے درمیان محبت کا ایک رشتہ قائم ہوگیا جیسے وہ جنم جنم کی دوست، غم گسار ہوں...... چندرا دیوی بس اسٹاپ پر اس کے ساتھ اتر گئی اور اس سے بولی۔ "اگر میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں......"

"اعتراض......؟" وہ خوش ہو کر بولی۔ "میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوگی۔ آپ ضرور ساتھ چلیں......"

وہ عورت بس اسٹاپ سے چند قدم پر تھی۔ وہ راہ داری میں آکر بڑے کمرے کے آخری حصے کی طرف بڑھی، ایئر کنڈیشنڈ دفتر تھا۔ وہاں کھڑا استقبالیہ تھا۔ ریسپشن کے کاؤنٹر پر کوئی نہ تھا۔ جو لڑکی تھی وہ کسی کام سے اندر گئی ہوئی تھی۔ چندرا دیوی نے کہا وہ نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرے گی۔ کیوں کہ اس کے ساتھ اندر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ درگا اندر کی طرف بڑھ گئی۔ پھر چندرا دیوی ایک دم سے غائب ہو کر اس کے ساتھ ہولی۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ ہر کسی کو دیکھ سکتی تھی۔ اور دیکھ رہی تھی۔

دفتر میں میزوں پر موجود لڑکیاں خاموشی سے کام کر رہی تھیں۔ درگا نے سوچا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیف اندر موجود ہے۔

وہ اس کمرے میں جہاں چیف کی لیڈی پرائیویٹ سیکریٹری بیٹھتی تھی۔ درگا نے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چندرا دیوی بھی اس کے ہمراہ اندر پہنچ گئی۔ چیف ایک فحش باتصویر امریکی رسالہ دیکھ رہا تھا جس کے کنارے کثرت مطالعہ کی وجہ سے مڑ چکے تھے۔ اس کے سرورق پر ایک امریکی اداکارہ کی نامناسب حالت کی رنگین تصویر چھپی ہوئی تھیں۔ درگا چیف کے سامنے بت بنی کھڑی تھی وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ چیف اس کی طرف متوجہ ہو۔ چیف کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور وہ پورا گنجا ہو چکا تھا۔

"اچھا تو تم کل صبح جا رہی ہو درگا......!" اس نے اپنے آگے کے نکلے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

"یس سر......!" درگا نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

"میں تمہیں تیاری کے لئے آج سہ پہر کی چھٹی کرنے کی اجازت دیتا ہوں...... کولمبو میں تمہارے پاس تین دن ہوں گے......؟ کیا تمہارے یہ تین دن کافی ہوں گے......؟ تم کیا کہتی ہو......؟"

"سر......! میں اس صورت میں مزید تین دن کی معافی چاہوں گی کہ اگر کام نہ ہوسکا؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے درگا......!" چیف نے کہا۔ "اور ہاں یاد آیا...... کیا تم کولمبو سے میرے لئے جدید ترین گیبرڈین کا کپڑا خرید کر لاسکتی ہو...... میں تمہاری واپسی پر ادائیگی کردوں گا۔"

"ضرور سر......! شکریہ۔" درگا بولی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

درگا نے سوچا کہ گیبرڈین کا کپڑا دو سو روپے میں آسانی سے مل جائے گا۔ کیوں کہ اب اس کا رواج نہیں رہا ہے۔ پچھلی مرتبہ چیف نے اس سے جین کی پتلون منگوائی تھی۔ جو اسے ایک سو دس روپے پرانے مال کی دکان پر ملی تھی۔ اس کی واپسی پر چیف نے اس کی رقم دینے پر اصرار کیا مگر اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے بھی چیف اس کے ساتھ عزت سے پیش آتا تھا۔ مثال کے طور پر آج سہ پہر کی چھٹی اور تنخواہ کے ساتھ رخصت...... سب سے بڑھ کر اس نے دوسری خاتون کلرکوں کی طرح درگا کی طرف جسمانی پیش رفت نہیں کی تھی۔

وہ ذیلی دفتر میں کام کرتی تھی۔ یہ دفتر صدر دفتر تھا۔ کیشیئر نے اسے تین دن کی تنخواہ کی ادائیگی کی۔ وہ باہر نکلی تو چندرا دیوی اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے چندرا دیوی کو بتایا کہ وہ کل صبح چھ بجے والی بس سے کولمبو جائے گی۔ اس وقت بسوں میں بہت رش ہوتا ہے۔ چندرا دیوی نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ سری لنکا تفریح، سیر و سیاحت اور یہاں کے معاشرے کے بارے میں جانکاری کے لئے آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک اخبار کی رپورٹر بھی ہے۔ اس لئے وہ بھی اس کے ساتھ کولمبو چلے گی۔ تفریح اور ساتھ رہے گا...... اور پھر اسے یہاں کے دفتروں کی جانکاری بھی ہوگی...... درگا یہ سن کر خوش ہوگئی۔ چندرا دیوی نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اس پر بوجھ نہیں بنے گی۔

صبح چھ بجے سے پہلے وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو چندرا دیوی اس کی منتظر تھی۔ اس پہلی بس کی روانگی میں بہت رش ہوتا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر درگا حیران ہوئی کہ آج بس میں اتفاق سے کوئی رش نہیں تھا اور اس دن مسافروں کی تعداد حیرت انگیز طور پر خاصی کم تھی۔ درگا...... چندرا دیوی کو ساتھ لے کر کھڑکی کے پاس والی نشست پر بیٹھ گئی۔ سورج کی روشنی کے سیلاب میں دیہاتی علاقہ چاول کے تازہ لگے ہوئے پودوں سے زردی سبز دکھائی دیتا تھا۔ ندی نالے پانی سے بھرے ہوئے تھے...... پوری وادی حتیٰ کہ جہاں جہاں سرسبز پہاڑیاں تھیں افراتفری سی پھیلی ہوئی تھی...... بس نو تعمیر شدہ سڑکوں اور پلوں پر سے ہنستی گاتی گزرتی جا رہی تھی۔

درگا نے بڑی خوشی اور فخریہ انداز میں بتایا کہ یہ ساری ترقی سابقہ حکومت کے دور میں ہوئی تھی۔ درگا سابقہ حکومت کی بڑی فراخ دلی سے تعریف کر رہی تھی...... نئی سڑکوں اور پلوں نے کولمبو جانا بہت آسان بنا دیا تھا۔ جہاں پہلے پورا دن درکار ہوتا تھا۔ اب صرف سات گھنٹے لگتے ہیں۔

شہر کی بھاگ دوڑ اور نفسانفسی کی زندگی عجیب طرح کی تھی۔ درگا اور اس کے خاوند نے پال کیلے میں آخر کار کسی نہ کسی طرح اپنا گھر بنا لیا تھا...... اس کے تین بچے تھے جن میں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور وہ امریکہ نقل مکانی کرنے والا تھا۔ اس کا ویزا آ گیا تھا۔ دوسرا کالج میں پڑھتا تھا اور اب وہ فائنل ایئر میں تھا۔ سب سے چھوٹے نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ درگا اور اس کے شوہر تنخواہ دار تھے اور وہ کسی طرح بھی کم خرچ کرتی...... رقم پس انداز کرتی لیکن ان کی بچت ہر چیز کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی نذر ہو جاتی۔ مٹی کے تیل کے چولہے میں کھانا پکانا اس نے چھوڑ دیا تھا اور فارم سے آئی ہوئی لکڑیوں کو جلا کر پکا رہی تھی اور یہ لکڑیاں ہمیشہ خشک نہیں ہوتی تھیں۔

اس نے پانچ برس پہلے ترقی کی درخواست دی تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ اس سلسلے میں وہ کوئی دو مرتبہ کولمبو جا چکی تھی۔ آخر کار خط و کتابت کے بعد اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کی درخواست منظور کی جا چکی ہے...... اس نے یہ ساری باتیں چندرا دیوی کو بتائی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بڑا بیٹا امریکہ جا کر ایک ڈالر بھی دو برس تک نہیں بھیج سکے گا۔ اس لئے کہ امریکی ویزا کے حصول کے لئے وہ بہت بڑی رقم کا مقروض ہو گیا ہے۔

سہ پہر کے وقت وہ کولمبو پہنچے۔ بس سے اترنے کے بعد چندرا دیوی اسے لنچ کے لئے قریبی

ریسٹورنٹ میں لے گئی۔ درگا نے پلاسٹک کا لنچ بکس نکالا جو اس کی بیٹی نے تیار کر کے دیا تھا۔ راستے میں بس دو ہوٹلوں پر رکی تھی۔ چندرا دیوی نے اسے سینڈوچز اور سموسے کھلائے اور چائے پلائی تھی۔ اس کے لنچ بکس میں ابلے ہوئے انڈے...... مکھن سلائس، چاول اور ابلی ہوئی مرغی تھی...... چندرا دیوی نے ہوٹل میں اپنے لئے چکن بروسٹ منگوایا تھا۔ درگا کے لئے بھی منگوانا چاہتی تھی لیکن درگا نے منع کر دیا۔ اس لئے کہ کھانا وافر مقدار میں تھا۔

جب وہ دونوں ہوٹل سے نکلیں تو شام کے دھندلکے پھیل رہے تھے۔ اس کے ہمراہ چندرا دیوی نہ ہوتی تو اسے ہجوم میں تھیلے اٹھا کر چلنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس وقت ٹیکسی کا ملنا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ وہ جب بھی کولمبو آئی تھی تو اس نے اپنی کزن کے ہاں قیام کیا تھا۔ اس کی کزن کالج میں ہم جماعت رہ چکی تھی۔ اب اس کی کزن کے چار بچے تھے۔ گزشتہ مرتبہ اسے برآمدے میں سونا پڑا۔ لیکن اب وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ مرتبہ جب وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر سو رہی تھی تو اس نے اپنے چہرے پر گرم گرم سانسیں اور بدن پر ایک ہاتھ کو کسی سانپ کی طرح رینگتا محسوس کیا تھا...... وہ ہڑبڑا کر بیدار نہ ہوتی تو وہ کزن کے پتی کے بازوؤں کی گرفت میں بے بس ہو جاتی۔ وہ ایک قدآور اور مضبوط بازوؤں کا شخص تھا۔ صبح کے ناشتے میں وہ اسے ہوسناک نظروں سے گھورتا رہا اور اس سے کہا تھا کہ ایک رات اور رک کر صبح چلی جائے۔ شام کو کسی اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔ آخری شو دیکھیں گے۔ وہ اسے خریداری بھی کرائے گا...... وہ ان باتوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ ان کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما تھا...... اس کی کزن رات میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتی تو بے ہوشی کی سی نیند سوتی تھی۔ کہیں دھماکا بھی ہو جائے تو بیدار نہ ہو...... رات رکنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ نوازشات کا صلہ وصول کرے...... اس نے اس پیشکش کو بڑی خوش دلی سے اور شکریے کے ساتھ رد کر دیا تھا۔

کولمبو...... سری لنکا کے تمام شہروں کے مقابلے میں بہت مہنگا تھا۔ یہاں ہر چیز مہنگی تھی۔ صرف ایک عورت سستی تھی۔ ہوٹل تو ہر درجے کے تھے۔ ان میں جو گھٹیا قسم کے ہوٹل تھے ان کا بھی کرایہ ایک دن کا ڈیڑھ سو روپے سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ اسے ایک رات ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کسی کام سے آئی تھی۔ چوں کہ اس کی کزن گھر پر نہیں تھی اس لئے وہ ہوٹل میں کمرا کرایہ پر لینے پر مجبور تھی۔ اس ہوٹل کا ماحول بہت خراب تھا۔ یہاں عیاش قسم کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو لڑکیوں اور عورتوں کو کمروں میں لے جا رہے تھے۔ جب وہ گہری نیند میں تھی تب اس نے دروازے پر دستک سنی۔ اس نے روشنی کر کے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا...... کون ہوسکتا ہے......؟ اس نے سوچا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ پھر اس نے ایک نسوانی آواز سنی...... اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک عورت کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے دو مرد تھے۔ عورت اس لئے بولی کہ یہ میرے دوست کے دوست ہیں۔ میں اپنی دوست کی پارٹنر ہوں...... ان کے دوست کو رات بھر ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ڈبل بیڈ لیا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف آپ کے کمرے کا کرایہ بلکہ دو سو روپے بھی پیشگی ادا کریں گے۔ صبح کا ناشتا بھی کرائیں گے...... ان کے پاس ولایتی بیئر بھی ہے...... وہسکی بھی...... اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹخنی لگا لی۔ اس کی نیند حرام ہوگئی تھی۔ جلد صبح ہونے کی پرارتھنا کرتی اور جاگتی رہی تھی۔ تب سے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کے کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرے گی...... اب وہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں جس کا ماحول اچھا ہو۔ لیکن کیا اس کا کرایہ وہ ادا کر سکے گی......؟ چندرا دیوی بھی ساتھ اور رات میں رکنے والی تھی۔ پھر چندرا دیوی اس کی دلی کیفیت بھانپ کر ایک فور اسٹار ہوٹل پر لے آئی جو سامنے تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کرائے کی فکر نہ کرے۔ وہ ادا کر دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی۔ چندرا دیوی نے ایک ڈبل بیڈ کرائے پر لیا۔ اس ہوٹل کے تمام کمرے ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ اس میں نہ صرف غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں ٹھہری ہوئی تھیں بلکہ مقامی لوگ بھی تھے۔ اس کا یومیہ کرایہ پندرہ سو روپے تھا۔ چندرا دیوی نے اسے جو ڈنر کھلایا تھا اس کا بل سات سو روپے بنا تھا۔

اسے گزشتہ سال کی بات یاد آئی تھی۔ یہ اس دن کی بات تھی جب اس کی کزن کے شوہر نے رات کے وقت اس کی گہری نیند سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ اس کی کزن کی طرح وہ بھی بے ہوشی کی نیند سوتی ہوگی۔ جب وہ کزن کے ہاں پہنچی تھی تو وہ لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک اچھے رشتے دار کی طرح وہ ان کے لئے کھانے کی بہت ساری چیزیں لے کر آئی تھی۔ اس کے بھانجے اور بھانجیوں کا کیسٹ پوری آواز میں لگا ہوا تھا۔ اس کی کزن اور اس کا شوہر اسے دیکھ کر بہت خوش نظر آئے تھے۔ اس کا شوہر تو کچھ زیادہ ہی خوش نظر آیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کزن کے شوہر کے دل اور آنکھوں میں میل ہے۔ لیکن اپنی کزن کے اس سوال میں اسے ہلکا سا طنز محسوس ہوا تھا۔ ”تم کب واپس جاؤ گی......؟ کتنے دنوں کے لئے آئی ہو۔“

”میں یہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رکوں گی۔“ اس نے جواب میں کہا تھا۔ ”اور میں زیادہ تر وقت باہر رہوں گی۔ میں دوپہر اور رات کا کھانا بھی باہر ہی کھاؤں گی۔ کیوں کہ میرا زیادہ تر وقت کاغذات کے پیچھے بھاگ دوڑ کرنے میں وزارت کے دفتر کا چکر لگانے میں گزرے گا...... جانتی ہو جس فائل پر سرخ فیتہ لگا ہو وہ ناک چنے چبوا دیتی ہے۔

اگلے دن اس نے ان کے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ وہ چھ بجے بیدار ہوگئی تھی۔ اس وقت بچے اسکول جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ ان کے کیسٹ ریکاڈر نے اسے رات بھر جگائے رکھا تھا۔ اس نے دانست بہت ہی مختصر سا ناشتا کیا۔ کافی کے ایک کپ کے ساتھ اس نے صرف ایک نمکین سلائس لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے مصروف دن گزارنا ہے اور یہ ناشتا ناکافی ہے...... اور پھر اس کی کزن نے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کزن پر بوجھ بننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کس قدر مہنگائی ہے۔ بڑا ناپ تول کر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ قناعت اور کفایت شعاری کا ہنر نہ ہو تو پھر گزارہ مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ غریب بھی کیا کرے۔ تین بچے ہیں جو ایک اچھے اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ گھر سے باہر آ کر ایک مدراسی ہوٹل میں جا کر اس نے مسالہ دوسا کھایا اور وقت ضائع کئے بغیر وہ متعلقہ افراد کے پاس گئی۔ کسی بھی دفتر میں واقف کار کا ہونا بڑا سودمند ہوتا تھا۔ اسے اپنے ایک پرانے رفیق کار ستیش صاحب کا خیال آیا تھا۔ جو ایک زمانے میں چیف سلیکشن تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف کلرکوں میں اسے ایک ایسا کلرک نظر آیا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔ ستیش صاحب ریٹائر ہو چکے تھے...... یہ تمام واقعات اسے اب یاد آ گئے تھے۔

صبح کے پرتکلف ناشتے کے بعد وہ نکلی تو چندرا دیوی بھی ساتھ تھی۔ چندرا دیوی سے اس کی ملاقات سپنے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ بڑی مخلص اور بے غرض عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس پر دل کھول کر خرچ کر کے اس کی رقم بچالی تھی۔ رات جس ہوٹل میں گزاری تھی وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی...... کیا دنیا میں چندرا دیوی جیسی ہستیاں بھی ہیں......؟ آخر اس کا کیا رشتہ ہے......؟ وہ نہ اس کی بہن ہے...... کزن ہے...... ماں یا بھائی ہے......؟ اس نے کیسے انمول اور انوکھے اور محبت بھرے رشتے میں باندھ لیا...... وہ سچ مچ کی کوئی دیوی ہے۔ جو آکاش سے اتری ہو...... اور بھگوان نے اس کی مدد کے لئے بھیجا ہو۔

درگا نے سوچا تھا کہ اسے سیدھا وزیر کے پاس جانا چاہئے...... کیوں کہ دورے کے موقع پر اس نے کسی پریشانی اور مسئلے کی صورت میں اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی...... وہ جانتی تھی کہ اس شخص نے یہ رسما کہا تھا۔ یہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو ایسا ہی بے وقوف

بناتے ہیں...... جھوٹ بولتے اور فریب دیتے ہیں...... اس کے علاوہ وہ شخص سراب کے نشے میں دھت تھا۔ وہ اس سے دفتر کے کچھ کاغذات پر دستخط کروانے گئی تھی...... وزیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ...... تم کتنی حسین ہو...... ہندوستانی اداکارہ مدھو بالا لگ رہی ہو...... اس کی آنکھوں میں دل کا میل جھانک رہا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز سے ہاتھ چھڑا کر ابھی آنے کا کہہ کر چلی آئی تھی...... درگا کو اندازہ تھا کہ اسے وہ باتیں یاد نہیں رہی ہوں گی جن کا اس نے وعدہ کیا تھا...... اور پھر اسے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ اس ترقی کا مسئلہ معمولی نوعیت کا ہے۔ جسے وزیر جیسے اہمیت کے حامل کے سامنے پیش کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا......“

چندرا دیوی کو دفتر کے استقبالیہ کمرے میں چھوڑ کر وہ اندر گئی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک کلرک سے اس افسر کے متعلق پوچھا جو عملے کے ارکان کی ترقی کے معاملات نمٹاتا تھا۔ اسے دفتر کے دوسرے حصے کی طرف بھیج دیا گیا۔

وہ افسر ایک تیس بتیس برس کی مجسم اور فربہ عورت تھی۔ جس کے دانت گندے...... بال ژولیدہ...... اور لبوں پر انتہائی شوخ رنگ کی لپ اسٹک لگی ہوئی تھی۔ اس نے میز کی دراز سے ایک فہرست نکالی اور بڑی مستعدی سے اس کا مطالعہ کیا۔ اس نے کاغذات کو الٹ پلٹ کرنے کے بعد اپنے منحوس چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے درگا کی طرف دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے مسز درگا جوشی......! فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے۔ شاید فارم ادھر ادھر ہو گئے ہوں......“

”لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا......؟“ درگا نے اونچی آواز میں کہا تو وہ فضا میں گونج گئی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا......؟“ اس عورت نے تکرار کی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں فارم ہوتے ہیں۔

”اس لئے کہ میرے پاس وہ خط موجود ہے جو آپ نے پچھلے مہینے بھیجا تھا۔“ اس نے تیزی سے اپنے پرس کی زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا۔ پھر خط باہر نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ دیکھئے...... اور اس پر فائل نمبر بھی ہے......“

وہ عورت اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

”مسز درگا جوشی......!“ اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے کام کے لئے مجھے ڈھیروں فائلیں دیکھنا پڑیں گی...... میں بہت مصروف ہوں...... مجھے اس کام کے لئے کسی اور کو لگانا پڑے گا۔“ اس نے درگا کے پاس والا دراز کھولتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس دراز میں صرف دو سو روپے کیوں نہیں ڈال دیتی ہیں......؟“

ایک لمحے کے لئے درگا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سب صرف اس کے ساتھ ہو رہا ہے جو خود بھی اسی وزارت میں کام کرتی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ کس طرح اس کے دفتر میں مسز سبھاش بھی یہی کرتی ہے۔ اس نے پرس کھولا تو اس عورت نے دراز اور کھول دی۔ درگا نے سو سو کے دو نوٹ ڈالتے ہوئے دراز میں جھانکا۔ اس میں سو سو اور پچاس کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق دو ہزار سے زیادہ رقم تھی۔

”کیا میں اپنے کام کے لئے سہ پہر کے وقت حاضر ہو جاؤں......؟“

”مسز درگا جوشی!“ اس عورت نے بڑے میٹھے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے...... آپ کل کیوں نہیں آ جاتیں...... آپ کی مدد کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی بن پڑا وہ کروں گی......“

وہ جانتی تھی کہ بحث و تکرار سے کچھ حاصل نہیں...... سرکاری دفاتر کے امور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

چندرا دیوی جو ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ غائب حالت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے تمام نوٹ اٹھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر اپنے پرس میں رکھ لئے...... اس نے سوچا کہ درگا کی فائل مل جانے کے بعد اس عورت کو سبق دے گی۔ یوں تو وہ بھی درگا کی فائل الماری سے نکال سکتی تھی۔ لیکن اس نے سوچا۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔

درگا نشست گاہ میں آئی اور اس سے بولی۔

"اس عورت نے دوسو روپے بھی لئے اور کام کل پر ڈال دیا۔ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں...... ایک دن اور رکنا ہوگا...... اور میں......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور خجل سی ہوگئی۔

اس کی بات سن کر چندرا دیوی بولی۔ "آپ اخراجات کے لئے پریشان ہورہی ہیں...... آپ کسی بات کی چنتا نہ کریں۔ میں نے آپ کو بتایا نہ کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ سیر و سیاحت پر آئی ہوں تو بڑی رقم لائی ہوں۔ ایک دن کیا...... کام ہونے تک ہفتہ بھی لگ جائے تو فرق نہیں پڑتا...... چلیے...... ہمارے پاس وقت ہے۔ وقت گزاری کرتے ہیں۔"

"چندرا دیوی جی......" اس کے خلوص اور ہمدردی کے جذبے پر درگا کا دل اور آنکھیں بھر آئیں۔"

اس وقت تقریباً دس بج چکے تھے۔ کولمبو کے مرکزی بازار جانے کے لئے چندرا دیوی نے ٹیکسی کرلی۔ درگا نے اس سے کہا تھا کہ کچھ خریداری کرنی ہے۔ وہاں ایک ایسی مارکیٹ تھی جہاں کپڑوں کی چھوٹی اور عام قسم کی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر ہر قسم کے نئے پرانے کپڑے مناسب داموں پر دستیاب تھے۔ اس نے دکان داروں سے گیبرڈین اور اس کے سب سے عمدہ اور اعلیٰ قسم کی کوالٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ آج کی صبح خاصی مرغوب تھی۔ بسوں، گاڑیوں اور ٹیکسیوں کے دھوئیں نے اس کے لئے سانس لینا دشوار کردیا اور اسے سینے میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ آخر اس نے ایک دکان پر کپڑا پسند کرکے بھاؤ تاؤ کیا۔ تین سو چالیس روپے میں کپڑا خرید لیا۔ وہ دونوں اسٹور سے نکل کر ایک بازار میں آئیں۔ درگا نے اشیا خورد و نوش کی قیمتوں کا موازنہ کی۔ یہاں قیمتیں اس کے علاقے کے بازاروں سے بہت زیادہ تھیں۔

دوپہر کے وقت لنچ پر اس نے چندرا دیوی کو مدعو کیا...... اسے ایک معمولی سے ہوٹل میں لے گئی۔ کیوں کہ اچھی حالت کے ہوٹلوں میں کھانے بہت مہنگے تھے۔ چندرا جانتی تھی کہ درگا اسے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کیا...... کوئی مشروب پلانے کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی۔ لہٰذا اس نے کہا۔

"درگا......! جب تک ہم کولمبو میں ہیں۔ تمام اخراجات میرے ذمے...... آج لنچ بھی میری طرف سے......"

پھر وہ درگا کو لے کر ایک مدراسی ہوٹل میں گئی۔ جہاں دال، چاول، دہی، دو قسم کی سبزی ترکاری اور پاپڑ کی تھالی تھی۔ یہ نہ صرف سستا بلکہ ذائقہ دار اور مزے دار تھا۔ مدراسی کھانے بہت اچھے اور لذیذ ہوتے تھے۔ اسی لئے پورے سری لنکا میں مقبول تھے۔

ہوٹل سے باہر آنے کے بعد وہ پھر مرکزی بازار میں آگئیں جہاں غیر معمولی رش تھا۔ پھر اسے ایک دم سے خیال آیا کہ اس بازار میں رہزنی کی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں اور عورتوں کے پرس جوان لڑکے اور مرد چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہجوم میں ایسے گم ہوجاتے ہیں کہ انہیں پکڑنا بہت دشوار ہوتا ہے...... اس کے ساتھ بھی ایک بار ایسا واقعہ پیش آچکا تھا۔ مگر اتفاق سے وہ رہزن چند قدموں کے بعد ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ پھر اس بدمعاش کی شامت آگئی۔ لوگوں نے لاتوں، جوتوں اور گھونسوں کی بارش سے اس کی ایسی خاطر تواضع کی کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ اگر پولیس مین نہ آتا تو وہ راہ گیروں کے ہاتھوں بے موت مارا جاتا۔ پھر اس نے اور چندرا دیوی نے کولمبو میں مرکزی بازار کے قریب بنا ہوا نیا اور جدید ترین قسم کا بازار دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس بازار کی دکانوں میں ایک عام آدمی کا خریداری کرنا تو درکنار قدم رکھنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک ڈیڑھ برس بعد کولمبو آئی تھی۔ ایک دوسرے کو دھکے دیتا

ہوا ہجوم...... لوگوں کے پسینے میں تر چہرے...... گلیوں سے آنے والی بدبو...... اور چھوٹے چھوٹے کوارٹروں والی عمارتیں...... اس کی وادی میں زندگی کتنی مختلف تھی۔ صرف ایک برس میں کولمبو یکسر بدل گیا تھا۔ جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں ایک بغلی گلی میں داخل ہوئیں تو وہاں سناٹا تھا اور وہ خالی پڑی تھی۔ وہ دکانوں کی عقبی گلی تھی۔ اچانک تین نوجوان بدمعاش جو چاقوؤں سے مسلح تھے ان کے سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک نے بڑے استہزائیہ لہجے میں دونوں سے کہا۔

"تم دونوں اپنا اپنا پرس ہمارے حوالے کردو...... مدد کے لئے شور نہ مچانا......"

"ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔" چندرا دیوی نے جواب دیا۔ "ہم دونوں کے پرس بالکل خالی پڑے ہیں...... اس لئے کہ صبح دس بجے تم جیسے دو بہادر سپوتوں نے پرس چھین کر اسے خالی کرکے لوٹا دیئے تھے۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو......" دوسرا بدمعاش غرایا۔ "ہمیں بے وقوف نہ بناؤ۔"

چندرا دیوی نے اپنا پرس اس بدمعاش کی طرف اچھال دیا۔ "لو...... اچھی طرح سے دیکھ لو اور اپنی تسلی کرلو۔"

اس بدمعاش نے پرس کی زپ کھول کر پرس کے اندر جھانکا...... اس کے خانے دیکھے...... پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

"یہ سچ کہہ رہی ہے...... واقعی اس میں ایک کوڑی بھی نہیں ہے......" اس نے خالی پرس الٹ کر دکھایا اور ایک طرف پھینک دیا۔

ادھر درگا بھونچکی سی ہوگئی کہ...... چندرا دیوی کی رقم کہاں گئی......؟ اسے یاد آیا۔ چندرا دیوی نے جب کبھی بھی بل اور ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لئے پرس کھولا تھا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں امریکی ڈالر اور مقامی کرنسی اور جانے کیا کیا تھا......؟

"یہ شاپنگ بیگ اور پرس ہمارے حوالے کردو......" تیسرے نے غرا کر ہاتھ بڑھایا۔

"دیکھو...... اس میں بھی کچھ نہیں ہے۔" چندرا دیوی بولی۔ "اس شاپنگ بیگ میں پرانے اخبار اور رسالے ہیں...... اس کا پرس بھی خالی ہے...... تم لوگ خوامخواہ اپنا قیمتی وقت ضائع کررہے ہو......"

تیسرا درگا کی طرف چاقو لہراتا ہوا بڑھا اور اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین لیا۔ اس میں دیکھا تو واقعی اخبار اور رسالے بھرے ہوئے تھے...... خالی پرس منہ چڑا رہا تھا...... درگا نے لمحے کے لئے سوچا...... کیا وہ جاگتے میں بھیانک خواب دیکھ رہی ہے؟

اس تیسرے نے غصے سے جھنجھلا کر خالی پرس درگا کے منہ پر دے مارا۔ وہ جھکائی نہیں دیتی تو پرس سے اس کا منہ زخمی ہوجاتا۔

جب وہ تینوں جانے کے لئے مڑے تو چندرا دیوی بولی۔ "ٹھہرو...... جا کہاں رہے ہو...... آج تم تینوں نے جو لوٹ مار کی ہے وہ مال دیتے جاؤ...... یہ ایک جرمانہ ہے...... اس جرم کا کہ تم نے پرس اس عورت کے منہ پر دے مارا......"

"کیا تمہارے باپ کا مال ہے......؟" پہلے نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... یہ مال نہ تمہارا ہے اور نہ میرے باپ کا...... کسی اور کا ہے......" وہ ان کی طرف بڑھی۔

"اپنی تلاشی دو......"

"قریب نہ آنا...... ورنہ یہ چاقو تمہارے سینے میں اتار دوں گا......" دوسرے نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

چندرا دیوی نے اس کی دھمکی کی پرواہ نہیں کی...... دوسرے بدمعاش نے اپنا ہاتھ فضا میں حملہ کرنے کے لئے اٹھایا۔ لیکن وہ ساکت ہوگیا...... دونوں بدمعاش بھی جہاں کھڑے تھے اور جس حالت میں تھے ساکت ہوگئے تھے۔ ان تینوں پر مجسموں کا گمان ہورہا تھا۔ ان میں ہلنے جلنے کی حرکت کی اور جنبش تک کی سکت نہیں رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

”یہ...... یہ...... یہ کیا ہوگیا ہے......؟ پہلے والے نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ میں پتھر کا ہوگیا ہوں۔“

”ہم دونوں بھی ایسا ہی محسوس کررہے ہیں......“ دوسرے اور تیسرے نے کہا۔

”ہاں......“ چندرا دیوی بولی۔ اس نے پہلے بدمعاش کے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔ ”کیا خیال ہے......؟ میں یہ چاقو تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے سینوں میں اتار دوں......؟ خون کردوں......؟ میں چاہوں تو ایسا کرسکتی ہوں...... لیکن ایسا نہیں کروں گی......“

چندرا دیوی نے دونوں بدمعاشوں کے ہاتھوں سے چاقو لے کر انہیں غیر مسلح کردیا۔ اس نے تینوں چاقو گٹر میں ڈال دیئے...... پھر اس نے اپنا پرس اٹھا کر تینوں بدمعاشوں کو باری باری دکھایا۔ انہوں نے دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ ملکی اور غیر ملکی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔

چندرا دیوی نے پہلے بدمعاش کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں سے نوٹ، اور ایک سونے کا لاکٹ برآمد ہوا...... وہ چیخا چلایا اور اس نے دھمکی بھی دی...... میرا مال نہیں نکالو...... زندہ نہیں چھوڑوں گا...... اس نے بڑی کوشش اور جتن کئے۔ وہ نہ تو مزاحمت کے قابل تھا اور نہ حرکت کے...... چندرا دیوی نے بڑے اطمینان سے اپنا کام کیا...... دونوں بدمعاشوں کی جیبوں سے بھی رقم، اور دستی گھڑیاں برآمد ہوئیں...... درگا نے اپنا شاپنگ بیگ دیکھا تو اس میں ردی اور رسالے نہ تھے بلکہ اس نے جو کپڑا خریدا وہ تھا۔ اس کے پرس میں بھی اس کی ساری رقم موجود تھی...... اس کی عقل دنگ تھی۔ کچھ کام نہیں کررہی تھی۔

”مجھے یہ اندازہ ہورہا ہے کہ تم تینوں کی جیبوں سے دس بارہ ہزار سے زائد رقم نکلی ہے......“ چندرا دیوی بولی۔ ”میں نے کتنا اونچا اور شاندار ہاتھ مارا ہے...... اس رقم سے ہم عیش کریں گی۔ پرتکلف کھانے کھائیں گی...... اچھا ہم جارہی ہیں...... تم تینوں بارہ گھنٹے تک اسی حالت میں رہو گے...... اگر تم لوگوں نے بدمعاشی نہیں چھوڑی تو پھر میں تم تینوں کو ساکت کرکے قتل کردوں گی...... میں تمہیں ابھی اور اسی وقت قتل کردیتی...... لیکن تم لوگوں کی جوانی پر ترس آگیا...... ویسے میں تم تینوں کے ہاتھ مفلوج کرکے جارہی ہوں تاکہ تم لوگ پھر سے رہ زنی کی وارداتیں نہ کرو...... گڈ بائی......“

پھر چندرا دیوی بڑے سکون و اطمینان اور تمکنت سے مین روڈ کی طرف بڑھی۔ وہ تینوں بدمعاش پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف انہیں غصہ آرہا تھا تو دوسری طرف وہ خوف زدہ بھی تھے کہ ان کا واسطہ ایک جادوگرنی سے پڑ گیا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا...... گو کہ انہوں نے سنا ہوا تو تھا کہ اس ملک میں جادوگر اور جادوگرنیاں ہیں...... لیکن وہ انتہائی دور افتادہ علاقوں میں تھیں...... کبھی کسی جادوگر اور جاگردونی نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔

”وہ کمینی...... ہم تینوں کو لوٹ کر دو دن کی کمائی لے گئی......؟“ ایک نے کہا۔

”اس نے ہمیں جادو کے زور پر بے حس و حرکت کردیا ہے......“ دوسرا بولا۔ ”پورے بارہ گھنٹے کے لئے......“

”میں پورا زور لگا رہا ہوں لیکن میری طاقت جو سلب ہوگئی ہے وہ کام نہیں کررہی ہے۔“ تیسرے نے کہا۔

”یہ کیا جادو تھا......؟“ پہلے والے نے کہا۔

”جاتے وقت اس نے جو پرس دکھایا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا...... جب کہ میں نے اچھی طرح دونوں پرس دیکھے تھے...... ان میں کچھ نظر نہیں آیا...... اب وہ مستقل ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو لوٹتی رہے گی......“

درگا جو ابھی تک سحر زدہ سی تھی وہ بار بار پلٹ کر ان بدمعاشوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ ان کے

تعاقب میں آئیں۔

”درگا بہن......!“ چندرا دیوی بولی۔ ”پریشان اور خوف زدہ نہ ہو...... یہ بدمعاش بارہ گھنٹوں تک حرکت تو درکنار جنبش تک نہیں کرسکتے اور نہ ہی تعاقب میں آسکتے ہیں...... تم اطمینان رکھو......“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا آخر یہ سب کچھ کیا تھا......؟ وہ تحیر زدہ لہجے میں بولی۔ ”کیا آپ کوئی جادوگرنی ہیں......؟“

”دراصل میں نے انہیں ہپناٹائز کردیا تھا......“ چندرا دیوی بولی۔ ”میں نے نہ صرف ہپناٹائز کا مکمل کورس کیا ہوا ہے بلکہ جوڈو کراٹے کی تربیت بھی حاصل کی ہے...... ہپناٹائز نہ صرف ایک فن ہے بلکہ ایک طرح جادو کی قسم بھی ہے۔“

”آج آپ کا یہ فن بڑا کام آیا......“ درگا نے ایک گہری سانس لی۔ ”رقم اور جان بھی بچ گئی...... ان بدمعاشوں کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ پرس چھین کر شور مچانے پر جان بھی لے سکتے تھے...... بھگوان نے بڑی کرپا کی......“

وہ باتیں کرتی ہوئی گلی سے نکل کر مین روڈ کے بس اسٹاپ پر پہنچی...... اس وقت ایک لمبی، بڑی خوب صورت نئی نویلی دلہن جیسی ٹورسٹ بس آکر رکی جو سیاحوں کو پورے شہر کی سیر کراتی تھی۔ اس نے نئی بس کے بارے میں اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ اس نے چندرا دیوی کو بتایا تو چندرا دیوی اس کا ہاتھ پکڑ کر بس میں سوار ہوگئی۔

کولمبو ایک ڈیڑھ برس میں واقعی یکسر بدل گیا تھا۔ بڑا ہی خوب صورت اور شان دار شہر لگتا تھا...... وہ پہلے کی نسبت کافی ستھرا ہوگیا تھا۔ اس شہر کی صفائی کے کیا کہنے...... لوگ کہتے ہیں کہ یہ امریکہ جیسا ہے۔ اس نے یہ بات چندرا دیوی سے کہی اور کہنے لگی۔

”محکمہ وزارت ٹورسٹ کے ایک اسسٹنٹ سیکریٹری نے ایک مرتبہ شہری ترقی کے مسائل پر لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا...... اس ملک میں بے پناہ دولت ہے......“ درگا نے سوچا۔ ان میں سے کون سی عمارت وزیر کی ملکیت ہے...... کیوں ایک افواہ تھی کہ وہ ایک پلازہ کا مالک ہے...... کوئی اتنی جلدی کسی عمارت کا مالک کیسے بن سکتا تھا...... اس کا جواب وزیر نے یہ دیا تھا کہ وہ ذاتی گاڑی اور ٹیکسی میں سفر کرنے کے بجائے بس کو ترجیح دیتا ہے۔ اور پھر اس نے کبھی فضول خرچی نہیں کی اور نہ ہی شامیں ہوٹلوں کی نذر کرتا رہا ہے۔ اس شہر کا موازنہ امریکہ کے کسی بھی شہر سے کیا جاسکتا ہے۔

درگا نے چندرا دیوی سے کہا۔ ”اگر امریکہ ایسا ہے تو اس کا بڑا بیٹا یقیناً ایسی زندگی گزارے گا...... اور بالآخر امریکی شہری بننے کے بعد مجھے اور میرے شوہر کو بھی بلالے گا تاکہ وہ بھی اس نوابوں کی نگری کے مزے لوٹ سکیں...... لیکن میں یہ سوچتی ہوں کہ مستقبل تو یہاں بھی ہے...... کیا ہزاروں...... اور لاکھوں نے اپنا مستقبل نہیں بنایا...... پھر ترک وطن کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں......“ چندرا دیوی نے تائیدی لہجے میں کہا۔

اگلی صبح جب وہ دفتر پہنچی تو اس عورت نے بتایا کہ بالآخر اس نے کاغذات ڈھونڈ لئے ہیں۔ ایک سو روپے دراز میں ڈال دو۔

”وہ کس لئے......!“ درگا حیرت اور غصے سے بولی۔ ”کل میں نے دو سو روپے...... دراز میں ڈال دیئے تھے......“

”اس لئے کہ کاغذات مل گئے...... کیا اس خوشی میں منہ میٹھا نہیں کراؤ گی......؟ مٹھائی جو کھاؤں گی......؟“

اس نے دراز میں رقم ڈالتے ہوئے دیکھا۔ دراز نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ شاید اس میں کل کی رشوت کی رقم تھی۔ جو عورت کسی وجہ سے لے جانہ سکی تھی...... درگا کا خون اس وقت کھول کر رہ گیا جب اس میں ایک فارم کم تھا...... یہ فارم آئی 15 کے انتظامی شعبے سے ملتا تھا...... اس فارم کو پُر کرکے اس کی تصدیق

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کروائی تھی اور واپس انتظامی شعبے میں جمع کروانا تھا...... یہ شعبہ پانچویں منزل پر تھا۔ وہ کمرے سے نکلنے والی تھی کہ ایک عورت جو اس سے عمر میں تین چار برس بڑی ہوگی کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر اس عورت سے بولی۔

''میری ترقی کا کیا بنا......؟ میں چھ برس سے خوار ہو رہی ہوں۔ میرے کاغذات آخر کب ملیں گے؟''

''کاغذات اس صورت میں ملیں گے کہ تم پانچ سو روپے دراز میں ڈال دو...... اور پھر تمہیں تین دن انتظار کرنا ہوں گے......؟''

''کیا......؟'' عورت کو جیسے بجلی کا سنسنا دینے والا جھٹکا لگا۔ ''کس بات کے اور کس منہ سے تم پانچ سو روپے مانگ رہی ہو......؟'' میں نوریلیا سے دور دراز کا سفر کر کے آئی ہوں...... ایک بار تین سو روپے خرچ ہوجاتے ہیں...... میں جب بھی آئی تم نے منہ کھول دیا...... میں اب تک چار ہزار روپے دے چکی ہوں...... آخر تم لوگ خط لکھ دیتے ہو...... جب آتی ہوں تو ٹرخا دیتی ہو...... میں یہاں کہاں ٹھہرتی...... یہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے...... میں ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتی...... میرے پاس صرف تین سو روپے ہیں...... ہاں...... یہ ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے ہاں ٹھہر جاؤں...... بیس برس سے تم رشوت کھا رہی ہو...... تمہارے پاس بڑی دولت اور بڑا گھر ہے......''

''شٹ اپ......'' وہ عورت بگڑ گئی۔ ''اصل بات یہ ہے کہ تمہارے کاغذات دفتر کے ایک شخص نے دبا رکھے ہیں۔ وہ پانچ سو روپے مانگ رہا ہے...... تم پانچ سو دے دو...... اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ چالیس ہزار کی رقم بھی مل جائے گی...... تمہارے سارے دلدر دور ہوجائیں گے......''

درگا کمرے سے نکلی۔ یہ شعبہ پانچویں منزل پر تھا۔ لفٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ لہٰذا اسے سیڑھیوں کے راستے جانا پڑا۔ جہاں سگریٹ کے ٹوٹے...... پان کی پیک اور گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر انگلش فلموں کے نامناسب پوسٹر جس میں اداکارائیں عریاں حالت اور جذباتی انداز میں تھیں۔

جس وقت درگا سیڑھیاں چڑھ رہی تھی تب چندرا دیوی نے دراز سے رقم نکال لی اور گنی...... وہ بیس ہزار روپے تھے...... نوریلیا سے آئی ہوئی عورت رو رہی تھی۔ چندرا دیوی نے ظاہر ہو کر کہا۔

''بہن یہ لو بیس ہزار کی رقم ہے...... ابھی اور اسی وقت جا کر اس عورت کے منہ پر دے مارو اور کہو کہ کاغذات دو...... میں تو تمہیں مزید دو سو روپے اور دوں گی...... وہ پوچھے گی کہ یہ رقم کہاں سے آئی...... کہنا کہ میری بہن لے کر آئی ہے......''

''یہ رقم......؟'' اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ''آپ کس لئے مجھے دے رہی ہیں......؟ میں تو آپ کو جانتی ہی نہیں ہوں...... یہ بہت بڑی رقم ہے...... اگر یہ قرض ہے تو میں نہیں لوں گی......''

''یہ قرض نہیں ہے آپ کی رقم ہے......'' چندرا دیوی بولی۔

''میری رقم......؟'' اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا اور آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ ''یہ کہاں سے آئی......؟''

''آپ نے اب تک ترقی کے خط کے لئے جو چکر لگائے اور خرچ کیا...... یہ اس رقم کو معہ سود میں نے اس سے وصول کیا ہے۔'' چندرا دیوی بولی۔ ''اس دفتر میں رشوت کا کاروبار زوروں پر ہے۔ ساری رشوت اس عورت کی میز کی دراز میں جمع ہوتی ہے اور شام کے وقت عملہ آپس میں بانٹ لیتا ہے...... جو بھی رشوت لے کر کام کرتا ہے۔ ایک چٹ کے ساتھ اس عورت کے کمرے میں بھیج دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے پاس رقم جمع کرادے۔''

''یہ افسر بہت بڑی رشوت خور ہے...... میں نے اپنی زندگی میں ایسی خبیث اور لالچی عورت نہیں دیکھی......'' وہ عورت تلخی سے کہنے لگی۔ ''میں بتا نہیں سکتی کہ اس چڑیل کو دولت کی کتنی ہوس ہے...... وہ دولت

کے لئے نہ صرف اپنا دھرم بلکہ اپنی جوان بیٹیوں کو بھی فروخت کردے گی...... آپ نے کس طرح سے یہ رقم اس چڑیل سے وصول کرلی؟''

''بات یہ ہے کہ میں اینٹی کرپشن کی انسپکٹر ہوں...... میں یہاں اس سے پوچھ گچھ کے لئے آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اپنی خیر چاہتی ہو تو اس عورت کی فائل دے دو...... اس فائل میں تمام فارم ہونے چاہئیں...... اگر ایک فارم بھی کم ہوا تو تمہاری خیر نہ ہوگی...... تم مجھے بیس ہزار روپے دے دو...... ورنہ ابھی گرفتار کروادوں گی۔ اس نے فوراً ہی بیس ہزار کی رقم دے دی۔'' چندرا دیوی نے کہا۔

''لیکن کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا......؟ نہ میں نے آپ کو دیکھا تھا......؟ آپ نے گفتگو کیسے سن لی......؟''

''میں نے اس وقت دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا...... آپ دونوں کی گفتگو سن کر دہلیز پر رک گئی۔ آپ دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ اس لئے آپ دیکھ نہ سکیں...... لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ آپ اندر جائیں...... رقم دے کر فائل لے لیں۔'' چندرا دیوی بولی۔

جب وہ عورت اندر داخل ہوئی تو اس افسر عورت نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ''تم کیوں آئی......؟''

''یہ لو تین سو روپے...... لیکن فائل مجھے ابھی اور اسی وقت چاہئے...... ابھی فائل مل گئی تو تمہیں مٹھائی کے دو سو روپے اور دوں گی......؟''

''تم نے چند لمحوں میں رقم کا کیسے بندوبست کرلیا......؟'' وہ تحیر زدہ ہو کر اٹھی۔ اس نے عورت سے رقم دراز میں ڈالنے کے لئے کہا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ اس کے تمام خانوں میں فائلیں بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھیں پھر اس نے دس فائلوں کا بنڈل نکالا۔ اس میں سب سے اوپر اس عورت کی فائل رکھی تھی۔ اس نے وہ فائل نکالی۔ بنڈل الماری میں رکھ کر بند کردی۔

''تمہاری قسمت اچھی تھی جو تمہاری فائل سب سے اوپر رکھی تھی۔'' اس کمینی عورت نے اس عورت کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے چیک کرلو...... اس میں کوئی کاغذ یا فارم تو غائب نہیں ہے......؟''

اس عورت نے فائل کھول کر اس کا مطالعہ کیا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور بولی۔

''میری قسمت کی بات نہیں بلکہ رشوت کے جادو کے باعث یہ فائل مل گئی...... تم نے مجھے بہت ڈرایا اور خوار کیا...... خرچ کروایا...... جو ذہنی اذیت پہنچائی میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی...... میں زندگی کی آخری سانس تک بددعا دیتی رہوں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ باہر آئی...... تاکہ چندرا دیوی کا شکریہ ادا کرسکے۔ لیکن چندرا دیوی وہاں نہیں تھی...... اس نے بہت تلاش کیا۔ وہ اس کی محسن اور دیالو تھی۔ اس کے کارن اس نے آخر اپنی منزل پالی تھی۔ وہ اسے دل میں دعائیں دیتی اور روتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

درگا اس شخص کے پاس پہنچی جس سے اسے فارم لینا تھا۔ وہ خاصا فکر مند تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

''شریمتی جی...... آپ پھر کل سہ پہر کے وقت زحمت کریں...... کیوں کہ ہمارے پاس فارم ختم ہوگئے ہیں۔ کل تک نئے فارم چھپ کر آجائیں گے۔'' ''میں صرف اس کام کے لئے پال کیلے سے آئی ہوں......'' اس نے احتجاج کیا۔

معاً اس کی نگاہ میز پر پڑی۔ وہی پرانا حربہ...... اس شخص کی میز کی دراز قدرے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے نوٹ جھانک رہے تھے۔ اس کے پرس میں سو اور پچاس کے نوٹ تھے۔ اگر اسے چندرا دیوی نہ ملتی تو بھگوان جانے کتنی رقم خرچ ہوتی...... اور اسے کتنی تکلیف ہوتی...... اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر خود کو نصیحت کی اور سمجھایا کہ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ اس نے پچاس کا نوٹ دراز میں ڈال دیا۔

پلیز!...... میری خاطر زحمت کر کے فارم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ ایک فارم کی تو بات ہے شاید ادھر ادھر پڑا ہوا مل جائے...... مجھے بہت جلدی ہے...... میں نے آپ کا خیال کیا...... آپ ذرا میرا بھی خیال کرلیں۔"

اس شخص نے مسکراتے ہوئے دراز بند کی...... میز کے پیچھے ایک زنگ آلود الماری جو تھی اس کے پاس گیا۔ اسے فارم کی تلاش میں لحہ بھر لگا۔ پھر اس نے فارم نکال کر بڑھا دیا۔

درگا نے فارم کے مندرجات کا مطالعہ کیا۔ جو ایک شناختی سوال نامہ تھا...... شاید خفیہ ایجنسیوں کے کچھ لوگ دوبارہ سرکاری ملازمین کی سیاسی سابقہ وابستگیوں کی جانچ پڑتال کررہے تھے۔ حالاں کہ ہر دفتر میں پہلے ہی حکومت کا ایک خفیہ ایجنٹ یا مخبران کے نئے ٹائپسٹ کی طرح تھے۔ حکومت تامل ناڈو کی تنظیم کے کسی فرد کو پسند نہیں کرتی تھی۔

اس نے جلدی جلدی فارم پر کیا۔ بیرون ملک سفر کے خانے کو دیکھ کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کرسکی۔ کتنے سرکاری ملازمین اپنی زندگی میں بیرون ملک گئے ہوں گے...... وہ تو کبھی سری لنکا کے جزیروں پر بھی نہیں گئی ہوگی۔ وہ لوگ شاید اس فارم میں مہیا کردہ معلومات کو کمپیوٹر میں محفوظ کرلیں گے...... بھگوان جانے اس کے بعد کیا ہوگا۔

اپنے تعلیمی کوائف...... ملازمت شروع کرنے کی اور اس قسم کی دوسری دستاویزات پر نظر دوڑاتے درگا نے اس حقیقت پر غور کیا کہ اس نے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کسی بڑے عہدے کی خواہش نہیں کی تھی...... حالاں کہ خواتین نہ صرف بیدرد ڈائریکٹرز بلکہ نائب وزیر تک کے عہدوں پر فائز تھیں۔ وہ اپنی حالت پر افسوس کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ اور اس کا شوہر اپنے حدود سے آگاہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں اپنی حالت سنوارنے کے لئے کیا کیا قربانیاں دینی پڑیں گی۔ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ ان کے پاس اپنا گھر تھا اور وہ پرسکون نیند سوسکتے تھے۔ انہیں ایسے ڈراؤنے خواب بھی تنگ نہیں کرتے تھے۔ جنہیں وہ غلط کاریاں جنم دیتی ہیں جو انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے کرنا پڑتیں۔

وہ انتظامی شعبے کے چیف کے پاس گئی۔ اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ اس نے فارم صحیح طور پر کیا ہے...... مگر اسے اس کی کیا پڑی تھی۔ فارم میں کوئی غلطی پکڑنے میں انہیں کچھ وقت لگتا اور اس کے پاس جواب یہ تھا کہ وہ اپنی ترقی کے سلسلے میں دو دن سے ماری ماری پھر رہی تھی اور اسے ابھی تک ایک بھی تصدیق شدہ تحریر نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی انتظامی شعبے کا چیف نریندرا اپنے دفتر میں موجود تھا۔ وہ تقریباً آٹھ برس قبل ایک تعلیمی سیمینار میں مل چکے تھے اور درگا کو اس کا گنجا سر طوطے جیسی ناک اور پتلے ہونٹ یاد تھے۔ نریندرا ایک ایمان دار ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا اور اب درگا کو اس بات کی صداقت کا پتا لگانا تھا۔

اس کی باری آئی وہ باہر پڑی ہوئی بنچ سے اٹھ کر اندر گئی۔ نریندرا کی میز کے قریب گئی۔ اس کے عقب میں دیوار میں ملک کے صدر اور اس کی بیوی کی تصویر آویزاں تھی۔

"جی آپ کا کیا مسئلہ ہے......؟" اس نے سوالیہ نظروں سے درگا کو دیکھا۔

"میری ترقی سر......!" درگا نے جواب دیا۔

"یہ پانچ برس زیر التوا ہے۔" درگا نے کاغذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ چیف نریندرا نے تجربہ نگاہوں سے اس فارم کا معائنہ کیا۔

"مسز درگا جوشی......! یہاں تو سب کچھ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو طریقہ کار معلوم ہے۔ میری تصدیق کے بعد شعبہ مالیات میں یہ پتا کرنا کیا فنڈز دستیاب ہیں......؟ اگر نقد فنڈز دستیاب ہیں پھر وزیر اس پر دستخط کردے گا اور آپ کی تنخواہ میں سال کے پہلے مہینے سے تین ہزار کا اضافہ ہوجائے گا......" وہ دوبارہ فارم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے دوسرے صفحے پر عجلت سے لکھا تھا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ بہت عرصے سے ملازمت کررہی ہیں اور مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ افسر شاہی کو ایک انچ بھی ہلانے میں ان کے ساتھ صبر و تحمل سے پیش آنا چاہیے۔"

اب وہ کمرے میں اکیلے تھے۔ "کیا یہ کافی ہے سر!"

"کیوں کیا کچھ اور بھی جو میں بھول گیا ہوں......"

اپنی بدحواسی میں درگا اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا چیف نریندرا اچھا آدمی ہے۔ اور سوچا کہ وہ اسے گیبرڈین کا دوسرا پیس دیدیے جو اس نے اپنے پتی کے لئے خریدا تھا تو وہ کیا محسوس کرے گا......؟ آخر اس نے اس کی پانچ برس کے پہلے مہینے نے اضافہ کیا تھا اور اس کے احکامات جاری کردیئے تھے۔

باہر چندرا دیوی اس کے انتظار میں تھی۔ ان دونوں نے دوپہر کا کھانا وزارت کی کینٹین میں کھایا تھا۔ اس نے چندرا دیوی چیف سے ملاقات کا احوال بتایا۔ ڈیڑھ بجے وہ دونوں شعبہ مالیات میں تھیں۔ لیکن چندرا دیوی باہر ہی رہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں میزوں پر خوش گپیوں میں مصروف تھیں...... کچھ اخبار پڑھ رہی تھیں...... کچھ خلا میں فکری مندی سے گھور رہی تھیں۔ یہ بڑا ہی مانوس منظر تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ واپس اپنے دفتر کے ماحول میں آگئی ہو۔ چیف کے دفتر سے معلوم ہوا کہ وہ واپس نہیں آرہا ہے۔ وہ وزیر کے ساتھ بجٹ پر ہونے والی میٹنگ میں شرکت کے لئے وزیراعظم ہاؤس گیا ہوا ہے۔

اسے ٹھہرنے اور انتظار کرنے میں کوئی تکلیف نظر نہ آئی۔ چندرا دیوی نے اس کو فلم گائی تیک یہ انگریزی فلم بڑی مقبول تھی۔ شہر کے سب سے مہنگے ترین سینما ہال میں چل رہی تھی۔ جس کا کم از کم ٹکٹ دو سو روپے کا تھا۔ چندرا دیوی نے سب سے مہنگے ترین درجے کا ٹکٹ لیا۔ اس سینما ہاؤس میں اس کی فلم دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ اتنا خوب صورت اور شاندار سینما ہال پورے ملک میں ایک ہی تھا۔ پانچ برس کے بعد اس نے یہ فلم دیکھی تھی۔ جو بڑا المیہ تھی۔

اگلی صبح نو بج کے دس منٹ کے بعد درگا شعبہ مالیات میں موجود تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ بہت ہی خوب صورت اور نوجوان لڑکیاں ملازم ہیں۔ بھڑکیلے اور نیچی تراش کے لباس جو بہ ظاہر کچھ بھی نہیں کرتیں...... ساڑھے نو بجے چیف وشوا ناتھ آگیا۔ وہ بادامی رنگ کے گیبرڈین سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا شمار بااثر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ درگا نے شیشے کی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ چکا ہے۔ اندر چلی گئی۔ شعبہ مالیات کا چیف وشوا ناتھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ اور پاکٹ سائز کلکولیٹر پر حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس نے درگا کو دیکھا اس کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں اس کے موٹے اور بھدے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ آئی۔

"جی......"

درگا نے کم سے کم الفاظ میں اپنا مدعا بیان کیا لیکن وہ یہ بتانا نہیں بھولی کہ وہ صرف اس کام کے لئے پال کیلے سے چھٹی لے کر آئی ہے۔

"آپ اپنے کاغذات چھوڑ جائیں۔" اس نے بہ دستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ذرا جلدی میں ہوں...... آج سیکریٹریٹ میں میٹنگ ہے سارا دن میں نہیں آؤں گا۔ آپ شام کو پانچ بجے دوبارہ آ کر مل سکتی ہیں۔" اس نے دو مرتبہ سر کو جنبش دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ جاسکتی ہے۔

درگا کے پاس پورا دن فارغ تھا...... اب وہ نئی ہندوستانی فلم دیکھنا چاہتی تھی۔ ہندوستانی فلمیں ذہنی سکون بخشتی تھیں۔ اس میں بولڈ مناظر تھے۔ بہرحال وہ اپنے کچھ دوسرے ساتھی ملازمین سے خوش قسمت تھی جو ایک ہفتے تک انتظامی شعبے سے کاغذات کی تصدیق بھی نہ کراسکے۔ اس کے علاوہ دوسری وزارتوں میں اس سے بھی برا حال تھا۔ مثال کے طور پر اس کی ایک شناسا انسان کو صرف اپنا تبادلہ کرانے کے لئے دو ہزار روپے دینے پڑے تھے...... اور چندرا دیوی مسیحا تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ ابھی عمارت کے بیرونی دروازے تک پہنچی تھی کہ بوندا باندی شروع ہوگئی۔ اس نے وزارت منصوبہ بندی وتعلیم...... جہاں اس کے کچھ دوست ملازم تھے فلم دیکھنے جانے کے بجائے عمارت ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کرلیا۔

تین بجے درگا دفتر سے ملحقہ انتظار میں چندرا دیوی کے ساتھ جا بیٹھی۔ اس کے اپنے دفتر میں پرانی وضع کے ٹائپ رائٹر تھے۔ پونے پانچ بجے چیف وشوا ناتھ واپس آ گیا۔ اس کا قیمتی چرمی بریف کیس کاغذات سے بھرا ہوا تھا۔ چیف نے اس سے کہا کہ آج رات چائنیز ریسٹورنٹ میں اسے ڈنر کھلائے ۔ وہاں صرف پانچ سو خرچ آئے گا۔

وہ رات آٹھ بجے چندرا دیوی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ پر پہنچی۔ اس سے کہا کہ وہ اکیلی چلی جائے۔ ڈنر کے بعد چیف نے اس سے کہا۔

''آج کی رات ہم دونوں ایک کمرے میں بند ہوجائیں گے...... صرف ہزار روپے کی بات ہے۔''

''سر! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک غریب کلرک ہوں...... میرے پاس اب صرف پانچ سو روپے بچے ہیں۔''

چیف نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دبایا۔ ''تم چنتا نہ کرو۔ کسی ہوٹل میں چلیں گے...... وہاں کرایہ صرف پانچ سو ہوگا۔''

درگا نے جو کچھ سنا ہوا تھا وہ اس پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اسے یاد آیا...... مشہور تھا کہ شعبہ مالیات کا چیف عورتوں کا رسیا ہے اور اکثر اس صورت میں رشوت وصول کرتا ہے...... ایسا نہیں ہوسکتا...... ایسا نہیں ہوسکتا...... میرا انکار ضروری ہے...... اس نے خود سے کہا۔ بے چینی اور خوف سے اس کا دل گھٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے لئے صرف نیوڈلز منگوائیں جو سب سے سستی چیز تھی۔

''سر...... ! میرے تین بچے ہیں۔'' درگا قریب قریب رو دی۔ ''میرا سب سے بڑا بچہ شادی شدہ ہے اور میرا ایک پوتا بھی ہے۔''

''یہ تو حیرت انگیز بات ہے کہ تم اتنی عمر کی نہیں لگتیں...... دوشیزہ معلوم ہوتی ہو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔'' اس نے بھوکی نظروں سے اس کے جسمانی نشیب وفراز کو دیکھا۔

چیف نے وہسکی منگوائی درگا کا گلا خشک ہوچکا تھا۔ اس کا مستقبل داؤ پر تھا۔ ہر حال میں اس شیطان کو خوش کرنا تھا۔ کوئی حربہ عزت بچانے کا نہیں رہا تھا۔ نہ ہی فرار کی کوئی راہ رہی تھی۔ اس کے آگے مزاحمت بیکار تھی۔

اس نے دو گلاسوں میں وہسکی بھری اور ایک گلاس درگا کی طرف بڑھایا۔ ''لو پی لو......''

''میں نے کبھی وہسکی نہیں پی سر!'' وہ بولی۔

چیف نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کردیا۔ پھر اس سے بولا۔ ''واش روم میں جا کر...... نہا کر آجاؤ۔''

وہ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ چیف بستر پر بے لباس پڑا تھا۔ اس کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔ گہری نیند میں غرق تھا۔ درگا واش روم میں گئی۔ کپڑے پہن کر آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

چیف کوئی دو گھنٹے بعد بیدار ہوا...... پھر اس نے کہا۔ ''درگا...... ! تم نے مجھے جس فیاضی سے خوش کیا...... میں اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتا...... تم نے اتنی جلدی لباس بھی پہن لیا...... کوئی بات نہیں...... چلو اب چلتے ہیں......'' وہ بستر سے اتر کر کپڑے پہننے لگا۔ ''میں نے اب تک ایسا بدن کسی عورت اور لڑکی کا نہیں دیکھا......''

درگا سمجھ گئی کہ وہسکی نے اس پر اثر کیا...... نشے کی حالت میں اس نے جو سپنا دیکھا وہ اسے حقیقت سمجھ بیٹھا...... وہ دل میں خوش تھی کہ اس سپنے کے کارن اس کی عزت ایک بھیڑیے کے ہاتھوں بچ گئی۔ اس کا مستقبل بھی داؤ پر نہیں لگا۔

چیف نے اسے ہوٹل سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر اتارا تو وہ پیدل پہنچی۔ اس نے کمرے کے دروازے کا ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ چندرا دیوی نے اندر سے بند نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا چندرا دیوی کو اعتماد میں لے کر بتا دے کہ اس کی عزت کیسے بچ گئی۔ اس نے واقعہ کے بارے میں بتانے سے خاموش رہنا۔ چندرا دیوی اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی......؟

صبح نو بجے وہ چندرا دیوی کے ساتھ دفتر پہنچی۔ رسمی کارروائی کے بعد اسے ساٹھ ہزار کی رقم بڑے نوٹوں کی شکل میں مل گئی۔ اس نے نوٹ اپنے بڑے تھیلے میں رکھ لئے۔ شام چھ بجے وہ دونوں بس سے اتریں۔ درگا نے چندرا دیوی کو اس کے ہاں دو تین دن رکنے کی دعوت دی تھی۔ وہ پال کیلے کے نواح میں رہتی تھی۔ اس کا گھر دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ اس نے تین مشکوک آدمیوں کو بس سے اترتے دیکھا تھا۔

انہوں نے کچھ راستہ طے کیا تھا کہ ان تینوں بدمعاشوں نے جو پستول اور ریوالوروں سے مسلح تھے ان دونوں کو نرغے میں لے لیا۔

''لاؤ یہ بیگ ہمارے حوالے کردو......'' ایک غرایا۔ ''ورنہ تم دونوں کو شوٹ کردوں گا۔''

''اس بیگ میں ضروری کاغذات ہیں۔'' درگا نے کہا۔ ''صرف سو روپے پڑے ہیں۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' دوسرے نے چاقو لہرایا۔ ''رقم میں نے خود گن کر تمہیں دی تھی......''

درگا نے اسے پہچان لیا...... چندرا دیوی اس سے بولی۔ ''تم بیگ اسے دے دو...... یہ زندگی اور مستقبل سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔''

''لیکن...... لیکن......'' وہ ہکلائی۔

''تم میری بات مانو...... ذرا تماشا دیکھو......'' چندرا دیوی نے سرگوشی کی۔

''قدرے تذبذب سے اس نے رقم والا بیگ پستول والے بدمعاش کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بیگ لے کر اس کی زپ کھولی۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ اس نے بیگ میں ہاتھ ڈالا تا کہ گڈیاں نکالیں۔ اسے ایسا لگا جیسے بچھوؤں نے ڈنک مارا ہو۔ اس نے ایک چیخ مار کر ہاتھ باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ سے خون رس رہا تھا۔ اس نے پرس زمین پر پھینک دیا تو اس میں سے بہت سارے بچھو اور سانپ نکل آئے۔ وہ تینوں بدمعاشوں کی طرف بڑھے۔ پستول والے نے انہیں نشانہ بنانا چاہا تو اس کے ہاتھ

انسان! جانوروں کی نظر میں......!

☆ انسان کو اکثر میرے نام کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ (شیر)

☆ انسان ایک بے لگام جانور ہے۔ (گھوڑا)

☆ جہاں بے رحمی کی حد ہوتی ہے، وہیں سے انسان کا ظلم شروع ہوتا ہے۔ (گدھا)

☆ انسان ایک دوسرے کو اشاروں پر نچانے والا مداری ہے۔ (ریچھ)

☆ انسان کا دل ہرنی جیسا اور خیالات شکاریوں جیسے ہوتے ہیں۔ (چیتا)

☆ انسان گندگی تو خود پھیلاتا ہے اور نفرت ہم سے کرتا ہے۔ (مکھی)

☆ انسان عیاری میں میرا بھی باپ نکلا۔ (لومڑی)

☆ انسان کے قد سے اونچا اس کی زبان کا قد ہوتا ہے۔ (زرافہ)

☆ بھلا ہو ڈارون کا جس کے مطابق ہم پہلے انسان تھے...... اور رشتے داروں کے خلاف بولنا ٹھیک نہیں۔ (بندر)

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں پستول کی جگہ ایک سانپ تھا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بھاگا تو اس کے ساتھی بھی بھاگ لیے۔

ان کی نظروں سے بدمعاشوں کے اوجھل ہوتے ہی سانپ اور بچھو نوٹوں کی گڈیوں میں تبدیل ہو گئے۔ چندرا دیوی نے اس کے پرس میں نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر ڈال دیں اور اس کا منہ بند کر کے اسے لوٹا دیا۔

پھر وہ چندرا دیوی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ دیر بعد بولی۔

"آپ کی وجہ سے میں دو مرتبہ بدمعاشوں سے بچ گئی...... آپ نہ ملتیں تو بھگوان جانے کیا ہوتا......؟"

اس نے اپنے آنسو ساڑی کے پلو میں جذب کیے۔ پھر وہ جھک کر اس کے چرن چھونے لگی تو چندرا دیوی نے جھک کر شانے پکڑ کر اسے اٹھایا۔

"یہ آپ کیا کر رہی ہیں......؟"

"میں اپنی دیوی کے قدم چھونا چاہتی ہوں...... رات میں آپ کے کارن ہوٹل میں میری عزت بچ گئی۔"

"وہ کیسے......؟" چندرا دیوی نے انجان ہو کر کہا۔

"آپ بھی ہوٹل کے اس کمرے میں آ گئی تھیں جس میں مجھے چیف میری عزت سے کھیلنے کے لئے گیا تھا...... آپ غائب حالت میں موجود تھیں...... آپ نے اس پر جادو کیا تو وہ گہری نیند میں سو گیا۔ سپنے میں اس نے میرے ساتھ وقت گزاری کی...... بیدار ہوا تو وہ یہ سمجھا کہ یہ سپنا نہیں حقیقت تھی...... اب میں نے جان لیا کہ آپ جادوگرنی ہیں...... کیا آپ کو اس سے انکار ہے......؟"

"درگا......! آپ بہت ذہین اور ہوشیار ہیں......" چندرا دیوی بولی۔ "لیکن یہ بات کسی کو نہ بتائیں......"

"آپ نے کولمبو میں اور یہاں بدمعاشوں کو جو سبق دیا وہ بھی آپ کے جادو کا ہی کمال تھا۔" درگا نے کہا۔

"چلو...... گھر چلو...... بچے اور تمہارا شوہر بے چینی سے تمہارے منتظر ہیں......"

جب درگا گھر پہنچی تو اس کے شوہر اور بچوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ چندرا دیوی کو حیرت سے دیکھا۔

"یہ میری محسن ہیں......" درگا نے شوہر اور بچوں کو بتایا۔ "میں بعد میں بتاؤں گی کہ انہوں نے مجھ پر کیا احسانات کیے ہیں۔"

دوسرے دن صبح دس بجے چندرا دیوی...... درگا اور اس کا شوہر چالیس ہزار کی رقم لے کر سود خور رنگا سوامی کے ہاں پہنچے تاکہ رہن رکھی ہوئی چیزیں اور جائیداد کے کاغذات واپس لے لیں۔ چالیس ہزار کی رقم کی ادائیگی کر کے......"

رنگا سوامی صاف مکر گیا۔ "اب میں کوئی چیز نہیں دے سکتا...... اس لئے کہ مدت گزر چکی ہے۔"

"کیا کہا......؟" جوشی کو غصہ آ گیا...... "جائیداد تین لاکھ...... زیورات دو لاکھ...... قیمتی اشیا ایک لاکھ کی ہیں...... تم چالیس ہزار میں ہڑپ کرنا چاہتے ہو...... یہ تمہارے باپ کا مال نہیں ہے......"

"ہاں میرے باپ کا مال ہے...... جو کر سکتے ہو کر لو...... نکل جاؤ یہاں سے......" رنگا سوامی اڑ گیا۔

"چلیے...... ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔" چندرا دیوی بولی۔

پھر وہ میاں بیوی کو سمجھا بجھا کر بولی۔ "ہمارے پاس قانونی راستہ ہے......"

"رنگا سوامی...... ایک حرام زادہ ہے...... وہ اب تک سینکڑوں لوگوں کا مال بغیر ڈکار لیے ہضم کر چکا ہے۔ ہر کسی کی آہ لیتا رہتا ہے...... کسی دن یہ آہ تمہیں لگ جائے گی......" درگا بولی۔

"یہ ڈکیتی کے خوف سے سارا رہن کا مال اور کاغذات بینک لاکرز میں رکھتا ہے۔" واپسی میں جوشی نے بتایا۔ "اس نے تین الگ الگ بینکوں میں لاکرز لے رکھے ہیں...... ایک بینک کے لاکرز میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں...... اور گھر میں جو تجوری ہے وہ بھی نوٹوں اور رہن رکھے زیورات سے بھری ہوئی ہے...... یہ بیس برس سے یہاں کے لوگوں کا کھٹمل کی طرح خون چوس رہا ہے......"

رات دس بجے چندرا دیوی نے درگا اور اس کے شوہر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ...... بستر پر نوٹوں کا ڈھیر کاغذات...... زیورات اور بہت ساری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔

"یہ کیا ہے......؟" جوشی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ سب ان لوگوں کا مال ہے جو کسی مجبوری کی بنا پر رنگا سوامی کے پاس سود پر قرض لیتے رہے......" چندرا دیوی بولی۔ "آپ اس میں سے اپنے کاغذات، زیورات اور قیمتی اشیاء نکال لیں...... اور وہ رقم بھی جو اب تک سود کی مد میں ادا کی گئی...... پھر آپ متاثرہ لوگوں کو ان کی امانتیں اور کاغذات لوٹا دیں...... اور ان سے کہنا کہ اپنی زبانیں بند رکھیں......"

"اگر یہ بات چھپی نہ رہ سکی تو کیا چوری کا الزام نہیں آئے گا......؟" جوشی نے کہا۔

"نہیں......" چندرا دیوی بولی۔ "اس لئے کہ یہ سارا مال بینکوں کے لاکرز میں تھا...... اس کی تجوری میں بھی...... بینک یہی کہے گی کہ ہم کو کیا معلوم...... لاکرز تو صحیح سلامت ہیں...... متاثرہ لوگوں کے خلاف اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوگا......"

"لیکن...... یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا......؟" جوشی نے حیرت سے کہا۔

"جادو سے......" درگا بولی۔ "آپ ہندوستان کی بہت بڑی جادوگرنی ہیں...... سری لنکا کے دورے اور سیاحت پر آئی ہوئی ہیں۔"

"آپ کے اس جادو نے ہم سب اور متاثرہ لوگوں پر جو احسان کیا ہم کبھی بھول نہ سکیں گے......" جوشی نے ممنونیت سے کہا۔

"پتا جی...... پتا جی......" کمرے کے باہر سے اس کے لڑکے نے کہا۔ "رنگا سوامی کے مکان میں آگ لگی ہے......"

ان لوگوں نے باہر آ کر دیکھا۔ اس کا مکان شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ رنگا سوامی باہر کھڑا مدد کے لئے چیخ رہا تھا۔ کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں بڑھا۔

کل بیالیس متاثرہ لوگ تھے۔ دوسرے دن ان سب کو ان کے سود کی رقم، کاغذات، اور رہن کی چیزیں دے دی گئیں۔ وہ خوش خوش ہنستے ہوئے گئے تھے...... رنگا سوامی ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔

دوسرے دن درگا...... چندرا دیوی کے کمرے میں ناشتے کے لئے بلانے گئی تو وہ موجود نہیں تھی۔

☆......☆......☆

چندرا دیوی خونی مجسمے کی تلاش میں تھی۔ وہ اس قدر خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ چندرا دیوی سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے اور چندرا دیوی کو ختم کرنے کے لئے روپ بہروپ بدلنے پر مجبور تھا۔ اس لئے مجسمہ کو تلاش کرنے اور اس کی شناخت میں اس لئے بھی سخت دشواری اور دقت پیش آ رہی تھی کہ وہ کسی ایک شہر اور علاقے میں نہیں ہوتا تھا۔ چندرا دیوی ناقابل تسخیر تھی۔ اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا تھا۔

کینڈی کے علاقے کی سب سے حسین لڑکی نروپا کی شادی تھی۔ اس کے حسن اور معصومیت کا چرچا دور دور تک تھا۔ اس سے شادی کرنے کے لئے بہت سارے امیدوار تھے۔ قرعہ فال ایک لڑکے گوپال بندرانیکے کے نام نکلا جو ایک شریف لڑکا تھا۔ پانچ بہنوں کا بھائی تھا۔ ابھرتا ہوا کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ آل راؤنڈر تھا۔ فرسٹ کلاس میچز میں اس کی اعلیٰ کارکردگی نمایاں رہی تھی اور اسے جلد ہی ٹیسٹ کیپ ملنے والی تھی۔ وہ وزارت ڈاک و تار میں کلرک تھا۔ اس کی قیمت کیسے جاگی......؟ نروپا سے شادی کرنے والے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

امیدواروں میں بڑے گھرانوں کے لڑکے تھے...... وہ اسے بہورانی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ نروپا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ والدین کا عام گھرانے سے تعلق تھا۔ والدین نے بیٹی کو اس بات کا اختیار دے دیا تھا کہ جیون ساتھی کا انتخاب وہ اپنی مرضی اور خوشی سے کرے۔

ہر سال...... سری لنکا کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا۔ اس میں سری لنکا کے نامور، تجربہ کار اور ٹیسٹ کھلاڑی بھی حصہ لیتے تھے۔ اس سال بھی یہ ٹورنامنٹ حسب دستور پال کیلے اسٹیڈیم میں ہوا۔ کینڈی کی ٹیم فائنل میں پہنچ گئی۔ یہ ون ڈے میچز ہوتے تھے۔ گوپال بندرانیکے نے مرن چند کے ایک اوور میں مسلسل سات چھکے مارے۔ سات چھکے اس لئے کہ اس میں ایک نوبال بھی تھی...... اس نے اپنے ایک اوور میں ہیڈ ٹرک بھی کی تھی۔ اس ہیڈ ٹرک میں اس نے بڑے بڑے کھلاڑیوں کو کلین بولڈ کیا تھا...... اس نے ایک سو دس رن بھی بنائے تھے۔ اس کی اعلیٰ پرفارمنس نے تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا۔ گوپال نہ صرف مین آف دی میچ قرار دیا گیا بلکہ اس پر انعامات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ اس کے علاوہ اسے کئی نجی کمپنیوں کی طرف سے ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ وہ اپنی قومی ایئر لائن میں ملازم ہوگیا۔

گوپال خوب صورت تو نہ تھا لیکن وجیہہ تھا۔ اس کے خوب صورت کھیل پر لڑکیاں مرمٹی تھیں۔ ان میں نروپا رائے بھی تھی۔ گوپال کے والدین اپنے بیٹے کا رشتہ نروپا کے لئے لے گئے تو نروپا نے ہاں کردی...... اس کی شادی بڑے روایتی انداز اور دھوم دھام سے ہوگئی۔ جب وہ رخصت ہو کر پالکی میں جارہی تھی۔ گوپال گھوڑے پر سوار تھا۔ چندرا دیوی نے بھی اس شادی میں شرکت کی تھی...... نروپا کو ایک سونے کا لاکٹ تحفہ میں دیا تھا۔ نروپا کے والدین کو جب بتایا کہ وہ ہندوستان سے سری لنکا سیر وسیاحت کے لئے آئی ہوئی ہے۔ اس نے شادی کی تقریب اور دلہن کو دیکھا تو وہ بن بلائے آگئی۔ نروپا اور اس کے والدین بہت خوش ہوئے۔ چندرا دیوی کو نروپا کے حسن اور معصومیت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ رخصتی کے بعد وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔

براتیوں نے نصف راستہ طے کیا ہوگا کہ اس نے برات اور دلہن کو دیکھا۔ دلہن کے دیکھتے ہی اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گوپال کے روپ بہروپ میں دلہا بنا گھوڑے پر سوار تھا۔ گوپال ایک ویرانے میں بے ہوش پڑا تھا۔

مجسمہ نروپا کو اغوا کر کے لے جانا نہیں چاہتا تھا وہ گوپال بن کر تین دن تک عیش کرنا چاہتا تھا...... بہت دیر تک ملاقاتی رسمیں ہوتی رہیں...... والدین اور بہنوں نے نروپا کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

جب رسومات سے فارغ ہو کر مجسمہ حجلہ عروسی میں داخل ہوا تو نروپا مسہری پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ سرخ جوڑے میں...... اسے خوشی اور لباس نے اور نکھار دیا تھا۔

اس نے کمرے کے باہر چاپیں سن کر لمبا سا گھونگھٹ نکال لیا اور اس کا دل ان جانے خیالات اور سپنوں سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجسمہ نے اندر داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کیا اور فاتحانہ انداز سے مسہری کی طرف بڑھا۔

''میری جان نروپا......!'' وہ اس کے سامنے جا بیٹھا تو نروپا اور سکڑ کر سمٹ گئی تھی۔

''اپنا گھونگھٹ الٹ کر یہ چاند سا مکھڑا تو دکھا دو......'' وہ بولا۔

''پہلے منہ دکھائی دو......'' نروپا کسمائی۔ اس کے خوب صورت مہندی لگے ہاتھ ساڑی کی سلوٹوں میں گم تھے۔

''میری جان......! منہ دکھائی تو میں خود ہوں......'' مجسمہ بولا۔

''دنیا میں مجھے تم سے زیادہ عزیز کوئی نہیں ہے۔'' نروپا نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک دستور ہے...... دلہن کو منہ دکھائی میں کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے...... وہ کتنی ہی معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ چیز زندگی کی یادگار ہوتی ہے۔''

''سنو...... رات گزارنے کے بعد میں صبح تمہیں ایک ہیرے کی جڑاؤ انگوٹھی دوں گا...... یہ میرا وچن ہے...... دراصل میں تمہیں پا کر اتنا خوش ہوا تھا کہ مجھے منہ دکھائی کا تحفہ دینے کا خیال نہیں رہا......''

''تم جب تک منہ دکھائی نہ دوگے اس وقت تک نہ تو گھونگھٹ الٹوں گی اور نہ ہی قریب آنے دوں گی۔''

مجسمہ کو خیال آیا کہ شاید منہ دکھائی کی انگوٹھی گوپال کی جیب میں ہوگی...... اس نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔ میری جان...... بس...... دس منٹ میں انگوٹھی لے کر آتا ہوں۔''

وہ غائب ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں گوپال بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی جیب میں انگوٹھی کی ڈبیا موجود تھی۔ وہ انگوٹھی لے کر حجلہ عروسی میں آ گیا۔ نروپا بدستور سکڑی سمٹی رنگین گٹھری بنی بیٹھی تھی۔

''اچھا اپنا ہاتھ بڑھاؤ......'' وہ بولا۔ ''میں انگوٹھی لے آیا ہوں۔''

نروپا نے اپنا خوب صورت، مرمریں اور سڈول ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ایک مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی۔

''اچھا...... اب تو اپنا گھونگھٹ الٹ دو......'' اس نے کہا۔

''آپ الٹیں گے......'' وہ شرما اور لجا کر بولی۔

مجسمہ نے جیسے ہی اس کا رنگین گھونگھٹ الٹا اس کے منہ پر اتنے زور کا تھپڑ پڑا کہ اسے دو ہزار سال قبل کا چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ وہ فرش پر گر پڑا...... چانٹے کی جلن نے اس کے رخسار کو جھلسا دیا۔ اس نے دیکھا۔

''وہ نروپا نہیں تھی...... چندرا دیوی تھی......''

نروپا کی جگہ چندرا دیوی کو دیکھ کر مجسمہ کی سٹی گم ہوگئی۔

وہ بھونچکا سا ہوگیا...... اسے یقین نہیں آیا اور نہ ہی اس کے وہم وگمان میں تھا کہ نروپا کی جگہ چندرا دیوی ہوگی۔

وہ ساکت و جامد سکتے کی سی حالت میں بڑی حیران اور خوف زدہ نظروں سے چندرا دیوی کو دیکھ رہا تھا...... چندرا دیوی نے اس کے منہ پر جو تھپڑ رسید کیا اس کی جلن ایسی لگ رہی تھی جیسے دہکتا ہوا انگارہ ہو اور اس نے اس کا گال جھلسا دیا ہو...... اسے خوف سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اس پر کسی انسانی طاقت کا کوئی اثر ہوتا تھا نہ کسی مہلک سے مہلک ہتھیار سے نقصان پہنچایا جاسکتا تھا کیوں کہ وہ سونے کا بنا ہوا تھا۔ انسانی روپ دھار کر وہ عام انسانوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ انسانی روپ دھارنے سے گو وہ ایک گوشت پوست کا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے نہ تو زخمی کیا جاسکتا تھا۔ نہ جان سے مارا جاسکتا تھا۔ نہ ہی اسے دکھ، درد اور کسی بھی قسم کی تکلیف ہوسکتی تھی۔

لیکن معاملہ برعکس تھا۔ اس کے ایک تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کردیئے تھے۔

''ننگا رام جی......!'' چندرا دیوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ سہاگ رات کیسی ہے جس کا تم نے سپنا دیکھا تھا...... یہ کیسی بے رخی اور بے دردی ہے...... کیا دلہن سے اتنی ناراضگی...... آؤ...... میرے پاس آؤ...... میں بے قرار ہورہی ہوں...... تمہارے قرب کے لئے......''

مجسمہ کیا کہتا...... اس کے حواس معطل تھے۔ وہ تو مجسمہ بنا چندرا دیوی کو دیکھے جارہا تھا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے......

''اتنے کٹھور تو نہ بنو......؟ کیا میں کوئی بدصورت ہوں......؟ مجھ میں دلکشی اور کشش نہیں ہے...... میرا حسن اور پرشباب گداز بدن بہار نہیں دے رہا ہے......؟ میں تڑپ رہی ہوں تمہارے بازوؤں کے حصار اور محبت بھرے الفاظ کے لئے...... آؤ...... میرے سینے کو کسی پھول کی طرح بھینک نہ دو...... اس لئے کہ سہاگ کی پہلی رات عورت کو سپنا ہی نہیں سرمایہ بھی ہوتا ہے۔''

وہ چندرا کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے...... چندرا دیوی سے مقابلہ کرنا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے غائب ہونے اور فرار ہونے کی کوشش کی...... لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ اس صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ چندرا دیوی نے اس کی ساری پوشیدہ قوتوں کو سلب کر کے اسے ایک عام سا آدمی بنا دیا ہے۔

چندرا اسے یوں آسانی سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج اسے ہر قیمت پر کیفر کردار تک پہنچا کر رہے گی۔ وہ آج بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے چکمہ دیتا پھر رہا تھا۔ پرندوں اور جانوروں تک بہروپ بدل رہا تھا تاکہ چندرا دیوی کے ہتھے نہ چڑھے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چندرا دیوی سے مقابلہ کرنا اور جیتنا اس کے بس کی بات نہیں...... اس لئے بچتا بچاتا پھر رہا تھا۔

چندرا دیوی نے اس کی یادداشت کو ایک دم سے دھندلا دیا تھا۔ چند منٹ پہلے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اسے اب تھپڑ کی جلن اور تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ واقعہ بھول کر پلنگ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں چندرا دیوی نہیں نروپا کھڑی تھی۔ سرخ جوڑے میں بلا کی حسین دکھائی دے رہی تھی۔

مجسمہ کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ پلنگ سے اتنی دور فرش پر کیسے گرا ہوا ہے۔ صرف اسے اتنا یاد تھا کہ اس نے گھونگھٹ الٹا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ شاید دروازہ بند کرنے بڑھا تو لڑکھڑایا اور اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ گر پڑا تھا۔

وہ دلہن کو اس ہوش ربا حالت میں دیکھ کر اٹھا۔ چندرا دیوی کی جگہ نروپا تھی۔ وہ گوپال کے بہروپ میں تھا۔ چندرا دیوی ان کی نظروں سے غائب ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے نروپا کو اپنے زیر اثر لیا ہوا تھا تاکہ وہ گوپال کا بدلہ مجسمہ سے لے۔ مجسمہ نے گوپال کو بے ہوش کر کے ایک ویرانے میں پھینک دیا تھا۔ گوپال کا بہروپ بھر کر نروپا کے ساتھ عیش کرنے آ گیا تھا۔

نروپا نے اسے گوپال ہی سمجھا ہوا تھا۔ جب مجسمہ اس کے پاس پہنچا تو نروپا اس طرح سے چونکی جیسے اسے ہوش آیا ہو مجسمہ کو دیکھ کر......

"تم...... تم...... گوپال نہیں ہو......؟" نروپا ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہذیانی لہجے میں بولی اور اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔

"میں گوپال نہیں ہوں......؟" وہ انجان سا بن کر حیرت سے بولا۔ "پھر میں کون ہوں میری جان......!"

"تم کوئی اور ہو......" نروپا نے تیز لہجے میں کہا۔ "تم نے میرے گوپال کا بہروپ بھرا ہوا ہے......"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گوپال کا بہروپ بھر لوں......؟" مجسمہ نے کہا۔ "یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو کہ میں گوپال نہیں ہوں۔ یقین نہیں آ رہا ہے تو اپنے ہونٹوں سے اندازہ کر لو...... تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قرب سے آشنا ہیں۔"

"تمہارے جسم سے سلفر کی بو آ رہی ہے۔" نروپا بولی۔ "یہ بو کسی بدروح یا شیطان کے جسم سے پھوٹتی ہے۔"

"گویا میں کوئی بدروح ہوں میری جان نروپا......!" مجسمہ ایک زوردار قہقہہ مار کر ہنسا۔ لیکن وہ دل میں حیران تھا کہ نروپا نے یہ بات کیسے جان لی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور تمہارا واہمہ ہی ہے۔" وہ نروپا کے قریب ہونے لگا۔ "ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو...... یہ حسین اور رنگین رات تیزی سے بیت رہی ہے۔ میری آغوش میں آ جاؤ...... یہ ملن کی رات ہے۔ ارمانوں بھری رات ہے......"

"میرے قریب نہ آنا...... مجھے چھونا نہیں......" نروپا نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر تیزی سے کہا اور پوچھا۔ "یہ بتاؤ کہ میرا گوپال کہاں ہے؟"

"ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا گوپال نہیں ہوں...... ہم دونوں نے سات پھیرے کئے ہیں...... ایک دوسرے کو سویکار کیا ہے۔ ہماری یہ شادی محبت کی شادی ہے...... شادی سے پہلے کیا ہم دونوں خوب جی بھر کے من مانیاں نہیں کرتے تھے......؟"

"میں کہتی ہوں تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ......" وہ بگڑ کر بولی۔ "ورنہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا......؟" اس نے نروپا کے اور قریب ہو کر مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہاری ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دوں گی......؟" نروپا غرائی......

اس پر ہنسی کا جیسے دورہ پڑ گیا۔ پھر اس نے اپنی ہنسی روک کر نروپا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر استہزائیہ انداز سے بولا۔

"یہ پھول سے نازک ہاتھ جو چومنے کے لائق ہیں...... وہ کیا میری ہڈی پسلیاں توڑ دیں گے......؟"

"یہ اتنے نازک اور کمزور نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو......؟" وہ مجسمہ سے اپنے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

"اچھا......" اس کے لہجے میں طنز بھر گیا۔ "میں دیکھتا ہوں کہ ان خوب صورت مرمریں ہاتھوں میں کتنی شکتی ہے؟"

اس نے نروپا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرنا اور آغوش میں لینا چاہا تو نروپا نے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اس طرح سے لڑکھڑاتا ہوا گیا جیسے کوئی بے وزن سی شے ہو۔ سامنے والی دیوار سے بری طرح ٹکرایا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا نروپا کی طرف کسی آندھی طوفان کی طرح بڑھا تاکہ اسے دبوچ کر تاخت و تاراج کر دے کسی مفتوحہ علاقے کی طرح...... چندرا دیوی نے اس کی ساری پوشیدہ قوتوں کو بے اثر کر دیا۔ پھر نروپا کو شکتی کی صلاحیت دے دی۔

وہ جیسے ہی نروپا کو آغوش میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا نروپا نے اسے دونوں ہاتھوں سے کسی پہلوان کی طرح اٹھا لیا۔ اس سے نروپا کو ایسا لگا کہ یہ کوئی پلاسٹک کا گڈا ہے۔ اتنا ہلکا پھلکا کہ اسے یقین نہ آیا۔

پھر بھی اس نے فضا میں گھما کر پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔

مجسمہ کی کھوپڑی فرش پر بج اٹھی۔ اس کے سم کے انجر پنجر ڈھیلے پڑ گئے۔ ہڈیاں چیخ اٹھیں۔ درد و تکلیف کی شدت نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اسے خوف سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی تھی اس لڑکی میں اتنی شکتی کہاں سے آ گئی جس نے اسے کسی نوزائیدہ بچے کی طرح فرش پر دے مارا تھا۔ وہ چھ من وزن کا تھا۔ اور پھر اسے چوٹ کیسے آ گئی؟ اس کے دماغ کی چولیں کیسے ہل گئیں...... دھان پان اور نازک اندام سی لڑکی...... یہ کیا اسرار ہے کہ اس میں ناقابل یقین تک کی شکتی موجود ہے۔

اس نے کوشش کی اپنی پراسرار اور خفیہ صلاحیتوں اور طاقت سے کام لے...... لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان سے محروم ہو گیا ہے...... اس لمحے چندرا دیوی ظاہر ہوئی۔ چندرا دیوی کو دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سارا کھیل چندرا دیوی کا ہے...... اس نے غائب ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

"آپ چندرا دیوی......!" نروپا اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی سے بولی۔ "آپ یہاں اندر کیسے آ گئیں......؟"

"یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" چندرا دیوی نے کہا۔ "تم نے اس مردود کو خوب پہچان لیا کہ یہ گوپال نہیں ہے...... تمہارا شوہر نہیں ہے...... گوپال کا ہم شکل بن کر عیش کرنے آیا تھا...... تمہاری سچی محبت دھوکا نہ کھا سکی۔ تمہاری محبت اور عزت بچ گئی۔ آنچ آنے سے بال بال بچ گئیں...... اس سے یہ پوچھو کہ تمہارا پتی گوپال کہاں ہے؟ جب تک یہ نا بتائے اس وقت تک اسے اٹھا کر فرش پر پٹختے رہو۔"

"لیکن یہ تو بہت بھاری ہے......" نروپا حیرت سے بولی۔ "معلوم نہیں نفرت اور غصے سے میں نے اسے کیسے اٹھا لیا؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ اس عورت کے کارن......" مجسمہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "یہ جادوگرنی ہے...... اس نے تمہیں شکتی دے دی ہے جس سے تم نے مجھے اٹھا کر کسی پہلوان کی طرح پٹخ دیا۔" پھر وہ چندرا دیوی سے بولا۔ "مجھے جانے دو...... میرا جادو مجھے دے دو...... میری شکتی...... پھر میں اپنی دنیا میں چلا جاؤں گا...... مجھے شما کردو۔"

"نہیں...... ہرگز نہیں......" چندرا دیوی نے سخت لہجے میں کہا۔ "تم اس قابل نہیں ہو کہ تم اس سنسار میں رہو...... تمہارے اندر جو بدروح ہے...... شیطانیت ہے...... وہ تمہیں کبھی راہ راست پر قائم نہیں رکھے گی......؟ تم نے بڑا خون خرابا اور بدکاریاں کی ہیں۔ تم ایک ظالم اور بے رحم ہی نہیں بلکہ خون آشام بھیڑیے ہو...... تم نے دلہا دلہن پر ذرہ برابر رحم اور ترس نہیں کھایا...... جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں...... پیار کے اٹوٹ بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں...... ان کی زندگی میں ملن کی رات آئی تھی۔ ارمانوں سے بھری رات...... تم نے کیا کیا......؟ ان کی راہ میں پتھر بن گئے...... انہیں ملنے اور ایک نئی زندگی کے سفر کا آغاز کرنے نہیں دیا...... اپنے جادو کے زور سے گوپال کو جدا کرکے اسے ویرانے میں پھینک آئے اور گوپال کے ہم شکل بن گئے۔ ایک اتفاق تھا جو میں اس شادی میں شریک تھی...... اگر میں نہ ہوتی تو تم گوپال بن کر جانے کتنے دنوں تک اس سے کھلونے کی طرح کھیلتے رہتے۔ پھر گوپال کو موت کی بھینٹ چڑھا دیتے تاکہ بھانڈا نہ پھوٹ جائے......"

مجسمہ اس سے پہلے کچھ کہتا نروپا تڑپ کر بولی۔

"میرا گوپال کہاں ہے دیدی......؟"

اس خبیث سے پوچھو......" چندرا دیوی بولی۔ "یہ بتائے گا کہ گوپال کہاں اور کس حالت میں ہے......؟"

"کہاں ہے میرا پتی......؟" نروپا نے تیز لہجے میں مجسمہ سے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا...... مجھے نہیں معلوم...... مجھے کچھ یاد نہیں۔" اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

"تم اسے اٹھا کر فرش پر پٹخ دو...... اس وقت تک اٹھا اٹھا کر فرش پر پٹختے رہو جب تک گوپال کے بارے میں نہ بتا دے۔" چندرا دیوی بولی۔ "یہ کمینہ بن رہا ہے۔ ضد میں آگیا ہے...... ہٹ دھرمی دکھا رہا ہے۔"

"کیا میں اسے پھر سے اٹھا کر پٹخ سکوں گی......؟" نروپا بولی۔ "میرا دل کررہا ہے کہ اسے فرش پر پٹخ پٹخ کر جان سے ماردوں......"

"کیوں نہیں......" چندرا دیوی بولی۔ "میں نے تمہیں عارضی طور پر شکتی دی ہوئی ہے۔ اس سے کام لو......"

نروپا نے مجسمہ کو اٹھایا اور فرش پر دے مارا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "بتاؤ...... میرا پتی کہاں ہے؟"

مجسمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کراہ کر رہ گیا۔

نروپا نے اور غصے سے اٹھا کر فرش پر دے مارا اور سابقہ سوال دہرایا۔

"یہ چندرا دیوی بھی جانتی ہے......" وہ مردہ لہجے میں بولا۔ "اس سے پوچھ لو۔"

"میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں......"

نروپا کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھانے لگا۔

مجسمہ نے نہیں بتایا۔ وہ جیسے ضد میں آگیا تھا...... پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کوئی منتر پڑھا جو اسے نہ جانے کیسے یاد آگیا تھا۔ پھر دوسرے لمحے کمرے میں دو جگہ سے سفید سا دھواں اٹھا...... پھر وہ انسانی ہیولے میں ظاہر ہوگئے...... ان دونوں کی رنگت حبشیوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گہری تھی...... یہ چھ چھ فٹ قد کے تھے۔ نیم برہنہ...... ان کے سیاہ جسم چمک رہے تھے...... چہرے اس قدر خوف ناک، مکروہ اور گھناؤنے تھے کہ انکی شکلیں دیکھتے ہی نروپا خوف و دہشت سے بے ہوش ہوگئی۔

ان میں سے ایک نے غراتے ہوئے کہا۔ "ہم

سنگا رام کو لے جانے آئے ہیں۔ تم نے اس کا یہ حشر نشر کرکے اچھا نہیں کیا......"

"سنو......" چندرا دیوی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں...... تم اسے لے جانا چاہتے ہو اور لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ...... لیکن ایک بات یاد رکھو...... دنیا کی کوئی طاقت اسے یہاں سے لے جا نہیں سکتی...... ہاں...... اس کی راکھ لے جاسکتے ہو...... کیوں کہ میں اسے بھسم کررہی ہوں۔"

ان دونوں بدروحوں کے پارے چڑھ گئے۔ وہ مجسمہ کی طرف بڑھے تاکہ اسے اٹھا کر لے جائیں۔ غائب ہوجائیں...... وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچے اور انہوں نے اس کے بازو تھامے اس کے جسم سے شعلے خارج ہونے لگے۔ وہ دونوں خوف ناک چیخ مار کر پیچھے ہٹے۔ ان شعاعوں نے انہیں بری طرح جھلسا دیا تھا۔ وہ ششدر تھے کہ ان پر کسی بھی بھیانک ہتھیار اور آگ کا اثر نہیں ہوتا تھا...... شعاعیں بھی بے اثر ہوجاتی تھیں...... ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسی شعاعیں تھیں۔

"کیا ہوا......؟ کتو......!" چندرا دیوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا...... اسے لے جا کیوں نہیں رہے ہو......"

"تم نے ہماری راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی ہے......" ان میں ایک کسی اژدھے کی طرح پھنکارا۔ پھر اس نے کوئی منتر پڑھ کر چندرا دیوی پر پھونکا...... چندرا دیوی پر تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس وقت نروپا ہوش میں آچکی تھی۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی لیکن دہشت زدہ سی ہوکر یہ خوف ناک منظر دیکھنے لگی۔ اب اسے یقین ہوگیا کہ چندرا دیوی بچ نہیں سکتی۔ کیوں کہ یہ لاتعداد تیر تھے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر بھونچکی ہوگئی...... دوسرے لمحے خوش بھی...... چندرا دیوی کا کومل بدن یہ تیر چھلنی نہ کرسکے۔ ہر تیر چندرا دیوی کے بدن سے لگتا تو وہ پھول بن جاتا تھا۔ گویا اس پر پھولوں کی بارش ہورہی تھی۔

دوسری بدروح نے جو یہ دیکھا تو وہ فرش پر لوٹ پوٹ کر ایک سیاہ ناگ بن گیا۔ بہت ہی موٹا اور دس بارہ فٹ لمبا...... اس کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ اس کی موٹائی تین فٹ سے کم نہ ہوگی۔ وہ اژدھا لگ رہا تھا۔ نروپا کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن چندرا دیوی بڑے سکون و اطمینان سے کھڑی رہی۔ جب وہ قریب آیا تو چندرا دیوی نے بڑی مستعدی سے اس کی دم پکڑ لی اور اسے اس طرح گھمایا جیسے وہ کوئی رسی کا ٹکڑا ہو۔ پھر اسے جیسے پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ دوسرے لمحے وہ بے دم سا ہوگیا...... پھر وہ دونوں گدھے کے سر کے سینگ کی طرح نظروں سے غائب ہوگئے۔ مجسمہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور نروپا انگشت بدنداں تھی۔ اس کے ہوش وحواس اڑ گئے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا خوف ناک...... ناگ نہیں دیکھا تھا اور نہ فلموں میں...... اس کے دیس میں سانپ، ناگنیں، ناگ اور اژدھے بھی ہوتے تھے جو جنگلوں میں بسیرا کئے ہوتے تھے...... جو معین اوقات شدید ترین گرمی میں جنگل سے قریب شاہراہوں پر نکل آتے تھے۔

وہ تحیر زدہ سی چندرا دیوی کو دیکھ رہی تھی...... یہ عورت جتنی حسین تھی اتنی بہادر، نڈر اور دلیر تھی۔ سب سے بڑھ کر ایک عظیم ترین جادوگرنی...... بچپن میں اس نے بھوتوں، چڑیلوں، بدروحوں اور جادوگروں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اس کے دیس میں جادوگروں اور جادوگرنیوں کی کوئی کمی نہیں تھی......

لیکن اس نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ موکل ذلیل وخوار ہوکر شکست کھا کر فرار ہوگئے تھے۔ وہ مجسمہ کو لے جانے میں ناکام رہے تھے۔ چندرا دیوی کے جادو کے سامنے ان کا کوئی زور نہیں چلا تھا۔ وہ بے بس اور ناکارہ ہوکر رہ گئے تھے۔

پھر ایک اور بدروح ظاہر ہوئی۔ جو سابقہ بدروحوں کے مقابلے میں کہیں خوف ناک، گھناؤنی اور مکروہ تھی...... جسے دیکھ کر نروپا بے ہوش ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کی آنکھیں ٹینس کی گیند سے بھی بڑی تھیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور شعلوں کی طرح سرخ تھیں اور انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں جو مرغی کے انڈوں کی طرح اور اسی سائز کی تھیں۔ اس بدروح کی قامت دس فٹ سے زیادہ تھی۔ وہ جسامت میں کسی دیو سے کم نہ تھی۔ اس کے ہاتھ دو دو گز لمبے اور موٹے تھے۔ اس کے چہرے کا طول و عرض بہت بڑا تھا اور اس کی بڑی خوف ناک، موٹی اور بے ہنگم ناگ تھی۔ اس کے نتھنے اتنے بڑے تھے کہ ٹینس کی گیند کے سائز کی کوئی بھی چیز باآسانی اندر جاسکتی تھی۔ دہانہ بہت بڑا تھا۔ درخت دو دو تھے۔ نیچے دو...... اوپر دو...... ہونٹ بھی موٹے اور کراہت انگیز تھے۔

"میں نہ صرف ننگا رام بلکہ تمہیں بھی لے جانے آیا ہوں۔" وہ تڑختے لہجے میں بولا۔ "تم نے میرے دو ساتھیوں کو بھی ٹکنے نہیں دیا...... ان کا کہا نہیں مانا اور ان کا جادو بے اثر کردیا...... لیکن میرے ساتھ ایسا نہ ہوگا۔"

"تمہارے دل میں جو حسرت ہے وہ پوری کرلو......" چندرا دیوی نے تنک کر کہا۔ "بکواس کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب میدان میں مقابلہ کرنے آئے ہو تو مقابلہ کرو...... گیدڑ بھبکیاں مت دو۔"

"وہ جانے کیا کیا پڑھ کر چندرا دیوی پر دس منٹ تک پھونکتا رہا...... نہ تو مجسمہ غائب ہوا نہ چندرا دیوی...... مجسمہ نے بے بسی سے کہا۔

"کمال ہے...... ایک معمولی جادوگرنی کو تم قابو میں نہ کرسکے...... اس نے دیکھو میرا کیا بھرکس نکال دیا ہے...... میری شکتی اور جادو سب کو اس نے ختم کردیا ہے...... میں سارے منتر بھول چکا ہوں...... جلدی سے کچھ کرو...... یہاں سے لے جاؤ۔ یہ میرا جنم ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے...... میں ابھی پانچ سو برس رہوں گا...... یہ میرے جنم کو ختم اور سدا کے لئے بھسم کردینا چاہتی ہے...... تم مجھے یہاں سے لے چلو......"

"میں تمہیں لے جانے کے لئے ہی تو آیا ہوں......" اس نے جواب دیا۔ "میں نہ صرف تمہیں بلکہ اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا تاکہ تم اس کے ساتھ جی بھر کے جشن مناسکو...... تم چنتا نہ کرو...... پریشان نہ ہو۔ میں ابھی اسے بے ہوش کئے دیتا ہوں۔"

"اسے بھی ساتھ لے چلو......" مجسمہ نے نروپا کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ بھی کیا حسین ہے۔"

اس نے مڑ کر نروپا کی طرف دیکھا۔ نروپا مجسمہ کی بات سن کر تھر تھر کانپنے لگی تو چندرا دیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ مجسمہ سے بولی۔ "تم بڑے سہانے خواب دیکھ رہے ہو......؟"

"ہاں...... اب میرا ہر خواب پورا ہوگا...... میں تم دونوں کے ساتھ جی بھر کے جشن مناتا رہوں گا۔"

"تم بھول رہے ہو......" چندرا دیوی بولی...... "خواب، خواب ہوتے ہیں۔"

اس بدروح نے چندرا دیوی کی طرف اپنا ہاتھ کیا...... اس کی انگلیوں سے آگ برسنے لگی۔ فرش پر چنگاریاں گرنے لگیں...... وہ چنگاریاں بچھوؤں اور چھوٹے چھوٹے سانپوں میں بدل گئیں۔ فرش پر درجنوں کی تعداد میں بچھو اور سنپولئے تھے۔ وہ چندرا دیوی کی طرف رینگتے ہوئے بڑھنے لگے...... نروپا یہ دیکھ کر دہشت سے لرزنے لگی۔ اس کا حوصلہ جواب دینے لگا۔

"یہ کیا کررہے ہو......؟" مجسمہ بولا۔ "اس طرح تو یہ مرجائے گی۔ میرے سارے ارمان بھی مرجائیں گے۔"

"نہیں...... بدروح بولی۔ "یہ بچھو اور سنپولئے ڈنک ماریں گے تو بے ہوش ہوجائے گی زخمی ہوکر...... پھر میں اسے لے جاسکوں گا...... یہ دلہن تو صرف آنکھیں دکھانے کی دیر ہے...... بے ہوش ہوجائے گی۔ اسے بے ہوش کرنا کچھ مشکل نہیں......"

چند لمحوں کے بعد بچھو اور سنپولئے اس کے کپڑوں پر چڑھ گئے۔ پھر اس کے بدن کے ان حصوں پر ڈنک مارنے لگے جو لباس میں چھپے نہیں تھے۔ اس کی کمر...... بانہیں اور چہرے اور گلے سے نیچے...... جو بھی

ڈنک مارتا تھا وہ فرش پر گر کر مر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام بچھو اور سنپولئے کیڑے مکوڑوں کی طرح فرش پر ڈھیر بنے پڑے تھے۔ چند لمحوں کے بعد وہ سب نظروں سے غائب ہوگئے۔

"تمہارا جادو بھی اس پر چل نہیں سکا......" مجسمہ بولا۔ "اب کروگے کیا......؟ جاکر کسی اور بڑے جادوگر کو بھیجو جلدی سے......"

"اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ اس کا تمام جادو ختم کردیا جائے...... نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری......" بدروح پیچ و تاب کھاتی ہوئی بولی۔ "اس کے سوا کوئی چارہ نہیں......"

بدروح کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اس کا سارا جسم شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ مجسمہ نے گھبرا کر کہا۔ "یہ تم کیا کررہے ہو......؟"

"میں اسے اپنی آغوش میں لے لوں گا......" اس نے جواب دیا۔ "اس طرح یہ جل کر بھسم ہوجائے گی اور اس کا جادو بھی...... پھر ہم اس کے جادو کے اثر سے نکل جائیں گے...... نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری......"

"یہ جل کر مرجائے گی تو میں اس سے محروم ہوجاؤں گا......" مجسمہ نے کہا۔ "میرے ارمان اور حسرتیں دل میں رہ جائیں گی۔ میں دنیا کی حسین ترین عورت کے قرب اور اس کے کیف سرور سے محروم ہوجاؤں گا...... کوئی اور صورت کرو۔ میرے جذبات کا خیال کرو...... میں اس سے کھلونے کی طرح کھیل کر اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں...... اس نے میرا جو حشر نشر کیا ہے۔ وہ قابل معافی نہیں ہے۔"

"لگتا ہے کہ تمہاری مت ماری گئی ہے احمق......" بدروح نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ "تم دیکھ رہے کہ اس پر کوئی جادو نہیں چل رہا ہے...... اس پر کوئی منتر کارگر نہیں ہورہا ہے...... آخر تمہیں اتنی ہوس کیوں ہے......" اب تمہیں دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا...... موت یا جنم......؟ اور پھر یہ دلہن بھی کم حسین نہیں ہے......؟ بولو...... کیا چاہتے ہو؟"

اس نے جواب دینے سے پہلے بڑی بے چارگی سے چندرا دیوی کی طرف، اور دلہن کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جنم......؟"

وہ بدروح چندرا دیوی کی طرف لپکی۔ جیسے ہی وہ چندرا دیوی کے قریب پہنچی۔ چندرا دیوی نے اسے بڑے زور سے مجسمہ کی طرف دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ مجسمہ کے اوپر جا گرا...... مجسمہ پر گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی۔ مجسمہ کی چیخیں نکل گئیں۔ بدروح نے اس سے الگ ہوکر آگ کو بجھانا چاہا...... لیکن وہ الگ نہ ہوسکے۔ دونوں اس طرح جل رہے تھے جیسے چتا جل رہی ہو...... تھوڑی دیر کے بعد فرش پر راکھ کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ان کا وجود اور نام و نشان تک نہیں رہا۔

لیکن آج اس کے سہاگ رات میں جو خوف ناک، پراسرار اور دہشت ناک واقعہ پیش آیا تھا جس نے دل اور وجود کو ہلا کردیا تھا اس نے کسی فلم میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ خود اس کی زندگی سے متعلق تھا۔ اس نے جو بدروحوں اور مجسمہ کو دیکھا تھا۔ ایسی فلموں میں نظر نہیں آیا تھا...... مجسمہ جو گوپال بن گیا تھا...... چندرا دیوی مسیحا بن کر نہ آتی تو جانے کیا ہوتا...... وہ مجسمہ جس نے گوپال کا ہمشکل بنالیا تھا وہ ایک درندہ صفت تھا...... خون آشام بھیڑیا...... جو اس کی عزت سے کھیلنا چاہتا تھا۔ کھلونا بنانا چاہتا تھا...... وہ یہ سوچ کر کانپ گئی تھی کہ اس کی عزت پر آنچ آتی تو اور جب یہ راز کھلتا کہ نقلی گوپال اس کا پتی نہیں بلکہ بدروح تھی تو اس کا ردعمل کیا ہوگا...... اور پھر گوپال کیا سوچتا......؟ کیا اس کی بات کو سچ مان لیتا؟

جب دونوں روحیں جل کر خاک ہوگئیں تو چندرا دیوی نے اس کے پاس جاکر دلاسا دیا۔

"نروپا گھبراؤ نہیں...... میں نے مجسمہ اور اس بدروح کا خاتمہ کردیا...... اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ چندرا دیوی کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں سے کی جھڑی لگ گئی۔

چندرا دیوی نے جب اسے ایک گلاس پانی پلایا تو اس کے اعصاب بحال ہوئے اور آنسو تھمے۔ پھر اس نے پوچھا۔

"دیوی..... میرا گوپال کہاں ہے.....؟ کس حالت میں ہے! کیا وہ زندہ ہے.....؟"

"چلو..... میں تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔" چندرا دیوی نے جواب دیا۔ "وہ بے ہوش اور زخمی حالت میں ہے..... لیکن زندہ ہے۔ تمہیں دھیرج رکھنا ہے..... میں نہیں چاہتی کے اس کے گھر والوں کو اس واقعے کا علم ہو۔"

"کیا اس کے گھر والوں کو اس واقعے کی خبر نہیں ہوئی ہوگی.....؟" وہ متعجب لہجے میں بولی۔ "کیا یہ حیرت اور دکھ کی بات نہیں ہے کہ اس قدر شور شرابا اور ہنگامہ ہوا..... گھر میں سے کوئی بھی نہیں آیا..... سب سوتے رہے؟"

"اس لئے کہ میں نے اس مکان اور پڑوسیوں کے لوگوں کی سماعت بندی کردی تھی۔" چندرا دیوی بولی۔ "تاکہ گھر اور پڑوسیوں کا کوئی فرد کمرے میں موجود کسی کوئی آواز سن نہ سکے..... اگر میں ایسا نہ کرتی تو ایک طوفان آجاتا اور ہنگامہ کھڑا ہوجاتا..... میں نے جان لیا تھا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ اس لئے ضروری ہوگیا تھا کہ آواز کوئی بھی سن نہ سکے۔"

نروپا کی نگاہ معاً سیاہ اور سنہری راکھ پر جو فرش پر اس جگہ تھی جہاں وہ دونوں روحیں جل کر فنا کستر ہوئی تھیں۔ سنہری راکھ ایک طرف تھی۔ سنہری راکھ سے قدرے ہٹ کر سیاہ راکھ تھی..... وہ دونوں الگ الگ جلے تھے۔ انکے درمیان دو تین فٹ کا فاصلہ تھا۔ نروپا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ حیران تھی کہ ایک طرف سنہری اور دوسری طرف سیاہ راکھ کیوں ہے۔ یہ کیا اسرار ہے؟ اس نے چندرا دیوی سے پوچھا۔

"سیاہ راکھ تو اس کالی بدروح کی ہے جو مجھے اور تمہیں لے جانے آیا تھا۔" چندرا دیوی نے کہا۔ "سنہری راکھ اس بدروح کی ہے جو گوپال کا بہروپ بھر کر تم سے دل بہلانا چاہتا تھا..... یہ ایک مجسمہ تھا جس میں بدروح سما گئی تھی..... میں یہ کہانی تمہیں بعد میں سناؤں گی۔ تم ایسا کرو کہ جلدی سے اس سنہری راکھ کو کسی کپڑے میں باندھ لو۔ میں سیاہ راکھ کو یہاں سے اس طرح صاف کئے دیتی ہوں کہ اس کا نام ونشان تک نہیں رہے گا۔"

"یہ سنہری راکھ ہے کیا.....؟" نروپا نے تحیر زدہ لہجے میں پوچھا۔ "ایسا لگ رہا ہے کہ سونے کو پیس کر پوڈر بنا دیا گیا ہو۔"

"یہ سنہری راکھ پوڈر ہے..... سونے کا..... اس کا جو گوپال کا ہم شکل بنا تھا۔" چندرا دیوی بولی۔ "یہ سونا تم لوگوں کے بہت کام آئے گا..... یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی..... جلدی سے اسے کسی کپڑے میں باندھ کر چھپا دو..... پھر تم گوپال کو اعتماد میں لے کر بتا دینا..... یہ واقعہ کسی اور کو نہ سنانا..... کوئی اس واقعہ کا یقین بھی کرنے کا نہیں....."

سونے کی راکھ ایک کپڑے میں باندھ کر رکھنے میں چندرا دیوی نے اس کی مدد کی..... پھر وہ عقبی دروازے سے باہر آئیں۔ گوپال کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گوپال ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ وہ دونوں اسے لے آئیں۔ پھر اس کے کپڑے صاف کئے۔ پھر بستر پر لٹا دیا۔ چندرا دیوی نے کہا وہ اس وقت جاربی ہے۔ تھوڑی دیر بعد گوپال ہوش میں آجائے گا۔ گوپال کی تلاش میں جاتے سے چندرا دیوی نے مختصر الفاظ میں اسے بتنگا رام مجسمہ کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اب بتنگا رام کا وجود نہیں رہا تھا۔ اس دیس کے لوگوں نے اس سے سدا کے لئے نجات پالی تھی۔ نروپا اس کے متعلق معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن چندرا دیوی ٹال کر نکل گئی۔

(جاری ہے)

مسیحا

خالد علی۔ کراچی

اچانک لائونج کی کئی بتیاں حیرت انگیز طور پر جلنے بجھنے لگیں۔ معمول کی آواز سنائی دی۔ بجلی میں کوئی فنی خرابی پیدا ہوگئی تو سیکڑوں میل دور بیٹھے شاہ صاحب نے کہا تم گھبرائو نہیں میں روشنیوں کو بحال کرتا ہوں اور بتیوں کا جلنا بجھنا ختم ہوگیا۔

اللہ والوں کی نظر دائمی کو اعلیٰ بنا دیتی ہے..... جس کا مکمل ثبوت کہانی میں موجود ہے

اس روز میں دفتر سے تھکا ماندہ نکلا تو شام کے سوا سات کا عمل رہا ہوگا، میں تنہا نہیں تھا میرے ہمراہ میرا ایک دوست اقبال احمد بھی تھا جو مہینے دو مہینے میں مجھ سے ملنے آجایا کرتا تھا۔ اقبال میرا ہم جماعت رہ چکا تھا اس لئے ہمارے درمیان خاصی بے تکلفی بھی تھی۔ وہ جب بھی میرے پاس آتا ہمارا پروگرام کچھ یوں ہوتا کہ ہم دفتر سے نکل کر ایک جگہ جاتے جہاں ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتے کچھ دیر گپ شپ کرتے پھر اقبال بس پکڑ کر اپنے گھر کے لئے روانہ ہوجاتا اور میں موٹر سائیکل پر اپنے گھر آجاتا۔ حسب معمول اس دن بھی میں ہوٹل سے نکل کر اقبال کو بس اسٹینڈ تک چھوڑنے جارہا تھا جب اس نے فرقان کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں علم ہے کہ فرقان کی بیوی کی حالت اب کیسی ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر اقبال کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔ "کیا ہوا فرقان کی بیوی کو۔؟"

فرقان کے سلسلے میں یہ عرض کردوں کہ وہ بھی ہمارا کلاس فیلو تھا انتہائی حاضر جواب ہونے کے علاوہ کھیل کود اور پڑھائی کے معاملے میں بھی ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا تھا۔ ایف۔ اے کی تعلیم کے دوران کالج میں وہ شائستہ نامی ایک طالبہ پر ریشہ خطمی ہوگیا طلبا کا خیال تھا کہ وہ شائستہ سے محض فلرٹ کررہا ہے اس لئے کہ وہ ایک بڑے باپ کی بیٹی تھی اور خاصی نک چڑھی بھی تھی کسی ہم جماعت لڑکے کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی اپنے لئے شان سمجھتی تھی۔ جملہ لائی کار میں باوردی ڈرائیور کے ساتھ بڑے کروفر سے کالج آتی تھی اور کسی نہ کسی زاویے سے دوسروں پر اپنی امارت کا اظہار کرنا بڑے فخر کی بات سمجھتی تھی۔ کچھ ساتھی طلباء نے فرقان کی ذہانت اور حاضر جوابی کا امتحان لینے کی خاطر اسے اس بات پر اکسایا کہ۔ "تم ہر اعتبار سے پوری جماعت میں سرفہرست ہو لیکن اب ایک لڑکی تم پر سبقت لے جارہی ہے۔ اگر تم اس شہ زور گھوڑی کی لگام پکڑ کر اسے قابو کرو تب جانیں گے۔"

فرقان کچھ دنوں تک بے تکلف ساتھیوں کو یہ کہہ کر ٹالتا رہا کہ۔ "میں تمہارے جال میں پھنسنے والا نہیں۔" لیکن اس کے بعد حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی کہ سب حیران رہ گئے۔ شائستہ جو کسی طالب علم کو بقول شخصے گھاس ڈالنا بھی پسند نہیں کرتی تھی کچھ اس طرح فرقان کی گرویدہ ہوئی کہ طلبہ کے علاوہ لیکچرار اور پروفیسر بھی ششدر رہ گئے۔

"پتھر کو جونک کس طرح لگی؟" ابھی طلبہ برادری میں اس عقدہ کو حل کرنے کی کوششیں جاری تھیں جب اچانک ایک دن فرقان نے اس بات کا باضابطہ اعلان کردیا کہ وہ اور شائستہ عنقریب رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے ہیں اور ہوا بھی ایسا ہی۔ ایف اے کا امتحان ہونے سے دو ہفتے پیشتر ہی ان دونوں کا نکاح بھی ہوگیا۔

شائستہ کے والدین کے پاس چونکہ دولت کی کمی نہیں تھی اس لئے انہوں نے بیٹی کو جہیز میں چار سو گز کے رقبے پر تعمیر شدہ ایک خوبصورت کوٹھی بھی دی جو ہر اعتبار سے فرنشڈ (FURNISHED) تھی۔ شائستہ کا رشتہ طے کرنے سے پیشتر یہ بات طے پا چکی تھی کہ شادی کے بعد دونوں اسی کوٹھی میں رہیں گے چنانچہ فرقان نے وعدے کے عین مطابق شائستہ کے ساتھ اسی شاندار کوٹھی میں رہائش اختیار کرلی۔ اس کی خواہش تھی کہ اس کے والدین بھی ساتھ رہیں لیکن انہوں نے بڑی خوبصورتی سے بیٹے کی بات ٹال دی۔

شادی کے بعد بھی فرقان نے اپنے دوستوں کے ساتھ اپنا سابقہ رابطہ حسب دستور جاری وساری رکھا لیکن ایف۔ اے کے بعد ہماری راہیں جدا جدا ہوگئیں۔ دو سال پلک جھپکتے ہی بیت گئے پھر گریجویشن کے بعد ہر شخص تلاش روزگار میں مصروف ہوگیا لیکن دلوں میں موجود محبتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ہم بچھڑے ہوئے ساتھی اور یار دوست جب بھی اور جہاں بھی ملتے اسی بے تکلفی اور گرم جوشی سے بغل گیر ہوجاتے۔ اقبال احمد چونکہ میرے دفتر کے قریب ہی رہا کرتا تھا اس لئے میری اور اس کی ملاقاتیں ہر دوسرے تیسرے دن ہو جاتی تھیں اور ایک دوسرے کے ذریعے دیگر ساتھیوں کا حال احوال بھی معلوم ہوتا رہتا تھا۔ پھر اقبال کے والد نے کافی دور اپنا میں مکان خرید لیا تو میری اور اس کی ملاقات میں بھی کمی آگئی لیکن مہینے دو مہینے میں وہ وقت نکال کر مجھ سے ملنے ضرور آجاتا تھا۔ اور ہم کسی ہوٹل میں بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرلیا کرتے تھے۔ فرقان کا ذکر ہمیشہ ہوا کرتا تھا چنانچہ اس روز جب اقبال نے فرقان کی بیوی شائستہ کے سلسلے میں مجھے استفسار کیا تو میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے وضاحت چاہی تو اقبال نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"تم فرقان سے کب سے نہیں ملے۔؟"

"یہ اندازہ اگر غلط نہیں ہے تو ایک سال سے کچھ اوپر کی بات ہوگی جب میری اور فرقان کی ملاقات کلفٹن کے ساحل پر واقع ایک ہوٹل میں ہوئی تھی۔ شائستہ بھی اس کے ہمراہ تھی اور بظاہر دونوں بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔"

"ہاں، وہ دونوں بہت خوش تھے لیکن ان کی خوشی کو کسی کی نظر لگ گئی۔"

"کیا مطلب۔؟ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"دو مہینے پہلے ایک ذاتی کام کے سلسلے میں فرقان سے ملاقات کرنے اس کی کوٹھی پر گیا تھا لیکن وہ اس قدر پریشان اور الجھا ہوا تھا کہ میں نے اپنا کام پس پشت ڈال دیا۔ فرقان نے مجھے بتایا تھا کہ شائستہ کسی موذی مرض میں گرفتار ہے۔ ملک کے کئی ماہرین اس کا تفصیلی معائنہ کرچکے ہیں لیکن کوئی حتمی تشخیص نہیں کرسکا۔" اقبال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں شائستہ کی کیفیت تو نہیں دیکھ سکا لیکن فرقان نے دبی زبان میں ایک بات ایسی ضرور کہی تھی جو ابھی تک میرے ذہن میں چبھ رہی ہے۔"

"کیا کہا تھا اس نے۔؟" میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"اس کا خیال ہے کہ کسی دشمن نے شائستہ پر کوئی ایسا گندا عمل کروایا ہے جس کا علاج ڈاکٹروں کے بس میں نہیں ہے۔"

"اس شبے کی کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی۔؟" میں نے پہلو بدل کر سوال کیا۔

"نہیں ....." اقبال نے بڑی افسردگی سے جواب دیا "فرقان اس وقت اس قدر پریشان اور الجھا ہوا تھا کہ میں نے اسے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"کیا اس کے بعد تم اس کی خیریت دریافت کرنے نہیں گئے۔؟"

"ایک دو بار چکر لگایا تھا لیکن حسن اتفاق سے ملاقات نہیں ہوسکی، البتہ کوٹھی کے چوکیدار سے صرف اتنا معلوم ہوسکا تھا کہ شائستہ کی حالت سنبھلنے کے بجائے روز بروز بگڑتی جارہی ہے۔"

میں عام طور سے آٹھ بجے تک گھر پہنچ جانے کا عادی ہوں، اس روز میں تھکا ہوا بھی تھا لیکن اقبال کی زبانی فرقان کی پریشانی کی اطلاع سن کر میں نے اسی وقت فرقان سے ملنے کی ٹھان لی۔ اقبال بھی میرے ہمراہ چلنے کو تیار ہوگیا۔ اتنے میں بھی ہمارے درمیان فرقان اور شائستہ کا ذکر ہوتا رہا۔ ہم فرقان کی کوٹھی پر پہنچے تو وہاں ایک عجیب سی ویرانی طاری تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اقبال نے جس انداز میں مجھے حالات کی سنگینی کا احساس دلایا تھا اس کے پیش نظر میری وہ کیفیت ہوگئی ہو۔ جو کچھ میں نے محسوس کیا وہ ایک فطری عمل بھی ہوسکتا تھا لیکن جب کوٹھی کے چوکیدار سے ہماری گفتگو ہوئی تو مجھے یقین آگیا کہ دال میں کہیں نہ کہیں کچھ کالا ضرور ہے۔

چوکیدار اقبال سے زیادہ واقف تھا اس نے بڑے مہذب انداز میں اقبال کو سلام بھی کیا لیکن جب اقبال نے اندر جاکر فرقان سے ملنے کا اظہار کیا تو چوکیدار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"آپ پھر کسی وقت چکر لگا لو صاحب..... اس وقت کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔"

"کیوں؟" اقبال نے پوچھا۔ "اس وقت اجازت کیوں نہیں ہے؟"

"میں ملازم ہوں جناب..... صاحب کا جو آڈر تھا وہ آپ کو بتادیا، اس کے علاوہ....."

"ہم فرقان صاحب کے پرانے دوست ہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "تم ایسا کرو کہ ہم دونوں کا نام اپنے صاحب تک پہنچادو۔ اس کے بعد بھی اگر اجازت نہ ملی تو ہم واپس چلے جائیں گے۔"

میری بات چونکہ معقول تھی اس لئے چوکیدار کچھ پسیج گیا، اس نے ہمیں باہر ہی انتظار کرنے کو کہا پھر بھاٹک کو اندر سے بند کرکے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ چوکیدار کے طرز عمل سے اقبال کے علاوہ میری تشویش بھی دو چند ہوگئی۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں قلابازی کھا رہے تھے۔ وقت جیسے جیسے گزر رہا تھا ہماری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

الجھن بھی بڑھتی جارہی تھی۔ تقریباً بیس منٹ کے طویل صبر آزما انتظار کے بعد پھاٹک کھلا۔ چوکیدار نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اندر جانے کو کہا میں اپنی موٹر سائیکل پھاٹک کے باہر ہی کھڑی کرکے اقبال کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھاتا روش عبور کرکے پورٹیکو تک پہنچا تو فرقان ہمیں صدر دروازے پر کھڑا نظر آگیا۔ اس کے چہرے پر امید وبیم کی بڑی حیرتناک سنجیدگی مسلط تھی۔ اس نے ہم دونوں کا بڑا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

''شائستہ کی طبیعت اب کیسی ہے؟'' میں نے دبی زبان میں پوچھا۔

''خدا کی طرف سے روشنی کی ایک آخری کرن نظر آئی ہے۔ دعا کرو کہ میری دنیا اجڑنے سے محفوظ رہے۔'' فرقان کی آنکھیں نمناک ہونے لگیں۔ اس کی آواز بھی فرط جذبات سے کپکپارہی تھی۔ غموں کے بادل اس کے چہرے پر منڈلاتے نظر آرہے تھے۔

''ڈاکٹروں کا کیا کہنا ہے؟'' اقبال نے آہستہ سے سوال کیا۔

''بات ڈاکٹروں کی حد سے گزر چکی ہے۔'' فرقان نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''حسن اتفاق سے خدا کا ایک بندہ مل گیا ہے جو اس وقت اندر موجود ہے۔ تم دونوں بھی میرے ساتھ آجاؤ لیکن خاموش رہنا۔ جب تک وہ عامل تمہیں مخاطب نہ کرے خود سے کچھ نہ کہنا۔''

فرقان اپنی بات مکمل کرکے تیزی سے پلٹا ہم اس کے مزید کچھ دریافت کرنے کے بجائے خاموشی سے اس کے پیچھے ہوئے۔ ایک کمرہ پار کرنے کے بعد ہم فیملی لاؤنج میں داخل ہوئے جہاں شائستہ ایک صوفے پر اس طرح سہمی بیٹھی تھی جیسے ہزاروں نادیدہ خطروں نے اسے گھیر رکھا ہو، اس کے برابر اس کی ماں بیٹھی تھی وہ بھی پریشان نظر آرہی تھی، ایک عورت اور بھی تھی۔ ان دونوں نے شائستہ کے دونوں ہاتھوں کو اس طرح پکڑ رکھا تھا جیسے ان کو یہ خطرہ لاحق تھا کہ کہیں وہ اٹھ کر بھاگ نہ جائے۔ جس صوفے پر شائستہ موجود تھی اس کے برابر والے صوفے پر ادھیڑ عمر کا شخص شلوار قمیض میں ملبوس سر پر ٹوپی لگائے بیٹھا شائستہ کو تیز اور چبھتی ہوئی نظروں سے ٹکٹکی باندھے گھور رہا تھا۔ دونوں صوفوں کے درمیان قالین پر ایک بارہ تیرہ سال کی لڑکی سامنے والی دیوار پر نظر جمائے بیٹھی تھی، اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس وقت خواب بیداری کی کیفیت سے دوچار ہو۔

ہم فرقان کے ساتھ اس خوبصورت اور کشادہ فیملی لاؤنج میں داخل ہوئے تو صوفے پر بیٹھی دونوں عورتوں نے ہمیں سرسری نظروں سے دیکھا پھر ہونٹ چبا کر رہ گئیں، شائستہ کی نظریں بھی ہماری جانب اٹھیں لیکن ان نظروں میں اجنبیت کا احساس چھلک رہا تھا اور چہرے سے بیزاری عیاں تھی۔ علیحدہ صوفے پر بیٹھے ادھیڑ عمر والے شخص نے بھی ہمیں ایک نظر دیکھا پھر دوبارہ شائستہ کی طرف متوجہ ہوگیا لیکن جو بچی فرش پر بیٹھی تھی اس کی توجہ بدستور سامنے والی دیوار پر مرکوز تھی۔ فرقان ہمیں ایک علیحدہ صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے ادھیڑ عمر والے شخص (جس کا نام شیخ اکرام الدین تھا) کے قریب جا کر بیٹھ گیا۔ لاؤنج میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی پھر شیخ برہان الدین نے سپاٹ لہجے میں فرقان کو مخاطب کرکے کہا۔

''تمہاری بیوی کا علاج ہو جائے گا لیکن اس میں کچھ وقت لگے گا۔''

''شیخ صاحب۔ اب تو خدا کے بعد بس ایک آپ ہی کا سہارا رہ گیا ہے۔'' فرقان نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''آپ کسی طرح شائستہ کا علاج کردیں تو میں تمام زندگی آپ کا احسان مند رہوں گا۔''

''میری دو شرطیں ہوں گی۔''

''میں آپ کی ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' فرقان نے قدرے جذباتی انداز میں کہا۔ ''شائستہ صحتمند ہوجائے تو میں آپ کو سونے میں بھی تول سکتا ہوں۔''

''غلط سمجھا آپ نے۔'' شیخ اکرام الدین زیر لب مسکرا کر بڑے دوستانہ انداز میں جواب دیا۔ ''مجھے جس کام کی خاطر پیرو مرشد نے تعینات کیا ہے اس میں

کسی مسائل سے ایک پیسہ لینا بھی میرے لئے حرام ہے۔ آپ میرا اشارہ ان بازاری اتائیوں میں نہ کریں جو آج کل گلی کوچوں میں بھیس بدل بدل کر سادہ لوح اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کی جیبوں پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈال رہے ہیں اور کوئی ان پریشان حالوں کا پوچھنے والا بھی نہیں ہے۔ میرے پاس خدا کا دیا بہت کچھ ہے بلکہ اس قادر مطلق نے مجھے میری خواہشات سے بڑھ کر نواز رکھا ہے۔ میں اس کا جس قدر بھی شکر و احسان ادا کروں، کم ہی ہوگا۔''

''کیا آپ نے شائستہ کے مرض کی تشخیص کرلی ہے۔؟'' فرقان نے عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

''میری پہلی شرط یہ ہوگی کہ آپ کسی بھی صورت میں مجھے کچھ دینے دلانے سے پرہیز کریں گے اور دوسری شرط یہ ہوگی کہ آپ اس وقت جو کچھ دیکھے اور سنیں گے اس کا تذکرہ ہر خاص و عام سے نہیں کریں گے۔'' شیخ اکرام الدین نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ ''پیرو مرشد نے مجھے یہ حکم ضرور دیا ہے کہ میں حاجتمندوں کو تلاش کروں اور ان کی مدد کروں لیکن جھوٹی شہرت سے پرہیز کرنے کی سختی سے تاکید بھی کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ میری بات سمجھ رہے ہوں گے۔؟''

''مجھے آپ کی دونوں شرطیں منظور ہیں۔'' فرقان نے سنجیدگی سے اقرار کرلیا۔

''آپ دونوں حضرات کی تعریف۔؟'' شیخ اکرام الدین نے ہماری طرف دیکھ کر بڑے نرم انداز میں سوال کیا۔

''یہ میرے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔'' فرقان نے تعارف کی رسم ادا کی۔ ''بیحد مخلص اور قابل اعتماد، شائستہ کی خیریت پوچھنے کی غرض سے آئے تھے، میں نے دروازے سے لوٹانا مناسب نہیں سمجھا لیکن اگر آپ کو۔''

''جی نہیں......'' شیخ اکرام الدین نے مجھے عجیب دوستانہ انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''شائستہ کے مرض کے سلسلے میں آپ نے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے؟'' فرقان نے پرامید لہجے میں دریافت کیا۔

''جو کچھ ہانڈی میں ہے وہ ابھی آپ سب کے سامنے ڈوئی میں آجائے گا۔'' شیخ اکرام نے یکلخت سنجیدگی اختیار کرلی کچھ دیر شائستہ کو دیکھتے رہے پھر انہوں نے اپنی تمام تر توجہ اس بچی پر مرکوز کردی جو فرش پر بیٹھی بدستور سامنے والی دیوار کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ خاموش بیٹھا باری باری سب کے چہروں کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں یہاں یہ بھی عرض کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نہ تو کبھی پیری مریدی کے چکر میں پڑا نہ ہی مجھے ان عالموں پر اعتقاد ہے جو بازاروں میں بڑے بڑے بورڈ لگائے بیٹھے سادہ لوح اور پریشان حال افراد کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ہمارے بھولے بھالے عوام بھی اس بات پر غور نہیں کرتے کہ جو شخص خود اپنی حالت نہ بدل سکے بھلا وہ دوسروں کی تقدیر کے لکھے کو کس طرح بدل سکتا ہے۔ میں ذاتی طور پر ایک ایسے شخص سے بھی بخوبی واقف ہوں جو کسی زمانے میں سیخ کباب کی دکان پر بیٹھا دن بھر پسینے میں شرابور ہوا کرتا تھا لیکن اب اس نے داڑھی بڑھا کر اپنا چولا بدل لیا ہے اور باقاعدہ روحانی علاج کا کاروبار کررہا ہے۔ موصوف کا ایک آستانہ کراچی میں ہے اور ایک لاہور گیا جہاں وہ پریشان حال لوگوں کو اپنی چرب زبانی، ستاروں کی چال اور مختلف قسم لوح تیار کرکے راتوں رات کروڑ پتی بننے کے جھوٹے خواب دکھارہا ہے، خود موصوف کی جو حالت ہے اس سے میرے علاوہ اور بھی بے شمار لوگ واقف ہیں۔ اس کے علاوہ بھی آج کل آپ کو شہروں شہروں گلی کوچوں میں بڑے بڑے عالموں کے جو بے شمار بورڈ نظر آرہے ہیں اس سے بھی یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہیں ہے کہ اتنے حاجتمند نہیں ہیں جتنے عالم اور روحانی مشوروں کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسکالر پیدا ہوگئے ہیں۔ کسی مجبور کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے کی خاطر یہ ٹھگ صفت افراد جو مذموم کاروبار کررہے ہیں اس کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ اس کاروبار کی آڑ میں اور بھی بہت سارے جرائم پرورش پارہے ہیں جس کے قصے آئے دن اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود ایک غریب شخص ان ہی جعلی پیرو فقیر اور کالے علم کے خودساختہ ماہرین کے دروازے تک جانے پر مجبور ہے۔

بہرحال۔ میں اقبال کے ساتھ خاموش بیٹھا شیخ اکرام الدین کے رنگ ڈھنگ کا باقاعدہ جائزہ لے رہا تھا۔ موصوف نے کوئی کارنامہ انجام دینے سے قبل فرقان کے سامنے اپنی جو دوشرطیں رکھی تھیں وہ بظاہر نہایت معقول تھیں لیکن میں دل میں یہی سوچ رہا تھا کہ کامیاب ہو جانے کی صورت میں شاید وہ بھی موقع محل دیکھ کر فرقان کی کھال اتارنے کی کوشش ضرور کریں گے۔

فیملی لاؤنج میں تادیر گہرا سکوت طاری رہا، شیخ اکرام الدین کے ہونٹ کسی عمل کا ورد کررہے تھے لیکن ان کی آنکھیں فرش پر بیٹھی بچی پر مرکوز تھیں۔ شائستہ نے دیوانگی کی کوئی حرکت نہیں کی تھی لیکن اس کے دائیں بائیں موجود دونوں خواتین نے حفظ ماتقدم کے طور پر اس کے بازوؤں پر اپنی گرفت برقرار رکھی تھی۔

”پروین......“ طویل خاموشی کے بعد شیخ اکرام الدین کی پاٹ دار ابھری وہ بچی سے مخاطب تھے۔“ تمہیں سامنے کیا دکھائی دے رہا ہے؟

”میرے سامنے ایک کالا پردہ پڑا ہے۔“ بچی نے جسے پروین کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا سنجیدگی سے جواب دیا۔

جواب میں شیخ اکرام الدین نے سیدھے ہاتھ پر کچھ پڑھ کر دم کیا پھر ہاتھ کو پروین کی نگاہوں کے سامنے لہرا کر بولے ”میں کالا پردہ ہٹا رہا ہوں۔ اب بتاؤ تمہیں کیا دکھائی دے رہا ہے۔“

”کسی باغ کی ایک کیاری نظر آرہی ہے۔ گلاب کے پودے بھی ہیں اور پھول دار کچھ اور پودے بھی ہیں۔ زمین پر گھاس بھی نظر آرہی ہے۔“ پروین نے بدستور دیوار پر نظر جمائے جمائے جواب دیا۔

”اور کیا نظر آرہا ہے......؟“ شیخ اکرام الدین نے ٹھوس آواز میں سوال کیا۔

”اور کچھ بھی نہیں ......“ پروین اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر پلکیں جھپکانے لگی پھر بولی۔“ ایک کالا بھونرا گلاب کے پھول پر منڈلا رہا ہے۔“

”میں دوسرے پودوں کو غائب کررہا ہوں، تم اس گلاب کے پھول پر نظر جمائے رکھو۔“

شیخ صاحب نے دوبارہ اپنے سیدھے ہاتھ کو پروین کی نظروں کے سامنے آڑا ترچھا کرتے ہوئے پوچھا۔”اب تمہیں کیا نظر آرہا ہے۔؟

”کیاری میں اب گلاب کا صرف ایک پودا باقی رہ گیا ہے۔ کالا بھونرا بھی نظر آرہا ہے۔“ پروین نے خوابیدہ انداز میں جواب دیا۔“

”تم اس پودے کو جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کرو۔“ شیخ اکرام الدین کا لہجہ اور ٹھوس ہوگیا۔

”نہیں ......“ پروین نے کچھ توقف سے جواب دیا۔”میں زین کی کھدائی نہیں کرسکتی۔ کالا بھونرا بھی مجھے کاٹنے کی کوشش کررہا ہے۔“

”میں بھونرے کو بھی تمہاری نظروں سے دور کرتا ہوں۔ تم اپنے ہاتھ کو کدال کی طرح استعمال کرو۔“

پروین کسی بت کی طرح خاموش بیٹھی سامنے دیوار کی جانب دیکھتی رہی۔ شیخ اکرام الدین کسی مداری کی طرح بار بار اپنا ہاتھ ادھر ادھر جھٹک رہے تھے انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی سے جنگ کررہے ہوں۔

”پروین......“ انہوں نے کچھ توقف کے بعد دوبارہ بچی کو مخاطب کیا۔”کیا تم نے گلاب کے پودے کی کھدائی مکمل کرلی؟ بھونرے کا کیا بنا؟ کیا وہ اب بھی پھول کے آس پاس نظر آرہا ہے۔“

”نہیں۔ وہ اب غائب ہوگیا ہے۔ میں پودے

کی جڑ کھود رہی ہوں۔“

”تیز تیز ہاتھ چلاؤ اور مجھے وہ سب کچھ بتاتی رہو جو تمہیں نظر آرہا ہے۔“

”جڑ کے نیچے کی مٹی زیادہ نرم ہے۔ میں اپنے ہاتھ کو کدال کی طرح استعمال کررہی ہوں۔ گلاب کا پودا اب ایک طرف جھکنے لگا ہے۔ اب مجھے مٹی کے اندر کاغذ کا ایک چوکور اور بوسیدہ ٹکڑا نظر آرہا ہے جسے دھاگے سے باندھا گیا ہے اور ساتھ ہی اس میں تین اور سوئیاں پیوست ہیں۔ کاغذ کا رنگ سفید کے بجائے پیلا اور نیلا ہوچکا ہے۔“

”کھدائی روک دو۔“ شیخ اکرام الدین نے تیزی سے کہا پہلے سوئیوں کو الگ کرو اور پھر دھاگا ہٹا کر کاغذ کے ٹکڑے کو بڑی احتیاط سے کھولو اور مجھے بتاؤ کہ اس پر کیا نظر آرہا ہے۔“

کمرے میں پھر خاموشی مسلط ہوگئی، میں نے شائستہ کی سمت دیکھا وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اس کی والدہ کے چہرے پر تشویشناک سنجیدگی کے بادل منڈلاتے نظر آرہے تھے۔ فرقان کی نگاہیں شیخ اکرام الدین پر مرکوز تھیں۔ میں نے پہلو بدل کر اقبال کی جانب دیکھا، وہ بھی اس پراسرار ماحول میں پوری طرح گلے گلے ڈوبا نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد پروین کی آواز خاموشی کا منہ چیرتی ہوئی ابھری۔

”میں نے کاغذ کو کھول لیا ہے۔ اس پر اردو کے بجائے کسی اور زبان میں کچھ لکھا ہے۔ میں اس کو نہیں پڑھ سکتی۔“

”کیا کاغذ پر چوکور خانے بھی نظر آرہے ہیں اور اس کے درمیان کچھ ہندسے درج ہیں۔“

”نہیں ...... میں ایک تحریر دیکھ رہی ہوں۔ گول گول دائرے سے ایک دوسرے میں الجھے نظر آرہے ہیں۔ کاغذ پر دوسطریں ہیں۔“

”کیا تم اندازہ لگاسکتی ہو کہ تحریر کس زبان میں ہے۔؟“

”نہیں...... میں نے اس قسم کی تحریر پہلے کبھی نہیں دیکھی۔“

”تم اس تحریر پر نظریں جمائے رکھو...... میں اس کا ترجمہ اردو میں کررہا ہوں۔“

شیخ اکرام الدین نے پھر بدبدانا شروع کردیا۔ ان کے ہاتھ بار بار فضا میں بلند ہونے لگتے تھے، وہاں موجود ہر شخص پوری توجہ سے شیخ اکرام الدین کو دیکھ رہا تھا اللہ میرا دل بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہورہا ہے وہ شعبدے بازی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

”اب غور سے دولائینوں میں لکھی ہوئی عبارت پڑھنے کی کوشش کرو۔“

”پہلی والی تحریر بدل چکی ہے مگر اردو میں بھی جو کچھ لکھا ہے وہ اس قدر پیچ پیچ اور ملا جلا لکھا ہے کہ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔

”کیا اس تحریر میں تمہیں شائستہ کا نام کہیں نظر آرہا ہے۔؟“

جی شائستہ کا نام نظر آرہا ہے لیکن میں پوری تحریر نہیں پڑھ سکتی...... نمی کی وجہ سے الفاظ بھی پھیل کر اتنے دھندلے ہوگئے ہیں کہ۔“

”ٹھیک ہے۔“ شیخ اکرام الدین نے پروین کا جملہ کاٹ کر سنجیدگی سے کہا۔”تم کاغذ کے اس ٹکڑے کو پھاڑ کر اور ساتھ ہی سوئیوں کو کیاری سے کچھ دور پھینک دو۔“

”میں نے اسے پھاڑ کر دور پھینک دیا ہے لیکن اب مجھے کچھ نظر نہیں آرہا...... ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔“

”تم بہت نیک اور پیاری پیاری بیٹی ہو۔“ شیخ اکرام الدین نے اس بار پیار بھرے انداز میں کہا۔“ کچھ دیر کے لئے ستالو۔ اپنے کان بھی بند کرلو...... کیا تمہیں میری آواز سنائی دے رہی ہے۔“

”ہاں......“

”میں نے تم سے کیا بات کہی ہے۔؟“

”میں کچھ دیر ستالوں اور کان بند رکھوں۔“

پروین کا جواب سن کر شیخ اکرام الدین نے نظر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گھما کر شائستہ کو دیکھا پھر فرقان سے مخاطب ہو کر بولے۔

"تمہاری بیوی پر کسی ایسے شخص نے ایک گندہ عمل کرایا ہے جسے تم دونوں کی شادی منظور نہیں تھی۔"

"ہوسکتا ہے آپ درست فرمارہے ہوں لیکن کیا اس غلیظ عمل کا کوئی ایسا توڑ ممکن نہیں ہے کہ شائستہ کی حالت ٹھیک ہوجائے؟"

"عالم الغیب صرف اس کی ذات ہے جو کون و مکان کے تمام بھیدوں سے واقف ہے۔ کل کیا ہوگا یا کیا نہیں ہے اس کے سوا کوئی نہیں جان سکتا لیکن اس کی ذات سے مایوسی بھی گناہ ہے۔ میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میری حتی الامکان کوشش یہی ہوگی کہ آپ کی بیگم اس سحر سے آزاد ہوجائیں جس نے ان کے دل و دماغ کو پوری طرح قید کر رکھا ہے۔"

"شیخ صاحب....." شائستہ کی والدہ نے بڑی پر امید نظروں سے اکرام الدین کو دیکھتے ہوئے زبان کھولی۔ "ہماری معصوم بچی پر جس دشمن نے گندہ عمل کرایا ہے کیا اسے اسی پر لوٹا نہیں سکتے؟"

"مجھے اس کی اجازت نہیں ہے کہ خدا کے کسی بندے کو مشکلات میں ڈالوں۔"

"اور جس بندے نے ہمیں اذیت میں مبتلا رکھا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟" خاتون نے قدرے ناگواری کا اظہار کیا۔

"آپ جو کچھ کہنا چاہ رہی ہیں میں بخوبی سمجھ رہا ہوں لیکن اس کی مصلحتوں کو دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ جو قدریں لکھ دیا گیا وہ اٹل ہے۔ پیر و مرشد نے مجھے ایک ہی حکم دیا تھا کہ کبھی کسی کے خلاف برا نہ سوچوں۔ جو جیسا کرتا ہے اسے اسی کے اعمال کے مطابق سزا و جزا کا حق دار سمجھا جاتا ہے۔ میں آپ کی بچی کو اس اذیت سے چھٹکارا دلانے کی حتی المقدور کوشش کروں گا جس میں وہ فی الوقت مبتلا ہے۔"

"اور اگر بچی کے صحت یاب ہونے کے بعد ہمارے دشمن نے پھر کوئی دوسرا وار کر دیا تو اس کا تدارک کیا ہوگا۔؟"

"میں کوشش کروں گا کہ دوبارہ ایسی کوئی صورت پیدا نہ ہو لیکن" اگر کچھ ہوا تو پھر جوابی کارروائی میں کوئی مناسب قدم اٹھانے پر غور کیا جاسکتا ہے۔"

شائستہ کی والدہ ہونٹ چبا کر خاموش ہوگئیں۔ "میرے ذہن میں منفی خیالات ابھر رہے تھے۔ سابقہ ذاتی تجربوں اور دوسروں کی زبانی سنی سنائی کہانیوں کے پیش نظر میں یہی سوچ رہا تھا کہ شیخ اکرام الدین پہلے اپنی حدت زبانی اور ایک دو شعبدے بازی کے بعد کسی چالاک مکڑی کی طرح فرقان کو اپنے جال میں پوری طرح جکڑے گا پھر جونک بن کر اس کا خون چوستا رہے گا۔ ایک کی جگہ دو۔ اور دو کی جگہ چار وصولنے کی خاطر ایسے ہی خوبصورت ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں مسائل کی کھوکھ پڑی میں یہ بات پوری طرح بٹھادیں کہ عامل ہی ان کا واحد نجات دہندہ ہے۔ اس کے بعد وہ عامل کے اشاروں پر اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگانے کو خوشی خوشی تیار ہوجاتا ہے۔

"قبل اس کے میں اپنا دوسرا عمل شروع کرو، میں آپ تمام خواتین و حضرات سے درخواست کروں گا کہ وہ ایک بار سورہ فاتحہ اور اور تین بار سورہ اخلاص صدق دل سے پڑھ لیں اور میرے عمل کے دوران مکمل خاموشی اختیار رکھیں۔"

شیخ اکرام الدین کے کہنے پر تمام افراد کے ہونٹ متحرک نظر آنے لگے۔ میں نے بھی ان کی ہدایت پر عمل کیا پھر سوچنے لگا کہ۔ "دیکھیں اب عامل کے پٹارے سے کیا شعبدہ برآمد ہوتا ہے۔؟"

کچھ دیر سکوت طاری رہا۔ شیخ اکرام الدین نے اس بار آنکھ بند کر کے ٹھوڑی سینے سے لگادی، ہونٹوں کی جنبش بتا رہی تھی کہ وہ کسی عمل کا ورد کر رہے ہیں، ساتھ ساتھ ان کے سیدھے ہاتھ کی انگشت شہادت بھی دائرے کی صورت میں تیز تیز گردش کر رہی تھی میں نے کن انکھیوں سے شائستہ کی سمت دیکھا، وہ بدستور سہمی سہمی سی نظر آرہی تھی فرقان کی نظریں شیخ اکرام الدین کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ اقبال بت بنا بیٹھا تھا۔

"پروین بٹی....." اچانک شیخ اکرام الدین نے نظریں اٹھا کر بچی کو مخاطب کیا لہجہ خاصہ گمبھیر تھا "تم شائستہ آنٹی کو کب سے جانتی ہو۔؟"

"جب سے وہ ہمارے پڑوس میں آکر آباد ہوئی ہیں۔"

"وہ تمہیں کیسی لگتی ہیں۔؟"

"میری شائستہ آنٹی بہت اچھی ہیں مجھے بیحد پیار کرتی ہیں اور اسکول کا سبق بھی یاد کراتی ہیں۔" پروین نے معصومیت سے جواب دیا لیکن اس کی نظریں بدستور سامنے دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔

"تم اس وقت ان کے گھر جاؤ۔" شیخ اکرام نے قدرے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ان کے گھر میں چاروں طرف گھوم پھر کر دیکھو..... وہاں تمہیں کوئی نیا آدمی یا عورت نظر آئے تو مجھے بتانا۔ ڈرنا نہیں، تم بہادر بیٹی ہو، میں بھی تمہارے آس پاس رہوں گا۔"

پروین نے زبان سے کچھ نہیں کہا، اثبات میں سر کو جنبش دی پھر خاموشی طاری ہوگئی، شیخ اکرام کی نظریں پروین کے چہرے پر مرکوز تھیں میں خاموش بیٹھا سب کچھ دیکھ رہا تھا جب اچانک فیملی لاؤنج کی کئی بتیاں حیرت انگیز طور پر جلنے بجھنے لگیں، فرقان نے اپنے صوفے سے اٹھنے کی کوشش کی، اس کا خیال تھا کہ لائٹ کا بار بار جلنا بجھنا کسی فنی خرابی کا نتیجہ ہے لیکن شیخ اکرام الدین نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا پھر پروین سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو۔؟"

"میں شائستہ آنٹی کے کمرے کے باہر ہوں لیکن یہاں بجلی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے، بلب بار بار بجھتے ہیں پھر جل جاتے ہیں مجھے عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"گھبراؤ مت..... میں روشنیوں کو ٹھیک کرتا ہوں۔ تم اپنا کام جاری رکھو، جیسے ہی کوئی نیا چہرہ نظر آئے مجھے فوراً گاہ کرنا۔" شیخ اکرام الدین نے ہاتھ کو دوبارہ ادھر ادھر گھمایا تو بتیوں کا جلنا بجھنا ختم ہوگیا۔

میں اپنی جگہ تشکیل کر بیٹھ گیا، شعبدہ بازی اور نظر بندی کے ذریعہ بہت ساری باتیں ممکن ہوسکتی ہیں لیکن روشنیوں کا جلنا بجھنا میرے لئے تعجب خیز ہی تھا، میں نے اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا تھا کہ صرف فیملی لاؤنج کی روشنیاں متاثر ہوئی تھیں۔ جو بلب یا ٹیوب لائٹس کمروں میں یا کھڑکی سے باہر باغیں باغ میں روشن تھے ان پر مطلق کوئی اثر نہیں ہوا تھا، میں ابھی اس اچانک رونما ہونے والی ناقابل یقین صورت حال کے بارے میں عقبی گھوڑے دوڑا رہا تھا جب پروین نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔

"میں ایک سائے کو شائستہ آنٹی کے کمرے میں دیکھ رہی ہوں، شاید آنٹی کی آنکھیں بند ہیں، وہ شاید سو رہی ہیں لیکن سایہ ان گرد چکر کاٹ رہا ہے مجھے اس کی شکل نہیں نظر آرہی، اس نے اپنے چہرے کو اندھیرے میں چھپا رکھا ہے۔"

"میں روشنی کرتا ہوں....." شیخ اکرام الدین نے سنبھل کر تیزی سے کہا پھر ہاتھوں کو بے معنی انداز میں (کم از کم میرا خیال یہی تھا) لہراتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "پہلے تم سائے کے پیروں پر نظر ڈالو۔ اس کے پیر پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

"یہ نہیں..... مجھے کچھ صاف نظر نہیں آرہا۔"

"دیکھتی رہو۔ میں اس سائے کو بے نقاب کر رہا ہوں۔" شیخ برہان الدین نے ٹھوس آواز میں بچی کو ہدایت دی۔

بچی نے فوراً کوئی جواب نہیں دیا۔ لاؤنج میں موجود شائستہ کے علاوہ ہر فرد میں بغور دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا پروین۔؟ کیا اب سایہ بے نقاب ہوگیا۔؟"

"ہاں..... آں" بچی نے رک رک کر جواب دیا۔ "اس کے پیر پیچھے کی طرف نہیں ہیں..... کوئی خوبصورت نوجوان معلوم ہوتا ہے لیکن میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہی..... اس نے میری طرف پیٹھ کر رکھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔"

"تم دوسری طرف جا کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرو۔"

"اس نے پھر اپنا چہرہ گھما لیا....." بچی نے تھوڑے توقف سے جواب دیا۔ "وہ..... وہ ہاتھ سے مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہا ہے۔"

"تم اس سے کہو کہ اگر وہ اپنا نام بتا دے تو تم وہاں سے چلی جاؤ گی۔ اس کے بغیر تم اس کا پیچھا نہیں چھوڑو گی۔"

"نہیں..... نہیں....." پروین کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھرنے شروع ہوئے۔ وہ بدستور سامنے دیوار پر ٹکٹکی باندھے سہمے ہوئے انداز میں کہہ رہی تھی۔ "اس کے ایک ہاتھ میں چاقو ہے۔ وہ بار بار مجھے اشارے سے بھاگنے کو کہہ رہا ہے۔ چاقو سے خون کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ ہر طرف خون ہی خون پھیل رہا ہے۔ اب۔ اب شائستہ آنٹی نے بھی آنکھیں کھول دیں۔ وہ جاگ گئی ہیں..... ان کے چہرے پر بھی خوف ہے..... وہ..... وہ بھی مجھے بھاگ جانے کا اشارہ کر رہی ہیں۔"

"اپنی شائستہ آنٹی سے اس خوبصورت نوجوان کا نام دریافت کرو۔؟" شیخ اکرام الدین نے کچھ پڑھتے ہوئے پیراہن کو ہدایت دی۔

"وہ اس کا نام نہیں جانتیں..... بہت خوفزدہ لگ رہی ہیں۔" بچی نے بدستور سہمے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے..... تم واپس آ جاؤ لیکن واپسی سے پہلے میں جو راکھ تمہیں دے رہا ہوں اسے نوجوان کی طرح پھینک دینا..... شاباش، تم بہادر بچی ہو..... ڈرنا مت، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

شیخ اکرام نے اپنی مٹھی بند کر کے پروین کے سمت بڑھا دی ان کے چہرے پر بڑی گمبھیر سنجیدگی مسلط تھی پروین نے سیدھا ہاتھ بلند کر کے شیخ اکرام الدین کی طرف بڑھایا پھر واپس کھینچ لیا۔ میں یہاں پہ واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ پروین اور شیخ اکرام الدین کا ہاتھ آپس میں مل نہیں سکا تھا لیکن انداز ایسا ہی تھا جیسے بچی نے کوئی شے وصول کر لی ہو۔ ایک لمحے بعد اس کی آواز ابھری۔

"میں نے راکھ نوجوان کی طرف پھینک دی ہے..... وہ..... وہ اب نظر نہیں آ رہا..... اس کی جگہ ایک کالا بلا فرش پر بیٹھا مجھے خونخوار نظروں سے گھور رہا ہے..... میں واپس آ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے..... تم بہادر بچی ہو..... کچھ دیر آرام کر لو۔"

"شائستہ آنٹی کا کیا ہوگا؟" پروین نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ "خطرناک کالا بلا اور وہ کمرے میں تنہا رہ گئے ہیں۔"

"تم سب کچھ بھول کر پرسکون ہو جاؤ۔" شیخ اکرام الدین نے پروین کو ہدایت کی، اس پر کچھ پڑھ کر دم کیا پھر فرقان کی سمت دیکھ کر بولے۔ "میں نے اس نوجوان کو پوری طرح دیکھ لیا ہے۔ وہ اب میری نظروں سے روپوش نہیں ہو سکے گا۔"

"کون ہے وہ۔؟" فرقان اور شائستہ کی والدہ نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

"خدا کا فرمان ہے کہ جہاں کسی بات کے اظہار سے شر اور فساد کا اندیشہ لاحق ہو وہاں خاموشی بہتر ہے۔" شیخ اکرام الدین۔ پہلو تہی اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن اگر اس کا کوئی تدارک نہ ہو تو میری بیٹی کو اسی طرح پریشان کرتا رہے گا۔" شائستہ کی ماں نے کسمسا کر جواب دیا۔ "آخر ہمیں معلوم تو ہو کہ ہمارا اصل دشمن کون ہے.....؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں پیر و مرشد کی ہدایت کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔"

"آپ کا کہنا بجا ہے مگر شائستہ کا کیا ہے گا؟"

"یہ میرا کام ہے....." شیخ اکرام الدین نے

سنجیدگی سے کہا۔ "میں ایسی بندش کر دوں گا کہ وہ نوجوان آئندہ شائستہ بیٹی کو تنگ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس کے لئے آپ کو بھی میری مدد کرنی ہوگی۔" شیخ اکرام الدین نے دوسرا جملہ شائستہ کی ماں کو مخاطب کر کے کہا۔ "میں آپ کو کلام الٰہی کی کچھ مختصر آیتیں پڑھنے کے لئے دوں گا۔ آپ سوا مہینے تک پابندی سے کوئی ایک وقت مقرر کر کے۔ ہر حالت میں میرے بتائے ہوئے تسبیح کے گُل کے طریقے کو جاری رکھیں گی۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"اگر خدانخواستہ درمیان میں ہمارے دشمن نے ہمیں پریشان کرنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کیا تو ہم آپ کو کہاں تلاش کرتے پھریں گے۔" فرقان نے نہایت عاجزی اور انکساری سے کہا۔ "خدوم بشیر صاحب (جنہوں نے فرقان کو شیخ اکرام الدین سے رابطہ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا) بتا رہے تھے کہ آپ کا قیام کسی ایک جگہ نہیں رہتا۔ آپ ایسے پیر و مرشد کے حکم کے مطابق ملکوں ملکوں اور شہروں شہروں سفر کرتے رہتے ہیں۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔" شیخ برہان اکرام الدین نے بڑی شفقت سے مسکرا کر کہا۔ "میں اپنے واقف کاروں اور ضرورتمندوں سے کبھی غافل نہیں رہتا۔ آپ کو جب بھی میری ضرورت محسوس ہوگی میں کسی نہ کسی طرح آپ سے از خود رابطہ کر لوں گا۔"

"شائستہ کا علاج کس طرح ہوگا۔؟" شائستہ کی والدہ نے دریافت کیا۔

"سب سے بڑا سچا دوا ہی ہے جس نے انسان کو پیدا کیا۔ وہ درد دیتا ہے تو اس کی دوا بھی تجویز کرتا ہے۔ آپ اپنی مقدس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ اس میں ہر مرض، ہر دکھ درد کا نہایت نافع علاج موجود ہے۔" شیخ اکرام الدین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں کل کسی وقت آپ کو زعفران سے لکھے ہوئے کچھ تعویز بھیج دوں گا۔ آپ اسے روزانہ ایک گلاس پانی میں حل کر کے شائستہ کو پلاتی رہیں۔ خدانے چاہا تو اب کوئی بلا یا گندہ عمل آپ کی بچی کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔"

شیخ اکرام الدین نے پہلے کچھ پڑھ کر پروین کو اپنے حصار سے آزاد کیا پھر ایک کاغذ پر وہ آیتیں تحریر کرنے لگے جو شائستہ کی والدہ کو پڑھنی تھیں۔ کچھ دیر بعد جب لاؤنج میں صرف ہم تین دوست رہ گئے تو فرقان نے کہا۔

"شیخ صاحب..... میں ذاتی طور پر آپ سے کچھ درخواست کرنا چاہتا ہوں۔"

"اس کی چنداں کوئی ضرورت نہیں ہے۔" شیخ اکرام الدین نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "آپ جو کہنا چاہتے ہیں وہ میں سمجھ رہا ہوں لیکن میں ان دو شرطوں کی خلاف ورزی کی صورت نہیں کر سکتا جو پیر و مرشد کی طرف سے عائد ہیں..... ہاں آپ اگر مناسب سمجھیں تو کسی اسلامی مدرسے میں جو سچے قرآن و سنت کی روشنی میں وہاں کے اساتذہ سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔ وہیں کسی جمعہ کو پیٹ بھر کر کھانا کھلوا دیں یا حسب استطاعت کوئی رقم مدرسے کو عطا کر دیں کہ یہ نہ صرف کارِ خیر ہے بلکہ ثواب جاریہ بھی ہے۔"

"بہتر ہے....." فرقان نے دبی زبان میں جواب دیا۔

میں نے وہاں مزید رکنا مناسب نہیں سمجھا فرقان اور شیخ صاحب سے اجازت لے کر واپس چلا آیا۔ اقبال کو میں نے ایک قریبی بس اسٹینڈ تک چھوڑ دیا۔

پندرہ میں روز بعد میں فرقان کا حال احوال معلوم کرنے اس کے گھر گیا تو یہ جان کر ازحد مسرت ہوئی کہ شائستہ کی حالت میں روز بروز افاقہ ہو رہا تھا۔ ایک مہینے بعد تو وہ پھر سے ایسی بھلی چنگی ہو گئی جیسے کبھی بیمار ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے فرقان سے دبی زبان میں شیخ اکرام الدین کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں ترکی کے شہر انقرہ میں کسی ضرورت مند کے علاج کی خاطر گئے ہوئے ہیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

تھکا ہوا وجود سارا یہ مانتا ہوں
مگر خیالوں سے کوئی جائے تو نیند آئے
(سیماممتازعباسی......لاڑکانہ)

من کی اجڑی بستی کا ہم سے ذکر مت چھیڑو
ہم اداس بیٹھے ہیں یہ نگر بسا کر بھی
عشق بھول ہی تو ہے نا سمجھ لوگوں کی
جس میں کچھ نہیں ملتا آبرو گنوا کر بھی
(عمران رمضان کمبوہ......ٹھینگ موڑ الہ آباد)

رابطہ ٹوٹ چکا ہے تو صدائیں کیسی
اب جو ملنا ہی نہیں ہے تو وفائیں کیسی
ان سے کہہ دو اپنی یادیں اور آنسو واپس لے لیں
جب کوئی جرم نہیں تو یہ سزائیں کیسی
(لاہوتی عمار......آحدی موڑ دولتالہ)

میں نے چاہا کوئی تحفہ دوں تجھ کو
میرے پاس تو وفاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی بھر نہ پڑے غم کا سایہ تجھ پر
میرے پاس تو دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

اگر تم کہتے تو تمہارے بغیر جی لیتے
کسی کو کچھ نہ بتاتے اپنے لبوں کو سی لیتے
تم ہماری محبت کو یوں بدنام نہ کرتے
اگر تم اپنے ہاتھوں سے زہر بھی دیتے تو ہم ہنس کر پی لیتے
(ایم مجاہد لیاقت......ملتان)

ہر دل میں درد چھپا ہوتا ہے
بیان کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے
کچھ لوگ آنکھوں سے درد بہادیتے ہیں
اور کسی کی ہنسی میں بھی درد چھپا ہوتا ہے
(انتخاب: شفیق رضا......میاں چنوں)

بہت اداس تھے یہ دن ہجر کے
خوشی ہوتی نہ تھی کسی سے مل کے
زخم بھرجاتے ہیں سبھی کے لیکن منیر
نہیں بھرتے زخم یہ میرے دل کے
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

آنکھیں تیرے حسین تصور سے بند تھیں
دنیا سمجھ رہی تھی کہ نیند آگئی مجھے
(عمر دراز......کھڈیاں خاص)

کل وقت ملا تو زلفیں تیری سلجھادوں گا
آج الجھا ہوں وقت ذرا سلجھانے میں
(ناصر اقبال......کھڈیاں خاص)

خدا نصیب کرے ان کو دائمی خوشیاں
عدم وہ لوگ جو ہم کو اداس رکھتے ہیں
(محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

اس طرح میرے تعارف کی ضرورت کیا ہے
میں وہی ہوں کہ جسے آپ نے چاہا تھا کبھی!
(سرفراز راجو......کنگن پور)

چاہا ہے اس کو روح کی گہرائیوں کے ساتھ
زندہ ہوں اپنی ذات کی تنہائیوں کے ساتھ
(ڈاکٹر شبیر احمد......کنگن پور)

کتنا مشکل ہے محبت کی کہانی لکھنا
بہتے پانی پہ پانی سے پانی لکھنا
(محمد عثمان علی......میاں چنوں)

نہ بزم اپنی نہ ساقی اپنا نہ شیشہ اپنا نہ جام اپنا
اگر یہی ہے نظام ہستی تو غالب زندگی کو سلام اپنا
(راجہ خرم ساگر......دولتالہ)

سیاہ ہماری قسمت کے ستارے ہونگے کبھی سوچا نہ تھا
وہ جان سے ہم کو پیارے ہونگے کبھی سوچا نہ تھا
اتر تو گئے محبت کے ساغر میں لیکن اے جان جاناں
دور اس سمندر کے کنارے ہونگے کبھی سوچا نہ تھا
(محمد بشیر احمد پرواز......جنڈانوالہ)

بہت سوچا بہت سمجھا، بہت ہی دیر تک پرکھا
کہ تنہا ہو کے جی لینا محبت سے تو بہتر ہے
(رانا ظفر اقبال......جنڈانوالہ)

دیکھا جو بے رخی سے تو حیرت ہوئی مجھے
دنیا تو بے وفا تھی مگر تم کو کیا ہوا
(مس فوزیہ کنول......کنگن پور)

☆☆

غزل

غم دوراں کے افسانے بھلانے کی تمنا ہے
جو ناممکن ہے اسے ممکن بنانے کی تمنا ہے
ستم یہ ہے کہ وہ حالات ہی پیدا نہیں ہوتا
نہ جانے کب سے دل کو مسکرانے کی تمنا ہے
جسے سنکر زمانہ پیار کے سانچوں میں ڈھل جائے
رباب دل پہ ایسا گیت گانے کی تمنا ہے
میری محرومیاں اپنی جگہ، میں بک نہیں سکتا
زمانے کی مجھے اپنا بنانے کی تمنا ہے
مجھے بھی آرزو تھی بحر غم سے بچ نکلنے کی
مگر اب حال یہ ہے ڈوب مرنے کی تمنا ہے
جسے گہرا کیا اپنوں ہی کے منفی رویوں نے
وہ زخم دل یارب تجھے دکھانے کی تمنا ہے
یہ دست صلح جوئی کیسے یکطرفہ بڑھے واجد
انہیں ہر دن نیا فتنہ جگانے کی تمنا ہے
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

اذیتوں سے مرا روز پالا پڑتا ہے
ہوا کے رخ پہ ہی اپنا چراغ جلتا ہے
کسی بھی دور میں آتا نہیں زوال اس پر
خزاں رسید چمن میں جو پھول کھلتا ہے
یوں بے سبب تو ہوا دستکیں نہیں دیتی!
سکوت شب میں کوئی نام میرا لیتا ہے
بلند رکھتا ہے اپنا جو حوصلہ ہر دم
مشقتوں کا اسے پھل ضرور ملتا ہے
حکیم وقت تو کرتا نہیں لحاظ کبھی
بدل بدل کے روش امتحاں لیتا ہے
(حکیم خان حکیم......کامل پور موسیٰ)

مجھ سے گلے ہیں اسے مجھ پر بھروسہ نہیں اسے
یہ سوچ کر ہم نے بھی روکا نہیں اسے
وہ شخص بھی چاند ستاروں سے یہ پوچھے
ہے کونسی وہ رات جب سوچا نہیں اسے
الفاظ تیر بن کر اترتے رہے دل میں
سنتے رہے چپ چاپ ہی ٹوکا نہیں اسے
احسان یہ محبت نہیں اصول وفا ہے
ہم جان تو دیں گے مگر دھوکا نہیں اسے
(احسان سحر......گاؤں زادے خیلانوالہ۔میانوالی)

اس طرح تو جاناں محبت مشکل ہوجائے گی
یکطرفہ نیاز مندی میں رفاقت مشکل ہوجائے گی
بچاتا ہی رہا ہوں زیست کے دیئے تیز ہوا سے لیکن
بارش ہوگی تو اس کی حفاظت مشکل ہوجائے گی
کبھی دل کی تسلی کو کافی تھی اک مسکراہٹ بھی تمہاری
پر عمر بھر روٹھے رہو گے تو قناعت مشکل ہوجائے گی
وہ کہتے ہیں محبت امر ہوتی ہے بچھڑ جانے کے بعد
دل کے معاملے میں تو اتنی شرافت مشکل ہوجائے گی
گلے مل کر پلٹ آنا خاموشی سے اس کی خوشی کی خاطر
جدائی کی گھڑی میں تو ایسی ہمت مشکل ہوجائے گی
(ذیشان اقبال عظمی......کراچی)

نہ وجود اپنا نہ روح اپنی بس اب تماشا یہ زیست ٹھہری
نہ دل لگی میں سکون پایا نہ عاشقی میں قرار پایا
نہ وصال لمحے ہی راس آئے نہ فراق ہی ہم گزار پائے
عجب یہ چاہت کے مرحلے ہیں نہ جیت پائے نہ ہار پائے
نہ ہی یادوں کی دھند اتری نہ دل کے دامن کو جھاڑ پائے
نہ آنکھیں خوابوں کو ڈھونڈ پائیں نہ خواب آنکھوں کو ڈھونڈ پائے
بس اک تماشہ یہ زیست ٹھہری......
بس اک تماشہ یہ زیست ٹھہری......
(انیلہ غزل......حافظ آباد)

اندھیری شب کے دامن میں روشنی کیسی
اداس دل ہو تو پھر زندگی میں ہنسی کیسی
دے گیا وہ خوب ہمیں ترک الفت پہ سزا
ہمارے لئے اب زمانے میں پھر خوشی کیسی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیری یادوں کے تصور میں کھلے ہیں پھول بھی
مہکتی ہوئی ہواؤں میں پھر یہ تشنگی کیسی
حسن بہاراں سے وہ کبھی ہمکنار نہ ہوا
بجھی بجھی سی نگاہوں میں یہ بہاروں کی دلکشی کیسی
گلشن میں شاخ تمنا کی طرح ہیں جاوید
پھر میرے لئے یہ اداؤں کی تازگی کیسی
(محمد اسلم جاوید.....فیصل آباد)

یہ میرے نصیب کی ویرانی ہے یا میری بے بسی
جو بھی ملا وہ بچھڑنے کے لئے
میرا حال جو بھی ہے اسے چھوڑو
میرا تو ہر لمحہ ہی ہے تڑپنے کے لئے
مشکلیں تو یونہی ہر کسی پہ آتی رہتی ہیں
پر یہ آزمائش ہے میرے بکھرنے کے لئے
میرا دل بھی یہ بات مجھ سے کہتا ہے
جو بھی بستا ہے وہ اجڑنے کے لئے
بہت دیر سے یہ بات میں سمجھی ہوں
جو قدم بھی ڈگمگاتا ہے وہ سنبھلنے کے لئے
(ساجدہ راجا.....ہنداں سرگودھا)

بشر دے رہا ہے بشر کی دہائی
اور ہر کوئی بیان کررہا ہے اپنی ہی سچائی
نہ ہے دل میں روشنی نہ ہی زبان پر
اور چہرے پر بھی نہ رہی کسی کے روشنائی
غرض سے تو اپناتا ہے اب انسان
اسی لئے تو ہے ہر کسی کو بے معنی سی تنہائی
وہ ہم کو پہچاننے تک نہیں ہیں
اور کہتے ہیں کہ ہماری تو ان سے ہے شناسائی
اگر ہے ہماری قربت کا اعتبار
تو کیوں ہے ہم سے بے وفائی
یوں دل خراب نہ کرو آپ
گر آج ہے میرے گھر میں تنہائی
بڑا خوش ہوا ہوں میں ان کے الفاظ سے
کہ اس نے کی ہے ہماری پذیرائی
قبول کرلیتے دل و جان سے اگر آپ رضا کو
تو نہ ہوتی آج آپ کی رسوائی
(سکندر علی رضا.....فیصل آباد)

اور کیا کرتا بیان غم تمہارے سامنے
میری آنکھیں ہوگئیں پرنم تمہارے سامنے
ہم جدائی میں تمہاری مر بھی سکتے ہیں مگر
چاہتے یہ ہیں کہ نکلے دم تمہارے سامنے
جس میں ہم دونوں کے بچپن کی بھی اک تصویر ہے
ڈھونڈ کر لایا ہوں وہ البم تمہارے سامنے
آتے آتے لب پہ رہ جاتی ہیں دل کی حسرتیں
کھولتے ہیں ہم زباں کم کم تمہارے سامنے
تم سمندر کی طرح آغوش وا کرتے نہیں
ہم تو بن جاتے ہیں موج یم تمہارے سامنے
کس لئے تم نیند میں شرما رہے ہو اس طرح
خواب میں کیا آگئے ہیں ہم تمہارے سامنے
(یاور عظیم.....راولپنڈی)

آج ہم تو سنا کے رہیں گے
ساری دنیا کو بتا کے رہیں گے
گھر کی بربادی پہ روئیں کس لئے
آشیاں نیا اک بنا کر رہیں گے
نہ کریں گے رسوا تمہیں شہر وفا میں
زخم دل ہم چھپا کے رہیں گے
تو تبسم بھی آیا لبوں پہ ہمارے
آنسو سب کچھ بتا کے رہیں گے
سب کے دکھ درد کو سمجھیں گے اپنا
اجڑی محفلیں سجا کے رہیں گے
تنہا نہ اب پھریں گے امتیاز
کسی کو اپنا بنا کر رہیں گے
(ایس امتیاز احمد.....کراچی)

کہانی پیار کی تم کو سنانا چاہتی ہوں
تیرے گھر کو ان ہاتھوں سے سجانا چاہتی ہوں

میری قسمت میں شاید تو نہیں ہے پھر بھی ساجن
میں وعدے سب وفاؤں کے نبھانا چاہتی ہوں
خوشی مجھ سے گریزاں ہے مگر پھر بھی میری جان
خزاں کی رت میں بھی گلشن کھلانا چاہتی ہوں
ذرا سی دیر کو سمجھو میری جان میں تیری ہوں
دل کو اس حسین دھوکے میں لانا چاہتی ہوں
ستم ہے مجھ سے سب کچھ چھن گیا لیکن میں اب بھی
تمہارے خواب آنکھوں میں بسانا چاہتی ہوں
میری ساری ریاضت رائیگاں جائے گی لیکن
محبت صرف تم سے ہے بتانا چاہتی ہوں
(انتخاب: شرف الدین جیلانی.....خٹڑ والیار)

یاد رکھنا تم میرے کچھ مہر کو
بھولنا مت مجھ پہ ڈھائے قہر کو
ہے سلام ہر وقت میرا فخر سے
نام دینے والے میرے شہر کو
کل پیا تھا حق پہ جو سقراط نے
آج ہے میں نے پیا اس زہر کو
عاشقی فرہاد پر ہے ختم بس
کس نے کھودا دودھ کی پھر نہر کو
اب بھی تم کو یاد کرتی ہوں بہت
کیوں دباؤں دل میں اٹھتی لہر کو
راہ تکتی تھی تمہاری میں سبھی
روز ہی بیتی ہوئی دوپہر کو
مجھ پہ خانم رب کی رحمت ہے بڑی
بس خدا قائم رکھے اس مہر کو
(فریدہ خانم.....لاہور)

مجھے تم سے پیار ہے دل کی گہرائی سے
مجھے صرف ڈر لگتا ہے تمہاری جدائی سے
مجھے کوئی ڈر نہیں ہے اس ظالم زمانے کا
بس اندیشہ ہے زندگی کی بے وفائی سے
میں نے تو سب کچھ چھوڑا صرف تمہارے لئے
اور تم تھے کہ ڈر گئے صرف اپنی رسوائی سے
جب سے تم نے ساتھ میرا چھوڑا ایم
ہم نے بھی دوستی کرلی ہے تنہائی سے
(ایم مجاہد لیاقت.....ملتان)

خواہشوں کے پرندے میں نے اڑا دیئے سارے
اور روگ دل کے میں نے مٹا دیئے سارے
پھر نہ بنانے دیا کسی کو گھونسلہ شاخ دل پر
تیرے بعد شجر دل کے میں نے کٹا دیئے سارے
وہ تیرا چہرہ، وہ تیرے لب، وہ تیرے گیسو!
نقش تیرے دل سے میں نے مٹا دیئے سارے
وہ پل وہ لمحے وہ دن جب خوش رہنا تھا مجھے
تیرے ہی ہجر میں جاناں میں نے بتا دیئے سارے
وہ تیرا جانے سے کہنا کہ آج رونا ہے تمہیں
آنسو جتنے تھے اس وقت میں نے بہا دیئے سارے
موت کی سرحد پہ ہوں اور میں تنہا ہوں منیر
کئے تھے وعدے جو میں نے نبھا دیئے سارے
(منیر احمد ساغر.....میاں چنوں)

ڈرتا ہوں کہ ان کا کہیں دیدار نہ ہوجائے
اور آنکھ کہ رسوا سر بازار نہ ہوجائے
اس واسطے روتا ہوں کڑی دھوپ میں رہ کر
واقف میری حالت سے شب تار نہ ہوجائے
تو میری محبت پہ کبھی شک نہ کیا کر
ڈرتا ہوں کہ تجھ پہ میری جاں وار نہ ہوجائے
ہر اک سے یہ قصہ الفت نہ کہا کر
پاگل کہیں یہ سارا ہی سنسار نہ ہوجائے
بہتر ہے حسن ان کی ہر اک بات بھلادے
تو ان پہ فدا اب کے سر دار نہ ہوجائے
(انتخاب: محمد نوید انجم.....سوہاوہ چکوال)

راہ وفا میں آخر یہ کام کردوں
خود ہار کر جیت تیرے نام کردوں
تیری محبت میں کچھ ایسی کشش ہے
کہ تجھ کو چاہوں تو خود کو تیرا غلام کردوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تیرے سارے دکھوں کو لے کر اپنی جھولی میں
اپنی ساری خوشیاں تجھے انعام کردوں
مجھے ڈر نہیں زمانے کا اے سائباں!
تو جو کہے میں دعوئی محبت سرعام کردوں
تجھے چاہا ہے میں نے کچھ اس قدر
کہ تیری چاہتوں کے واسطے اپنی عمر تمام کردوں
(سحرش اعظم............لاہور)

ذرہ ذرہ دیدہ و دل ہے گوشہ گوشہ بستی ہے
عشق ہے جب تک سلسلہ جنباں دل کی ہستی ہستی ہے
جینے تک ہیں ہوش کے جلوے، آگے ہوش کی مستی ہے
موت سے ڈرنا کیا معنی ہے موت بھی جز و ہستی ہے
معنی صورت، صورت معنی، فکر و نظر کے دھوکے ہیں
فکر و نظر تک ہی رہ جانا، فکر و نظر کی پستی ہے
چشمک حسن و عشق مبارک دیدہ و دل ہیں خرم و شاد
حشر تک اب یہ بحث سلامت، کس کی کہاں تک ہستی ہے
(انتخاب: محمد عثمان علی............میاں چنوں)

غم کو آنکھوں کے رستے نکلتے دیکھا ہے
سینۂ سنگ سے آب اگلتے دیکھا ہے
زکر غرور جوانی کا یہ دولت فانی ہے
ہم نے ہڈیوں سے گوشت کو گلتے دیکھا ہے
پل میں تاج سلطانی پل میں کاسۂ ہاتھ
شام کو ہم نے سورج کو بھی ڈھلتے دیکھا ہے
خوشیاں ہم کو راس نہیں پھر قسمت سے کیا شکوہ
ہم نے اپنے سینے میں درد کو پلتے دیکھا ہے
وہ محبوب ہے کیا جانے آتش عشق
ہم نے خود کو اس کے پیار میں جلتے دیکھا ہے
وہ پیکر انساں یا پھر کوئی سایہ ہے پرواز
ہم نے اس کے پیچھے پیچھے خود کو چلتے دیکھا ہے
(محمد بشیر احمد پرواز............جنڈانوالہ)

مٹی کا ہر پتلا انسان نہیں ہوتا
دکھ دے کے جینا کسی کو آسان نہیں ہوتا
سہل ہوتی ہے زندگی جینا آسان نہیں ہوتا
کھاتے ہیں چھین کے پیتے ہیں نوچ کے
بزدلوں، لٹیروں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا
کاٹ لیتے ہیں اک دن اپنے ہی بھائی کو
ان ظالموں کا کوئی ایمان نہیں ہوتا
شیطان تو خود ہی بن گیا ہے آدمی
انسان کے پیچھے اب کبھی شیطان نہیں ہوتا
مرجائیں گے اک دن وہ نہیں جانتے ہیں کہ
موت کا کھلے عام اعلان نہیں ہوتا
آئے ہیں ہاتھ خالی اور جائیں گے بھی ہاتھ خالی
اس سفر میں دنیاوی سامان نہیں ہوتا
(عمران رمضان کمبوہ............ٹھینگ موڑ الہ آباد)

آ کے پتھر تو میرے صحن میں دوچار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے
ایسی دہشت تھی فضاؤں میں کھلے پانی کی
آنکھ جھپکی بھی نہیں ہاتھ سے پتوار گرے
مجھے گرنا ہے تو میں اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایہ دیوار پہ دیوار گرے
تیرگی چھوڑ گئے دل میں اجالے کے خطوط
یہ ستارے میرے گھر ٹوٹ کے بیکار گرے
کیا ہوا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی تھی
کیوں مجھے ڈھال بنانے کو یہ چھتنار گرے
وقت کی ڈور خدا جانے کہاں ٹوٹے؟
کس گھڑی سر پہ لٹکی بھولی یہ تلوار گرے
ہم سے ٹکرا گئی خود بڑھ کر اندھیرے کی چٹان
ہم سنبھل کر جو چلتے تھے ناچار گرے
کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو میرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے
ہاتھ آیا کہیں کچھ رات کی دلدل کے سوا
ہائے کس موڑ پہ خوابوں کے پرستار گرے
(محمد آصف شہزاد الہ آبادی............الہ آباد ٹھینگ موڑ)

☆☆

کچھ سرو من پر لکھ ڈالو
مضمون چمن پر لکھ ڈالو
بے چین ہواؤں کے نوحے!
پتوں کے کفن پر لکھ ڈالو
اقدام کی جنبش کہتی ہے
تعمیر وطن پر لکھ ڈالو
اب گھر کے اجالے باغی ہیں
اس بات کو "من" پر لکھ ڈالو
کچھ گیت یہاں سوداگر ہیں
مجبور چلن پر لکھ ڈالو
آنکھوں کے ستارے ختم ہوئے
اب چاند گہن پر لکھ ڈالو
قمر حروف کرب و بلا
اسلام کے من پر لکھ ڈالو
(چوہدری قمر جہاں علی پوری.....ملتان)

خواب پوش آنکھوں میں
آنسوؤں کا بھر جانا
حسرتوں کے شاخ پر
تتلیوں کا مر جانا
حبس کی ہواؤں میں
خوشبوؤں کا ڈر جانا
دل کے گرم صحرا میں
حشر ہی بپا ہونا
درد لا دوا ہونا
کیا بہت ضروری ہے
اب ترا جدا ہونا؟
(ارشد ملک.....راولپنڈی)

جب نظر سے نظر ملائے گی
زندگی میں بہار آئے گی
اب ہمارا ملن نہیں ممکن
کیسے کہہ دوں کہ لوٹ آئے گی
خواہشوں کو میں مار دوں لیکن
زندگی مجھ سے روٹھ جائے گی

کوئی امید کی کرن ہی نہیں
ساتھ میرا وہ کیا نبھائے گی
کب تک چپ رہوں گا میں آخر
بات دل کی لبوں تک آئے گی
میں نے سوچا نہ تھا شفیق کبھی!
یہ محبت مجھے رلائے گی
(محمد شفیق اعوان.....شمس آباد اٹک)

خواب حقیت ہوا نہیں کرتے
جن کو ملے دھوکا وہ دعا نہیں کرتے
آزمانا ہے ہمیں جتنی بار آزمالو
ہم جیسے لوگ دغا نہیں کرتے
وفا کا راگ الاپنے والے اکثر
وفا وفا کہتے ہیں، وفا نہیں کرتے
جو رگ رگ میں بس جائیں
دل سے کبھی ان کو جدا نہیں کرتے
پھولوں سے محبت اچھی ہے احمد
مگر کانٹوں کو بھی خفا نہیں کرتے
(احمد شیر خان.....کوٹلہ علی دتی لودھراں)

سوچ کے محور میں خود کو
گہرے سمندر کی طرح ڈوبتے پایا
تو اندازہ ہوا کہ؟
یہ گہرائی تو زندگی بھر رہے گی
جلتی شمعوں کی طرح
لہروں کے شور کی طرح
میں بھاگتی بھاگتی صحراؤں کی
گہرائیوں میں کہیں گم ہو گئی ہوں
کانٹوں کی چبھن سورج کی تپش میں
میں جھلس رہی ہوں
میری آہ فغاں کون سنے
کوئی آس پاس نہیں ہے
یونہی سسکتے سسکتے مرجاؤں گی
اگر صدا دو گی کوئی نہیں سنے گا
سوائے ان صحراؤں کے

موت نے آن پکڑا جب تو گھبرائی چلائی
تڑپی کانپی کانپتے کانپتے آنکھ کھلی
تو دیکھا خواب ہائے خواب؟
(گلنار شہزادی.....فاروق آباد)

اک بھیگی ہوئی سی رات ملے
اس رات میں تیرا ہاتھ ملے
تیرے لب سے ٹپکیں جو بوندیں
انہیں میرے لبوں کا ساتھ ملے
کچھ تم بھی بہکی بہکی سی
کچھ مجھ پہ نشہ سا طاری ہو
اک ایسی رات ہماری ہو
پھر تم آؤ میری بانہوں میں
میں جی بھر کے تمہیں پیار کرو
تم مجھ سے تھوڑا شرماؤ!!!
شرم کے مارے گلے سے لگ جاؤ
میں جتنا تم کو پیار کرو
تم اتنی بے تاب ہوجاؤ
ہمیں پیار کے کچھ لمحات ملیں
اک بھیگی ہوئی سی رات ملے
اس رات میں تیرا ہاتھ ملے
(رانا ظفر اقبال.....جنڈانوالہ)

کاش یہ دل ہوتا دھڑکن نہ ہوتی
نہ کسی کیلئے تڑپتا نہ اس میں جلن ہوتی
کاش یہ رات ہوتی مگر نیند نہ ہوتی
نہ خواب میں اس کو دیکھتے نہ ہمیں تکلیف ہوتی
کاش کہ پانی ہوتا مگر پیاس نہ ہوتی
نہ یوں لب ترستے نہ پینے کی آس ہوتی
کاش کہ دریا ہوتا مگر گہرائی نہ ہوتی
ہم تیر جاتے اگر یہ سچائی نہ ہوتی
کاش کہ رشتے ہوتے مگر دردی نہ ہوتی
ہم چھوڑ دیتے سب کو، اگر یہ مجبوری نہ ہوتی
(لاہوتی عمار.....آھدی موڑ دوتالہ)

☆☆

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھیانک چیخ

نظارت نصر۔ فیصل آباد

بھیانک چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا، ڈھائی گز لمبا ایک موٹا سیاہ ناگ لڑکی کی کمر کے گرد بل دے کر جکڑ چکا تھا اور پھر سانپ نے اپنا پھن عین لڑکی کے چہرہ کے قریب کرلیا تو ڈر و خوف سے لڑکی کی آنکھیں باھر کو ابل پڑیں اور وہ حواس سے بیگانہ ہوگئی۔

دل ودماغ پر سکتہ طاری کرتا......ایک عجیب وغریب خونی ودہشت ناک شاخسانہ

درمیانی رفتار سے دوڑتی گاڑی میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی میں بیٹھی اس حسین وجمیل دوشیزہ کی مخروطی انگلیاں اسٹیئرنگ وہیل کو بڑی نزاکت اور مہارت سے تھامے ہوئے تھیں۔

ڈرائیو کرتے کرتے اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے موبائل کو اٹھا کر ٹائم دیکھا۔ وقت شاید کم رہ گیا تھا کہ اس نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ چند منٹ بعد گاڑی دائیں طرف مڑ گئی۔ اس سڑک پر زیادہ تر عمارتیں دفاتر پر مشتمل تھیں۔

گاڑی بے نیازی سے اونچی اونچی عمارتوں کو نظر انداز کرتی آگے بڑھتی جارہی تھی۔ کچھ مزید فاصلہ طے کرکے گاڑی ''نورہائٹس'' کے پارکنگ لاج میں جاکر رک گئی۔

دوشیزہ نے بڑی ادا سے دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر آگئی۔ قدرے تیز رفتاری سے اس نے لفٹ تک کا فاصلہ طے کیا اور لفٹ میں سوار ہوگئی۔ آفس ٹائم شروع ہورہا تھا۔ عمارت میں بھی لوگ آجارہے تھے وہ سب کو نظر انداز کیئے اپنی ہی دھن میں تھی۔

لفٹ تیزی سے اوپر اٹھ رہی تھی۔ چند لمحوں بعد لفٹ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ دروازہ کھلا تو لفٹ میں سوار دیگر دو مردوں کے ساتھ وہ بھی باہر آگئی۔ ابھی اس نے کاریڈور میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے سے آتے ایک خوبرو جوان نے چہک کر کہا ''گڈ مارننگ مس یمنیٰ!''

لڑکی کے خوبصورت ہونٹ مسکرا اٹھے۔ ''گڈ مارننگ مسٹر شاد کیسے ہیں آپ؟''

''بہت اچھے ایک دم فٹ، آپ سنائیں، آپ کیسی ہیں؟''

وہ دونوں ایک ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ لڑکی ایک دروازے کے سامنے جاکر رک گئی تھی۔

''میں بھی بالکل فٹ ہوں۔ ابھی تو ورکنگ آورز ہیں لنچ میں بات کریں گے۔''

جوان کے چہرے کے رنگ قدرے پھیکے پڑ گئے۔ مگر اس نے خود کو سنبھال لیا زبردستی مسکراتے ہوئے بولا۔

''آپ لنچ کی تو بالکل بات نہیں کریں اس وقت تو آپ کی جھلک بھی دکھائی نہیں دیتی ہم جیسے عام ورکروں کو۔''

لڑکی کے ماتھے پر شکن نمودار ہوگئی۔

''طنز مت کرو۔ ایک پروجیکٹ ڈسکس کرنا تھا۔ اسی سلسلے میں مجھے لنچ باس کے ساتھ کرنا پڑا۔''

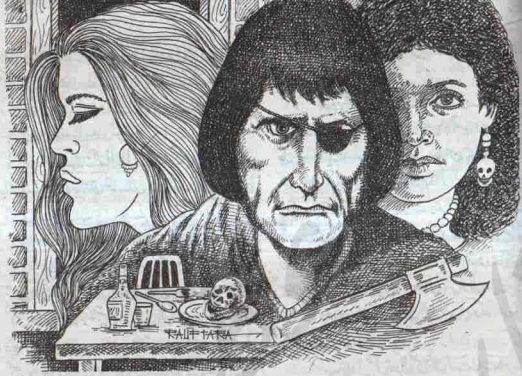

اس کے ساتھ ہی وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی، جوان نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے دروازے پر لگی تختی کو دیکھا جس پر لکھا تھا۔ ''اسسٹنٹ منیجر۔''

اس نے سر جھٹک کر اپنے خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا اور آگے بڑھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایک فائل کا مطالعہ کرنے میں بری طرح منہمک تھی جب اس کے سامنے میز پر رکھے فون کی گھنٹی بجی، اس نے نگاہیں فائل پر مرکوز رکھے ہوئے فون اٹھالیا۔

''ہیلو!'' انداز مصروف سا تھا۔

''میڈم! باس کمرے میں آپ کا انتظار کررہے ہیں، وہ نئی ڈیل کے بارے میں آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

دوسری طرف باس کی سیکریٹری تھی۔ اس نے ''اوکے میں ابھی آرہی ہوں۔'' کہہ کر فون رکھ دیا۔ سامنے میز پر کھلی ہوئی فائل بند کی اور پرس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر اس نے میز کا سب سے نچلا دراز کھولا۔ اگلے لمحے وہ گھبرا کر اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی۔ سرخ کور والی فائل دراز میں نہیں تھی۔

اس نے بہت پریشانی کے عالم میں سارے دراز یکے بعد دیگرے کھنگال ڈالے۔ مگر مطلوبہ فائل ان میں نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح پتہ تھا کہ اس فائل میں کروڑوں کی ڈیل بند تھی۔ اگر وہ فائل نہیں ملتی تو اس سے باس کو ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ یا اگر وہ فائل کسی دشمن کمپنی کے ہاتھ لگ گئی تو ان کی کمپنی کی ساکھ ہی تباہ ہوجاتی۔

وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ فائل اس نے نچلے دراز میں خود رکھی تھی مگر اب وہاں باقی سب کاغذات تو موجود تھے مگر فائل نہیں تھی۔ فائل کھوئی نہیں تھی چرائی جاچکی تھی۔ یہ اسے یقین ہوگیا تھا۔ مگر کیسے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

اس کے دراز کا تالا سلامت تھا۔ اس نے خود تالا کھولا تھا۔ پھر دفاتر کو برابر طریقے سے بند کیا جاتا تھا۔ اور یہ ذمہ داری بابا فضل کی تھی وہ پچھلے دس سال سے اس کمپنی میں ملازم تھے۔ ان کی وفاداری پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ سراسیمہ سی کھڑی تھی جب فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس نے یوں فون کی طرف دیکھا جیسے اس میں سے موت کا پیغام اسے سنایا جانے والا ہو۔ گھنٹی مسلسل بج

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہی تھی۔ ناچار اسے اٹھانا ہی پڑا۔ دوسری طرف باس کی سیکریٹری تھی جو اسے باس کی طرف سے ملنے والا حکم سنا رہی تھی کہ وہ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں باس کے سامنے حاضر ہو جائے۔

یمنی کے لئے فرار کی کوئی راہ نہیں بچی تھی اسے باس کے پاس جانا ہی تھا۔ اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری اور باس کے پاس جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

پر ہول سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ کبھی اس حویلی کی بڑی شان رہی ہو گی مگر اب وہاں سامان عبرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ زیادہ تر چمگادڑیں آدھی گر چکی تھیں کچھ کمروں کی دیواروں میں بڑے بڑے شگاف یادراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی چھتوں کی پرہیبت شگافوں میں کئی جگہ کسی پرندے کے اجڑے ہوئے گھونسلے موجود تھے۔ شائد کبھی وہ یہاں بستے ہوں گے مگر اب یہ حویلی مکمل طور پر ویران تھی۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے روش تھی جس میں اب فٹ فٹ اونچی گھاس اگی ہوئی تھی۔ روش کی چھت میں بھی کئی بڑے بڑے سوراخ تھے۔ روش کے اختتام پر ایک نیم دائرے میں وسیع برآمدہ بنا ہوا تھا جس میں کئی کمروں کے دروازے تھے۔

ایک طرف شکستہ سیڑھی تھی۔ چھت پر بھی دو کمرے بھی رہے ہوں گے مگر اس وقت تو وہاں صرف ٹوٹی پھوٹی دیواریں ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ سیڑھی اس قدر خستہ تھی کہ اگر کوئی اس پر چڑھنے کی کوشش کرتا تو یقیناً وہ زمین بوس ہو جاتی۔

ساری حویلی میں ویرانی اور شکست و ریخت کا عمل واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اچھی طرح جائزہ لے کر اس نے ایک قدرے اچھی حالت والے کمرے میں ایک طرف اپنے ساتھ لایا ہوا سامان رکھ دیا۔

وہ ایک گہرے سانولے رنگ کا پست قامت دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کے لمبے میلے اور الجھے ہوئے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ایک میلا سا چغہ پہنے ہوئے تھا۔ گلے میں کئی طرح کی موتیوں کی مالائیں پہنی ہوئی تھیں۔ وہ شکل سے ہی ایک پیشہ ور جادوگر دکھائی دے رہا تھا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد اس نے کمرے کے وسط میں جگہ صاف کی۔ سامان کا تھیلا اس صاف جگہ پر رکھ دیا۔ اور خود بھی بیٹھ گیا۔ سامان میں سے پہلے کھانا نکال کر کھایا۔ پھر دو پنجرے نکال کر باہر رکھ دیئے۔ ایک پنجرے میں چار مینڈک بند تھے اور دوسرے پنجرے میں ایک چھوٹا الوتھا۔ پھر اس نے ایک بڑا تھال نکالا ایک چھوٹے تھیلے میں سے مختلف جڑی بوٹیاں، سینگ اور پھولوں کی پتیاں اس تھال میں ڈال دیں، پھر اس نے موم بتیوں کا ایک پیکٹ نکال کر باہر رکھا اور خالی تھیلے کو ایک طرف پھینک دیا۔

سب تیاری مکمل ہو گئی تھی بس اسے رات ہونے کا انتظار کرنا تھا۔ اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر سامنے رکھ لی۔

وہ ایک لڑکی کی تصویر تھی جو بے حد خوبصورت تھی۔ اس کے ریشمی بال اس کے شانے اور شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ کسی بات پر ہنس رہی تھی۔

"لڑکی تو واقعی بڑی سندر ہے۔ اس کے لئے تو کوئی بھی کشٹ اٹھانے پر آمادہ ہو جائے گا۔"

وہ کچھ دیر تصویر دیکھتا اور زیر لب بڑبڑاتا رہا پھر تصویر تھال میں رکھ کر خود آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے عمل کو شروع کرنے کے لئے ابھی تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ وہ اتنی دیر میں آرام کر نا چاہتا تھا۔

☆.....☆.....☆

"یس ایم ڈی ڈیشان اسپیکنگ"

فون اٹھا کر اس نے بڑے باوقار انداز میں کہا۔ دوسری طرف کسی سیکورٹی ایجنسی کا نمائندہ بات کر رہا تھا۔

ڈیشان شاہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیا رپورٹ ہے۔ میں چور کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

سیکورٹی ایجنسی والے نے اسے تسلی دی اور بتایا

کہ انہوں نے خفیہ کیمرے نصب کر دیئے ہیں۔ اب جو کوئی بھی کمرے میں داخل ہو گا یہ کیمرے اس کی تصویر بنالیں گے۔ وہ مطمئن ہو گیا۔ اس کی اسکریپ خریدنے کی کمپنی تھی۔ ان دنوں ایک بڑا بحری جہاز کا ملبہ بیچنا چاہتا تھا۔ مسٹر ڈیشان شاہ کے علاوہ اس کا ایک کاروباری حریف نذیر ملک بھی اس سودے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

شاہ نے اپنی واقفیت کی بناء پر یہ سودا تقریباً طے کرہی چکا تھا کہ اس کی قابل اعتماد نائب کے مقفل دراز سے مسودے کی فائل چوری ہو گئی۔ مسٹر شاہ کو آج سے پہلے یمنی سے کبھی کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ پچھلے ساڑھے تین سال سے اس کے پاس کام کر رہی تھی۔ مگر کسی کے بدلنے میں دیر کتنی لگتی ہے۔ مسٹر شاہ نے اگرچہ فوری طور پر اسے کچھ نہیں کہا تھا مگر اس نے سارے اسٹاف سے چھپا کر ایک سیکورٹی ایجنسی سے کہہ کر سارے آفس میں خفیہ کیمرے نصب کرا دیئے تھے تاکہ اس چور کو پکڑا جا سکے۔

فائل چوری ہونے سے اس کا کوئی بڑا نقصان نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے احتیاطاً اس فائل کی ایک کاپی اپنے پاس بھی رکھی ہوئی تھی۔ بس اسے یہ کہنا پڑا تھا کہ اس سے پہلے کوئی دوسری پارٹی اسے زیادہ آفر دیتی، اس نے ادائیگی کر دی۔ اس طرح اس کے سر سے فوری خطرہ ٹل گیا تھا۔ لیکن وہ آئندہ ایسے کسی ممکنہ نقصان سے بچنے کے لئے پیشگی اقدامات کر رہا تھا۔

ادھر یمنی خاموش اپنی چیئر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر چور کون ہو سکتا ہے؟ باس نے اگرچہ اسے کچھ نہیں کہا تھا۔ مگر باس خاموش تھا۔ پتہ نہیں اس خاموشی کے پیچھے کیا چھپا تھا۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ کس طرح یہاں سے فائل کو چور سمیت برآمد کر کے باس کے سامنے پیش کر دے اور اپنا بے گناہی ثابت کر دے۔

تھکن کے احساس سے اس نے آنکھیں موند کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔ چند لمحوں بعد اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ارد گرد کا جائزہ لیا۔ مگر کمرے میں اس کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

لیکن اگلے ہی لمحے اس کی بھیانک چیخوں سے کمرہ گونج اٹھا۔ دو ڈھائی گز لمبا ایک موٹا سیاہ ناگ اس کی کمر کے گرد بل دے کر اسے جکڑ چکا تھا۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا۔ سانپ نے لہرا کر اپنا پھن یمنی کے چہرے سے چند انچ کے فاصلے پر عین اس کے سامنے کر لیا اور اب یمنی کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ یمنی کا کھلا ہوا منہ خود بخود بند ہو گیا، وہ اتنی خوفزدہ ہو چکی تھی کہ اس کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔

لیکن اس سے پہلے کہ سانپ اسے کوئی اور نقصان پہنچاتا۔ اس کی چیخوں کو سن کر باہر سے کئی لوگ دوڑے آئے۔ ان میں سب سے آگے شاد تھا۔ یمنی کو ایک جسیم سانپ کے شکنجے میں دیکھ کر وہ سب اپنی جگہ جم کر رہ گئے۔ ان کی ذرا سی غلطی یمنی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا سکتی تھی۔

سانپ اتنے سارے لوگوں کی آمد کے باوجود یمنی سے ویسے ہی لپٹا ہوا تھا۔ خوف کی شدت سے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ سانپ نے پھن موڑ کر آنے والوں کی طرف دیکھا۔ اتنی دیر میں شاد بھی سنبھل چکا تھا۔ وہ تیزی سے مڑا۔

"ریوالور یا گن جلدی کرو۔" اس نے جاتے جاتے اپنے ساتھ آنے والوں سے چلا کر کہا اور خود گارڈ کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ سانپ کو نشانہ بنانے کا اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ شاد علی کے قدموں میں جیسے پہیے لگے ہوئے تھے اس نے دس منٹ کا فاصلہ پانچ منٹ میں طے کر لیا۔ وہ یمنی کے لئے اپنی جان بھی دے سکتا تھا۔ گارڈ سے ریوالور جھپٹ کر وہ جب کمرے میں پہنچا تو وہاں کوئی بھی سانپ نہیں تھا۔

یمنی اسی طرح کرسی پر بے ہوش پڑی تھی مگر سانپ سامنے موجود نہیں تھا۔ شاد علی نے احتیاط سے قدم آگے بڑھائے، تب تک کئی دوسرے افراد بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

آ گئے تھے۔ شاہ علی نے کرسی کے برابر پہنچ کر دیکھا مگر سانپ وہاں بھی نہیں تھا۔

پورے فلور پر کھلبلی مچ گئی۔ اتنا بڑا سانپ اس معروف علاقے میں آیا کہاں سے؟ اور پھر اب گیا کہاں؟ چونکہ سب لوگ باہر چلے گئے تھے اس لئے کسی نے بھی سانپ کو جاتے یا کہیں چھپتے نہیں دیکھا تھا۔

باس کو اطلاع کردی گئی تھی۔ باس نے اسٹاف کی چھٹی کردی اور یمنی کو اسپتال بھجوانے کے لئے ایمبولینس کال کرلی۔ اس کے بعد اس نے ایک کال سیکورٹی ایجنسی میں بھی کی۔ وہ یمنی کے کمرے کے خفیہ کیمروں کی مدد سے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ سانپ وہاں آیا کیسے اور اب گیا کہاں؟''

ایجنٹ سے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ تقریباً نصف گھنٹے کے بعد مسٹر شاہ کا فون آ گیا۔ ایجنٹ نے کہا۔

''جناب حیرت انگیز بات ہے۔ یہ سانپ کیمرے کی آنکھ سے بچ کر نہ جانے کیسے کمرے میں داخل ہوا تھا کیونکہ اس کی تصویر صرف اسی وقت کی ہے جب وہ میڈم کو بچکر رہا تھا۔ شائد وہ روشن دان کے ذریعے کمرے میں آیا ہوگا۔

اور جناب اس سے بھی بڑی حیرت کی بات ہے کہ جب سب لوگ کمرے سے نکل گئے تو سانپ نے میڈم کا چہرہ اپنی زبان سے چھوا پھر آہستہ سے نیچے اتر کر میز کے نیچے چلا گیا۔ اس کے بعد وہ کہاں گیا؟ یہ معلوم نہیں کیونکہ کیمرے میں اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔''

رپورٹ دے کر ایجنٹ خاموش ہوگیا۔ وہ مزید احکامات کا منتظر تھا۔ مسٹر شاہ نے کہا۔

''ایسا کرو تم اپنے ماہر شانہ بازوں کے ہمراہ یہاں آ جاؤ۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ سانپ ابھی تک میز کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ تم اپنی نگرانی میں اس کا خاتمہ کراؤ، اس کے لئے تمہیں علیحدہ سے ادائیگی کی جائے گی۔''

فون رکھ کر وہ اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ایجنٹ کو یہاں پہنچنے میں دس پندرہ منٹ تو لگ ہی جانے تھے۔ چند لمحے اسی طرح گزر گئے تب اسے یمنی کا خیال آیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر فون کر رہا تھا۔ جس اسپتال میں یمنی کو بھیجا گیا تھا وہاں کا ایک سینئر ڈاکٹر مسٹر شاہ کا دوست تھا۔ اس نے اسی ڈاکٹر سے رابطہ کر کے یمنی کا حال پوچھا۔ تو ڈاکٹر نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ لڑکی شدید خوف اور صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہوئی ہے اسے دو مرتبہ ہوش میں لایا گیا ہے مگر وہ پھر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اس لئے اسے اب بے ہوش ہی رکھا گیا ہے۔ جب خوف کے اثرات کم ہوں گے تو وہ از خود ہوش میں آ جائے گی پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

شاہ مطمئن ہوگیا۔ چند گھنٹوں بعد وہ ایجنٹ اپنے ہمراہ دو آدمیوں کو لے کر آ گیا۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے سارے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لی مگر سانپ کو نہ ملنا تھا نہ ملا۔

دوسری طرف وہاں سے کافی دور ایک بڑے سے آفس میں بھاری چہرے اور بڑی بڑی مونچھوں والا ایک سیاہ رو شخص بڑے غرور سے کرسی پر براجمان تھا۔ چند لمحے تک وہ ایک فائل کا مطالعہ کرتا رہا پھر اس نے فون اٹھا کر ایک نمبر ملایا۔

''دیکھو دوست! یہ جس شخص کی فائل تم نے مجھے بھجوائی ہے میں اس کے کارنامے پڑھ کر بہت حیران ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ ہمارے زیادہ کام آ سکتا ہے۔ اس لئے تم آج ہی جاؤ اور اسے بھی ہمارے لئے ہائر کرلو۔ وہ جتنی بھی رقم کا مطالبہ کرے تم اسے ادا کر دینا میں کسی بھی قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ سمجھ گئے نا تم۔''

رابطہ منقطع کرنے سے قبل اس نے دوسری طرف کی بات سن لی تھی پھر اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

''میں نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا ہے۔ اس مرتبہ بھی فتح میرے قدم چومے گی۔''

☆.....☆.....☆

مسٹر شاہ پریشانی کے عالم میں اپنے آفس کی بڑی سی میز کے پیچھے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کیمروں کی موجودگی میں اس مرتبہ اس کے آفس سے ایک بڑی رقم چوری ہوگئی تھی مگر کیمرے میں کسی شخص کی کوئی تصویر نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ چور کا وجود ہی نہ مرئی تھا۔ جسے کیمرے کی آنکھ دیکھ نہیں سکی تھی۔

دوسری طرف یمنی ابھی تک بے ہوش تھی۔ ڈاکٹروں کی اسے ہوش میں لانے کی ساری کوششیں ناکام ہوگئی تھیں ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ ''تمہیں سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر اسے ہوا کیا ہے بظاہر یہ بالکل ٹھیک دکھائی دیتی ہے مگر اسے ہوش نہیں آ رہا ہے۔''

پولیس میں رپورٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مسٹر شاہ اپنے ملک کی پولیس کی کارکردگی سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ جب پریشانی حد سے بڑھی تو وہ اٹھ کر گھر آ گیا، اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اپنے کمرے کی طرف جانے کی بجائے وہ کچن میں آ گیا مگر وہاں خانساماں نہیں تھا۔ سوائے چوکیدار کے اسے ابھی تک کوئی نوکر بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ لیکن اس نے زیادہ توجہ نہ دی۔

خانساماں کو ایک دو آوازیں دیں پھر خود ہی فریج کھول کر دودھ کا جگ نکال لیا۔ ابھی وہ اسے گلاس میں انڈیلنا چاہ رہا تھا کہ اس کی نظر جگ میں موجود دودھ پر پڑی اس میں چھوٹے چھوٹے کئی سیاہ سانپ تیر رہے تھے۔

شاہ اچھا بھلا جی دار آدمی تھا مگر اس نظارے سے اس کا ہاتھ کانپا اور جگ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا پڑا اور ٹوٹ گیا دودھ اور سانپ فرش پر بکھر گئے۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ کر دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ سانپ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے نکاسی کی نالی میں جا گھسے اور غائب ہوگئے۔

اس کا دل خراب ہوگیا۔ کچن سے باہر آ کر اس نے نوکروں کو کئی آوازیں دیں مگر کوئی نہ آیا اس مرتبہ اسے تشویش ہوئی۔ وہ انہیں تلاش کرنے لگا پورا

جسم کو مٹھی کھا جائے گی.....!

ایک شخص نے سعید بن عاصؓ سے فی سبیل اللہ کچھ مانگا۔ سعیدؓ نے اپنے خادم سے کہا۔ ''اسے پانچ سو دیدو۔'' خادم اندر گیا۔ پھر لوٹ کر آیا اور پوچھا۔ ''پانچ سو دینار یا پانچ سو درہم؟''

سعیدؓ نے کہا۔ ''میری مراد اس وقت پانچ سو درہموں ہی سے تھی مگر اب جب کہ تو نے پوچھ ہی لیا ہے تو اسے پانچ سو دینار ہی دے دو۔''

یہ سن کر سائل کے آنسو بہہ پڑے۔ سعیدؓ نے پوچھا۔ ''اے شخص تو کیوں رو رہا ہے۔''

سائل نے جواب دیا۔ ''میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ تیرے جیسے سخی کے جسم کو مٹی کھا جائے گی۔''

(ایس امتیاز احمد۔ کراچی)

گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ تلاش سے تھک کر وہ اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکل گئی۔ اس کے بیڈ کی سفید چادر پر ایک قوی الجثہ سیاہ ناگ بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ اور اس کے سب نوکر یہاں بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ شاہ خالی ہاتھ تھا۔ وہ پلٹ کر بھاگا اور چوکیدار کو چیخ کر اندر بلایا اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر واپس کمرے میں آیا تو سانپ غائب ہو چکا تھا۔ اس نے طویل سانس لیا۔

اچھا تو آفس کا سانپ بھی اسی طرح غائب ہوا تھا۔'' اس نے چوکیدار سے کہا کہ وہ ان سب نوکروں کو ہوش میں لے آئے اور خود اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شاہ کا وہ دوست اس کا سب سے مخلص اور دیرینہ ساتھی تھا۔ شاہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ پہلے والد کا انتقال ہوگیا اور پچھلے سال والدہ کا بھی انتقال ہوگیا تھا۔ وہ اپنی کوٹھی میں اکیلا نوکروں کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ جب بھی اس کا دل اداس ہوتا وہ اپنے دوست وسیم کے گھر آجاتا تھا۔ اس نے وسیم کو ساری بات بتادی۔ سن کر وہ بھی کافی پریشان ہوگیا۔ اس نے پہلے تو اسے دلاسہ دیا پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"دیکھو شاہ! تمہارا کوئی دشمن تمہیں ہراساں کرنا یا نقصان پہنچانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے اس نے کالے جادو کا سہارا لیا ہے اگر بات دو بدو لڑائی کی ہوتی تو ہم دونوں مل کر لڑتے مگر اب بات سفلی طاقتوں کی ہے۔ اب ہمیں کسی اللہ والے کی مدد کی ضرورت پڑے گی۔ میں ایک ایسے بزرگ کو جانتا ہوں اگر وہ ہماری مدد کے لئے آمادہ ہوگئے تو ہم اس شیطانی چکر سے نکل آئیں گے" شاہ نے سارا معاملہ اس کے سپرد کردیا۔ دونوں نے مل کر کھانا کھایا۔ اور شام کو ان بزرگ کے پاس جانے کا فیصلہ کرکے آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے۔

سوتے ہی شاہ نے خواب دیکھا کہ وہ ایک جنگل میں بھٹک گیا ہے۔ یمنیٰ اس کے ساتھ ہے۔ ہر طرف سانپ ہی سانپ ہیں وہ ان سے بچنے کے لئے بھاگتے پھر رہے ہیں پھر اسے شاد علی نظر آیا وہ ایک بوڑھے جادوگر سے گتھم گتھا تھا۔ پھر اس نے ایک بڑے پتھر سے جادوگر پر حملہ کردیا۔ جادوگر نے اس پر جادو کے زور سے ایک آگ کا گولہ پھینکا اور شاد علی اس آگ کی لپیٹ میں آگیا۔ شاہ اسے جلتا دیکھ کر بری طرح چلایا ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور تھا۔ اور سانس دھونکنی کی مانند چل رہی تھی۔ اس نے پانی پیا اور اس خواب کے منظر پر غور کرنے لگا۔

☆......☆......☆

وہ سڑک کبھی کشادہ رہی ہوگی مگر اس وقت تو ریڑھیوں خوانچہ فروشوں اور پیدل چلنے والوں کے رش کی وجہ سے بہت تنگ ہوگئی تھی سامنے ہی ایک پرانی اور قدرے ٹوٹی ہوئی دو منزلہ عمارت تھی۔ شاد علی سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل پر آگیا۔ ایک کمرے میں مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بھی بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ لوگ اپنی باری پر اگلے کمرے میں جارہے تھے۔ آدھے گھنٹے بعد اس کی باری بھی آگئی۔ کمرے میں ایک عامل بیٹھا تھا۔ شاد علی کو دیکھتے ہی اس نے کہا۔

"اوبابو! گروجی تیرا کام کرنے غریب آباد کی ٹوٹی حویلی میں گیا ہوا ہے۔ بس چند دن اور لگیں گے اور تیرا کام ہوجائے گا۔"

شاد علی نے فیس اسے تھمائی اور باہر آگیا۔ ویگن اسٹینڈ پر اسے غریب آباد جانے والی ویگن مل گئی وہ بھی اس میں سوار ہوگیا، اس کے چہرے پر دبے دبے غصے کے آثار تھے۔ مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچ کر وہ ویگن سے اتر گیا۔ ٹوٹی حویلی کی تلاش میں اسے کافی دیر خوار ہونا پڑا بالآخر ایک رکشہ والا دگنا معاوضہ لے کر اسے وہاں تک چھوڑ آیا۔

ویران علاقے میں ٹوٹی ہوئی یہ حویلی عجیب بھیانک منظر پیش کررہی تھی۔ اگر عام حالات میں کوئی اسے اس اجاڑ کھنڈر میں داخل ہونے کو کہتا تو وہ کبھی بھی جرأت نہ کرتا مگر اس وقت اس کی جان پہ بنی ہوئی تھی۔ اس کی محبت داؤ پر لگی تھی۔ وہ اسپتال سے یمنیٰ کو دیکھ کر آیا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ گروجی نے یمنیٰ کو اس کے لئے رام کرنے کی بجائے جان سے مارنے کے لئے جادو کیا تھا۔

اسے خود پر بھی افسوس تھا کہ اس نے کیوں یمنیٰ کی محبت پانے کے لئے جادو کا سہارا لیا۔ دراصل وہ مسٹر شاہ کو اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ تھوڑی تگ و دو کے بعد وہ گروجی کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ ایک دائرے میں بیٹھا تھا۔ چاروں طرف مینڈکوں کے مردہ اجسام کے ساتھ موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک طرف الو پنجرے میں پڑا تھا اور گرو آنکھیں بند کئے جادو کرنے میں مشغول تھا۔

یہ دیکھ کر شاد علی کی آنکھوں میں خون اتر آیا کہ گرو نے یمنیٰ کی تصویر میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں اسے ایک مرتبہ کسی نے بتایا تھا کہ سوئیاں کسی کو مارنے یا روح کو اپنے قبضے میں کرنے کے لئے چبھوئی جاتی ہیں۔ اس نے چلا کر کہا۔

"گرو آنکھیں کھول تیرا برا وقت آگیا ہے۔ میں نے تجھے یہ نہیں کہا تھا کہ میری محبت کو قتل کردے۔"

اس نے قریب پڑی ہوئی ایک اینٹ اٹھا کر اس کے سر پر دے ماری تو گرو کا سر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور وہ دائرے میں گر کر تڑپنے لگا۔ اس کا منتر ٹوٹ گیا تو اس کے بیروں نے شاد علی پر حملہ کردیا۔ وہ بھی گر کر تڑپنے لگا۔ چند لمحوں بعد دونوں ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔ پنجرے میں بند الو کریہہ چیخ مار کر خاموش ہوگیا۔ ویران حویلی میں دو لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔

☆......☆......☆

گاڑی کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ مغرب سے پہلے وہاں پہنچنا چاہتے تھے۔ دوپہر کے خواب کا اس پر بہت اثر تھا اس لئے شاہ ظل بالکل خاموش تھا۔ وسیم بھی خواب سن چکا تھا۔ اسے بھی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ انہوں نے شاد علی سے رابطہ کرنے کی کوشش کی بھی مگر دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی مگر شاد علی نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بھی فکرمند ہوگئے تھے۔

آدھے گھنٹے کی مزید ڈرائیو کے بعد وہ ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ گئے۔ اس کے درمیان میں ایک سادہ سی مسجد بنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا حجرہ تھا اس حجرے کا دروازہ بند تھا۔

وسیم نے گاڑی ایک طرف کرکے روک دی۔ دونوں اتر کر مسجد میں چلے گئے۔ وضو کرکے فارغ ہوئے تو مسجد سے اذان کی آواز بلند ہونے لگی۔ انہوں نے بھی جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اس کے بعد لوگ ایک طرف ہوکر بیٹھ گئے اور اگلی صف میں سے ایک باریش بزرگ ان کے سامنے بیٹھ گئے۔

وسیم نے شاہ کو بتایا کہ یہ وہی بزرگ ہیں جن کی خاطر وہ یہاں تک آئے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے مسائل بیان کرتے رہے بزرگ انہیں دعائیں اور کسی کسی کو تعویز بھی دے رہے تھے۔ یہ دونوں خاموشی سے ایک طرف بیٹھے رہے۔ دراصل ان کا ارادہ تھا کہ سب کے جانے کے بعد وہ ان سے بات کریں گے۔

جب آخری آدمی بھی اٹھ کر چلا گیا تو بزرگ کے سامنے وہ دونوں مؤدب بیٹھ گئے۔ پرنور چہرا والے بزرگ نے مسکرا کر ان کی سمت دیکھا تو وسیم بولا۔

"جناب! یہ میرا دوست ذیشان شاہ ہے۔ اس کی اسکریپ خریدنے کی کمپنی ہے۔ شاید کسی کاروباری حریف نے اسے نقصان پہنچانے کے لئے اس پر جادو کروایا ہے۔"

اس کے بعد اس نے ساری بات ان بزرگ کو تفصیل سے بتادی اور خواب بھی سنادیا۔ بزرگ خاموشی سے سنتے رہے جب وہ خاموش ہوا تو انہوں نے فرمایا۔

"ابھی دیکھ لیتے ہیں" اور ساتھ ہی آنکھیں بند کرلیں۔ چند منٹ کے بعد بزرگ نے آنکھیں کھولیں اور بولے۔

"دیکھو میاں! تمہارا کاروباری حریف تمہیں نقصان پہنچارہا ہے۔ اس کے علاوہ لڑکی کا معاملہ ہے۔ اس کے لئے پہلے تمہارے ہی ایک نوکر نے کسی سے جادو کروایا۔ لیکن اسی جادوگر سے وہ کاروباری حریف بھی جادو کروا رہا تھا وہ بھی اس لڑکی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جادوگر کی اپنی نیت بھی خراب ہوگئی تھی۔ تمہارے اس نوکر نے اس کو تلاش کرکے اسے ہلاک کردیا۔ تو جادوگر کے بیروں نے اس لڑکے کو مار ڈالا لڑکا مسلمان ہے۔ غریب آباد کی حویلی سے اس کی لاش اٹھوالو اور دفن کروادو جادوگر ہندو تھا۔ اسے رہنے دینا اس کے چیلے خود ہی اسے اٹھالیں گے۔"

بزرگ خاموش ہوگئے تو وسیم نے کہا۔

"جناب! ایک تو اس حریف کا نام بتادیں،

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسرے اب جب جادو گر ہلاک ہو چکا ہے تو جادو کا توڑ تو خود بخود ہو گیا ہو گا یا بھی کوئی عمل کروانا پڑے گا؟"

ان بزرگ نے مسکرا کر کہا۔

دیکھو میاں! نام تو میں بتا تا نہیں۔ دوسری بات کہ اس شخص نے ایک اور جادو گر کو بھی تمہارے اور لڑکی کے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس لئے محنت تو کرنا پڑے گی۔ تم کل آنا میں تمہیں تعویذ دے دوں گا۔"

اس کے بعد انہوں نے اب تک خاموش بیٹھے ذیشان شاہ کی طرف رخ کیا اور بولے۔

"اگر تم لڑکی کے معاملے میں سنجیدہ ہو تو اس کو تحفظ دو۔ ورنہ اس کی کسی اچھی جگہ شادی ہو جانے دو۔"

شاہ ہکا بکا رہ گیا۔ وہ بات جس کا ذکر اس نے کبھی خود سے بھی نہیں کیا تھا ان بزرگ کو کیسے پتہ چل گئی تھی۔ چند لمحوں بعد اپنی حیرت پہ قابو پا کر اس نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"حضرت! یہ خواہش کئی سال سے میرے دل میں پل رہی ہے۔ مگر میں ٹھکرائے جانے سے ڈرتا ہوں، لڑکی بڑی خوددار ہے۔ اس کا باپ مر گیا ہے مگر بھائی سب اپنا کھاتے کماتے ہیں اور شادی شدہ ہیں، لڑکی نے بھائیوں کا احسان نہیں لیا اور اپنی ماں کے ساتھ الگ رہتی ہے اور خود کماتی ہے۔ مجھے اس کی خود داری سے ڈر لگتا ہے؟"

بزرگ نے اپنا ہاتھ شاہ کے کندھے پر رکھ دیا۔

"دیکھو بیٹا! وہ تمہاری طرف سے پہل کی منتظر ہے اور نکاح کے لئے اس کام میں دیر مت کرو۔"

خوشی سے شاہ کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ دونوں ان بزرگ کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر شاہ نے اپنے چچا زاد اور ایک دوسرے نوکر کو فون کیا کہ وہ غریب آباد کی حویلی سے شادعلی کی لاش اٹھا لائیں۔ اس نے انہیں جادو گر کی لاش اٹھانے سے منع کیا اور یہ بھی کہا کہ اس معاملے کی کسی کو خبر نہیں ہونی چاہئے پھر اس نے شادعلی کے گھر فون کر کے اس کی ایک حادثے میں ڈھیر ہو جانے کی خبر بھی دے دی۔

چونکہ وہ خواب میں شادعلی کو جادو گر کی وجہ سے مرتے ہوئے دیکھ چکا تھا اس لئے اسے پتہ تھا کہ حویلی میں مرنے والا شادعلی ہی تھا۔ وہاں سے دونوں سیدھے اسپتال گئے تھے۔ راستے بھر وسیم اسے چھیڑتا رہا۔ شاہ بہت خوش تھا۔ اسپتال میں یمنیٰ ہوش میں آ گئی تھی مگر ابھی تک خاموش تھی۔ انہوں نے پہلے اس کا حال چال پوچھا پھر اس کی ماں سے ساری بات کی اور پھر وسیم نے یمنیٰ سے رضامندی مانگی اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اسی روز نکاح خواہ اور گواہوں کا بندوبست کیا گیا۔ یمنیٰ کو اسپتال سے ڈسچارج کروا کر وسیم کے گھر لایا گیا اور آدھے گھنٹے بعد وہ یمنیٰ شاہ بن گئی۔ نکاح کے بعد باہمی رضامندی سے طے کیا گیا کہ ابھی نکاح کی خبر کو پوشیدہ رکھا جائے اور اصل دھوم دھڑکے سے نمٹ کر شادی کا ولیمہ پورے دھوم دھڑکے سے کیا جائے۔

اگلے دن شادعلی کے جنازے سے فارغ ہو کر دونوں دوست پھر ان بزرگ کے پاس پہنچ گئے۔ انہوں نے ایک بوتل میں پانی اور چار تعویذ دیئے۔

"یہ پانی ہے اپنے گھر اور دفتر دونوں جگہ چھینٹے مارنا اور میاں بیوی پینا بھی۔ یہ تعویذ ایک خود پہننا ایک اپنی بیوی کو پہنانا اور ایک ایک گھر اور دفتر میں بھی لگا دینا۔ اللہ تمہیں شادی مبارک ہو۔"

اس مرتبہ شاہ حیران نہیں ہوا تھا۔ اس نے بڑی عقیدت سے ان بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔ اور ان سے دعائیں لے کر دونوں دوست واپس آ گئے۔ واپسی سے پہلے شاہ نے ایک لاکھ روپے بزرگ کی خدمت میں پیش کئے اور قبول کر لینے کی درخواست کی۔ تو بزرگ نے کہا۔

"یہ میرے کام کی چیز نہیں ہے۔ پچھلی گلی میں ایک گھر میں شادی ہے یہ رقم لڑکی کے باپ کو دے دو، اللہ تمہیں اجر دے گا۔"

شاہ نے ایسا ہی کیا۔ وہ دل میں پختہ ارادہ کر چکا تھا کہ اب وہ ان بزرگ سے ملتا رہے گا اور یمنیٰ کو بھی ان سے ملوانے لائے گا۔

رات گہری ہو گئی تھی۔ بادلوں کی وجہ سے اتنی تاریکی تھی کہ چند منٹ کے فاصلے پر موجود اشیاء دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ ہوا میں تیزی آتی جا رہی تھی۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اس میں شدت آتی جا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان سے پانی کی چادر زمین پر اتر رہی ہے۔ بجلی اتنے زور سے کڑک رہی تھی جیسے ابھی زمین پر گر کر سب کچھ جلا ڈالے گی۔

چھوٹی سی پہاڑی پر بنا صدیوں پر انا مندر اگرچہ پتھر سے تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر اب اپنی آب و تاب کھو کر سیاہ بھدی عمارت میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مندر میں کمرے سے آگے کمرہ اور پھر اس کمرے کے اندر مزید ایک دروازہ تھا جس کی سیڑھیاں اندر تہہ خانے میں اترتی تھیں۔

تہہ خانے میں ایک طرف آگ جل رہی تھی دوسری طرف کئی پتھر کی مورتیاں رکھی تھیں۔ آگ کے قریب ایک کالا بھجنگ بوڑھا آلتی پالتی مارے آنکھیں موندے زور زور سے کوئی انجانا الفاظ دہرا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ پاس رکھے برتن میں سے کوئی سفوف آگ میں اچھال دیتا جس سے آگ مزید بھڑک اٹھتی تھی۔

وہ انہاک سے اپنے کام میں مصروف تھا کہ اس کی عقبی دیوار میں شگاف پڑا اور ہوا کا تیز جھونکا اندر آ گیا اس سے آگ بجھ گئی ساتھ ہی ایک زوردار کڑاکا ہوا۔ بوڑھا حواس باختہ ہو گیا۔

دیوار کے شگاف میں سے ایک بزرگ اندر داخل ہوئے۔ بوڑھا انہیں دیکھ کر غصے سے چلانے لگا۔

"تیرا ستیاناس ہو۔ تو نے مندر کو بھرشٹ کر دیا۔ میں تجھے برباد کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے منتر پڑھتے ہوئے زور سے ہاتھ جھٹکے اس کے ہاتھوں سے رسیاں نکل کر بزرگ کی طرف بڑھیں مگر ان کے قریب جا کر رسیوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی۔ بزرگ نے مسکرا کر کہا۔

"شیطان کے چیلے! تیرے ایسے حربے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے تجھے پہلے بھی منع کیا تھا مگر تو نہیں مانا اب تیرا کام تمام ہو گا۔"

اس کے ساتھ ہی انہوں نے بلند آواز سے قرآن کی آیات کا ورد شروع کر دیا۔ بوڑھے نے چند اور منتر پڑھے مگر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر وہ منت سماجت کرنے لگا مگر دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پورے جسم میں آگ لگ گئی اور وہ دھڑ ادھڑ جلنے لگا۔ اس کی چیخیں بڑی بھیانک تھیں۔ چند منٹ بعد بوڑھے کی بجائے وہاں راکھ کا ڈھیر پڑا تھا۔

اس کے ساتھ ہی یمنیٰ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ عجیب بے بسی سی محسوس کر رہی تھی۔ صبح اس نے فون پر اپنا خواب شاہ کو سنایا تو وہ کہنے لگا۔

"تیار رہنا میں شام میں تمہیں ان بزرگ کے پاس لے چلوں گا۔"

شام کو دونوں جب وہاں پہنچے تو یمنیٰ نے پہچان لیا۔ یہ وہی خواب والے بزرگ تھے۔ انہوں نے سلام کیا تو بزرگ نے شاہ سے مصافحہ کیا پھر یمنیٰ کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے۔

"تمہیں جو دکھایا ہے وہ اسی لئے ہے کہ تم پرسکون ہو جاؤ، میری ہدایت ہے کہ تم دونوں پانچ وقت کی نماز پابندی سے پڑھا کرو اور اللہ اللہ کیا کرو۔ اللہ تمہاری حفاظت کرے گا۔"

دونوں نے بزرگ سے وعدہ کیا کہ وہ پنجگانہ نماز ادا کیا کریں گے۔ بزرگ نے انہیں دعاؤں کے ساتھ وہاں سے رخصت کیا۔ راستے میں شاہ نے کہا۔

"میں چاہتا ہوں آنے والے اتوار کو ہم ولیمہ کر لیں، تمہارا کیا خیال ہے؟"

یمنیٰ مسکرانے لگی۔

"جیسے آپ کی مرضی باس" اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شمیکا

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔کراچی

دوسرا حصہ

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلفریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

"بیٹا میں رانی پور گاؤں کا رہنے والا ہوں مگر زیادہ تر شہر ہی میں رہا ہوں۔ بہت دنوں سے مجھے اپنے گاؤں رانی پور کی یاد آرہی ہے۔ مناسب سمجھو تو مجھے رانی پور پہنچا دو۔ یہ میری زندگی پر آپ دونوں کا دوسرا بڑا احسان ہوگا۔" بابا نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"بابا آپ ہمارے بزرگ ہیں اور بزرگوں پر بچے احسان نہیں کرتے بلکہ ان کی خدمت کرتے ہیں، ان کا حکم بجالاتے ہیں اور ان کی سیوا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے جس کی ادائیگی سے دلوں کو چین ملتا ہے۔ لہٰذا آپ اسے احسان کا نام نہ دیں۔ ہم آپ کو رانی پور گاؤں چھوڑ آتے ہیں۔" میری بات سن کر اس نے ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کیا۔ اس بار ہم تینوں اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں تھے۔ شمیکا کی بھی پہلی ترجیح یہی تھی کہ بابا کو ان کے گاؤں رانی پور پہنچا دیں۔ بعد میں ہم اپنے شہر، اپنے فلیٹ پر جائیں گے مگر ابھی تو صحرا کا سفر کٹ رہا تھا۔ اس کے بعد گھنے جنگلات سے گزرنا تھا۔ تب کہیں شہر اور پھر گاؤں کی صورت نظر آتی۔ اس بار شمیکا کی پرواز کی رفتار ہوائی جہاز سے تو کیا، ہوا سے بھی تیز لگ رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد بابا کو ان کے گھر چھوڑ آنا چاہتی تھی۔

"بیٹی ذرا رفتار کم کردو۔ کہیں ہواؤں کی تاب نہ لاکر میرا ہاتھ نہ چھوٹ جائے اور میں زمین پر گر پڑوں۔" بابا کی بات سن کر ہم دونوں مسکرا دیئے مگر شمیکا نے ایک فرمانبردار بچے کی طرح فوراً رفتار توڑ دی تھی۔ خدا کا شکر تھا، ہم صحرا پار کر چکے تھے۔ اب گھنے جنگلات کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ یہاں کی تر و تازہ ہوا کا احساس ہی فرحت بخش تھا۔ بھینی بھینی خوشبو ہماری سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ میں چاہ رہا تھا کچھ دیر جنگلات کے اوپر معلق رہ کر بھینی بھینی خوشبو اور مٹی کی سوندھی سوندھی مہک کو محسوس کرکے اپنے ذہن کو معطر کروں۔ پھر ایسا موقع کب ہاتھ آتا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ یکا یک شمیکا جیسے جم سی گئی۔ ہم تینوں فضا میں معلق سے ہوگئے تھے۔ اس بار شمیکا کی نظریں بڑے غور سے کسی جانب گھور رہی تھیں۔ جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔

"کیا ہوا۔ کیوں رک گئیں۔" میں نے شمیکا سے وجہ پوچھی۔

"مجھے ایسا محسوس ہوا ہے کہ وہاں اس گھنے درختوں کے جھنڈ میں چار پانچ آدمی کسی کو زبردستی اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ درخت گھنے ہونے کی وجہ سے وہ اچانک میری نظر سے اوجھل ہوگئے ہیں۔" شمیکا نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گمان ظاہر کیا۔

"کہیں یہ تمہارا وہم تو نہیں ہے۔" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں وہم تو نہیں ہے پھر بھی ہم ذرا نزدیک ہو کر یقینی صورتِ حال پیدا کر لیتے ہیں۔" شمیکا نے کہتے ہوئے ان کے قریب ہونا شروع کر دیا۔ واقعی وہ چار مرد تھے جو ایک بیس یا بائیس سالہ لڑکی کو زبردستی اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ چلائی رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی مگر بے سود۔ وہ چار مرد تھے اور یہ اکیلی اور نازک اندام۔ پہلے تو شمیکا نے فیصلہ کیا کہ ان کے سامنے اتر کر ان کا راستہ روک لیں مگر میں نے اشارہ میں سمجھایا کہ دیکھتے ہیں یہ اس لڑکی کو کہاں لے کر جاتے ہیں اور ان کے ارادے اور ناپاک عزائم کیا ہیں۔ کہیں کوئی ایسی شخصیت یا طاقت تو ان کے پیچھے نہیں ہے، جس کی خاطر یہ کام کر رہے ہوں، ان کا پورا گروپ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص ان لوگوں کو کہیں انگلیوں کے اشاروں پر نچا نہ رہا ہوں۔ ان تمام خدشات اور اندیشوں کی بنا پر ہم نے ان کا تعاقب شروع کر دیا۔ ہم غیر محسوس انداز سے ان کے سروں پر پرواز کر رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ کوئی ان کی کھوج لگا رہا ہے اور ان کا مسلسل تعاقب کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے آپ کو انتہائی محفوظ سمجھ رہے تھے اور بے فکری سے آگے قدم بڑھا رہے تھے۔ جب لڑکی کو درختوں کے ایک جھنڈ میں لے گئے۔ لڑکی نے ہرے گہرے رنگ کی ساڑھی اور لال تیز رنگ کا بلاوز پہن رکھا تھا۔ وہ اس قدر بدحواس ہو کر اپنے آپ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی کہ اسے خیال تک نہیں رہا کہ اس کی ساڑھی کا پلو اس کے سر اور شانے سے پھسل کر نیچے گر گیا ہے اور اس کا گورا بدن بلاوز سے جھانک رہا ہے۔ شمیکا نے زمین پر قدم رکھا تو بابا نے پوچھا۔

"کیا میں آنکھیں کھول دو، کیا رانی پور میرا گاؤں آ گیا ہے۔" میں نے بابا کے کان میں سرگوشی کی۔

"بابا ابھی ہم رانی پور گاؤں نہیں پہنچے۔ ابھی ہم نے آدھا راستہ طے کیا ہے۔ ایک ناگہانی آفت کی وجہ سے یہاں اتر آئے ہیں۔" میں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے بابا کو ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"بابا وہ سامنے درختوں کا جو جھنڈ نظر آ رہا ہے، وہاں چند بدمعاش ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی کو زبردستی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ہم اس لڑکی کی مدد کی نیت سے اس جنگل میں رکے ہیں۔ لہٰذا آپ احتیاط کریں اور بلند آواز سے نہ بولیں۔ کہیں ان بدمعاشوں کو ہماری آمد کی خبر نہ مل جائے۔" میری بات سن کر بابا جی انتہائی محتاط تو ہو گئے مگر مدھم آواز میں کہنے لگے۔

"بیٹا کیسا نازک وقت آ گیا ہے۔ ہر شخص عیاشی کے چکر میں پڑا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے ہر عمل کا ردعمل ہوتا ہے۔ مکافاتِ عمل جاری ہیں۔ یہ لوگ کسی کی ماں بہنوں کو بے آبرو کرتے ہیں تو کوئی ان کی ماں بہنوں کو بے آبرو کر رہا ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے بے حیائی، فحاشی اور زنا کاری عام ہوتی جا رہی ہے۔ مگر افسوس اور صد افسوس تب ہوتا ہے جب یہ لوگ پاکیزہ و پارسا اور شریف یا غریب خاندان کی بچیوں کی عزت کے لبادے تار تار کر دیتے ہیں۔ وہ بے چاریاں زندہ در گور ہو جاتیں ہیں، جیتے جی مر جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر تو جب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتیں تو خودکشی کر لیتی ہیں اور کچھ انتقاماً طوائفیں بن جاتی ہیں اور بہت سی زندہ لاش بن کر اپنی زندگی گزارتی ہیں۔ کاش بدمعاشوں اور عزت کے لٹیروں کو اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ کر دے اور ان کے چنگل سے نیک، پارسا اور پاکیزہ عورتوں کو بچا لے۔" بابا نے بات ختم کی تو میں نے بڑے ادب سے کہا۔

"بابا جی...... آپ یہیں تشریف رکھیں۔ میں اور شمیکا ان بدمعاشوں کی خبر لے کر آتے ہیں۔" ہم نے بابا جی کو ایک درخت کے سائے میں بٹھا دیا۔ میں درختوں کے پیچھے سے اور شمیکا غائب حالت میں اسی راستے سے اس جھنڈ میں چلی گئی جہاں پر وہ لڑکی کو لے

گئے تھے۔ میں بڑی مشکل سے خارزاروں سے بچتا بچاتا جنگلی درندوں کا خیال کرتے ہوئے ان کے اتنے قریب ہو گیا کہ ان کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ میں ایسی جگہ بھی تلاش کر رہا تھا کہ وہ لوگ مجھے نظر بھی آئیں۔ تبھی تو ان کی ہر حرکت پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اچانک میری نظر اس برگد کے گھنے درخت پر پڑی جس کی جڑیں نجانے کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی شاخوں نے آس پاس کے سبھی درختوں سے روابط قائم کیے ہوئے تھے۔ میں ٹارزن کی طرح اس برگد کے درخت پر چڑھ گیا اور اس کے موٹے تنے کی مدد سے غیر لچک دار شاخوں پر چلتا ہوا اس جگہ پہنچ گیا تھا جہاں سے وہ لوگ مجھے نظر آ رہے تھے۔

"بڑا غرور ہے تجھے اپنے حسن پر۔ آج دیکھ ہم ایک ایک کر کے تیرے حسن کے سرخاب کے پر نوچتے ہیں اور تیرے غرور کا آئینہ کس طرح چکنا چور کرتے ہیں۔" اس کے قریب کھڑے ہوئے شخص نے نفرت سے کہا۔

"اس میں غرور کی کیا بات ہے۔ کوئی لڑکا سرِ راہ تمہاری بہن کا ہاتھ پکڑے تو کیا اس کو جواب دینا غرور میں شمار ہو گا۔ میں نے تمہارے بھائی کے منہ پر صرف اس لیے تھوک دیا تھا کہ وہ مجھ سے بازاری زبان میں بات کر رہا تھا۔ جیسے میں اس کی کلاس فیلو نہیں بلکہ کوئی طوائف ہوں اور وہ میرے بدن کا خریدار ہے۔" لڑکی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا تو دوسرا شخص آگے بڑھا۔

"اور اس کے دوست نے تیری ساڑھی کا پلو کیا تھام لیا کہ تو نے اس کے ہاتھ پر اتنے زور سے دانتوں سے کاٹا کہ اس کی تین انگلیاں ناکارہ ہو کر رہ گئیں۔ آج ہم بھی دیکھتے ہیں کہ تجھ میں انصاف پسندی کی عمارت کس حد تک ہے۔ آج ہم بھی چاروں باری باری تیری ساڑھی کا پلو کھینچیں گے۔ اور دیکھیں گے کہ تو وہی سلوک ہمارے ساتھ بھی کرتی ہے یا نہیں۔" اس شخص نے اس کے بال نوچتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں کہ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ اپنے بھائی اور اس کے دوست کی بے عزتی کا بدلہ لینے نہیں بلکہ تم اپنے ہوس مٹانے کے لیے یہاں لے کر آئے ہو۔ تم بہانے تراش رہے ہو۔ مگر یاد رکھو میں مر جاؤں گی، تمہیں اپنی عزت کے لباس کو میلا کرنے نہیں دوں گی۔ اگر مجھے اپنی عزت کی دھجیاں ہی اُڑوانا مقصود ہوتی تو میں تمہارے لچے لفنگے بھائی اور اس کے حرام زادے دوست کی دست درازی پر مزاحمت کیوں کرتی۔" اس لڑکی نے ایک جھٹکے سے اپنے بال چھڑاتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہم بھی دیکھیں گے کہ تو اپنی جان دیتی ہے یا اپنی عزت۔ تیرے جیسی بے شمار لڑکیاں شعلہ بن کر بھڑکیں اور پھر سرد پڑ گئیں۔ وہ جلیں تو سہی مگر بہت جلد راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئیں۔ ان کی آسمان کو چھو لینے والی باتیں زمین بوس ہو گئیں۔ ان کا تکبر اور فخر سے تنا ہوا سر زمین پر رگڑ کھانے لگا۔ ان کے سینے میں بھرا تنتنا ایک آن میں نکل کر رہ گیا۔ وہ بھی پہلے تیری طرح سے بجلی کی طرح چمکتی رہیں اور برق بن کر آشیانہ جلانے کے بلند و بالا دعوے کرتی رہیں۔ بالآخر ہمارے طاقت ور جسموں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو گئیں، تب انھیں اپنے بکھرے ہوئے وجود کے سوا کچھ نہیں ملا۔" وہ ذرا توقف کرنے کو رکا اور پھر بولنے لگا۔

"اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اپنا عزت کا شیرازہ بکھرنے سے بچا لے۔ ہماری مرضی میں اپنی مرضی بھی شامل کر دے تاکہ نہ صرف تو کیف و لذت و سرور سے ہم کنار ہو بلکہ ہم ڈھیر ساری دولت بھی جاتے ہوئے تیری جھولی میں ڈال دیں۔" چوتھے شخص نے اسے دولت کا لالچ اور عزت گنوانے کی دھمکی دی تو اس کا خون کھول گیا۔ شاید اس کی رگوں میں کسی غیرت مند باپ کا خون دوڑ رہا تھا۔ اس نے غضب ناک ہو کر انتہائی نفرت کا اظہار کیا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

"لعنت ہو تمہاری شکلوں اور نیت پر، نجانے تمہاری اس ہوس پرستی اور ہوس ناکی سے تمہاری اپنی ماں بہنیں بھی کیسے محفوظ رہیں ہوں گی۔ تم نے تو ان پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھی غلط نگاہ ڈالی ہوگی اور ہوسکتا ہے تم میں سے کسی نے اپنی سگی ماں یا بہن کو اپنی ہوس کا شکار بھی بنالیا ہو۔" اس سے پہلے کہ وہ اپنے دل کی تمام بھڑاس نکال لیتی، اس کے قریب کھڑے شخص نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "کیا بکتی ہے حرافہ۔" اور پُرجوش انداز میں ہوا میں ایک ہاتھ بلند کیا اور تمام طاقت کو یکجا کرکے اس کے منہ پر تھپڑ دے مارا۔ لڑکی نے خوف سے پلکیں جھپکائیں اور اپنے سر کو ذرا سا خم کیا۔ مگر طمانچہ رسید کرنے کی آواز ذرا سی بھی نہیں آئی۔ اس نے رفتہ رفتہ نگاہ اور سر اوپر اٹھا کر دیکھا تو وہ شخص اب بھی ہوا میں ہاتھ اٹھا کھڑا تھا، اور زور لگا رہا تھا کہ اس کا ہاتھ نیچے کی طرف آئے اور اس کے منہ پر پڑے۔ کافی دیر بعد زور آزمائی کرنے پر بھی وہ اپنا ہاتھ چھڑا نہ سکا تو وہ لڑکی دو قدم آگے بڑھی اور ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کرکے کہنے لگی۔

"بس اتنی ہی مردانگی تھی تجھ میں۔ ایک لڑکی کو اغوا کرکے ویران جگہ پر لانا۔ پھر اسے بے بس کرکے اپنے ساتھی کی مدد سے بے آبرو کرنا، کیا اسی کو مردانگی کہتے ہو تم لوگ، لعنت ہو تمہاری اس مردانگی اور ہوس ناکی پر۔" لڑکی کے ہاتھ کا طمانچہ بہت زوردار تھا۔ اس شخص کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ میں نے بغور اس کا چہرہ دیکھا تو اس پر ان گنت خوف اور ڈر کے اثرات نمایاں ہورہے تھے۔

"یہ کیا کیا تم نے۔ میرے اُستاد کے منہ پر طمانچہ مارا۔ ٹھہر میں تیری خبر لیتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے دوسرے شخص نے اپنی پنڈی پر باندھا ہوا دودھاری خنجر نکال لیا۔ اس پر دھوپ کی شعاعیں پڑیں تو وہ آب دار موتیوں کی طرح چمک دینے لگا۔ وہ شخص خنجر لیے لڑکی کے سر پر پہنچا، وہ بڑا پُرجوش دکھائی دے رہا تھا۔ وہ غضب ناک انداز میں دھاڑا، اور اپنے خنجر بردار ہاتھ کو اپنی فصلی کے پاس سے کرکے پیچھے لے گیا اور انتہائی سرعت رفتاری سے اس کے پیٹ میں خنجر اتار دینا چاہا مگر لاکھ کوشش کے باوجود اور زور آزمائی کرنے کے بعد بھی وہ اپنا ہاتھ اپنے پیٹ سے آگے نہیں لے جاسکا۔ اس لڑکی کے پیٹ میں تو کیا خنجر اُتارتا۔ میں تمام مناظر دیکھ کر مسرت سے جھوم گیا تھا اور شمیکا کے فن اور کرتب کی داد دے رہا تھا۔ دونوں اشخاص کے چہروں پر دہشت کی لکیریں بن گئی تھیں۔ ان کے وحشت ناک چہرے قابلِ دید ہوگئے تھے۔ لڑکی اس چمتکار کو اپنے بھگوان کی کرپا سمجھ رہی تھی اور راون کے ہوتے ہوئے رام کی آمد تصور کررہی تھی۔ شاید وہ شمیکا کو رام کا اوتار سمجھ رہی تھی۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی جو چند لمحوں کے بعد اس کے سامنے کھل کر آنے والی تھی۔ تیسرے شخص کے ہاتھ میں تلوار تھی مگر اس کی ہمت نہیں ہورہی تھی کہ وہ آگے بڑھ کر اس دبلی پتلی لڑکی پر حملہ کرے۔ کیوں کہ وہ اپنے دو ساتھیوں کا احوال دیکھ چکا تھا جو ابھی تک اپنا اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھے۔

"شیام دور کیوں کھڑا ہے بزدل۔ آگے بڑھ کر اس لڑکی کا سر قلم کردے۔" پہلے والے شخص نے غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں، شیام۔ آگے بڑھ اور اس کمینی کا سر قلم کردے جس نے جادوٹونے سے ہمارے ہاتھوں کو جکڑ دیا ہے۔" دوسرے شخص نے غیرت دلائی تو شیام آگے بڑھا۔ مگر اس کے قدم اُٹھانے کی رفتار انتہائی سست تھی۔ جیسے وہ کسی سانپ کو پکڑنے کے لیے محتاط انداز میں دبے پاؤں آگے بڑھ رہا ہو کہ ذرا سی آہٹ سنتے ہی سانپ بھاگ جائے گا، یا اس پر حملہ آور ہوگا۔ ابھی وہ دو چار قدم آگے آیا ہی تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ایک انتہائی دردناک چیخ مار کر پہلا شخص زمین پر جاگرا، اور پیٹ پکڑ کر بری طرح تڑپنے لگا۔ جیسے گولی یا تیر لگنے کے بعد زخمی پرندہ زمین پر گر کر زندگی اور موت کی کشمکش میں تڑپتا ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شمیکا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ان کے دونوں ہاتھوں کو جکڑ رکھا تھا مگر اب تیسرا شخص آگے بڑھ رہا تھا تو ایک ہاتھ فارغ کرنا تھا۔ لہٰذا شمیکا نے اس کے جسم پر ایک زوردار لات ماری جس سے وہ نہ صرف دور جاگرا بلکہ بن پانی

کی مچھلی کے تڑپنے لگا۔ تیسرا شخص وحشت زدہ ہوکر وہی رک گیا جہاں تک پہنچا تھا۔ اس کی ہمت نہیں ہورہی تھی آگے بڑھنے کی۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کے پاؤں زمین نے جکڑ لیے ہوں۔ "بزدل...... اُلو کے پٹھے، آگے بڑھ کر اس لڑکی کا سر قلم کیوں نہیں کرتا۔ جلد کر، تاکہ اس کی جادوٹونے کی شکتیاں ختم ہوں اور ہم باآسانی اسے قابو کرکے اپنی مار اور بے عزتی کا بدلہ لے سکیں۔" دوسرے شخص نے کہا اور پورا زور لگادیا اپنا خنجر بردار ہاتھ چھڑانے کے لیے مگر ہر کوشش بے سود رہی۔ اس بار تیسرے شخص کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ واقعی اس لڑکی کے پاس جادوئی شکتیاں ہیں جس کے بل بوتے پر وہ دوسروں کو قابو کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے اور مزید دو اسلحہ بردار مردوں سے اس ویران اور سنسان جگہ پر تنِ تنہا اور نہتا ہوتے ہوئے مقابلہ کرنے پر تیار دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس گھمنڈ میں آگے بڑھا کہ تلوار سے اس لڑکی کا سر قلم کردے، تاکہ ان سب پر سے جادو کا اثر ختم ہو۔ اور سب نارمل ہوسکیں۔ وہ یہ سوچ کر دو قدم اور آگے بڑھا تو خنجر بردار شخص کے سر پر ایک ہتھوڑے جیسا ہاتھ پڑا تو وہ لڑکھڑا کر درخت کے تنے سے جالگا۔ وہ چکرا کر درخت سے تنے پر گرا تو اس کے سر سے خون کے فوارے پھوٹ پڑے۔ اب تو تلوار والے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ وہ الٹے قدموں بھاگ جانا چاہتا تھا مگر چوتھے شخص نے انتہائی چالاکی سے کام لیا اور اپنے کوٹ کی جیب سے ریوالور نکال لیا۔ ایک لمحے کے لیے اس لڑکی کے چہرے پر خوف کا رنگ آیا اور پھر ایک دم ہی کا خوف خود بہ خود ختم ہوگیا۔ شاید اس نے یہ سوچ لیا ہو کہ جس بھگوان نے رام کو میری مدد کے لیے بھیجا ہے، وہی اسے گولی اور ریوالور سے بھی محفوظ رکھے گا۔ وہ مطمئن ہوچکی تھی۔ چوتھا شخص نہایت متکبرانہ انداز میں چال چلتا ہوا آگے آیا اور وہ بڑی ہی نخوت سے بولا۔

"اے ہٹو بزدلو! تم نے ایک لڑکی کو اس قدر خود پر حاوی کرلیا ہے کہ تین تین مرد اس کے آگے زمین چاٹ رہے ہیں۔ وہ ریوالور کے ٹرائیگر پر انگلی رکھتے ہوئے پھر گویا ہوا۔

"اب دیکھنا کہ لکڑی کے آگے مکڑی کیسے ناچتی ہے۔" وہ لڑکی کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے بولا۔ شمیکا نے شاید تیسرے شخص کی گردن پر ایک ہاتھ جڑ دیا تھا۔ وہ درد کی شدت سے کراہتا ہوا دور جاگرا تھا اور اس کی تلوار اس سے بھی زیادہ دور جاگری تھی۔ خوف زدہ تو یہ چوتھا شخص بھی تھا مگر یہ اپنی مردانگی کا جھنڈا ریوالور کے بل بوتے پر گاڑنا چاہتا تھا۔ مجھے نجانے کہاں سے شرارت سوجھی۔ میں نے اس چوتھے شخص اور اس لڑکی کا دھیان جنات کی طرف لانے کے لیے آوازیں نکالنا شروع کردیں۔ عجیب وغریب آوازیں سن کر وہ دونوں ہی چونکے تھے۔ لڑکی سمجھ گئی تھی کہ یہ مددگار رام نہیں ہے جو راون سے اسے بچانے آگیا ہے۔ یہ تو کوئی جناتی طاقت ہے جس نے اس گھنے اور خوف ناک جنگل میں اکیلا اور بے یار و مددگار دیکھ کر مدد کرنے آگیا ہے۔ دوسری طرف مردوں کا ذہن بھی کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ بھلا جادو کی شکتیاں یوں تین تین مردوں کو کیسے ایک ساتھ قابو میں کرسکتی ہیں اور پھر وہ لڑکی نہ تو جنتر منتر پڑھ رہی ہے اور نہ ہی ہاتھوں یا آنکھوں سے اشارے کررہی ہے۔ پھر کوئی جادوئی شکتیاں کیسے عمل کررہی ہیں۔ میری آوازیں سن کر ان کا ذہن بھی جنات کی طرف گیا اور ان چاروں میں سے ابھی تک کسی کو کوئی نظر بھی نہیں آیا تھا۔ گرتی ہوئی دیوار کو میں نے ایک دھکا اور دیا تھا۔ ایک موٹی سی شاخ توڑ کر اس کی طرف اچھالی تھی۔ وہ اس کے سر پر لگی تو وہ دہشت زدہ تو پہلے ہی سے تھا، اب تو خوف سے لرزنے لگا۔ شمیکا نے اس کا دھیان بٹا دیکھا تو ایک جھٹکے سے اس کی ریوالور چھین لی تھی اور خود کو ایک حسین وجمیل لڑکی کی صورت میں ظاہر کردیا تھا۔

"تم کیا سمجھے تھے، ایک لڑکی کو بے بس کرکے یہاں لاکر اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لوگے۔ یہ نہ تو بہادری ہے اور نہ ہی عقل مندی، اسے فقط بزدلی اور نامردانگی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اگر تم اب بھی اپنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

حرکتوں سے باز نہ آئے تو میں اس کی مدد کے لیے ہر وقت اس کے ساتھ رہوں گی اور اسی طرح تمہیں اور تمہارے تمام ساتھیوں کو مار پیٹ کر ذلیل ورسوا کرتی رہوں گی۔ بتاؤ تم باز آتے ہو، یا اور کچھ چھنکار دیکھنا چاہو گے۔'' شمیکا نے لڑکی کے سر اور سینے پر اس کی ساڑھی کا پلو پھیلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں ہم آج سے اسے اپنی بہن سمجھیں گے۔'' دو مردوں نے بیک وقت کہا تھا۔

''بس اسے ہی اپنی بہن سمجھو گے۔'' شمیکا نے ایک مکا ہوا میں لہرا کر پوچھا۔

''نہیں دنیا کی ہر لڑکی کو ہم اپنی بہن سمجھیں گے۔'' اس بار دوسرے اور مردوں نے بھی اقرار کیا تھا۔

''تم کون ہو بہن۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی۔'' اس لڑکی نے شمیکا کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے نہ صرف میری عزت اور جان بچائی ہے بلکہ ان ظالم لوگوں کو سبق بھی سکھایا اور انسان بھی بنایا ہے۔'' لڑکی نے فرطِ مسرت سے شمیکا کے گال کا بوسہ لے لیا۔ وہ چاروں ایک ایک کر کے کھسک رہے تھے۔ شمیکا نے انھیں للکار کر کہا۔

''خبردار اگر آئندہ تم نے اس قسم کی کوئی حرکت کی۔ میں ہر لمحہ تم پر نظر رکھوں گی۔ کوئی شکایت ملی تو بخشوں گی نہیں۔'' شمیکا کی بات سن کر وہ چاروں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ شمیکا اپنے ساتھ ابھی لڑکی کو لے کر اس طرف ہی آرہی تھی جس طرف بابا کو بٹھایا تھا۔ جب وہ دونوں برگد کے درخت کے نیچے سے گزرنے لگیں تو میں ایک شاخ پکڑ کر جھولتا ہوا نیچے آگیا۔

''تم کہاں چھپ گئے تھے۔ مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی خدانخواستہ ان لوگوں کے ساتھیوں نے تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچا دیا ہو۔'' شمیکا نے مجھے خیریت سے دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

''میں تو اس فلم کے تمام سین اس برگد کے پیڑ پر چڑھ کر دیکھ رہا تھا۔ بڑا مزا آرہا تھا۔ میں نے ہی تو حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکال کر انھیں ڈرایا تھا اور ان کا حوصلہ پست کیا تھا۔'' میں نے لڑکی کو مرعوب کرنے کے لیے بتایا۔ وہ گہرے تیز ہرے رنگ کی ساڑھی اور تیز لال رنگ کے بلاوز میں بڑی لال مرچ لگ رہی تھی۔ میں نے اس کی باتیں تو سنی تھیں۔ وہ واقعی ہری اور لال مرچ کی طرح تیکھی تھی۔ مگر ایسی لڑکیاں مجھے اچھی لگتی تھیں جو کم از کم اپنے حقوق غصب ہونے پر آواز تو اُٹھا سکیں۔

''آپ کس گاؤں کی رہنے والی ہیں۔'' میں نے براہِ راست اس لڑکی سے پوچھا۔ وہ مجھے انجان نظروں سے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی۔

''ان کا نام ارسلان ہے اور یہ میرے دوست ہیں۔ یہ اس لیے پوچھ رہے ہیں تا کہ تمہیں تمہارے گاؤں تک لے جا کر تمہارے گھر والوں کو سونپ دیں۔'' شمیکا نے اس کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے بابا کے پاس آپہنچے تھے۔

''میں چندن پور کی رہنے والی ہوں اور میرا نام رینا ہے۔'' اس نے پہلی بار اپنا نام بتایا تھا اور ساتھ ہی اپنے گاؤں کا نام بھی۔

''کیا کہا چندن پور...... وہی گاؤں جو رانی پور سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔'' بابا نے چونکتے ہوئے جواباً پوچھا۔

''ہاں بابا جی...... وہی چندن پور۔ کیا آپ رانی پور گاؤں کے ہیں۔'' رینا نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا۔

''اور کہیں آپ وہی عامل تو نہیں جن کے چرچے دور دور تک ہیں۔'' رینا نے بابا کے روبرو کھڑے ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بیٹا، میں رانی پور گاؤں ہی میں رہتا ہوں مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ میرے چرچے بہت دور دور تک ہیں۔ میں تو کلامِ الٰہی کو پڑھ کر کام شروع کرتا ہوں۔ اس کی تاثیر اپنا کام دکھاتی ہے۔ اس میں میرا

کوئی کمال اور ہنر نہیں ہے۔'' بابا نے انکساری اور عاجزی سے جواب دیا۔

''بابا میری سہیلی نے بتایا تھا کہ اس کی بہن نیلم کا آپ علاج کر رہے ہیں اور آپ بڑے پائے کے عامل ہیں۔ بڑے بڑے جنات سے آپ کی مڈ بھیڑ ہو چکی ہے اور کئی جنات کو آپ نے شکستِ فاش بھی دے ہے۔'' رینا کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود آئی تھی۔ ادھر بابا کے چہرے پر چھایا ہوا استعجاب اور گہرا ہو گیا تھا۔

''کیا کہا! نیلم تمہاری سہیلی کی بہن ہے۔ وہی جس کا میں علاج کر رہا تھا۔ جس پر ایک سرکش جن عاشق ہو گیا تھا۔'' بابا نے گتھی کو سلجھاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بابا! آپ نے اس کا علاج تو کر دیا اور اس جن سے اس کا پیچھا بھی چھڑا دیا مگر نیلم۔'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تو بابا ایک دم مضطرب و بے چین ہو گئے۔

''مگر نیلم کو کیا ہوا۔ وہ کہاں ہے اور کیسی ہے۔'' بابا نے انتہائی عجلت میں سوال کیا تھا۔

''بابا نیلم پر نجانے کس قسم کا اثر ہو گیا ہے۔ وہ نہ تو کھانا کھاتی ہے اور نہ پانی پیتی ہے۔ وہ ہنستی بھی نہیں اور روتی بھی نہیں۔ کہیں آتی بھی نہیں اور جاتی بھی نہیں۔ بس ہر وقت خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے۔'' رینا نے نیلم کی حالت جوں کی توں بیان کر دی تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے کہ وہ زندہ ہے۔'' بابا نے دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا اور پھر ہماری طرف متوجہ ہو کر گویا ہوئے۔

''شمیکا اور ارسلان بیٹا۔ یہ نیلم وہی لڑکی ہے جس کا علاج کرتے ہوئے اس سفاک جن نے مجھے دھوکا دہی سے قابو کر لیا تھا اور اٹھا کر صحرا میں لے گیا تھا زندہ دفن کرنے کے لیے۔ آگے کے واقعات تو خود تمہارے سامنے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اس سفاک جن کے کسی خاندانی فرد نے نیلم کو چپ رہنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مجھے چل کر اسے دیکھنا ہوگا۔ اگر تم لوگوں پر گراں نہ گزرے تو مجھے رانی پور کی بجائے چندن پور چھوڑ آؤ، تا کہ میں نیلم کا مکمل علاج کر کے جنات کی بندش کر سکوں اور اسے ذہنی اذیت سے نجات دلانے کی کوشش کر سکوں۔'' بابا نے التجا کی۔

''ہاں شمیکا جی...... مجھے بھی چندن پور جانا ہے۔ ہم دونوں کو وہیں چھوڑ دیں۔ ہم آپ کے احسان مند ہوں گے۔'' رینا نے ہاتھ جوڑ دیئے تھے۔

''رینا، یوں ہمیں شرمندہ مت کرو، میں نے اور ارسلان نے اپنی زندگیاں خلقِ خدا کی خدمت اور مدد کے لیے وقف کر دی ہیں۔ لہٰذا یہ اب ہمارا فرض بنتا ہے، اس میں احسان والی کوئی بات نہیں ہے۔ آؤ ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں۔ کچھ دن گاؤں کا ماحول بھی دیکھ لیں گے۔'' شمیکا نے ان کا دل ہلکا کرنے کے لیے کہا۔

''کیوں نہیں باجی۔ آپ ہمارے گاؤں میں دو ہفتے بھی رہ لیں گی اور پیٹ بھر کر کھا لیں گی تو آپ کا اسمارٹ اور سڈول پن ختم ہو جائے گا۔ ہمارے گاؤں کی آب و ہوا تر و تازہ اور خوراک اور غذا انتہائی خالص ہے۔ شہروں کی طرح ملاوٹ والی چیزیں ہمارے ہاں نہیں ہوتیں۔'' رینا بہت بھولپن سے صاف گوئی کر رہی تھی۔ وہ شہروں کی برائی اور گاؤں دیہاتوں کی تعریف نہیں کر رہی تھی بلکہ حقیقتِ حال بیان کر رہی تھی۔ گاؤں میں نہ صرف غذا اور خوراک ہی خالص ہوتی تھی بلکہ یہاں کے لوگ بناوٹی زندگی اور مصنوعی تہذیب وتمدن کے باسی نہیں تھے۔ وہ کھلی کتاب کی صورت زندگی گزارتے تھے جو اندر اور باہر سے یکساں ہوتی تھی۔ ان میں قول وفعل کا بھی تضاد نہیں پایا جاتا تھا۔

ہم سب نے چلنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ اور باتوں میں لگے رہنے سے کافی فاصلہ طے ہو گیا تھا۔ تب شمیکا نے ہم سب کو ایک دوسرا کا ہاتھ تھام کر آنکھیں بند کرنے کو کہا۔ ہم نے ایسا ہی کیا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے آنکھیں بند کرتے ہی تیز تیز ہوائیں چلنے لگی ہیں، یا پھر آندھی کے جھکڑ چلنے لگے ہیں۔ مگر ہم میں سے کسی نے شمیکا جی کی ہدایت کے مطابق آنکھیں کھولیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور نہ ایک دوسرے سے ہاتھوں کو چھوڑا۔ یہ عمل کافی دیر ہوتا رہا۔ تب شمیکا جی کی نئی ہدایت ملی تو ہم سب نے آنکھیں کھول دیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑ دیے۔

"کیا یہی چندن پور گاؤں ہے۔" شمیکا نے رینا سے پوچھا تھا۔

"ہاں! باجی، اسی روپ نگر کو چندن پور کہتے ہیں۔" میں نے دیکھا تو واقعی یہاں کی دھوپ بھی سنہری تھی۔ ہریالی بھی خوب تھی۔ تمام درخت ہرے بھرے اور پھل دار تھے۔ کھیتوں میں جیسے سونا بکھرا ہوا تھا۔ چھوٹی چھوٹی نہروں کے ذریعے کھیتوں کو سراب کیا جاتا ہوگا۔ کس قدر کم آبادی اور آلودگی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ شہروں کی طرح یہاں پر دھواں، کثافت اور گرد و غبار نہیں تھا۔ یہاں کے لوگوں کے چہروں پر بھی بشاشت اور بشاشت ڈیرا جمائے تھی۔ میں نے گاؤں کی تعریف کی اور کہا۔

"کاش ہم بھی کسی ایسی جگہ ہی اپنا گھر بنالیں اور سکون و آرام کی زندگی بسر کریں۔" یہ بات کرتے ہوئے میری نگاہیں نادانستگی میں شمیکا کی طرف اُٹھ گئیں۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہوگیا تھا۔

"شمیکا جی، پہلے آپ سب لوگ میرے گھر میرے ساتھ چلیں گے۔ کم از کم دو ہفتے وہیں رہیں گے۔ ہمیں جی بھر کر میزبانی کا شرف عطا کریں گے۔ پھر کہیں جانے دیں گے۔" رینا نے اپنے گھر کی راہ لیتے ہوئے ہم سب کو بھی ساتھ لے لیا۔

"مگر رینا بیٹی مجھے تو اپنے کام سے جانے دو۔ نیلم کو میری ضرورت ہے میں اسے جلد از جلد اس کرب ناک حالت سے نجات دلانا چاہتا ہوں۔" بابا اپنے کام سے نہایت ہی مخلص تھے، شاید انھوں نے بھی اپنی زندگی کا مقصد انسانیت اور اس کی خدمت کو بنایا ہوا تھا۔

"جی بابا..... میں آپ کو آج ہی نیلم کے گھر لے چلوں گی۔ مگر پہلے میرے گھر والوں سے مل کر انہیں شکریے کا موقع دیں۔ نہا دھو کر تھکن اتار لیں۔ کھانا کھا کر فریش ہولیں، پھر نیلم کے گھر بھی چلیں گے۔" رینا نے بابا سے اس طرح بات کی جیسے وہ اپنے باپ سے بات کررہی ہو۔ بابا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ رینا کے اخوا ہونے کی خبر اس کے پورے گاؤں اور گاؤں کے نواحی علاقوں اور اس کے مضافات میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ تمام گاؤں والوں نے آکر رینا کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی مگر کسی کو کچھ معلوم نہ ہوسکا تھا۔ یہ پہلا بچہ ملا تھا جس نے رینا کو گاؤں میں دیکھا تھا اور وہ خوشی سے دیوانہ ہوگیا تھا۔ وہ چیختا ہوا کہہ رہا تھا۔ "رینا باجی آگئی۔ رینا باجی آگئی۔" چند منٹوں میں یہ اطلاع بھی پورے گاؤں کو ہوچکی تھی کہ رینا بخیر و عافیت اور صحیح سلامت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اس کی چچی اس کو دیکھنے کب سے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ دوڑ کر رینا سے لپٹ گئی۔

"میری بچی تو خیریت سے تو ہے نا۔ ان بدمعاشوں نے تیرے ساتھ بدتمیزی یا زیادتی تو نہیں کی۔" رینا کی چچی کی سسکیوں کی آواز سن کر ہم سب کا دل بھر آیا تھا۔ وہ کافی دیر تک روتی رہی تھیں اور انھوں نے کافی دیر تک رینا کو اپنے سینے سے چمٹائے رکھا تھا۔ پھر یکا یک انھیں جیسے ہی مہمانوں کا خیال آیا، وہ یک دم رینا سے جدا ہوگئیں اور آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

"بیٹی یہ لوگ کون ہیں انھیں اندر بٹھاؤ نا۔"

چچی نے ہمیں اندر آنے کا راستہ دیا تو ہم سب گھر کے اندر داخل ہوگئے۔

"چچی جان سانس دم تو لینے دیں، میں آپ کو ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دوں گی۔ یہ سب میرے اور آپ کے بھی محسن ہیں۔ ان کی وجہ سے تو میری جان اور عزت محفوظ رہی ہے۔ ورنہ ان بدمعاشوں نے تو مجھے تباہ و برباد کرنے اور جان سے مارنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی تھی۔ کہتے ہیں کہ مارنے والے سے بچانے والا بڑا ہوتا ہے۔ میں اپنے محسنوں کو بغیر سیوا کیے جانے نہیں دوں گی۔" رینا نے مسکراتے ہوئے چچی کی طرف دیکھ کر کہا۔

جس گھر میں ہم داخل ہوئے تھے۔ یہ رقبے کے لحاظ سے بہت بڑا گھر تھا مگر اس میں فقط دو کمرے، باورچی خانہ اور واش روم بنا ہوا تھا۔ اس گھر کی تمام دیواریں اس قدر نیچی تھیں کہ کوئی بھی دراز قد شخص گلی میں چلتے ہوئے بغیر ایڑیاں اُٹھائے صحن میں دیکھ سکتا تھا۔ اس مکان کو لال پکی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ دروازوں پر جتی سے پردہ کیا گیا تھا۔

"رینا میں ابھی آئی۔ بھگوان داس سے مہمانوں کے لیے سودا سلف لینے جارہا ہوں۔" رینا نے اچھا کہا اور ہمارے لیے غسل خانہ تیار کردیا۔ سب سے پہلے بابا کی باری تھی، وہ غسل خانے میں فریش ہونے کے لیے جاچکے تھے۔ بابا فریش ہوکر آئے تو شمیکا نے غسل خانے کا رخ کیا۔

"میں دیکھ کر آتی ہوں چچی جان کو دیر کیوں ہوگئی۔ دیر ہونا نہیں چاہیے تھی، حالاں کہ بھگوان داس کی دکان سامنے ہے۔" رینا منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی چل دی۔ شمیکا کو فریش ہوتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی۔ ادھر رینا کی چچی بھی واپس نہیں آئی تھی اور رینا بھی نہیں۔ میرے ذہن میں خیال گزرا کہیں کوئی سنگین درپیش آگیا ہو۔ میں دیکھتا ہوں۔ میں باہر نکلا تو ایک راہ گیر سے معلوم کیا کہ بھگوان داس کی دکان کہاں ہے۔ اس نے گھر کے پیچھے اشارہ کیا تو میں اس جانب چل پڑا۔ زیادہ فاصلہ طے نہیں کرنا پڑا۔ رینا کے گھر کے پیچھے بیس پچیس گز کے فاصلے پر بھگوان داس کی دکان تھی۔ یہ پرچون فروش تھا اور شاید اس گاؤں میں اس کی بھی پرچون کی ایک ہی دکان دکھائی دے رہی تھی یا پھر بہت زیادہ دور جاکر دوسری دکان ہوگی۔ دکان پر رش تو زیادہ تھا مگر میں نے دکان دار کی طرف نظر اٹھائی تو وہ رینا کی چچی سے بحث کرنے میں الجھا ہوا تھا اور رینا اسے اور اپنی چچی کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس دکان پر بہت زیادہ رش اس لیے بھی تھا کہ کچھ گاؤں کی خواتین رینا کی چچی سے رینا کے اغوا ہونے اور پھر بازیاب کرائے جانے کی کہانی سننا چاہتی تھیں۔ انہوں نے رینا اور اس کی چچی کو گھر سے باہر دیکھا تو وہیں رک گئیں تاکہ سرسری طور پر ہی جان لیں مگر رینا اور اس چچی بھگوان داس کی منتیں کررہی تھیں۔ میں نے تذبذب کے عالم میں قریب ہوکر ان کی گفتگو سننے کی کوشش کی تو ناقابل یقین آوازیں میری سماعت سے ٹکرائیں۔

"بھائی صاحب! میں آپ کی پائی پائی ادا کردوں گی۔ اس وقت میری بچی بدمعاشوں سے جان اور عزت بچا کر آئی ہے اور اس کے اور میرے محسن میرے ہاں مہمانوں کی حیثیت سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی خاطر مدارات کرنی ہے۔ لہٰذا آج مجھے سودا دھار دے دیں، میں کل کسی طرح تمہارا سارا قرض اتار دوں گی۔ مہربانی کیجیے مہمانوں کے آگے میرا بھرم رہ جائے۔" رینا کی چچی نے ایک بار پھر التجا کی۔

"چچی! آپ اس سنگ دل اور سود خور کے منہ کیوں لگ رہی ہیں۔ یہ پتھر ہے، اس پر کسی کی بات کی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میں اپنی کتابیں بیچ کر مہمانوں کے لیے کھانے لے کر آتی ہوں، آپ گھر چلیں۔" رینا نے اپنی چچی کا بازو تھام کر کھینچنے کے سے انداز میں کہا۔

"ہاں ..... ہاں! کتابیں بیچوں یا کالج بیچو، مجھے میرے پیسے چاہئیں۔ پورے دو ماہ سے ادھار کھا رہی ہو۔ چٹنی رم بتی ہے اور اس پر جتنا سود ہوتا ہے، ایک ایک پائی وصول کرلوں گا۔ اگر رقم کا بندوبست نہ ہو تو پھر کہیں پتا ہے، میں اس کا عوض کیا چیز لیتا ہوں۔" بھگوان داس نے رینا کے پرشباب سراپے پر ایک نگاہ اوپر سے نیچے تک ڈالی تو وہ غصے سے پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔ تب مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے ہاتھ میں وہ بٹوا آگیا جو قسطنطنا جن کی بیوی نے تحفتاً دیا تھا اور بٹوا دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ میرے زندگی بھر کام آئے گا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا، بھلا کوئی بٹوا زندگی بھر کسی کے کیسے کام آسکتا ہے۔ ناممکن ہے، کیوں کہ تمام بٹوں کی عمریں کم از کم دو چار ماہ یا زیادہ سے زیادہ ایک یا ڈیڑھ سال کی ہوتی ہے۔ مسلسل استعمال کرنے پر وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھٹ جاتے ہیں اور پھر انھیں ناقابلِ استعمال کہہ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ میں نے اسی ادھیڑ بن میں بٹوا کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ سو اور ہزار روپے کے کئی نوٹ نظر آرہے تھے جو نئے تھے۔ جنھیں ابھی تک کسی ہاتھ نے چھوا تک نہیں تھا۔

"بڑے میاں۔ ذرا خواتین سے عزت سے بات کیا کریں۔ ایک تو آج کل کی مہنگائی نے عوام کی کمر توڑ رکھی ہے اور پھر تم جیسے لالچی اور سود خور کی بدتمیزیوں نے غریبوں کا سکھ چین حرام کردیا ہے۔ بتاؤ رینا کی چچی کا کل کتنا قرض ہے اور ہاں اپنا سود بھی اس میں شامل کرکے بتانا۔" میں نے بھگوان داس کو تلخ لہجے میں متوجہ کرتے ہوئے کہا تو ان کے سامنے موجود تمام افراد نے پیچھے مڑ کر میری طرف بڑی عجیب اور رشک بھری نظروں سے دیکھا۔

"اس گاؤں میں اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ بہر حال مجھے تمہاری آشنائی سے کیا لینا ہے، مجھے تو میرے قرض کے پیسے سود سمیت مل جائیں اور کیا چاہیے۔ میں تو آم کھاتا ہوں، گٹھلیاں تھوڑی گنتا ہوں۔ پیسے بھائی تقریباً پانچ ہزار، پانچ سو، پچاس روپے بنتے ہیں، کل میزان۔" بھگوان داس نے بہی کھاتا پہلے ہی سے کھول رکھا تھا۔ اس نے کیلکولیٹر سے فوراً حساب کیا اور مجھے بتایا۔ میں نے بٹوے میں سے چھ ہزار روپے کے نوٹ اور چار نوٹ پانچ سو روپے کے نکال کر کل دس ہزار روپے بھگوان داس کے بہی کھاتے پر پھینک دیے۔

"یہ جو اپنے پانچ ہزار پانچ سو پچاس روپے اور اس ہی کھاتے میں چار ہزار چار سو پچاس روپے ایڈوانس لکھ لو اور خبردار اگر کبھی کسی خاتون سے بدتمیزی کی تو۔" میں نے ایک بار پھر اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔

"بیٹا! یہ تم نے کیا کیا۔ پہلے ہی ہم لوگ تمہارے احسان تلے دبے ہوئے ہیں اور مزید بوجھ کیسے برداشت کریں گے۔ تم اپنے روپے واپس لے لو۔ میں اپنے مکان کے کاغذات گروی رکھ کر بھگوان داس کا قرض چکا دوں گی۔" رینا کی چچی نے مجھ سے التجا کی۔

"رینا نے شاید آپ کو ہمارے بارے میں بتایا نہیں ہے۔ ہاں ابھی ہمارے درمیان گفتگو ہی کب ہوئی ہے، چلو چچی جان، بہت زور کی بھوک لگی ہے، جلدی سے کھانا بنائیں تاکہ اس پیٹ کی دوزخ کو بھرا جاسکے۔" میں نے بڑے پیار سے چچی جان سے درخواست کی تو وہ سب کچھ نظر انداز کرکے ہمارے ساتھ آگئیں اور اپنا سودا سلف اٹھائے باورچی خانے میں چلی گئی۔ چچی جان کے میں بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔ مجھے ایک خیال نے بجلی کا سا جھٹکا لگایا۔ جب میں نے بٹوا کھول کے دیکھا تو اس میں اتنے ہی روپے موجود تھے جتنے پہلے تھے۔ میں نے اپنی تسلی کے لیے ایک بار پھر اس بٹوے میں سے دس ہزار روپے نکال کر گننے شروع کیے۔ پورے دس ہزار روپے میرے ہاتھ میں موجود تھے اور دس ہزار روپے میں بھگوان داس کو دے کر آرہا تھا۔ جب کہ بٹوا چھوٹا سا تھا، اس میں اس قدر رقم یعنی نئے نوٹ سمانے کی گنجائش نہیں تھی۔ شمیکا غسل خانے سے نکل رہی تھی، میں نے وہ بٹوا مٹھی میں چھپالیا اور دس ہزار کی رقم پینٹ کی جیب میں رکھ لی۔ شمیکا تو پہلے سے بال خشک کرنے ذرا دھوپ میں کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے مٹھی میں بند بٹوے کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر ایک بار اس کی زپ کھول کر بغور دیکھا تو اب بھی اس میں اتنے ہی نوٹ تھے، جتنے پہلی بار دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ دس ہزار روپے بھگوان داس کو دینے کے بعد میں نے دس ہزار روپے اپنی جیب میں رکھے ہیں مگر بٹوے میں رقم جوں کی توں کیوں کر محفوظ ہے۔ تب مجھے قسطنطنا سردار کی بیوی کا وہ جملہ یاد آیا جو اس نے مجھے بٹوا دیتے ہوئے بولا تھا کہ میری طرف سے یہ بٹوا تحفتاً رکھ لو، تمام عمر تمہارے کام آئے گا۔ اب میں مسئلے کا حل پاچکا تھا اور اپنی حیرت کا سبب بھی۔ میں اس جملے سے اور بٹوے میں بار بار غائبی طور پر رقم میں اضافہ ہونے سے سمجھ گیا تھا کہ یہ میرے تمام عمر کیسے کام آسکتا ہے۔ یقیناً اس میں

سے جس قدر رقم خرچ کرلی جائے، یہ رقم کبھی ختم یا کم ہونے کا نام نہیں لے گی۔ یہ سمجھتے ہی کسی سوچ نے مجھے اچھل کر کھڑا ہونے پر مجبور کردیا تھا۔

"بابا! میں سگریٹ لینے جارہا ہوں، کوئی پوچھے تو بتادینا۔" میں نے عامل بابا کے کان میں سرگوشی کی تو انھوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں ایک بار پھر بھگوان داس کی دکان پر آپہنچا تھا۔

"بابو جی کیا چاہیے۔" بھگوان کے لہجے میں دنیا بھر کا پیار اور نرمی سمٹ آئی تھی۔ اس کی دکان پر رش بدستور قائم تھا۔

"بھگوان داس جی! اگر میں آپ کے بہی کھاتے کے تمام قرضوں کا حساب بے باک کردوں تو۔" میں نے اس کی رائے جاننا چاہی۔ بھگوان داس نے چکرا کر اپنا سر تھام لیا۔ اس نے ایک ملازم کو ٹھنڈا پانی لانے کا کہا۔

"کیا کہا بابو جی۔ تمام قرضوں کا حساب بے باق کردیں گے۔ یعنی تمام گاؤں والوں کا اُدھار چکا دیں گے۔" ملازم پانی لے آیا تو بھگوان داس نے بات ختم کرکے گلاس لیا اور ایک ہی سانس میں سارا پانی غٹا غٹ حلق سے نیچے اتار لیا۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک نظر اپنے بہی کھاتوں اور دوسری نظر مجھ پر دیوانہ وار ڈال رہا تھا۔

"کیا کوئی قارون کا خزانہ ہاتھ لگ گیا ہے بابو جی۔" بھگوان داس نے اپنے چشمے کو ذرا نیچے ناک پر انگلی کی مدد سے کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔ میں اس میں سے ان غریب، مفلس اور نادار لوگوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے جیب سے دس ہزار روپے نکال کر اس کے سامنے ہاتھ میں تھام لیے۔

"مگر بابو جی، ہم بھی نئے نہیں۔ یوں تو ہمیں سراسر نقصان ہورہا ہے۔" بھگوان داس نے اپنے کاروباری ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"نقصان ......وہ کیسے۔" میں نے حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"بابو جی دیکھو، نا۔ ایک تو ہم ان لوگوں کو ادھار نہ دے سکیں گے اور جب ادھار نہ ہوگا تو سود کیسے وصول کریں گے اور پھر......" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اور پھر کیا۔ کیا اور بھی کوئی مطلب پوشیدہ رہ گیا ہے۔" میں نے اس کی للچائی ہوئی نظروں کا مفہوم سمجھ لیا تھا مگر اس کی زبان سے اگلوانا چاہتا تھا۔

"مگر بابو کبھی کبھی ان گاؤں والوں کے پاس پیسے نہیں ہوتے تو یہ لوگ اپنی جائیداد یا سونے چاندی کے زیورات ہمارے پاس گروی رکھ دیتے ہیں۔ یوں بھی ہمیں مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور کبھی کبھار جن کے پاس قرض چکانے کے لیے جائیداد اور قیمتی مالیت کا سامان بھی نہیں ہوتا، ان کے پاس حسن کی دولت تو ضرور ہوتی ہے۔ ان کے پاس بیٹیوں کی نعمت تو ضرور ہوتی ہے۔" بھگوان داس نے اپنی دھوتی شلوار کو کستے ہوئے بتایا۔

"تو کیا تم ان سے قرض کو چکتا کرنے کے لیے عزت بھی مانگ لیتے ہو۔ کیا وہ ایسا کرگزرتی ہیں۔" میں نے ششدر ہوکر پوچھا۔

"ہاں بابو جی۔ اسی سبب سے اب تک دس شادیاں کرچکا ہوں اور نجانے کتنی راتیں مختلف عمروں کی عورتوں سے رنگین ہوتی رہی ہیں۔" بھگوان داس نے کام چھوڑ کر تمام تر توجہ میری جانب مبذول کرلی تھی۔

"بھیا باتوں میں ہی لگے رہو گے یا ہمیں سودا بھی دو گے۔" ایک عورت کی آواز پر میں چونکا تھا۔ دیکھا تو واقعی ایک طویل قطار تھی سودا سلف لینے والوں کی۔ مجھے شرمندگی محسوس ہوئی کہ میں نے ان لوگوں کا وقت ضائع کیا ہے۔

"ماسی میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں نے آپ لوگوں کا وقت ضائع کیا۔ میں اپنی سزا خود تجویز کرتے ہوئے آپ تمام گاہکوں کو پیش کش کرتا ہوں کہ آج جس قدر سودا لینا ہو، لے لیں۔ آج تمام خریدے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گئے سودے کی ادائیگی میں کروں گا۔" میں نے ان پر احسان کرنا نہیں چاہا تھا، اس لیے بہانہ تراشا تھا۔

"بیٹا! یہ کوئی معذرت والی بات نہیں ہے۔ تم ایک اجنبی ہو، کیا پتا تم بھگوان داس سے کس کا پتا معلوم کر رہے ہو۔ اس میں اپنے آپ کو سزا دینے کی کیا ضرورت ہے۔" عورت نے مجھے بہانہ بھی نہیں بنانے دیا۔

"ارے بھئی، آج بھگوان داس بہت اچھے موڈ میں ہیں۔ یہ کسی سے خریدار کی رقم لینا نہیں چاہتے۔ لہٰذا جس قدر سودا اور دیگر ضروریات کی چیزیں اپنے باورچی خانے میں بھر سکتی ہوں بھر لیں۔" میں نے آنکھ دبا کر بھگوان داس کو اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ارے بیٹا! تم بھی کس کی باتوں میں آ گئے۔ یہ کنجوس شخص کسی کو اپنا پسینہ نہیں دیتا، تم مفت میں راشن دلانے کی بات کر رہے ہو۔" ساتھ کھڑی ہوئی عورتیں بلند آواز سے ہنسیں تو مجھے اپنی نادانی پر ندامت کا احساس ہوا۔

"سسٹر! کیا آپ انھیں سمجھا سکتی ہیں۔ میں ابھی سچ بات بتاتا ہوں۔ دراصل آج میری سال گرہ ہے، میں اس خوشی میں یہ پیش کش کر رہا ہوں۔" میں نے ایک جوان لڑکی سے درخواست کرتے ہوئے کہا۔ وہ پڑھی لکھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔

"دیکھیے بہنوں! ایک شخص کی سال گرہ ہے اور وہ ہم سب کو راشن کی صورت میں تحفہ دینا چاہتا ہے۔ ہم کیوں کسی کا تحفہ لینے سے انکار کریں۔ کیوں کسی انسان کا دل توڑیں۔ لہٰذا اس شخص کا دل رکھنے کے لیے اس کی پیش کش سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔" سسٹر کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ وہ سب خاموشی مگر حیرت میں ڈوبی اپنی ضروریات کی اشیا خریدنے لگیں۔ میں نے دس ہزار ہاتھ میں پکڑے ہوئے بھگوان داس کو دیئے تو وہ خوشی خوشی سارے کام سرانجام دینے لگا۔ کچھ دیر میں غریب اور بے بس لوگوں کے چہرے خوشی سے جگمگاتے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔ ایک بار پھر میں نے بٹوے میں جھانکا تو وہاں اس بار بھی نوٹ پورے موجود تھے۔ میں آتے ہوئے دس ہزار روپے اور دے آیا اور بھگوان داس کو خبردار کر دیا کہ وہ کسی بھی گاہک کو کسی چیز لینے سے منع نہ کرے۔ جو جس قدر اور جتنی اشیا مانگے اسے اس قدر اشیاء دے اور ہاں میں جب تک رینا کے ہاں موجود ہوں، وہ عوام کو مفت راشن دیتا رہے۔ میں ادائیگی کرتا رہوں گا۔" بھگوان داس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ارسلان جی! بہت آوارہ گردی اور سگریٹ نوشی ہو گئی، اب جلدی سے گھر چلیں۔ کھانا تیار ہے، سب لوگوں کو آپ کی غیر حاضری کی وجہ سے بھوک برداشت کرنا پڑ رہی ہے۔" رینا کی آواز سن کر میں فوراً اس کے ساتھ چل پڑا۔ یہ سوچ کر بھی کہ کہیں اس کو میری دریادلی اور سخاوت کی بھنک نہ پڑ جائے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ تازہ کھانے کی خوشبو سے سب کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ ہر شخص نے بلا تکلف پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور خوب سیر ہو گیا۔

"آپ لوگ اپنی بھوک سے کچھ زیادہ ہی کھا لینا کیونکہ یہاں کا پانی بہت زور ہضم ہے، بہت جلد آپ کو دوبارہ بھوک لگ جائے گی۔" چچی نے زیر لب مسکرا کر کہا تو سب مسکرانے لگے۔ وہ بار بار گرم گرم روٹیاں پکا پکا کر رکھنے آ رہی تھی۔ یکایک ان کے چہرے پر میری نظر پڑی تو میں کرب میں ڈوب گیا۔ رینا کی چچی کے چہرے پر کوئی زیور نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ناک میں سونے کی لونگ اور ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں تک نہیں تھیں۔ مجھے ان کی غربت پر بہت ترس آیا۔ میں قدرت کی حکمت کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک شخص کو امیر بنایا تو وہ امیر سے امیر تو ہوتا جا رہا ہے اور غریب، غریب سے غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ واہ رے مولا تیری قدرت۔

"ارسلان اور شمیکا بیٹی! آپ لوگوں کا بہت بہت شکریہ کہ مجھے یہاں تک لائے اور میری خاطر مدارات کی۔ اب مجھے اس لڑکی سے ملنا ہے جو رینا کی سہیلی کی بہن ہے اور اس کی حالت عجیب ہو گئی ہے۔

میں آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں۔" عامل بابا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بابا جی! میں آپ کو اپنی دوست فردوس کے پاس لے کر چلتی ہوں اور آپ کو جنت سے ملوا دے گی۔ پھر آپ بات کر کے اس سے دیکھ لینا کہ وہ اس حالت کو کیوں پہنچی ہے۔" رینا نے ساڑھی کا پلو سر پر ڈال لیا تھا اور وہ عامل بابا کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

"مجھے لگتا ہے کہ اس صحرا میں جلنے والے جن نے اس لڑکی پر کچھ جادو وغیرہ کر دیا ہے، تاکہ وہ اس کے آنے تک نہ کچھ سوچ سکے اور نہ کسی کو کچھ بتا سکے۔" میری بات سن کر شمیکا میری جانب متوجہ ہو گئی تھی۔

"میرا خیال ہے کہ تمہاری فیلڈ ہے، عامل بابا کے ساتھ تمہیں بھی جانا چاہیے تھا۔" میں نے شمیکا کو مشورہ دیا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ میدان میرا ہے اور اس مسئلے کو میں آسانی سے حل بھی کر سکتی ہوں۔ عامل بابا کو پہنچ کر کارروائی کا آغاز کرنے دو۔ یہ گاؤں زیادہ آبادی پر مشتمل نہیں ہے۔ میں چند منٹوں میں اس گھر کا پتا چلا لوں گی جہاں پر جنت اور عامل بابا مصروفِ عمل ہوں گے۔ تم بے فکر رہو۔" شمیکا نے اس بات کو ذہن پر نہیں لیا تھا۔

"تمہارے خیال میں کیا بات ہو سکتی ہے۔ اس صحرا کے جن نے جانے سے پہلے جنت پر کیسا اثر کیا ہو گا؟' میں نے شمیکا سے اظہارِ خیال کرتے ہوئے پوچھا۔

"دراصل اس نے ایک دوسرے جن کی ڈیوٹی جنت پر لگا دی ہو گی۔ جس کے خوف اور رکاوٹ کی بنا پر وہ سکتے کے عالم میں ہے۔ میں جا کر سب کچھ سیدھا کر لوں گی۔ ابھی ذرا آرام کرنے دو۔" شمیکا پاؤں پھیلا کر پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔ شاید وہ تھکن سے چور ہو گئی تھی یا پھر پیٹ بھر کے کھانے سے روٹیوں کا نشہ ہو رہا تھا۔ وہ بہت جلد نیند کی آغوش میں چلی گئی۔ شمیکا نے جو روپ عورت کا لیا تھا، وہ ایسا تھا جس کو دیکھ کر ایک دیہاتی عورت کا گمان ہوتا تھا۔ اس نے لاچا اور تنگ چولی زیب تن کی ہوئی تھی جو اس گاؤں کا عام لباس تھا۔ سونے کے بعد ہر انسان کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ شمیکا کے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ چکے تھے۔ اس کا معصوم سا چہرہ اس قدر پرکشش لگ رہا تھا کہ بس اپنی طرف مجھے نا چاہتے ہوئے بھی کھینچ لیا۔ اس کی پنڈلیوں سے اونچے لاچے میں سے گوری گوری پنڈلیاں کسی ہاتھ کے دباؤ کے انتظار میں لگ رہی تھیں۔ اچانک شمیکا نے سوتے میں انگڑائی لی تو اس کی تنگ چولی کے بٹن ٹوٹنے کو ہو گئے۔ وہ نیند میں کسی ساحرہ سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے حسن کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں نے لاکھ ضبط کیا مگر خود پر قابو نہ رہا۔ غیر ارادی طور پر میں اپنے چارپائی پر اُٹھ بیٹھا تھا۔ قدم بڑھانا ہی چاہتا تھا کہ کمرے میں رینا کی چچی آ گئی۔ میں انجان بن کر خلاؤں میں گھورنے لگا۔ رینا کی چچی نے صحن سے ایک چادر شمیکا کے جسم پر ڈال دی تھی۔ جس سے اس کی بے حجابی کافی حد تک چھپ گئی تھی مگر اس کے بدن کے فراز پہلے کی نسبت زیادہ نمایاں ہو گئے تھے۔ عجیب ہیجان خیز منظر تھا۔ شاید مرد کی طبیعت کو چچی خوب سمجھتی تھی۔ اس وقت میری جو حالت ہو رہی تھی، وہ کسی طرح پوشیدہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اچانک برابر والے گھر سے کسی عورت کے رونے کی آواز آنے لگی۔ پھر دو اور تین چار عورتیں ایک ساتھ بین کر رہی تھیں۔

"چچی جان! معلوم تو کروں، گھر والوں پر کیا مصیبت آن پڑی ہے جو اس طرح کرب ناک آواز میں رو رہے ہیں۔" میں نے چچی کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ یک دم ہم دونوں کی توجہ پڑوسیوں نے اپنے رونے دھونے کی طرف مبذول کرا لی تھی۔ چچی جان نے ساڑھی کا پلو سر اور شانے پر اچھی طرح پھیلایا اور بجلی کی سی تیزی سے گھر سے نکل گئیں۔ میں حیرت میں تھا۔ خدا جانے لوگ کن کن اذیتوں میں مبتلا رہ کر زندگی گزار رہے تھے۔ کسی کو بیماری نے آ لیا تھا تو کوئی کسی کی بے وجہ دشمنی کا نشانہ بن گیا تھا۔ کسی کا مال لوٹ کر اسے کنگال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کردیا جاتا تھا تو کسی کی عزت پر ڈاکا ڈال دیا جاتا تھا۔ اب نجانے اس گھر کے افراد پر کون سی مصیبت آن پڑی تھی۔ چچی کو گئے ہوئے زیادہ دیر ہوگئی تھی۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ شمیکا کو بیدار کردوں، کیوں کہ وہ پڑوس میں جاکر حالاتِ حاضرہ معلوم کرے تاکہ ان غریب اور بے بس لوگوں کی کچھ مدد کی جاسکے۔ میں کمرے میں آیا تو شمیکا کا حسن سراپا دیکھ کر اپنی جگہ ٹھٹک گیا۔ پہلے تو مجھے شک ہوا کہ یہ شمیکا نہیں ہے بلکہ کوئی سولہ سالہ لڑکی سو رہی ہے جو رینا کی چھوٹی بہن ہوسکتی ہے۔ مگر رینا تو اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی چھوٹی بہن کہاں سے آئی۔ پھر میں نے رینا کے متعلق سوچا، کہیں رینا خاموشی سے عامل بابا کو چھوڑ کر تھکن سے چور ہو کر سو تو نہیں گئی ہے۔ میرے سارے خدشات اور وسواس بے بنیاد تھے۔ کیوں کہ اس پلنگ پر شمیکا ہی سو رہی تھی۔ اس کی جگہ بھلا کوئی دوسری لڑکی کیسے اور کیوں کرلے سکتی تھی۔ ایک خیال نے میرے شک کو ہوا دی تو میں نے پھر اس چادر کی طرف بغور دیکھا جو رینا کی چچی نے شمیکا کو بے ترتیب سوتا دیکھ کر اوڑھا دی تھی۔ چادر بھی وہ نہیں تھی۔ کیوں کہ اس چادر کی زمین نیلی تھی اور اس پر بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے۔ جب کہ یہ چادر جو اس سولہ سالہ لڑکی نے اوڑھ رکھی تھی، اس کی زمین پیلی تھی، جس پر چھوٹے چھوٹے انگور بنے ہوئے ہیں۔ میں انتہائی تذبذب کے عالم میں پلنگ کی طرف چلنے لگا۔ میں نے اسے بہت قریب سے دیکھا تو واقعی شمیکا نہیں تھی۔ کوئی ظالم حسینہ اور حسن و شباب کا پیکر تھی جو سوتے میں اعصاب ڈھیلے پڑ جانے کی بنا پر ایک ساحرہ لگ رہی تھی۔ اس نے مجھے خود ایک نظر پڑتے ہی مبہوت کردیا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر ایک لمحہ بھی یقین نہیں آیا کہ ایسا ہوسکتا ہے۔ جس پلنگ پر شمیکا سوئی تھی، اس کی جگہ بغیر کوئی شور شرابے اور حرکات و سکنات کے آکر لیٹ سکتا ہے۔ خود کو ظاہر کرکے اس کو چھپا سکتا ہے۔ ناممکن! میں دل ہی دل میں بڑبڑانے لگا۔ اچانک میں اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے اچھل پڑا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ شمیکا ایک دیہاتی عورت کے لباس میں لاچا اور تنگ چولی پہن کر سوئی تھی۔ اس کے سوتے میں انگڑائی لینے سے اس کی تنگ چولی کے بٹن ٹوٹ گئے تھے۔ تبھی تو چچی نے شرم محسوس کرتے ہوئے اس پر چادر ڈال دی تھی۔ میں نے مغرب کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ ایک تروتازہ ہوا کے جھونکے نے نہ صرف میرے جسم کی نڈھالی کو دور کیا اور سانس کو بحال کیا بلکہ اس کے سینے سے پیٹ تک چادر کا کونہ بھی اُڑا دیا تھا۔ ناممکن۔ میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ شمیکا نہیں تھی۔ کوئی سولہ سال کی الھڑ مٹیار حسینہ تھی۔ جس کا نکلتا ہوا قد اس کے شمشاد بننے کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کی گہری نیند اس کی بے فکری کا پتا دے رہی تھی۔ شاید وہ سنِ بلوغت کو نہیں پہنچی تھی۔ تبھی اس قدر بے پروائی سے سو رہی تھی۔ ورنہ اکثر اوقات بلوغت کی حد کو چھونے والی دوشیزائیں کسی نہ کسی خوف اور ڈر کے مارے جاگ جاتی ہیں اور ہونقوں کی طرح ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہیں۔ میں اس کے بالکل قریب کھڑا ہو کر اس کے چہرے پر جھکا ہوا تھا مگر اس کو کوئی خوف، فکر یا خبر نہیں تھی۔ کیا میں سوگیا تھا جو شمیکا مجھے گہری نیند سوتا دیکھ کر بغیر بتائے کہیں چلی گئی ہے اور یہ لڑکی اس کے پلنگ کو خالی دیکھ کر یہاں سوگئی ہے۔ مگر شمیکا مجھے بغیر بتائے کہاں جاسکتی تھی۔ میں نے غسل خانے اور واش روم کی طرف نظر ڈالی تو ان دونوں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خالی ہیں۔ یاالٰہی مجھ پر یہ کس قسم کی نیند کا غلبہ ہوا تھا کہ مجھے اس لڑکی کی آمد کا اور شمیکا کے رخصت ہونے کا احساس ہی نہیں ہوا۔

مگر یہ لڑکی کون ہے۔ جب تجسس سے حد سے سوا ہونے لگا اور مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا تو پھر میرے ذہن کو اس کا ایک ہی حل سجھائی دیا کہ کیوں نہ اس لڑکی کو جگا کر پوچھ لیا جائے کہ وہ کون ہے اور یہاں بغیر اجازت آکر کیوں سوگئی ہے۔ اور پھر اس جگہ پر شمیکا سو رہی تھی، وہ کہاں چلی گئی ہے۔ میں اس کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر اسے جگانے ہی والا تھا کہ چچی جان کھنکار کر

دروازے سے اندر آرہی تھیں۔ میں نے لپک کر ان کو صحن ہی میں جالیا۔

''چچی جان! اس پڑوس کے گھر والی بات بعد میں بتایئے گا، پہلے یہ بتایئے شمیکا کہاں چلی گئی، مجھے بغیر بتائے ہوئے اور یہ اس کی جگہ پر کون لڑکی سوگئی ہے، جس کے بارے میں آپ نے نہ تو مجھے بتایا اور نہ اس سے کبھی ملوایا۔'' چچی میری بات سن کر ششدر سی رہ گئی۔

''نہیں تو ارسلان! نہ تو شمیکا کہیں گئی ہے اور نہ ہی اس کی جگہ پلنگ پر کوئی دوسری لڑکی سو رہی ہے۔ وہاں تو صرف شمیکا ہے اور کوئی بھی نہیں ہے۔ چچی جان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بتایا۔

''چچی جان! کہیں آپ کی نظر کمزور تو نہیں ہوگئی ہے جو آپ کو شمیکا کی جگہ سولہ سالہ لڑکی نظر نہیں آرہی ہے جو اس قدر گہری نیند سو رہی ہے۔'' میں نے بھی چچی جان کے پیچھے قدم اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ارسلان ابھی تو دن کی روشنی ہے۔ سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا ہے۔ شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ اندھیرے کا دور تک نام و نشان نہیں ہے پھر کیا تمہیں ابھی سے دھندلا، یا کم نظر آنے لگا ہے۔'' چچی نے اپنی فصلیوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''محسوس ہوتا ہے کہ تم نے بوریت محسوس کی ہوگی۔ اپنے اکیلے پن کی وجہ سے۔ تم ستانے کے لیے لیٹ گئے ہوں گے اور آنکھ لگ گئی ہوگی۔ شاید تم نے کوئی سندر سپنا دیکھا ہے، جس میں تمہیں شمیکا کی جگہ سولہ سالہ لڑکی سوتے میں نظر آگئی ہے۔ کیا تمہیں شمیکا کی بجائے کسی سولہ سال کی لڑکی کو پانے کی تمنا ہوگئی ہے۔'' چچی نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ کو ضبط کیا تھا مگر شمیکا سے ہنسی کو روکنا محال ہوا تو وہ ہنسنے لگی۔ ہنسی کی آواز سن کر ارسلان نے پلنگ کی طرف دیکھا تو وہاں نیلی زمین کی چادر (جس پر بڑے بڑے پھول بنے ہوئے تھے) میں شمیکا کسمسا رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ چچی جان میرے لیے پانی کا گلاس لینے چلی گئیں۔

''تو یہ تمہاری شرارت ہے۔ تم ایک بار پھر مجھے آزمانا چاہتی تھیں۔ کیا تم نے وہ مناظر نہیں دیکھے تھے، کیا تمہیں وہ لمحات یاد نہیں ہیں جب تم نے مجھے آزمانے کے لیے میری تنہائی سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تو بہ شکن اور کافر ادا حسینہ کو رات کے آخری پہرہ میرے گھر پر بھیج دیا تھا۔ اب تم ایک سولہ سالہ الھڑ مٹیار کا روپ لے کر میرے دل میں خواہش اور جذبات میں ہلچل پیدا کرکے میری شریف نفسی کا دل کھول کر مزا لے رہی ہو۔'' میں نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ چچی جان میرے لیے پانی لے کر آگئی تھیں۔ میں نے ندامت سے سر جھکا کر ایک ہی سانس میں گلاس کا سارا پانی حلق سے نیچے اتار لیا۔ پھر میں سنجیدہ ہوتے ہوئے چچی جان کی طرف متوجہ ہوا، تاکہ معلوم کرسکوں کہ پڑوس سے عورتوں کے رونے کی آوازیں کیوں آرہی تھیں۔ چچی جان نے خود ہی بتانا شروع کیا۔

''رونے کی آوازیں سن کر میں خود حیران تھی کہ خدانخواستہ کیا ناگہانی آفت آن پڑی ہے جو صائمہ کے گھر والے رو رہے ہیں۔ دو ماہ پہلے تو صائمہ کی شادی ہوئی تھی، تب تو ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ پھر یہ اچانک صفِ ماتم کیوں کر بچھ گئی۔ میں نے جاکر دیکھا تو اس گھر سے کچھ خواتین دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے باہر نکل رہی تھیں اور کچھ اندر داخل ہو رہی تھیں۔ اندر بھی کافی افراد جمع تھے۔ اس اچانک آنے والی افتاد نے مجھے بھی پریشان کردیا تھا۔ میں معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے بے چین ہوگئی تھی۔ میں بے چینی اور اضطرابی کیفیت میں ادھر ادھر نگاہ دوڑانے لگی تو مجھے دیوار سے تنہا لگے، اس کی سب سے عزیز کزن روتی نظر آئی۔ میں نے اسے دلاسا دے کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے۔ اس گھر کو کس کی نظر لگ گئی جو اس گھر کی فضا خوشیوں سے پلٹ کر غموں سے آلودہ ہوگئی ہے۔'' صائمہ کی کزن جس کا نام کرن تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ صائمہ کے شوہر نے ٹیلی گرام بھیجا ہے، جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں لکھا ہے کہ ہنی مون منانے کے لیے ہم لوگ صحت افزا مقام پر گئے تھے۔ سیر و تفریح اور چہل قدمی کے دوران ایک بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی سے صائمہ کا پاؤں پھسل گیا ہے، جس کے سبب وہ ایک گہری کھائی میں جا گری اور اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس کی موت کی خبر سن کر اس کے گھر والے اور سب عزیز و اقارب جمع ہوگئے ہیں اور ماتم کررہے ہیں۔" چچی جان کی اس الم ناک خبر پر مجھے بھی بے حد دکھ ہوا کہ دو ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ان کی پھولوں بھری سیج موت کی آغوش بن گئی تھی۔ ابھی تو صائمہ پر جوانی کی بہار چھانے بھی نہ پائی تھی کہ خزاں نے اس کا پر شباب چمن اجاڑ کے رکھ دیا تھا۔ میں نے فوراً انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ مگر میں یہ سوچ کر حیران ہورہا تھا کہ صائمہ کے شوہر کو اس الم ناک حادثے کی اطلاع دینے کی بجائے خود آنا چاہیے تھا مگر اس نے خود آنے کے بجائے فقط ٹیلی گرام ہی پر اکتفا کیوں کیا تھا۔ ٹیلی گرام میں فقط خبر ہوتی ہے، اس کی تفصیل نہیں۔ ہر شخص کے جواب میں ادھورا پن تھا۔ چچی جان کو بھی پوچھنے پر فقط اتنا بتایا گیا تھا کہ صائمہ پہاڑی سے گہری کھائی میں گر کر موت کا شکار ہوگئی ہے۔ اس سے آگے کچھ بتانے والے کو بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ دیر رو دھو کر صائمہ کی غائبانہ نماز جنازہ کا اہتمام کیا گیا۔ اس کی مغفرت کی دعا مانگی گئیں۔ اہلِ خانہ کے لیے صبرِ جمیل کی التجا خدا سے کی گئی۔ اس کام سے نمٹ کر کچھ آرام اور سکون کی فضا قائم ہوئی تو میں نے صائمہ کے بھائی شہزاد سے رابطہ قائم کیا۔ اس سے مجھے صائمہ کی موت کی تفصیل مل گئی تھی۔ کیونکہ شہزاد نے وہ خطوط لا کر دیئے تھے، جن کو صائمہ نے ہنی مون منانے کے دوران اسی صحت افزا مقام سے لکھے تھے، جہاں سے اس کی موت کی خبر آئی تھی۔ میں نے غور کیا تو یہ خطوط ایک ایک ہفتے کے وقفے سے لکھے گئے تھے۔ میں نے تاریخ وار ان کا مطالعہ کیا تھا۔ ہر خط میں یہی لکھا تھا کہ وہ بہت خوش و خرم زندگی بسر کررہی ہے۔ دنیا کی ہر خوشی اسے میسر اور راس آرہی ہے۔ وہ ایک کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر ہے اور بالکل اکیلی رہتی ہے۔ اس کے سسرال والے نہیں ہیں۔ ادریس خان اس کا شوہر اس کا بہت خیال رکھتا ہے، اس سے بے انتہا پیار کرتا ہے، وہ اسے اچھے سے اچھا کھلاتا ہے اور ہر روز کہیں نہ کہیں سیر و تفریح کے لیے لے جاتا ہے۔ ادریس خان کے پاس دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ تمام خطوط میں تحریریں ایک جیسی تھیں، مضامین یکساں تھے۔ بغور دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ ان خطوط میں ہاتھ کی لکھائی صائمہ کی نہیں تھی۔ کیوں کہ جس کاپی میں یہ خطوط رکھے تھے، وہ صائمہ کی نویں جماعت کی کاپی تھی اور صائمہ کی یہ لکھائی ان خطوط کی لکھائی سے یکسر مختلف تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ مجھے یہ واردات نظر آنے لگی۔ صائمہ کی موت واقع نہیں ہوئی ہوگی، بلکہ اسے پہاڑ سے دھکا دے کر گرایا گیا ہوگا۔ نجانے کیوں میرے ذہن کے گوشے میں یہ خیالات سر اُبھارنے لگے تھے۔ شکوک و شبہات دل میں جنم لینے لگے تھے۔ میرے وہم و گمان کو آخری خط نے یقین میں بدل دیا۔ وہ آخری خط صائمہ کی موت کے بعد یعنی ٹیلی گرام کے بعد روانہ کیا گیا تھا، جس میں صائمہ کی موت کی خبر کے ساتھ تفصیل درج تھی۔ میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ خط کا متین کچھ یوں تھا۔

"امی جان! امید ہے آپ کو صائمہ کے خطوط ملتے رہے ہوں گے جو وہ ہر ہفتے لکھا کرتی تھی۔ آپ نے خط کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ آپ لوگوں کے پاس ہمارا پتا نہیں تھا۔ ہم نے آپ کو اپنا پتا اس لیے نہیں دیا تھا کہ ہم عارضی طور پر ایک کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارا کوئی مستقل پتا نہیں تھا۔ ورنہ ضرور تحریر کرتے۔ مجھے صائمہ کی موت کا گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ میں اسی وجہ سے بیمار ہوگیا تھا۔ اس صدمے نے اس قدر نڈھال کردیا تھا کہ مجھے ہسپتال میں داخل ہونا پڑا۔ دو دن پہلے ہی ہسپتال سے آیا ہوں۔ طبیعت ابھی بھی ٹھیک نہیں ہوئی۔ اس لیے آپ کو خط لکھ رہا ہوں کہ صائمہ کی موت کس طرح واقع ہوئی، تاکہ آپ کو تفصیل سے آگاہ کردوں۔ شاید آپ کے دل کو تسلی ہوسکے۔ میں

جانتا ہوں جوان میت کا زخم انتہائی گہرا ہوتا ہے۔ جو بہت عرصے میں مندمل ہوتا ہے۔ بہر حال قدرت کو یہی منظور تھا۔

"جب ہم اس پہاڑی مقام پر آئے تو سردیوں کا موسم تھا۔ لہٰذا یہاں برف باری ہورہی تھی۔ صائمہ کو ایسا موسم دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ میں اس کے اصرار پر اسے سیر و تفریح کے لیے روزانہ کسی نہ کسی پہاڑی مقام پر لے جاتا تھا۔ یوں زندگی بہت خوش گوار گزر رہی تھی۔ سارا دن گھومتے پھرتے رہتے تھے اور شام ہوتے ہی گھر لوٹ آتے تھے۔ صائمہ کو کھانا پکانے اور گھر کا کام کاج کرنے کی بھی زحمت نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ہم تینوں وقتوں کا کھانا ہوٹلوں پر کھاتے تھے۔ بس سونے کے لیے گھر کا رخ کرتے تھے۔ جس دن صائمہ کی موت واقع ہوئی، اس دن یہاں کا درجہ انجماد منفی تھا اور برف باری شدت اختیار کرگئی تھی۔ یہاں کے راستوں کو برف نے ڈھانپ دیا تھا۔ ٹریفک کا نظام درہم برہم ہوکر رہ گیا تھا۔ جو جہاں تھا وہیں پھنس گیا تھا۔ ایسے حالات میں حسب معمول صائمہ نے ضد کی کہ اسے سیر پر لے چلوں۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ سردی حد سے تجاوز کرچکی ہے، ٹینکوں میں پانی جم کر برف بن چکا ہے اور تمام تر رستے برف آلودہ ہوچکے ہیں۔ پہاڑوں کو برف نے برف پوش کردیا تھا۔ میں نے سمجھایا تھا کہ وہ ایک معتدل آب و ہوا والے علاقے میں پیدا ہوئی ہے اور وہیں پلی بڑھی ہے۔ اسے یہ سخت سردی اور برف باری والا موسم راس نہیں آئے گا۔ وہ سخت بیمار پڑ جائے گی مگر وہ بضد رہی۔ بالآخر میں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اور اسے سیر پر لے گیا۔ یہاں پر واقع ایک جھیل دنیا میں بہت مشہور ہے اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے بہت دلکش ہے۔ اس جھیل کا شمار دنیا کی خوب صورت ترین جھیلوں میں ہوتا ہے۔ یہاں پر آئے ہوئے سیاح اس جھیل کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوئے بنا واپس نہیں جاتے ہیں۔ صائمہ کو بھی یہ جھیل بہت پسند آئی تھی۔ وہ دوبارہ اسے دیکھنے کے لیے آئی تھی۔ اس بار صائمہ نے اس کا نظارہ بلندی سے کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ وہ مجھے لے کر جھیل کے قریب واقع ایک بلند ترین پہاڑی پر چڑھ گئی۔ پہاڑی کے ایک طرف پہاڑوں کا دور تک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ دوری طرف جھیل تھی اور باقی دو اطراف میں ہزاروں فٹ گہری کھائیاں موجود تھیں۔ ہم قدرت کے دل کش مناظر میں یوں محو تھے کہ نشیب و فراز کا خیال ذہن سے نکل گیا۔ اچانک اس کا پاؤں برف پر سے پھسلا اور وہ ایک جھٹکے سے اس گہری کھائی میں جاگری، جس میں گرنے سے انسان کی ہڈیاں بھی نہیں ملتی۔ اس کی آخری چیخ کی آواز آج بھی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے تو میں سوتے میں چونک کر جاگ جاتا ہوں۔ میری شریکِ حیات مجھے فقط دو ماہ کی حسین ترین رفاقت کے بعد داغِ مفارقت دے گئی تھی۔ آپ میرے لیے دعا گو رہیں کہ خدا مجھے اور آپ کو صبر جمیل عطا کرے اور صائمہ کو غریقِ رحمت کرکے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔"

فقط بدنصیب

ادریس خان

اس آخری خط سے مجھے صائمہ کی موت کی نہ صرف تفصیلات معلوم ہوگئی تھیں، بلکہ اس کی موت کا نقشہ بھی ذہن میں گھوم گیا تھا۔ واقعی صحت افزا مقامات پر اس قدر اونچے پہاڑ ہوتے ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور اس قدر گہری کھائیاں ہیں کہ اللہ کی پناہ! بہر حال مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ سب کچھ حقیقتِ حال معلوم ہونے کے باوجود ایک شک ابھی بھی میرے دل میں پھانس بن کر چبھا ہوا تھا۔ وہم کا ایک نشتر میرے دل میں پیوست ہوچکا تھا کہ صائمہ نے کوئی خط خود نہیں لکھا تھا۔ بلکہ صائمہ کی طرف سے ادریس خان نے لکھے تھے۔ یہ وہ نکات تھے جن سے شکوک و شبہات جنم لے رہے تھے کہ ادریس خان نے یہ خط کیوں لکھے تھے۔ جبکہ صائمہ میٹرک پاس تھی اور لکھنا پڑھنا جانتی تھی۔ پھر ادریس خان کے کام پر چلے جانے کے بعد اس کے پاس فرصت ضرور ہوتی ہوگی۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوران خط خود لکھ سکتی تھی۔ میں ایک زمانہ شناس شخص تھا۔ دنیا کی رفتار سے واقف تھا۔ میں سارا دن صائمہ کی زندگی اور پھر موت کے پہلو پر غور کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عقل وخرد نے کہا۔ ہوسکتا ہے کہ صائمہ کا انتقال پہلے ہوچکا ہو، اور ادریس خان نے اس کے گھر والوں کو بعد میں مطلع کیا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ادریس خان نے صائمہ کو کسی دوسرے ملک اسمگل کردیا ہو، بعد میں اس کی موت کا بہانہ تراش لیا ہو۔ تیسرا شک یہ بھی سر اٹھا رہا تھا کہ کہیں اس کا تعلق کسی بہت بڑے اغوا کرنے والے گروہ سے ہو، اور اس نے کسی شمالی علاقہ جات میں نجی جیل بنا رکھی ہو، اور اس کی بہت اچھی رقم وصول کرلی ہو، کیونکہ صائمہ نہ صرف حسین وجمیل، نرم وگداز بدن والی اور کم عمر تھی۔ اس کا ثبوت اس کی ان تصاویر سے مل رہا تھا جو اس نے شادی سے پہلے کھنچوائی تھیں۔ کوئی بھی گھناؤنی سازش والا گروہ اس کی بہت اچھی قیمت دے سکتا تھا۔ ایسے گروہوں کی ان تمام اقسام کی خبریں دن رات اخبارات میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ جن سے نہ صرف معلومات میں اضافہ ہوتا تھا بلکہ کانوں کے کیڑے بھی جھڑتے تھے کہ آج کل انسان کتنی پستی میں گرتا جارہا تھا اور انسان کی قدر وقیمت کس قدر ارزاں ہوگئی تھی۔ شاید ادریس خان نے ایسا ہی کچھ کردیا تھا اور بعد میں صائمہ کے گھر والوں کو اطمینان دلانے کے لیے ایسا بہانہ تراش لیا ہو کہ جس کے لیے اسے نہ تو کوئی ثبوت پیش کرنا پڑے اور نہ اس کی لاش حوالے کرنی پڑے۔ اس لیے یہ سب باتیں ممکن بھی تھیں اور ناممکن بھی۔ لیکن اگر یہ سب ممکن تھا تو اسے ثابت کرنے کے لیے جو دلائل، حقائق اور ٹھوس ثبوت درکار تھے، وہ میرے پاس نہیں تھے۔ میں ایک عام سا انسان تھا، کوئی پولیس آفیسر نہیں کہ بال کی کھال نکالتا اور ادریس خان اور اس کے پورے گروہ کو بے نقاب کرکے قرار واقعی سزا دیتا۔ مجھے ان واقعات کے متعلق سوچ سوچ کر ذہنی ٹینشن ہورہی تھی۔ میں نے اپنے دل ودماغ اور ذہن سے ہر قسم کے خیالات کو جھٹک دینا چاہا مگر میں خدمتِ خلق کے ہاتھوں مجبور تھا اور یہ میری فطرت میں شامل تھی۔ انسانیت سے محبت میری رگ وپے میں بس گئی تھی اور میں نے اسی خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے شمیکا سے بھی بات کی کہ میں اس الجھی گتھی کو سلجھانا چاہتا ہوں تاکہ ادریس خان اور اس جیسے بدبخت لوگ آئندہ کسی معصوم لڑکی کی عزت کو کھیل تماشا نہ بنائیں اور اس کاروبار کو بند کردیں۔ شمیکا نے مجھے اس معاملے میں کھلی چھوٹ دے دی اور اپنی حمایت اور مدد کے لیے مکمل تعاون کی یقین دہانی کرائی اور چند کلمات مجھے منہ زبانی یاد کرادیئے کہ میں جب بھی ان کلمات کو تین بار دہراؤں گا تو وہ فوراً جہاں کہیں بھی ہوگی، میرے پاس چلی آئے گی۔ کلمات بہت آسان تھے۔

آ......ری بھونری، جا......ری بھونری۔ اپنے
پیا کو پاری بھونری
سن ری بھونری، بھوج ری بھونری، اپنے پیا کو
کھوج ری بھونری

ان کلمات کو میں تین بار ادا کروں گا تو شمیکا میرے پاس پلک جھپکتے میں حاضر ہوجائے گی۔ ایک طرف میرے ساتھ خدا کی مدد ونصرت تھی تو دوسری طرف شمیکا کی جناتی طاقتیں اور بے شمار شکتیاں۔ جناتی مدد سے کوئی بھی انسان دنیا کا کوئی بھی محاذ اور بڑے سے بڑا میدانِ کارزار فتح کرسکتا تھا۔ اور کہتے ہیں کہ تمام آسائشوں، راحتوں اور نعمتوں کو پانے کے لیے دولت سب سے مضبوط محرک ہوتا ہے، جس سے دنیا کی ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔ جس کی خاطر انسان نہ صرف اپنی عزت وآبرو، تن بدن اور ایمان تک بیچ دیتا ہے۔ دولت وہ کنجی ہے جس سے دنیا کی ہر عمارت کا تالا کھولا جاسکتا ہے۔ چاہے وہ عمارت کامیابی اور کامرانی کی ہو یا ترقی کی۔ دولت سے ہر ناممکن کام بھی ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ مجھ میں اس کی کمی کو قسطنطنا کی بیوی نے پورا کردیا تھا۔ اس کا وہ بٹوا بڑا عجیب وغریب ثابت ہوا تھا۔ میں نے دنیا میں آج تک ایسا دولت کا خزانہ نہ

دیکھا اور نہ سنا تھا۔ قارون کے پاس کیا دنیا کے کسی بادشاہ وشہنشاہ کے پاس بھی ایسا خزانہ نہیں تھا جو خرچ کرنے پر اتنا ہی رہتا تھا۔ میری تمام تر دعائیں قبول ہوچکی تھیں۔ خدا نے مجھے بے روزگاری کے عوض خدمتِ خلق کا کام سونپ دیا تھا۔ ایک اچھے دوست کی صورت میں شمیکا عطا کردی تھی اور دولت مند ہونے کے لیے بٹوا کافی تھا اور پھر نہ صرف مجھے یہ چیزیں دیں تھیں، شباب، جوانی، صحت مندی، خوب صورتی اور طاقت وقوت کے ساتھ حوصلہ اور دل جگر بھی عطا کیے تھے۔

میں نے صائمہ کے مسئلے کو سلجھانے کے لیے اپنی تگ ودو تیز کردیں۔ اپنی تشویش کو مٹانے کے لیے تفتیش کا دائرہ وسیع کردیا۔ مزید معلومات کی تو جو باتیں میرے سامنے آئیں، وہ مندرجہ ذیل تھیں۔ صائمہ کے تمام پڑوس والے اور محلے دار یہ بات جانتے تھے کہ صائمہ ایک بھینگی لڑکی تھی۔ جس کی وجہ سے کوئی عام آدمی اس سے شادی کرنے پر رضا مند نہیں ہوتا تھا۔ پھر ادریس خان نے اس سے شادی کیوں کرلی تھی۔ جب اس سوال کے جواب کی تصدیق چاہی تو اس محلے کے ایک لڑکے پپو سے پوچھا اور اس سلسلے میں بات کی تو اس نے بتایا کہ اس نے ادریس خان کو صائمہ کی اس خامی کے بارے میں کھل کر بتادیا تھا مگر اس کے باوجود وہ صائمہ سے شادی کرنے پر راضی ہوگیا تھا۔ صرف اس لیے کہ نسرین آپا جس نے یہ رشتہ کرایا تھا، اس نے ادریس خان نے ذہن میں یہ بات راسخ کردی تھی کہ لڑکی میں صرف خامی ایک ہے کہ وہ بھینگی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ خوب صورت، اسمارٹ، شرم وحیا کا پیکر، ان چھوئی کلی اور انتہائی کم سن ہے۔ اس کے والدین مالی طور پر مستحکم بھی ہیں۔ یوں تمہیں خوب صورت اور حسین لڑکی کے ساتھ جہیز کا سامان اور دولت بھی ہاتھ آئے گی۔ سونا چاندی کے زیورات اور نقدی بھی ملے گی۔ کیوں کہ صائمہ ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔ اور پھر وہ تمہارے احسان مند بھی رہیں گے کہ تم نے ان کی نقص والی بیٹی کو بیوی کے روپ میں اپنایا ہے۔ پپو نے بتایا تھا کہ ان وجوہات کی بنا پر ہی ادریس خان اس شادی کے لیے نہ صرف راضی ہوا تھا بلکہ بضد تھا۔ ادریس خان نے صائمہ سے نہ صرف شادی کا اٹل فیصلہ کرلیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی کر دکھایا۔ بے چاری صائمہ کی قسمت کہ وہ کنوارے پن میں اپنے والدین کے گھر عیش وآرام کی زندگی بسر کرتی رہی مگر شادی شدہ ہونے کے بعد اس کی زندگی نے اس سے وفا نہیں کی۔

پپو کی گفتگو سے یہ بات بھی سامنے آگئی تھی کہ ادریس خان نے صائمہ سے کم سنی، حسن وجمال اور جہیز دیکھ کر شادی کی تھی۔ میں اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ادریس خان نے صائمہ کے ساتھ دو ماہ عیش ونشاط کے گزارنے کے بعد اس کا جہیز ضبط کرلیا ہوگا اور دل بھر جانے پر اسے راستے کی رکاوٹ سمجھ کر ہٹا دیا ہوگا۔ اسے فروخت کردیا ہوگا، یا کسی دوسرے لڑکی کے عوض کسی دوست کی نذر کردیا ہوگا، یا پھر دوسری بات کہ اسے پہاڑ سے گرا کر قتل کردیا ہوگا۔ یہ بات ایک کہانی کی طرح اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ جب صائمہ کے گاؤں میں بات عام ہوئی کہ میں اس کیس کو اپنے طور پر لڑنے کی تیاری کررہا ہوں تو میری ملاقات ایک دوشیزہ سے ہوئی جو مجھے ایک اور کہانی سنانے کے لیے بے چین تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کہانی سچی ہے۔ لہٰذا میں وہ کہانی سننے کے لیے تیار ہوگیا تھا مگر اس کی شرط تھی کہ وہ کہانی مجھے اپنے گھر جاکر سنائے گی۔ اس لڑکی کا نام اریبہ تھا۔ جو دل میں مجھ سے ملاقات کا اشتیاق لے کر حاضر ہوئی تھی۔ میں اس کی شرط مانتے ہوئے اس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے دوپہر کے پر لطف اور خوش ذائقہ کھانے سے میری ضیافت کا بندوبست کردیا۔ وہ ایک حویلی نما عمارت میں رہتی تھی۔ اس کی حویلی نما عمارت پرانی طرزِ تعمیر کا شاندار نمونہ تھی۔ جس انجینئر اور ڈیزائنر نے بھی اسے بنایا تھا، وہ اپنے فن وہنر میں طاق تھا۔ اور اس کی تعمیر میں اس نے نہ صرف اپنے فن وہنر کا بھرپور استعمال کیا تھا بلکہ جی لگا کر بنایا بھی تھا اور گہری دلچسپی بھی لی تھی، ورنہ اس قدر وسیع اور بڑی عمارت اس قدر پرشکوہ نہ ہوتی۔ ہر زاویے سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس عمارت کی دلکشی کا خیال رکھا گیا تھا۔ جب میں نے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے لیے کال بیل کا بٹن دبایا تھا تو واضح الفاظ میں ''کوئی ہے'' ''کوئی ہے'' کے الفاظ کی تکرار صاف سنائی دی تھی۔ اور ایک لمحے بعد ہی چوکیدار نے دروازہ کھول دیا تھا۔

''آیئے ارسلان صاحب۔'' چوکی دار نے مجھے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اریبہ نے پلان کے مطابق گھر میں بتادیا تھا کہ وہ ارسلان کو لینے جارہی ہے۔ لہٰذا گھر میں کھانے پینے کے بندوبست کے ساتھ ادب وآداب کا خیال بھی رکھا جائے۔

''بیگم صاحبہ نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ آپ ان کے ساتھ آنے والے ہیں۔ ہم آپ ہی کا انتظار کررہے تھے۔ اریبہ کوئی اٹھائیس سال کی حسن وجمال کی مالک لڑکی تھی۔ اس کا حسن دیکھ کر خدا کی ثنا کرنے کو جی چاہتا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے کہنا پڑا کہ ایسی خوب صورت حویلیوں میں اریبہ جیسی شہزادی کو ہی رہنا چاہیے۔ ہم ضیافت سے فراغت پاکر دوسرے کمرے میں آرام و سکون سے بیٹھ چکے تھے۔ اریبہ میرے سامنے براجمان ہوگئی۔ اس نے پھول دار لان کا ہلکا سا سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا اور چھوٹا سا دوپٹا گلے میں اٹکایا ہوا تھا۔ یہ حقیقت تھی کہ نازک اندام لڑکی پر نازک سی چیزیں ہی مزہ دیتی ہیں اور اس کے حسن میں اضافے کا باعث بنتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ان کے محبوب کے ہاتھوں میں چوڑیاں زینت بن گئیں یا کانوں میں ہیرے کے جڑاؤ کے جھمکے زینت بخش رہے تھے۔ میں شاعر تو نہیں تھا مگر یہ کہنے کو جی چاہ رہا تھا کہ اریبہ نے جو جو اشیا زیب تن کی ہوئی تھیں، ان سب چیزوں کو اس کا نازک پھول جیسا اور نرم روئی جیسا گداز بدن زینت بخش رہا تھا۔ اس کے جسم وبدن پر کپڑے اور فیشن کی اشیاء سج کر اپنے مقدر پر ناز کررہی تھیں۔ بہرحال میں بہ مشکل اس کے حسن و جمال کے سحر سے نکل پایا تھا۔ اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سمجھ گئی تھی اور شرم وحیا کا مجسمہ بن چکی تھی۔

''جی اریبہ۔ میں ہمہ تن گوش ہوں، آپ جو کہانی مجھے سنانا چاہتی ہے، وہ من وعن سنادیں۔ ممکن ہے میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔'' ہم دونوں نجانے کس رخ پر مڑ جاتے، اگر میں مطلب کی بات پر نہ آ گیا ہوتا۔

''ارسلان صاحب، چائے پی لیں، پھر تسلی سے گفتگو ہوگی۔ میری کہانی میں مرچ مسالہ تو نہیں ہے، لیکن یہ ایک سچی کہانی اور جگ بیتی ہے۔'' اریبہ نے ملازمہ کو چائے کی ٹرے لاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''محترمہ، میں آپ کو زیادہ وقت نہیں دے سکوں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اس گاؤں میں ایک مہمان کی حیثیت سے رکا ہوا ہوں، اور مجھے بہت جلد اپنے مشن پر روانہ ہونا ہے۔'' میں نے مختصراً کہا۔

''جی ارسلان صاحب! میں آپ کے بارے میں جانتی ہوں کہ آپ کا وقت بہت قیمتی ہے اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ کی زندگی انسانیت کی خدمت کے لیے وقف ہے، اور اس خدمت کا نہ تو آپ کچھ صلہ چاہتے ہیں اور نہ کسی قسم کا کوئی معاوضہ۔'' اریبہ نے میری طرف چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے اقرار کیا۔ میں خاموش رہ کر چائے پینے کا عادی تھا۔ اس لیے چائے کے دوران گفتگو اور مزید بات چیت سے پرہیز کیا۔ چائے ختم کرنے کے بعد میں نے اپنی جیب سے ایک کاغذ اور قلم نکالا تاکہ کہانی کے کچھ نکات نوٹ کرسکوں۔ اریبہ نے مجھے تیار دیکھا تو خود بھی سنبھل کر بیٹھ گئی اور اپنی کہانی سنانے کا آغاز کیا۔ اریبہ نے بتایا۔

''ہم دو بہنیں تھیں۔ علیشا مجھ سے بڑی بہن تھی۔ ہم اپنا اسکول کھولنا چاہتے تھے۔ مجھے تعلیم وتربیت سے گہرا لگاؤ ہے اور علیشا کو بھی ایجوکیشن اور درس و تدریس کا شغف تھا۔ لہٰذا ہم نے پلان بنایا کہ کیوں نہ ایک اسکول قائم کیا جائے، جس سے ایجوکیشن یعنی تعلیم و تربیت کا شوق ہم دونوں کا پورا ہوجائے اور اس گاؤں کے بچوں کی تعلیمی ضروریات بھی پوری ہوسکیں۔ اور یوں قوم وملت کی ترقی میں ہمارا بھی حصہ شامل ہوجانا چاہیے۔ وہ آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوتا۔ اسکول

کھولنے کے لیے ہم نے معلومات حاصل کیں۔ ایک شرط یہ بھی تھی کہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر یا پرنسپل کی تعلیمی قابلیت ایم اے۔ ایم ایڈ ہونا چاہیے۔ علیشا نے ایم اے اور بی ایڈ کیا تھا۔ ایم ایڈ کی کمی تھی۔ ایم ایڈ کا ایک سالہ کورس تھا۔ علیشا نے اس کمی کو دور کرنے کے لیے ایم ایڈ میں داخلہ لے لیا تھا۔ اور یوں وہ اسکول کی پرنسپل بننے کے لیے خود میں قابلیت پیدا کررہی تھی۔ وہ مقامی ایجوکیشن کالج میں داخل ہوگئی، جس میں مخلوط تعلیم کا رواج تھا اور کوٹہ سسٹم کی پابندی تھی۔ دورانِ تعلیم علیشا کی دوستی ارباز خان سے ہوگئی جو شمالی علاقہ جات سے یہاں پڑھنے کے لیے آیا تھا اور اسے کوٹہ سسٹم کی وجہ سے اس کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ ان کی دوستی اس قدر آگے بڑھی کہ محبت میں تبدیل ہوگئی۔ میں نے علیشا کو دیکھ بھال کر قدم اٹھانے کے لیے سمجھایا تھا مگر وہ دونوں حد سے تجاوز کر گئے تھے۔ علیشا مجھ سے بڑی تھی۔ لہٰذا میں رعب، زبردستی یا ڈانٹ ڈپٹ سے کام نہیں لے سکتی تھی۔ ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں تھی، مگر ارباز خان ایک متوسط طبقے اور گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ جس نے محبت کے امیری اور غریبی کے فرق کو مٹانے والے ڈائیلاگ بول کر علیشا کا دل موہ لیا تھا۔ اس نے وہی پرانی باتیں دہرائی تھیں کہ محبت کسی ذات پات کو نہیں مانتی، کسی عمروں کی بندشوں کی مقید نہیں ہوتی، امیر وغریب کا فرق نہیں رکھتی اور محبت کی کوئی سرحد نہیں ہوتی بلکہ محبت اور جنگ میں وہ سب جائز اور ناجائز کام کر گزرنے کا قائل تھا۔ وہ محبت کو اندھی کہتا تھا کہ یہ ظالم سماج اور ستم گر زمانے کے رسم ورواج کی پابند نہیں ہے۔ وہ رنگ ونسل، ملت وتہذیب اور مذاہب کی سیمائیں بھی برداشت نہیں کرتا تھا۔ محبت کو رشتوں ناتوں کی بندشوں سے آزاد بتاتا تھا۔ اس نے ان باتوں سے علیشا کے ذہن کو یرغمال بنالیا تھا۔ علیشا کئی بار اسے یہاں بھی لائی تھی۔ وہ بنگلہ، شان وشوکت اور امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ سے بہت مرعوب ہوا تھا۔ دولت کی ریل پیل اور علیشا کے حسن وشباب اور جوانی نے اس کی محبت کی دیوانگی اور عشق کی مزید وارفتگی میں بظاہر اضافہ کردیا تھا۔

ایک طرف علیشا کو اس کی باتیں خوب صورت اور پر اعتماد لگتی تھیں تو کبھی کبھار اسے ارباز خان پر دھوکا دہی کا شبہ بھی ہوتا تھا۔ ارباز نے علیشا کو مجبور کردیا تھا کہ وہ جلد از جلد اس سے شادی کرلے۔ علیشا نے بھی ضد پکڑ لی تھی۔ بادلِ نخواستہ مجھے ان کی ضد اور نادانی کے سامنے مجبوراً ان کی شادی کا اقدام اُٹھانا پڑا۔ ہماری بے بسی سے فائدہ اٹھا کر ارباز خان نے علیشا کو شمالی علاقہ جات میں رہائش اختیار کرنے پر، نہ صرف راضی کرلیا تھا بلکہ جہیز کے علاوہ بیس لاکھ روپے نقد بھی طلب کیے تھے۔ یوں وہ اپنی من کی مراد پانے کے بعد علیشا کو تمام تر سامان کے ساتھ اپنے علاقے میں لے گیا۔

وہاں جاکر ہر ہفتے علیشا کا خط آتا رہا کہ وہ خوش وخرم زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا شوہر بہت محبت کرتا ہے اور اس کی صحت کا خیال رکھتا ہے۔ وہ سارا سارا دن سیر وتفریح کرتے رہتے ہیں اور رات کو لحافوں میں چھپ کر سو جاتے ہیں۔ تینوں وقت کا کھانا ہوٹلوں میں کھاتے ہیں۔ اور ابھی تک اس نے کام کاج کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ ارباز خان نے ابھی تک اپنے گھر والوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور ہم اس گھر میں اکیلے عیش و نشاط کی زندگی گزار رہے ہیں۔

''ٹھہرو۔ پلیز۔ ذرا رک کر دوبارہ بتانا۔ تھوڑا سا پانی پی لو، تمہارا گلا خشک ہوگیا ہے اور آواز بھی رندھ گئی ہے۔'' میرے کہنے سے وہ پانی پینے لگی۔ میں سوچ کی گہرائی میں اترتا چلا گیا۔ وہی کہانی، وہی ڈائیلاگ، وہی قصہ، وہی علاقہ، اسی طرح شادی، مگر کردار دوسرا تھا۔ نام دوسرا تھا۔ مجھے شک تھا کہ کہیں علیشا کے ساتھ بھی صائمہ والا حال تو نہیں ہوا۔ کہیں یہ کہانی ایک ہی تو نہیں ہے، جسے دوبارہ دہرایا گیا ہو، یا کھیل اسی طرح بار بار کھیلا جارہا ہو۔ جس کا ہیرو ایک ہو اور ہر فلم میں ہیروئن بدل جاتی ہو۔ ہیرو جس کے چہرے کئی ہوں، نام مختلف ہوں مگر کام ایک ہی ہو۔ حسین دوشیزاؤں کی قربت اور دولت کا حصول۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اریبہ حیران تھی کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں نے کاغذ اور قلم کیوں رکھ دیا تھا۔ وہ پریشان نظر آرہی تھی کہ میں نے کہانی ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ وہ نا سمجھتے ہوئے معنی خیز نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔

''اریبہ...... کیا آپ مجھے وہ خطوط دکھا سکتی ہیں جو علیشا نے تمہیں ہفتہ واری لکھے تھے؟'' میں نے اس سے خطوط مانگے تو اس کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

''ارسلان صاحب...... وہ خطوط بھی میں آپ کو دکھا دوں گی مگر پہلے میری بات تو مکمل ہو جانے دیں۔'' اریبہ نے مزید کچھ کہنا چاہا تھا۔

''پلیز اریبہ...... یہ ایک کہانی نہیں ہے۔ ایک المیہ ہے، ایک ایڈونچر ہے۔ تم جلدی سے مجھے کوئی ایک خط دکھا دو۔ ہوسکتا ہے کہ میں اس کہانی کو سننے سے پہلے ہی انجام تک پہنچ جاؤں۔'' میں نے اریبہ کو بولنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی اٹھی اور چند لمحوں میں وہ خطوط لے کر میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ایک خط لیا اور بغور دیکھنے لگا۔ اس خط کی تحریر، ہاتھ کی لکھائی، متن اور جملوں پر توجہ دی تو مجھے ایسا لگا جیسے ارباز خان کی بیوی علیشا کا خط نہیں بلکہ ادریس خان کی بیوی صائمہ کا خط پڑھ رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں خط ایک دوسرے کی فوٹو کاپی ہیں۔ بس نام تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ میں نے اپنے شک کو یقین کا جامہ پہناتے ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔'' اریبہ مزید حیرت در حیرت کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔

''اریبہ جی...... فقط اتنا بتا دیں کہ آپ کی بہن علیشا زندہ ہیں یا کسی پہاڑی پر سے ان کا پاؤں پھسل کر موت کا شکار ہو گئی ہیں۔'' میں نے اریبہ کی حیرت میں دو چند اضافہ کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ اپنی کرسی پر یوں اچھل پڑی تھی جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگ گیا ہو۔

''ارسلان صاحب، آپ کو کیسے پتا چلا کہ علیشا کا پہاڑی سے پاؤں پھسل کر انتقال ہوا ہے، آپ کون ہیں، آپ کو یہ سب باتیں پہلے سے کیسے معلوم ہیں، آپ سے تو میری یہ دوسری ملاقات ہے، جبکہ علیشا نے تو آپ کو اور آپ نے علیشا کو آج تک دیکھا تک نہیں ہے۔ پھر آپ اتنی گہری خفیہ اور رازدارانہ باتیں کیسے جانتے ہیں۔'' اریبہ نے مشکوک نظروں سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''مس اریبہ، یہ کہانی نئی نہیں ہے بلکہ اس کہانی کو دہرایا گیا ہے۔ یقیناً ایک دو ماہ کے بعد تمہیں علیشا کا ایک اور خط موصول ہوا ہوگا، جس میں اس کی اچانک موت کی خبر ہوگی۔ بہانا تراشا گیا ہوگا کہ شادی کا ہنی مون منانے کے لیے وہ پہاڑوں کی سیر کر رہے تھے، برف باری کا مزہ لے رہے تھے کہ علیشا کا بدقسمتی سے پاؤں پھسل گیا اور چٹان پر سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکی، جس کی وجہ سے وہ گہری کھائی میں جا گری۔ ایسی گہری کھائی جس میں گرنے سے انسان کی ہڈیاں تک نہیں پاتیں اور اس کے بعد ایک خط اور......''

''ہاں ہاں ارسلان صاحب، بالکل یہی کارروائی ہوئی تھی، ہو بہو ایسا ہی ہوا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ درپیش آیا ہوگا۔'' اریبہ نے میری بات کاٹتے ہوئے عجلت میں کہا۔

''دراصل اس محلے میں جہاں میں آج کل ٹھہرا ہوا ہوں۔ ایک صائمہ نام کی لڑکی رہتی تھی۔ اس کی شادی ادریس خان سے ہوگئی تھی۔ اس کا شوہر اسے جہیز کے سامان کے ساتھ شمالی علاقہ جات لے گیا تھا۔ صائمہ کے ہفتہ واری خطوط اس متن و عبارت کے ساتھ موصول ہونے لگے اور پھر تمام تر تفصیلات وہی ہیں جو آپ کی بہن علیشا کے ساتھ پیش آئیں۔ یہ واقعہ اسی پڑوس میں ہوا ہے، جس کی میں نے خود چھان بین کی ہے۔ لہٰذا ان دونوں واقعات یا یوں کہو کہ وارداتوں کی کڑیاں ملائی جائیں تو ایک زنجیر بنتی ہیں۔ اس زنجیر کے ایک سرے کو تھام کر چلا جائے تو اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ ادریس خان اور ارباز خان دو الگ الگ شخص نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ اور اس کی کارروائی کا مقصد دولت کے حصول کے ساتھ ساتھ نوجوان اور باکرہ لڑکیوں سے عیاشی کرنا ہے۔ جب تک

دل نہیں بھر جاتا، وہ ان کے ساتھ راتیں رنگین کرتا ہے۔ دن عیش و نشاط میں گزارتا ہے۔ اور جب دل بھر جاتا ہے تو پرانے کھلونے کو توڑ کر نیا کھلونا تلاش کرتا ہے۔ یا یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ جب تک اسے لڑکی جو اس کی نئی نویلی بیوی ہے، کو راستے سے ہٹانے کا بندوبست نہیں ہو جاتا، تب تک وہ اس کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور جب وہ اسے ایسی موت مارنے میں کامیاب ہو جاتا ہے، جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، یعنی اس کی لاش بھی نہ ملے اور کوئی باقیات بھی نہ رہے تو وہ نئے شکار کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ ایسے شخص کے تنہا ہونے میں شک ہوتا ہے کیونکہ ان کے پیچھے کسی بہت بڑے بردہ فروش گروپ کا ہاتھ ہوتا ہے یا پھر لڑکیوں کو اغوا کر کے سرحد پار بھیجنے والے گروہ بھی ملوث ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے کارندے ادریس خان یا ارباز خان جیسے لوگوں کے ذریعے امیر کبیر گھرانوں کی حسین و جمیل اور کم عمر دوشیزاؤں کو محبت کے جال میں پھانس کر یا اغوا کر کے یا بیرونِ ملک ملازمت کا لالچ دے کر ورغلاتے ہیں اور کسی بہانے سے اپنی کمین گاہوں تک لے آتے ہیں۔ جہاں پر وہ مال و دولت، زیورات اور لڑکیوں کی عزت لوٹ کر قتل کر دیتے ہیں یا پھر اغوا کی جانے والی لڑکیوں کے والدین سے بھاری رقم کی صورت میں تاوان حاصل کرتے ہیں اور اکثر اوقات ان کی قابلِ اعتراضات تصاویر بنا کر ان کے خاندان والوں کو بلیک میل کرتے رہتے ہیں۔ اس گھناؤنی سازش میں بسا اوقات پولیس بھی ان لوگوں کے ساتھ ملی ہوتی ہے، اور بڑے لوگ ان کی سرپرستی کر رہے ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ قانون کی گرفت میں نہیں آتے اور دیدہ دلیری سے اس گھناؤنے اور شرمناک کاروبار کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی معصوم سی لڑکی ان کا شکار ہو جاتی ہے، اور اپنی عزت و عصمت، مال و دولت کے ساتھ ساتھ اپنی جان بھی گنوا دیتی ہے۔ جیسے کہ صائمہ اور علیشا کے ساتھ ہوا۔ ایک دو واقعات تو ایسے بھی سامنے آئے ہیں کہ اس قسم کی لڑکیوں کو سمندر پار لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جاتا ہے۔ ان لوگوں کا تعلق جنسی تشدد کرنے والے گروہوں سے ہوتا ہے یا پھر عریاں فلمیں بنانے والوں سے۔ ایسے ہی ایک گروپ کے خلاف اعلیٰ حکام نے کارروائی کر کے چھاپے مارے تو ایک پہاڑ کی سرنگ میں نجی جیل کا انکشاف ہوا تھا۔ جس میں ایک سو کے قریب لڑکیوں کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ ان لڑکیوں سے پوچھ گچھ کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے کسی کو بیرونِ ملک ملازمت کا لالچ دے کر لایا گیا ہے۔ کسی کو اغوا کر کے اس جیل میں بند کر دیا گیا ہے، اور اکثر کو محبت کے جھوٹے مکر و فریب اور وعدوں کے جال میں الجھا کر قیدی بنایا گیا ہے۔ مگر افسوس صد افسوس کی بات یہ تھی کہ یہ لڑکیاں نہایت عریاں اور برہنگی کی حالت میں اس نجی جیل میں قید رکھی گئی تھیں اور انہیں کھانے کے لیے بھی سوکھی روٹی اور پانی دیا جاتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کے چہروں کی رونقیں نہ صرف چھن گئی تھیں بلکہ ان کی جگہ حیرت، افسردگی اور مایوسی نے لے لی تھی۔ ان لڑکیوں کا کہنا تھا کہ ہر روز کوئی نہ کوئی بڑے آدمی آتا تھا اور اپنی پسند کی لڑکی کو لباسِ عروسی پہنا کر اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور چند روز بعد وہ لڑکی دوبارہ لا کر اس جیل میں قید کر دی جاتی تھی۔ اس دوران وہ بڑے لوگوں کی ہوس کا شکار ہو چکی ہوتی تھی۔ ان لڑکیوں کو زبردستی سرکاری اور غیر سرکاری لوگ اپنے بستر کی زینت بناتے تھے اور مطلب پورا ہونے پر وہی سڑنے کے لیے چھوڑ جاتے تھے۔ عریاں یا برہنہ ان کو اس لیے رکھا جاتا تھا کہ ان کے لیے کپڑے کہاں سے آتے۔ یہ لوگ تو دولت لوٹتے تھے، دولت خرچ کرنا نہیں جانتے تھے، اور وہ ان لڑکیوں پر دولت کیوں خرچ کرتے، جن کی وقعت ان کی نظر میں کسی فالتو جانور سے بھی کم تر تھی۔ ان لوگوں کو تو فقط دولت جمع کرنے اور عیاشی کرنے سے مطلب تھا۔ کہیں لڑکیوں کا تو خوف اور بیمار ہونے کی وجہ سے انتقال بھی ہو گیا تھا۔ کیوں کہ بعض اوقات بڑے لوگ جب لڑکیوں کو زبردستی لباسِ عروسی پہنا کر لے جاتے اور پھر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھوڑ جاتے تھے تو ان لڑکیوں کی حالت قابلِ رحم ہوتی تھی اور وہ اس قدر زخمی ہوتی تھیں کہ ان کے زخموں سے خون رس رہا ہوتا تھا، جس کا کوئی علاج نہیں کرایا جاتا تھا اور وہ اسی طرح زخمی حالت میں خون رسنے کی وجہ سے موت کا شکار ہو جاتی تھیں۔ کسی بھی موقع پر ان ظالم لوگوں کو ترس یا رحم نہیں آتا تھا۔ شاید ان ستم گروں اور سفاک انسانوں کے سینے میں دل نہیں پتھر ہوتا تھا۔

"بس کریں ارسلان صاحب۔ مجھے وحشت ہو رہی ہے۔ ہمیں ایسے سفاک، ظالم اور درندہ صفت انسانوں کے خلاف آواز بلند کرنا ہوگی۔ کوئی تحریک چلانا پڑے گی، نجانے کتنی بے گناہ، معصوم سی لڑکیاں اپنی جوانی، عصمت اور جانیں گنوا چکی ہوں گی اور نجانے کتنی لڑکیوں کی گھات میں ان کے کارندے بیٹھے ہوں گے۔ نجانے اس قسم کی کتنی نجی جیلیں ہوں گی، جس میں ان جیسی بے شمار لڑکیاں ان کا شکار بننے والی ہوں گی۔" اریبہ نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

"آواز اٹھانے یا تحریک چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ دن رات اخبارات میں ایسی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں، مگر حکومت کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ وہ بے حسی اور دسترس میں نہ ہونے کا رونا روتی رہتی ہے۔ یہاں ان کا وہ دعویٰ بھی دم توڑ جاتا ہے کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں، اگر ایسا ہوتا تو یہ لوگ قانون کے لمبے ہاتھوں سے کیسے بچ کر رہتے۔ ان لوگوں تک قانون کے لمبے ہاتھ کیوں نہیں پہنچتے۔ اس جگہ یہ مثال صادق آتی ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔ واقعی اسے کچھ نظر نہیں آتا۔ کس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے اور کون ظالم کس قدر ظلم کر رہا ہے۔ وہ اپنی آنکھ بند ہی رکھتا ہے۔ اس وجہ سے ایسے لوگوں کے حوصلے بلند ہو جاتے ہیں اور وہ بے فکر ہو کر ہر جرم کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں افراتفری، نفسانفسی اور غیر مساوات کا دور پھیل جاتا ہے۔ گناہ عام ہو جاتے ہیں، جس سے معاشرہ تباہ و برباد ہو کر لازوال کا شکار ہو جاتا ہے، اور اس معاشرے کے لوگ بے حسی کی زندگی بسر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ قوم تباہی کا شکار ہو کر برباد ہو جاتی ہے اور دوسری قومیں اسے صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالتی ہیں۔

"میرا ایک دوست بتا رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی صبح سویرے کالج جانے کے لیے بس اسٹاپ پر کھڑی تھی اور وہ بس اسٹاپ ایک مشہور تھانے کے سامنے واقع تھا۔ وہ دوست چشم دید گواہ ہے کہ اس لڑکی کے پاس ایک کار آ کر رکی، جس میں چار جوان مرد سوار تھے۔ وہ بڑی عجلت میں کار سے اترے اور اسلحے کے زور پر اس لڑکی کو عین تھانے کے سامنے سے اغوا کر کے لے گئے۔ اب تم خود ہی سوچو، جس ملک میں اس قدر جرائم عام ہوں اور حکومت فقط بیان بازی کر کے رہ جائے اور مجرم دندناتے پھرے، اس معاشرے میں کیا نہیں ہو سکتا۔" میں نے اریبہ کو اپنی قوم کی بے حسی اور حکومت کی لاچاری کی باتیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"ارسلان صاحب، اگر آپ اس کام میں میری مدد کریں، یا میرے لیے علیشا کے قاتل کا سراغ لگائیں تو نہ صرف تمام تر اخراجات کے ساتھ آپ کا محنتانہ بھی ادا کروں گی اور ساری عمر آپ کی شکر گزار بھی رہوں گی۔" اریبہ نے التجا بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو اریبہ، یہ کام اس وقت تک پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ اس میں پولیس کا کوئی بڑا آفیسر ذاتی دلچسپی نہ لے۔" میں نے اریبہ کو راہ سجھائی۔

"ارسلان صاحب، میری ایک کلاس فیلو جو میری بہترین دوست بھی ہے۔ وہ ویمن پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہے۔ مس روبینہ، کیا مس روبینہ ہمارے کام آ سکتی ہیں؟" اریبہ کی آنکھوں میں چمک عود آئی۔

"کیا وہ اس پیچیدہ، اس مشکل ترین کام کے لیے تیار ہو جائیں گی۔" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے، وہ انسانی ہمدردی کے ناتے یا میری لحاظ و مروّت میں یہ کام سرانجام دینے کے لیے

ہامی بھر لے اور اپنی خدمات پیش کر دے، یوں ہم اس کے ساتھ مل کر اس سراغ رسانی کی مہم کی شروعات کر سکتے ہیں۔ میرے ذہن میں روبینہ کا خیال صرف اس لیے آیا ہے کہ میں اس سے پہلے بھی قانونی معاملات میں اس کی مدد حاصل کرتی رہی تھی اور وہ میرے آڑے وقت میں کام آ کر دوستی کا حق ادا کرتی رہی تھی۔" اریبہ نے مزید خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"کہیں تم اس روبینہ کی بات تو نہیں کر رہی ہو جو منفرد اور اچھوتے واقعات کو بیان کر کے کہانیوں، افسانوں اور ناولوں کے روپ میں شائع کراتی رہتی ہیں۔ اس کام کے لیے انھوں نے ملک کے ایک مشہور و معروف ناول نگار کو رکھا ہوا ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... ہاں! وہی روبینہ میری دوست ہے اور کئی بار یہاں میرے گھر پر بھی آ چکی ہے۔ جب بھی اس کے پاس کوئی نیا کیس آتا ہے اور وہ منطقی انجام کو پہنچ جاتا ہے تو وہ اسے کہانی کا روپ دے دیتی ہے بلکہ جیل میں لے جا کر اس کہانی کے کرداروں سے ملوا بھی دیتی ہے۔ ان حقائق کی بنا پر اس معروف رائٹر کا نام آسمانِ ناول پر آفتاب بن کر چمکنے لگا ہے۔ جس سے اس کی شہرت میں نہ صرف اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کے لیے دولت کے دروازے بھی کھل گئے ہیں۔ ارسلان صاحب ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ مجھے میری دوست انسپکٹر روبینہ اندھیروں میں روشنی کی ایک کرن لگی ہے۔ میں کل ہی اس کیس کے سلسلے میں انسپکٹر روبینہ سے رابطہ کروں گی۔ ہو سکے تو آپ بھی میرے ساتھ چلیے گا۔" اریبہ نے اچھی تجویز پیش کی تھی۔

لگتا تھا کہ اریبہ کو اپنی بہن علیشا کے لیے حد سے زیادہ تشویش لاحق تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ ایسے ظالم و جابر شخص کو قرار واقعی سزا دلوانا چاہتی تھی، جس نے اس کی بہن جیسی معصوم اور بے گناہ لڑکیوں کو تباہ کر کے قتل کر دیا تھا اور نجانے وہ کتنی ایسی لڑکیوں کو تباہ کرے گا۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اس تک پہنچا جائے اور اسے نہ صرف گرفتار کیا جائے بلکہ اس کے ذریعے اس کے گروہ کا خاتمہ تک کر دیا جائے۔ لہٰذا اریبہ کے دکھ میں، میں بھی برابر کا شریک تھا اور اس مہم میں مجھے بھی عمل دخل تھا، کیونکہ مجھے صائمہ کے قاتل تک پہنچنا تھا۔ میں نے سنجیدگی اختیار کر لی اور اریبہ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ کیونکہ اریبہ نے بتایا تھا کہ ایک حادثے میں اس کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے، وہ فقط دو ہی بہنیں تھیں۔ اب وہ تنہا رہ گئی ہے۔ کیونکہ علیشا نہ صرف اس کی بڑی بہن تھی بلکہ ماں کا درجہ بھی رکھتی تھی۔ اب اریبہ کا ساتھ دینے والا، یا اسے دلاسہ دینے والا کوئی نہیں رہا۔ دولت دیکھ کر رشتہ داری تو سبھی نبھانے کے لیے آ جاتے تھے مگر پُرخلوص اور ہمدرد کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ ان تمام وجوہات اور حقائق کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے علیشا کے قاتل کی تلاش میں اریبہ کا ساتھ دینے کا خود سے عہد کیا اور کل 2 بجے انسپکٹر روبینہ سے ملاقات کا وقت مقرر کر کے رخصت ہو گیا۔

میں ابھی اریبہ کی حویلی سے نصف فرلانگ کا فاصلہ طے کر پایا تھا۔ میری نظر اس بلند و بالا ٹنکی پر پڑی جو اس گاؤں کے مکانات میں پانی سپلائی کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ یہ ٹنکی بہت بڑی تھی، جس میں پانی کی گنجائش اس گاؤں کی ضرورت سے زیادہ تھی۔ شاید اس سے کئی گاؤں اپنی پانی کی ضروریات پوری کرتے ہوں گے، یا پھر یہاں کے کسان کھیتوں کو بھی اس کے پانی سے سیراب کرتے ہوں گے۔ بڑے قرینے سے لکڑی کا زینہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ مگر ایک شخص پر نظر پڑی تو میرے قدم خود بخود اپنی جگہ پر جم گئے۔ وہ کوئی نوجوان لڑکا تھا، جس کی عمر مشکل سے اٹھارہ یا انیس سال رہی ہوگی۔ اس نے عمدہ لباس، شلوار قمیض پہن رکھی تھا۔ وہ مسلسل پانی کی ٹنکی کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کے قریب پہنچنے والا تھا۔ مجھے خدشہ ظاہر ہوا کہ کہیں یہ کوئی تخریب کار نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ یہ اس پانی کی ٹنکی کو کسی بم سے اُڑا دے۔ ایسا ہوا تو تقریباً آدھا گاؤں تو اس کے سیلابی ریلے میں بہہ جائے گا اور دو تین گاؤں کو کچھ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کھلیان تباہ و برباد ہو جائیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ پانی کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ اگر اس بستی کو بم سے اُڑایا گیا تو پھر اس کی مرمت آسان نہیں ہوگی، کیونکہ یہ شہر سے دور دراز علاقہ تھا۔ اس کے لیے شہر سے انجینئرز، نقشہ نویس اور کاریگروں کو بلوانا پڑتا اور حکومت سے ایک بھاری مقدار میں فنڈ منظور کرا کے حاصل کرنا پڑتا۔

میں ایک درخت کی آڑ میں چھپ کر اس نوجوان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے لگا۔ بغور دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ خالی ہیں اور اس کے پاس کسی قسم کا بیگ یا بریف کیس بھی نہیں ہے۔ میرا ذہن بہت تیزی سے سوچ رہا تھا کہ اس نوجوان کا بستی تک پہنچنے کا مقصد کیا ہے۔ ایک اور خیال میرے ذہن میں بجلی کی سی تیزی سے کوندا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کہیں اس نوجوان کا یہ معمول نہ ہو کہ وہ ہر روز وہاں پہنچ کر چرس یا افیون پیتا ہو اور دنیا و مافیا سے بے خبر ہو کر سو جاتا ہو۔

اس طرح گاؤں والوں کی نظروں سے بھی بچتا رہے گا اور بدنامی کا سامنا بھی نہیں کرنا پڑے گا۔ اس طرف بھی میرا ذہن گیا کہ کہیں اس نوجوان کو بدنگاہی کی عادت نہ ہو، اور وہ اس قدر اونچی جگہ پر پہنچ کر نشیب میں بنے مکانات کے اندر نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہو، اور سامنے کھلے کھیتوں میں بھی نظر جماتا ہو۔ میں ابھی کچھ فیصلہ کر نہیں پا رہا تھا کہ یہ نوجوان کون ہے اور وہ وہاں کیوں گیا ہے۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی، وہ آخری سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور بستی کی طرف پشت کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ تذبذب کا شکار دکھائی دیتا تھا۔ کسی گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا تو میں اپنی جگہ سے اُچھل کر باہر آ گیا۔ اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بستی کے زینے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں دبے پاؤں اور محتاط انداز میں سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور اس نوجوان لڑکے کے قریب ہونے لگا تھا۔ میری رفتار موقعے کی مناسبت اور معاملے کی نزاکت کی وجہ سے تیز تھی۔ وہ نوجوان اس قدر سوچوں میں غلطاں تھا کہ اسے میری موجودگی کی خبر تک نہ ہوئی اور آہٹ کا اسے پتا تک نہ چلا۔ وہ اپنا ایک قدم نیچے کی طرف لٹکا چکا تھا، جب میں نے پیچھے سے اسے دونوں شانوں سے تھام لیا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" میرا سوال سن کر اور مجھے غیر متوقع اپنے سامنے پا کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس کی زبان گنگ سی ہو گئی مگر ایسا چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔ پھر وہ اپنی پہلی سی حالت میں آ گیا۔ اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جینے کی کوئی امنگ اور زندگی کی کوئی ترنگ نہیں تھی۔ اس نے اپنے شانے چھڑانے کے لیے زور لگایا تھا مگر ناکام رہا۔ وہ نفرت سے مجھے دیکھ رہا تھا، جیسے میں نے اس کا بہت قیمتی وقت برباد کر دیا ہو۔

"میں نے تم سے کچھ دریافت کیا ہے۔ سیدھی طرح بتاتے ہو یا تھانے لے کر جاؤں۔ شاید تم بم بلاسٹ کر کے اس بستی کو اُڑانا چاہتے تھے۔ آج کل تخریب کار ایسی گھناؤنی سازشیں کر کے اپنے ملک کو نقصانات پہنچا رہے ہیں اور اپنے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔" میر الزام سن کر وہ میری طرف گھوم گیا۔

"تم اجنبی اور پردیسی ہو، تمہیں اس گاؤں کے حالات کیا معلوم، تم یہاں کے رہنے والوں کی معاشی حالت کے بارے میں جانتے ہو اور نہ معاشرتی حالت کے بارے میں۔ تمہیں کیا خبر یہاں کے لوگ مر مر کے جی رہے ہیں اور وڈیرے موج مستی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جس شخص کو دو وقت کی روٹی میسر نہ ہو، وہ بھلا بم بلاسٹ کرنے کی طاقت کہاں سے لائے گا۔" اس نوجوان نے بڑے مایوس کن لہجے میں کہا تھا۔ اس کا لہجہ بڑا مودب اور زبان شستہ تھی۔ وہ اپنی گفتگو سے پڑھا لکھا معلوم ہو رہا تھا۔

"کیا تمہیں بھی دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہے؟" میں نے اس کے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ واقعی اس کا پیٹ کمر سے لگا ہوا تھا۔ اس نوجوانی میں وہ بوڑھوں کی طرح لگ رہا تھا۔

"ہاں مجھے بھی فاقے کرنے پڑتے ہیں۔ روزگار نہ ملنے پر گھر والے طعنے دیتے ہیں۔ اس لیے سوچا تھا کہ آج اس زندگی کا خاتمہ کر دوں، جس میں نا کامیابی اور نامرادیاں ہی لکھی ہوں۔ اس میں بھی تم نے رکاوٹ ڈال دی۔" وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی کوشش کرنے لگا۔

"اچھا تم خودکشی کرنے کے لیے اتنی بلند و بالا جگہ پر آئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہارے پاس دل، دماغ، تعلیم اور ہمت و حوصلہ ہے مگر روپیہ پیسہ نہیں۔ جو شخص اتنی اچھی مرنے یا خودکشی کرنے کی منصوبہ بندی کر سکتا ہے، وہ کاروبار کو پھیلانے، روزگار کو چلانے اور کام کو جمانے کی منصوبہ بندی میں کیوں کر کامیاب و کامران نہیں ہو سکتا۔"

"تم بھی میرے والدین اور دوستوں کی طرح باتیں اچھی بنا لیتے ہو۔ صرف زبانی خرچ خرچ۔" اس نے میری طرف بڑی حقارت سے دیکھا۔ تب میں نے ہوش کے ناخن لیے اور اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"دیکھو نوجوان، اگر تم بحفاظت میرے ساتھ نیچے اتر چلو تو میں تمہیں وہ چیز مہیا کر سکتا ہوں جس کی تمہیں ضرورت ہے اور تمہارے پاس کمی ہے۔"

"کیا تمہارے پاس اس قدر دولت ہے جو میرے والدین کے قرض چکا دے گی۔ جو ہمارے گروی رکھے مکانات و جائیداد اور زیورات کو چھڑوا لے گی، جن پر اس گاؤں کے وڈیرے عیش کر رہے ہیں اور قابض ہو چکے ہیں۔ کیا تم اس قدر دولت فراہم کر سکتے ہو کہ میں اپنا کاروبار جما سکوں اور دیگر لوگوں کے بھی کام آ سکوں۔" اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں میری حالت پر تمسخر اُڑانے والی حیرت تھی۔

"ہاں میں تمہیں اس قدر دولت دے سکتا ہوں جو تمہارے سارے مسائل حل کر دے گی اور تمہیں خوش حال بنا دے گی۔" میری بات سن کر یک دم اس کے چہرے کی رنگت تبدیل ہو گئی۔ حقارت اور نفرت کی جگہ حیرت اور تجسس نے لے لی تھی۔

"دیکھو اجنبی! میں انتہائی دل برداشتہ ہوں اور زندگی سے مایوس بھی۔ مجھے دنیا کی ہر خوشی سے نا امیدی پیدا ہو گئی ہے۔ مجھے ہر روز تک ایک زہریلے سانپ کی طرح ڈستی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت تمہارا یہ مذاق جلتی آگ پر تیل کا کام کرے گا اور میں اپنے ساتھ تمہیں بھی لے ڈوبوں گا۔" اس نے اس بار ایک جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا تھا۔

"یہ مذاق نہیں ہے۔ تم بھی مجھ سے اجنبی اور نا آشنا ہو۔ میں تمہارے ساتھ مذاق کیوں کرنے لگا۔ چلو آؤ نیچے چلتے ہیں۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ پہلے تم کچھ اپنے گھر لے کر چلو، اچھا سا کھانا کھلاؤ، اور اپنے والدین سے ملواؤ۔ میں تمہاری ہر ضرورت پوری کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔ تم مجھے اپنا بڑا بھائی مان سکتے ہو۔" میں نے انتہائی پیار و محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھرا تو وہ اپنی آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپایا اور اسے اپنے ساتھ چمٹا کر نیچے اترنے لگا۔ تمام سیڑھیاں اترنے تک اس نے اپنی نظریں اور گردن جھکائے رکھی۔

"پہلے مجھے بازار کی طرف لے چلو۔" میں نے اس سے کہا تو وہ دوسری جانب مڑ گیا۔ میں نے بازار پہنچ کر بہت سا سامان سالن اور روٹی پکانے کے لیے لیا اور بہت سے سودا سلف آئندہ دنوں کے استعمال کے لیے لدوا لیا۔ ادائیگی کرنے کے بعد اس نوجوان سے اس کے گھر کا پتا پوچھ کر دکان دار کو لکھوا پتا کہ وہ جلد از جلد سامان وہاں پہنچا دے۔ یہ کارروائی دیکھ کر نوجوان کو یقین ہو چلا کہ میں نے جو کوئی کہا تھا، میں اس میں پورا اتر جاؤں گا۔ اب اس کے چہرے پر ایک اطمینان بخش سکون تھا۔

"بابو جی! آپ یہاں ٹھہریں، میں ابھی آتا ہوں۔" نوجوان نے مجھے اپنے گھر کے دروازے پر رک جانے کے لیے کہا اور خود دوڑ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا تو اس کے ساتھ اس کے بوڑھے والدین اور دو بہن بھائی بھی تھے۔ انھوں نے بڑے پرجوش انداز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

زمیں میرا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر اندر آ گئے۔

"دیدی تمہارا نام کیا ہے۔" میں نے اس کی بہن جوعمر میں اس سے بڑی تھی، معلوم کیا۔

"میرا نام شانتی ہے بابو۔" وہ بولی۔ "دیکھو شانتی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ تم بہت اچھا کھانا پکانا جانتی ہو۔ یہ لو سامان اور جلدی سے سب کے لیے کھانا تیار کرو۔ مجھے بھی بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔" میں نے شانتی کو پکانے کا سامان پکڑاتے ہوئے کہا۔ وہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور میرے ہاتھ سے سامان لے لیا۔

"بیٹے تم نے ہم جیسے غریب لوگوں کے لیے یہ سب کچھ کیوں کیا ہے۔ ہم تمہارا احسان کس طرح اتاریں گے۔" جوان کی ماں نے بڑی اپنائیت سے کہا تھا۔

"ماسی۔ ایک طرف تو تم مجھے اپنا بیٹا کہہ رہی ہو اور دوسری طرف احسان کے اتارنے کی بات کر رہی ہو۔ بھی بیٹے بھی ماں پر کوئی احسان کرتے ہیں۔" میں نے ماں کے قدم چومتے ہوئے کہا۔

"لیکن بابو جی"

"دیکھو چتا جی۔ ایک تو میں بابو وابو کچھ نہیں ہوں۔ میرا نام ارسلان ہے۔ میں اس گاؤں میں اپنی دوست رینا کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ اور اب تو آپ نے مجھے بیٹا بھی کہہ دیا ہے۔ لہٰذا اب کو یہ گاؤں میرا اور میرے ماں باپ کا ہو گیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو نوجوان! ابھی تک تم نے اپنا نام بھی نہیں بتایا۔" میں نے اس نوجوان کو مخاطب کیا۔

"ارسلان بھیا! میرا نام شنکر ہے۔" میں آپ کا ساری عمر شنکر گزار رہوں گا کہ آپ....."

"ارے بھئی اب تم نے مجھے بھیا کہہ دیا ہے تو شکر گزاری والی بات چھوڑو اور اب دکان دار کو بلا لاؤ۔ جس کے تم لوگ مقروض ہو۔" میں نے شنکر سے کہا۔ اس سے پہلے وہ کوئی عذر پیش کرتا یا جواب دیتا۔ دروازے پر کسی نے دستک دی تھی۔ شنکر نے معذرت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس نے دروازہ کھولا تو وہ پریشان سا ہو گیا اور بہت عجلت میں دروازے سے باہر ہو گیا اور دروازے بند کر دیا تاکہ ہماری نظر اس پر اور آنے والے پر نہ پڑ سکے۔

"کنہیا لال جی۔ ہم آپ کی پائی پائی چکا دیں گے۔ بس آپ کو ذرا سا صبر اور کرنا ہو گا۔" شنکر کی آواز بڑی دھیمی تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتا۔ نہ تیری نوکری لگے گی اور نہ تو میرے پیسے دے گا۔ مجھے آج یہاں سے کچھ نہ کچھ لے کر جانا ہے۔ دیکھ اسی لیے میں کھاتہ بھی اٹھا لایا ہوں تاکہ اپنا حساب چکتا کروں اور سود اس طرح لکھا رہنے دوں۔" کنہیا لال کی آواز بڑی اونچی تھی۔ شنکر کے والدین کے چہروں پر ندامت کے پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔ وہ خود کو میرے سامنے بے حد شرمندہ محسوس کر رہے تھے۔

"کنہیا لال جی! ہمارے گھر ایک اجنبی مہمان آیا ہوا ہے۔ میں آپ سے دکان پر آ کر بات کرتا ہوں۔ ہماری عزت کا سوال ہے۔ ہمارے متعلق مہمان کیا سوچے گا۔" شنکر نے التجا کی۔

"مجھے تمہارے مہمان سے کیا لینا۔ تمہارے پاس خود تو کھانے کے لیے ہے نہیں، اس کو کہاں سے کھلاؤ گے۔ جاؤ تمہیں اپنی عزت کا اتنا ہی خیال ہے تو اس مہمان سے کہہ دو کہ میرا قرض چکتا کرے اور اپنی عزت کرا لے۔ اس طرح تم دونوں کا بھرم رہ جائے گا۔" کنہیا لال کی بات سن کر شنکر کو شدید غصہ آ گیا تھا۔ اور مجھے بھی اس کی باتیں بری لگی تھیں۔ میں اٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازے کھول دیا۔

"شنکر کنہیا لال کو اندر لے آؤ۔ آج میں اس کا سارا حساب چکتا کرتا ہوں۔" شنکر میری اچانک آمد پر شرمندگی محسوس کرنے لگا تو میں نے ہی کہا۔

"آؤ کنہیا لال جی۔ آج آپ کو اس در سے ناکام و نامراد نہیں جانا پڑے گا۔ آؤ اندر آ کر بیٹھو اور مجھے کھاتہ دکھاؤ۔" میں نے شنکر اور کنہیا لال کو اندر آنے کا راستہ دیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ مجھے تو میرے پیسے چاہیے، آپ دیں یا شنکر کے گھر والے اور اگر پیسے نہیں ہیں تو اس کے عوض کچھ نہ کچھ لے کر ٹلوں گا۔" کنہیا لال کھاتہ سنبھالتے ہوئے اندر آ گیا اور شنکر اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

"ہاں تو کنہیا لال جی۔ کتنے پیسے ہیں، ان لوگوں پر اور اس کا سود کتنا لگایا ہے آپ نے۔" میں نے کھاتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"شہری بابو لگتے ہو اور حساب کتاب میں بھی تیز ہو۔ بہرحال بابو جی، یہ دیکھو میں ہزار روپے بن گئے ہیں ان لوگوں پر، وہ سال سے ادھار سودا لے رہے ہیں۔ اور اس پر سود در سود تیس ہزار روپے ہیں یعنی کل پچاس ہزار ہوئے۔ تم حالت سے تو ایک عام سے شخص ہو۔ مجھے امید نہیں ہے کہ تم یہ قرض چکا سکو گے۔" کنہیا لال نے موٹے موٹے چشمے کے شیشوں سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

"یہ لو..... گنتے جاؤ۔" میں نے اپنا بٹوا کھولا اور اس میں سے ہزار ہزار کے کڑکڑاتے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتا رہا۔ وہ نئے نوٹ دیکھ کر لپائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا اور ان بھوکے فقیروں کی طرح نوٹ اٹھا رہا تھا، جیسے وہ لنگر کے لیے لٹنے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ پچاس ہزار ہونے کے بعد اب بھی اس کی نیت نہیں بھری تھی۔

"کنہیا لال جی۔ ان لوگوں کا ماہوار کیا خرچ ہوتا ہو گا۔" میں نے اس سود خور سے پوچھا۔

"بھی کوئی تین یا ساڑھے تین ہزار روپے۔"

کنہیا لال نے ذہن کے کیلکولیٹر پر حساب کر کے بتایا۔

"ٹھیک ہے تمہیں ہر ماہ ہزار روپے مل جایا کریں گے۔ تم شنکر اور اس کے گھر والوں کو اچھا قاعدگی سے اناج اور دیگر سامان بہم پہنچاتے رہنا۔" میں نے اس کی ہوس پوری کرنے کے لیے کہا۔

"بابو جی! میں خود ان کے گھر کے اندر سامان رکھ کر جایا کروں گا۔ آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں۔"

پھر ذرا وقت کے بعد اس نے کہا۔ "ہاں چار ہزار روپے ماہوار کی ادائیگی میں دیر نہ ہو اور نہ کبھی سلسلہ ٹوٹے۔"

"تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی مگر اس بات کا دھیان رکھنا کہ ان لوگوں سے عزت سے پیش آنا۔ اگر مجھے اس قسم کی کوئی شکایت ملی تو تمہارے تمام کھاتے جلا دوں گا۔" میں نے کنہیا لال کو دھمکی دی تھی۔

"کیسی بات کرتے ہو بابو جی۔ میں اپنے گھر سے پہلے ان کے گھر میں اناج بھجواؤں گا اور ان کا احترام اپنے ماتا پتا سے بھی زیادہ کروں گا۔ اب میں چلتا ہوں۔" کنہیا لال نے دھوتی میں پیسے اڑسے اور رام رام کرتا ہوا چلتا بنا۔

"بیٹے آپ نے یہ کیا کیا۔ اپنی محنت، خون پسینے کی کمائی ہم لوگوں پر لٹا دی۔" شنکر کی ماں نے کہا۔

"ماں جی! یہ کمائی میرے خون پسینے اور محنت کی نہیں تھی۔ یہ تو مجھے کسی نے تحفے میں دی تھی جو میں نے کنہیا لال کو بے دھڑک دے دی اور ابھی تو مزید رقم بچی ہوئی ہے جو آپ کی جائیداد اور زیورات گروی رکھے ہیں، وہ بھی چھڑانے ہیں۔ شنکر کیا تم چودھری صاحب کو یہاں بلا لاؤ گے۔" میں نے شنکر سے کہا تو وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے میں نے انہونی بات کر دی ہو۔

"بیٹے! ہم اور غریب لوگوں کی کیا مجال کہ چودھری صاحب کو اپنے گھر بلا لائیں۔ وہ تو ہم جیسوں کو اپنے قریب کیا، اپنی حویلی کے پاس بھی بھٹکنے نہیں دیتا۔" شنکر کے پتا جی نے کہا تھا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ چودھری کسی بھی گاؤں کا ہو، ایسا ہی اکھڑ، متکبر اور نخوت والا ہوتا ہے۔ اسے اس کا غرور و تکبر ہی لے ڈوبتا ہے۔

"میں جانتا ہوں پتا جی۔ مگر کیا کبھی کبھی لگتا الٹی نہیں ہو سکتی۔ تم ٹھہرو میں اپنی ایک دوست سے کہتا ہوں کہ وہ چودھری صاحب اس کی بات ضرور مانیں گے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیونکہ وہ اسے اپنے قریب کیا، حویلی کے اندر بھی جانے سے نہیں روک سکتے۔" شاید میری باتیں انھیں سمجھ نہیں آرہی تھیں۔ میں نے دل ہی دل میں شمیکا کو بلانے کا عمل دہرایا۔ اب یہ عمل مجھے زبانی یاد ہوگیا تھا۔ چند لمحوں میں دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے ماں جی سے کہا۔

"ماں جی ذرا سی زحمت ہوگی۔ ذرا دروازے پر میری دوست آئی ہے۔ اسے اندر تو لے آؤ۔" ماں جی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں اور چند لمحوں میں شمیکا کو اندر لے آئیں۔ میں نے ماں جی اور پتا جی اور شنکر کا تعارف شمیکا سے کرایا، اور چھوٹے بچے کا بھی جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا۔ شمیکا کو مختصر طور پر شنکر کی داستان سنائی اور کہا۔

"شمیکا جی۔ چودھری صاحب کے پاس ان کے مکانات و جائیداد اور زیورات گروی رکھے ہیں۔ وہ چیزیں ان سے چھڑوانی ہیں۔ آپ کو صرف اس لیے زحمت دی ہے کہ یہ کام، میرے، یا ان لوگوں کے بس کا نہیں ہے۔ اس لیے برائے مہربانی آپ جا کر چودھری صاحب کو یہیں بلا لائیں اور ہاں چودھری صاحب سے کہنا کہ وہ ان کے تمام کاغذات اور زیورات لیتے آئیں اور اپنے پیسے لے جائیں۔" شمیکا میری بات سمجھ چکی تھی۔ وہ جانے لگی تو ماں جی نے اس کا بازو تھام لیا۔

"ٹھہرو بیٹی۔ یہ تمہارا دوست تو بہت جلد باز ہے۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانا چاہتا ہے اور حیرت ہے کہ جما بھی لیتا ہے۔ ارسلان بیٹا اور تم پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو، بغیر کچھ کھائے پیے نہیں جانے دوں گی۔ شانتی جلدی سے کھانا لگا دے۔" شنکر کی ماں نے حسرت بھری نظروں سے مجھے اور شمیکا کو دیکھتے ہوئے آواز لگائی۔

"اماں جی، کھانا لگ چکا ہے۔ آپ سب لوگ یہاں آجائیں۔" شانتی کی آواز میں خوشی کی لہر شامل تھی۔ ہم دوسرے کمرے میں گئے تو کھانے کی خوشبو نے ہمارا سواگت کیا۔ اب تو بھوک برداشت سے باہر ہوگئی تھی۔ ہم نے کھانا شروع کر دیا۔

"بیٹے ارسلان ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانو گے۔" ماں جی نے کھانے کے دوران بات شروع کی۔

"نہیں ماں جی۔ کہیے کیا بات ہے۔" میں نے لقمہ ہاتھ میں روک کر پوچھ لیا۔

"بیٹی شمیکا، انتہائی خوب صورت اور کم سن دوشیزہ ہے اور تم بھی جوان اور صحت مند ہو۔ پھر تم اس کو دوست کب تک بنائے رکھو گے۔ تم دونوں آپس میں شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" ماں جی کے اچانک سوال پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے شمیکا کی طرف دیکھا تو وہ حیا آلود ہوگئی تھی۔ اس کے رخساروں کی گلابیاں دہکنے لگی تھیں اور کانوں کی لویں سرخ ہوگئی تھیں۔

"آپ کا مشورہ ٹھیک ہے ماں جی۔ ذرا فرصت ملے تو یہ کام بھی کر لیں گے۔ میرا گاؤں یہاں سے بہت دور ہے۔ جہاں میرے ماں باپ اور بہن بھائی رہتے ہیں۔ ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں تاکہ اپنے بزرگوں کی رضامندی اور ان کے سامنے یہ نیک کام سر انجام دے سکیں۔" میرے جواب سے مطمئن ہو کر ماں جی سکون سے کھانا کھانے لگی تھیں۔

"ارسلان بھیا۔ مجھے اپنی شادی میں ضرور بلایئے گا۔ میں دیکھوں گی، شادی میں اس قدر حسین و جمیل لگنے والی لڑکی جب دلہن بنتی ہے اور میک اپ سے بن سنورتی ہے تو کیسی قیامت ڈھاتی ہوگی۔' شانتی نے شمیکا کو مزید شرما دیا تھا۔

"ارسلان میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا ہے۔ میں چودھری صاحب کی طرف چلتی ہوں۔ اچھا ماں جی میں جلد واپس آتی ہے۔" شمیکا نے شرم سے گلنار ہوتا ہوا چہرہ چھپانے کے لیے جانے کا بہانہ کیا۔

"بیٹا آپ لوگ چودھری صاحب کے ساتھ جو سلوک کرو گے، کہیں آپ کے جانے کے بعد وہ ہم سے بدلہ نہ لے اور دشمنی پر اتر آئے۔" پتا جی نے خدشہ ظاہر کیا تھا اور یہ ممکن بھی تھا۔ کیونکہ بزدل اور ڈرپوک لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ وقت پر بھیگی بلی بن جاتے ہیں اور بعد میں شیر ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی اسلحے اور اپنے کتوں کے زور پر۔

"آپ لوگ اس بات کی فکر نہ کریں۔ ہم اپنے ایک ساتھی کو کہہ جائیں گے کہ وہ تم لوگوں کا ہر طرح سے خیال رکھے۔ لہٰذا ایک چودھری تو کیا، دس چودھری بھی اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔" شاید یہ بات بھی ان کے سروں پر سے گزر گئی تھی۔ شمیکا جا چکی تھی۔ میرا اشارہ تمنو کی طرف تھا۔ جو اسی علاقے میں رہتا تھا اور اسی علاقے کو ہم نے اس کے حوالے کیا ہوا تھا۔ وہ شنکر اور اس کے گھر والوں کا خیال رکھ سکتا تھا، اور کنہیا لال اور دوسرے بنئے کو پیسوں کی ادائیگی بھی کرتا رہے گا، اور ان سب کو سیدھا بھی کر کے رکھے گا۔ کھانا اس قدر لذیذ تھا کہ میرا پیٹ تو بھر گیا تھا مگر من نہیں بھرا تھا۔ اور بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں بلا تکلف کھانا کھاتا رہا۔ کافی دیر تک کھانا کھا کر اٹھا تو شانی نے کچی لسی پیش کی، جس سے کھانے کا لطف دوبالا ہوگیا۔ سب نے کھانے سے فراغت پالی تو میں نے ماں جی کا شکر ادا کیا اور ایک موٹی رقم ان کے ہاتھوں میں تھما دی۔ وہ انکار کرنے لگیں تو میں نے کہا کہ میں اپنی بہن شانتی کی شادی کے لیے دے رہا ہوں تاکہ جلد اس کے ہاتھ پیلے کر کے اس کے فرض سے سبکدوش ہو جایا جائے۔ پھر میں نے شنکر کو بلا کر کہا۔

"دیکھو شنکر! تم ایک تعلیم یافتہ اور باصلاحیت شخص ہو۔ میں تم کو کاروبار کے لیے رقم دے رہا ہوں۔ تم اس گاؤں میں ایسا کاروبار کرنا جس سے دیگر نوجوانوں کو بھی روزگار مہیا ہو، اور وہ بھی فاقہ زدہ نہ رہیں اور کبھی زندگی سے تنگ آ کر تمہاری طرح خودکشی کی کوشش نہ کریں۔ تم کاروبار کر کے اپنے قدم جما لینا اور ابھی تمہیں تمہارے مکان و جائیداد کے کاغذات بھی واپس مل جائیں گے اور تمام زیورات بھی۔ اس سے تم نہ صرف اپنی بہن کی شادی کرنا بلکہ اپنا گھر بھی بسا لینا اور سب مل کر ماں باپ کی خدمت کرنا۔ مجھے حق تو نہیں پہنچتا مگر مشورہ ضرور دے سکتا ہوں۔ تمہارے اس گاؤں میں رینا بالکل تمہارے جوڑ کی ہے، عمر میں تم سے دو برس چھوٹی ہوگی۔ تمہاری جوڑی خوب رہے گی۔ اگر تم چاہو اور تمہارے والدین کی رضا ہو تو تم اسے دلہن بنا کر اس گھر میں لے آنا تاکہ آسودگی بھی تمہارے قدم چومے۔ رینا بھی ایک سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ یہ مشورہ ہے حکم نہیں ہے۔ تم بہتر سمجھو تو عمل کرنا، ورنہ کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے بٹوے میں سے کئی مرتبہ ہزار ہزار کے نوٹ نکال کر اس کے ہاتھوں میں تھما دیے۔ وہ شکر گزار نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس سے پہلے وہ کچھ بولتا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اپنی جگہ پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

"کون ہے۔"

"جناب میں چودھری دیوداس ہوں۔" آپ نے مجھے بلوایا تھا۔ میں سر کے بل چل کر حاضر ہوا ہوں۔" چودھری کی عاجزانہ اور انکسارانہ گفتگو سن کر شنکر کے گھر والے حیرت میں ڈوب گئے۔ میں نے جا کر دروازہ کھولا تو آگے چودھری دیوداس اور پیچھے شمیکا کھڑی تھی۔

"آیئے چودھری دیوداس صاحب! یہاں تشریف رکھیں۔" میں نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابو جی، میں جلدی میں ہوں۔ میں تو ان کے زحمت فرمانے سے یہاں آگیا ہوں اور اپنے ساتھ شنکر بابو کے مکان اور جائیداد کے کاغذ اور زیورات بھی لیتا آیا ہوں جو انھوں نے میرے پاس گروی رکھوائے تھے۔" چودھری دیوداس نے شمیکا کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"چودھری صاحب، آپ کی کتنی رقم بنتی ہے، ذرا حساب لگا کر بتا دیں تاکہ میں اس مکان اور جائیداد کے کاغذات اور زیورات کے عوض ادائیگی کر دوں۔" میں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے بٹوے کی زپ کھولتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"بابو جی، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے ان کی سود کی مدد میں بہت پیسہ کھایا ہے۔ میں تو صرف اس لیے حاضر ہو گیا تھا کہ کہیں ان محترمہ منصف نازک کو دوبارہ میری حویلی میں آنے کی زحمت نہ ہو۔" چودھری صاحب نے ایک بار پھر شمیکا کی طرف تجسس نظروں سے دیکھا تو وہ مسکرا رہی تھی۔

"چودھری صاحب، آپ نے بھی تو زحمت کی ہے، ان غریبوں کے گھر پر چل کر آئے ہیں اور ساتھ میں یہ بھاری کھانا اور دیگر پلندے بھی اٹھالائے ہیں۔ میں ان کی قیمت ادا کیے بغیر باز نہیں آؤں گا۔ آپ کو پوری قیمت ادا کی جائے گی۔" میں نے اصرار کیا تو چودھری صاحب نے کھانا کھول لیا۔

یہی کوئی پندرہ ہزار اور پینتیس ہزار اور پچیس ہزار نوٹل پچہتر ہزار روپے ہوں گے۔" چودھری صاحب نے اپنی عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے سے اپنی گول گول آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے کہا۔ میں بغور چودھری صاحب کا ہی چہرہ دیکھ رہا تھا۔ جس پر ایک رنگ آرہا تھا اور ایک رنگ جارہا تھا۔ خوف کے مارے ان کا چہرہ کیا، سارا جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ شاید شمیکا نے چودھری صاحب کو اپنی اصل شکل دکھادی تھی۔ یا پھر کوئی اور حرکت دکھائی تھی جس کی وجہ سے چودھری صاحب کا برا حال ہو رہا تھا اور وہ اپنا سارا غرور اور ناز و تکبر کو روندتا ہوا ایک غریب کے گھر تک چلا آیا تھا۔ میں نے گن گن کر ۷۵ ہزار روپے چودھری صاحب کے ہاتھوں میں تھمادیے۔ وہ بار بار نئے نوٹوں کو گن رہا تھا۔ اپنی حالت پر ندامت کے آنسو بہا رہا تھا اور شنکر کی حالت پر متعجب تھا اور مجھے وہ شک بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ اتنے سے بڑے میں اس قدر رقم اور وہ بھی نئے نوٹ کس طرح سما گئے تھے۔

چودھری صاحب نے کھانا بند کیا، رقم گرتے کی جیب میں رکھی اور عینک درست کرتے ہوئے جانے کی اجازت طلب کی۔ اس نے رام رام کہتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑے تو شنکر اور اس کے گھر والوں نے بھی سکتے کی حالت میں اپنے اپنے ہاتھ جوڑ دیے اور سلو موشن میں رام رام کہنے لگے۔ چودھری دیو داس شمیکا سے کترا، اور نظریں بچا کر گزرنا چاہتا تھا مگر شمیکا نے اسے روک کر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"چودھری صاحب، اگر ہمارے بعد شنکر، اس کے گھر والوں یا ان کے رشتے داروں کو بھی تنگ کیا تو میں لوٹ آؤں گی۔ ہوا کی طرح اور تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہواؤں کا راستہ کوئی روک نہیں سکتا ہے۔ ذرا سی بھی شکایت ملی تو میں تمہاری اس ملازمہ کی زبانی ساری دنیا کو کہلوادوں گی کہ تم نے اس کے ساتھ اور اس جیسی معصوم اور کم عمر لڑکیوں کے ساتھ کیا، کیا کیا ہے۔" شمیکا نے بات ختم کر کے اسے باہر جانے کا راستہ دیا۔

"میری توبہ، میرے باپ کی توبہ، اگر میں اس گھر کا رخ بھی کروں۔ مجھے معاف کردے میری ماں۔" چودھری تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔

"چائے تیار ہے۔" شانتی کی آواز پر سب صحن میں چلے آئے۔ جہاں ایک چھپر کے نیچے ایک بڑی چوکی رکھی تھی، جس پر چائے کے سات آٹھ پیالے رکھے تھے اور ان سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ہم سب اس چوکی پر آبیٹھے۔

"شنکر بھائی اور میری پیاری بہن شانتی۔ آپ لوگ اپنے ماں باپ کا خیال رکھنا۔ شنکر اب کاروبار چلائے گا اور تم اپنی امی کا کام میں ہاتھ بٹانا۔ آپ کے والدین اب آرام کریں گے کیوں کہ اب ان کی عمر کا تقاضا یہی ہے۔ آپ لوگوں کو آپ کا مکان، زمین و جائیداد کے کاغذات اور زیورات مل گئے ہیں۔ اب آپ کو ادھار سودا سلف لینے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ زیورات کو سنبھال کر رکھنا اور جلد از جلد میری پیاری بہنا شانتی کے ہاتھ پیلے کردینا اور ہو سکے تو شنکر کے اپنے پاؤں پر کھڑا ہوتے ہی اس کا بھی گھر بسا دینا۔ تاکہ شانتی جائے تو اس گھر کی فضا سنسان نہ ہو۔ اس گھر میں ایک نئی نویلی خدمت گزار دلہن آجائے۔ اب ہمیں چلنا ہے۔" میں نے چائے کے دوران ایک بزرگ کی طرح سب کو نصیحت کی، جو سب نے اپنے پلے سے باندھ لی تھی۔

"بیٹے! تم میں اور شمیکا بیٹی میں کوئی تعصب، کوئی رنگ و نسل اور قوم وملت کی بندش نہیں ہے۔ تم لوگ انسانیت کے ناتے جو کام کر رہے ہو، ہم اس کے لیے تمہیں جس قدر بھی دعائیں دیں کم ہیں۔ تمہارا احسان زندگی بھر ہمیں یاد رہے گا۔ تمہارا خدا قدم قدم پر تمہاری مدد اور حفاظت کرے۔" شنکر کی امی نے مجھے اور شمیکا کو آشیر باد دیتے ہوئے دعاؤں سے نوازا۔

ہم ان کا ڈھیروں پیار اور دعائیں لے کر گھر سے باہر آگئے۔ "اب کدھر کا رخ کرنا ہے۔" شمیکا نے پوچھا۔

"پہلے ہمیں چند ادھورے کام نمٹانے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنے گاؤں کا رخ کریں گے، جہاں میرے والدین اور بہن بھائی سال ہا سال سے میرے منتظر ہیں۔"

"کیسے ادھورے کام؟" شمیکا نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"ارے بھول گئیں کیا۔ ہم نے عادل بابا کو کس کام کے لیے روانہ کیا تھا۔ کیا اس کام کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچانا۔" میں نے شمیکا کو یاد دلاتے ہوئے کہا۔

"ارے ہاں! رینا کو اس کا حق بھی تو دلوانا ہے۔" شمیکا نے چونکتے ہوئے کہا۔

"چلو، دیکھو عادل بابا اس وقت کہاں ہیں۔"

میں نے شمیکا کی نادیدہ قوت کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کچھ دیر آنکھیں بند کیے کھڑی رہی، پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دائیں سمت کو چلنے لگی۔

"شمیکا تم نے چودھری صاحب کے ساتھ کیا کیا تھا جو وہ اس قدر خوف زدہ تھا۔ وہ اپنا تمام جاہ و جلال خاک میں ملا کر ایک غریب کے گھر آگیا تھا، نہ صرف آگیا تھا بلکہ تمام گروی رکھیں چیزیں بھی اٹھالایا تھا۔ وہ بار بار تمہاری طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا اور تم سے کترا اور نظریں بچا کر گزر جانا چاہتا تھا۔ ذرا بتاؤ تو سہی تاکہ سفر بھی باتوں باتوں میں کٹ جائے۔" میں نے گفتگو کی ابتدا کی۔ کیوں کہ مجھے چودھری دیو داس کی حالت پر ترس بھی آرہا ہے اور ہنسنے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔

"میں جب چودھری دیو داس کی حویلی کی چھت پر اتری تو مجھے بالائی کمرے سے کسی کم سن لڑکی کے چیخنے کی آواز آنے لگی۔ میں نے اس کمرے کے روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ گھر کا روشن دان بند تھا مگر اس کے شفاف شیشوں سے اندر کا تمام منظر نظر آرہا تھا۔ میں نے دیکھا چودھری زبردستی ایک پندرہ یا سولہ سالہ لڑکی کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے اسے قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لڑکی نے اپنی تمام تر قوت صرف کردی تھی مگر کہاں ہاتھی اور کہاں چیونٹی۔ وہ بلی کے منہ میں چڑیا کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ چودھری کے بھاری بھرکم ہاتھ نے اس کے آدھے چہرے کو ڈھانپ لیا تھا۔ وہ اسی حالت میں اسے پیچھے دھکیل رہی تھی، کہ اس کا سر ایک بڑے ستون سے ٹکرایا اور وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر گئی۔ چودھری کو مزید موقع اور مہلت مل گئی۔ وہ اب نہایت اطمینان اور سکون سے اسے بے عزت کرسکتا تھا۔ ابھی وہ اس کی چولی کے بٹن کھول ہی رہا تھا کہ میں ہوا کی طرح اندر کمرے میں پہنچی تو یہ منظر دیکھ کر چودھری دیو داس کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اب اسے اقبال جرم کے علاوہ اور کچھ کہنے کی نوبت نہیں آئی، کیوں کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ وہ لڑکی بھی ہوش میں آچکی تھی، وہ بھی چودھری کے خلاف گواہی دے سکتی تھی کہ چودھری اس کے ساتھ زبردستی گناہ کرنے کے درپے تھا اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دینا چاہتا تھا۔ اور پھر میں نے بھی چودھری کے کرتوت گنوائے تو وہ بھونچکا سا ہو کر کہنے لگا۔

"تم کیا چاہتی ہو، تم کون ہو، جو میرے بارے میں اتنا کچھ جانتی ہو۔ جبکہ میرے لیے تو تم اجنبی ہو؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

’چودھری نے نظریں جھکا کر پوچھا۔ میں نے لڑکی کا حلیہ درست کر کے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔ اس طرح سے کسی قدر اس کی دھاڑیں بند ہوئی تھیں اور اسے اپنی عزت کے تحفظ کا احساس ہوا تھا۔

”چودھری صاحب، شنکر اور اس کے گھر والوں کو تو جانتے ہوں گے؟“ میں نے چودھری سے پوچھا تھا تاکہ اپنے مطلب کی بات کروں۔

”کون شنکر اور اس کے گھر والے؟“ چودھری نے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

”چلو لڑکی، ذرا باہر چل کر چودھری صاحب کی شرافت کا ڈنکا بجاتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اور یہ گاؤں والوں کو جان جائیں۔“ میں نے لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر چلتے ہوئے کہا۔

”دیدی میرا نام رادھا ہے۔ میں چودھری دیوداس کی بیٹی ہوں۔ آج سے سولہ سال پہلے انھوں نے میری ماں کو بھی اسی طرح جبر سے زیادتی کر کے بے آبرو کیا تھا، جو ان کی حویلی کی پرانی ملازمہ تھی۔ میرے پاپا بھی ان کے ساتھ شکار کھیلنے گئے تھے اور ایک درندے کا شکار ہو گئے تھے۔ انھوں نے چودھری صاحب کی تو جان بچالی تھی مگر خود اپنی جان ان پر قربان کر دی تھی۔ یہ ہمیں اس ایثار و قربانی اور خدمت گزاری کا یہ صلہ دے رہے ہیں کہ بے آبرو کر رہے ہیں۔ اور بے غیرتی کی انتہا ہے کہ اپنی بیٹی کو بھی اپنی ہوس کا شکار بنا رہے ہیں۔“ رادھا نے زار و قطار روتے ہوئے بتایا۔

”چودھری دیوداس، تمھیں اپنی ہوس کے پیچھے اپنے خون کی سچائی اور جذبات کی صداقت اور رشتوں کے تقدس کا بھی خیال نہیں رہتا۔ رادھا تمھاری بیٹی ہے۔ یہ تمھارا خون ہے جو تمھارے نطفے سے پیدا ہوئی ہے۔ تم اپنی بیٹی کو بھی ہوس کا شکار بنا رہے ہو۔ لاکھ لعنت ہے تم پر۔“ میں نے انتہائی حیرت سے چودھری کو لعنت دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ حرام کی اولاد ہے۔ میری بیٹی کیسے ہوئی۔“ چودھری نے نفرت سے کہا۔

”کیا تم نے رادھا کے باپ کے مرنے کے بعد اس کی ماں کو بے آبرو نہیں کیا تھا۔ تبھی تو رادھا کہہ رہی ہے کہ وہ تمھاری بیٹی ہے۔“ میں نے رادھا کی بھرپور وکالت کرتے ہوئے کہا۔

”عورت تو بے وفا، ہرجائی اور بے حیا ہوتی ہے۔ اس کا کیا بھروسہ۔ کس کس کے ساتھ اپنی راتیں رنگین کرتی ہے اور کس کس سے محبت جتاتی ہے اور دن رات کس کس کے ظلم و جبر اور زیادتی کا نشانہ بنتی ہے۔“ چودھری نے عورت کی تذلیل کی تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔

”چودھری اپنی زبان کو لگام دے۔ عورت تو تیری ماں، بہن، بیوی اور بیٹی بھی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سب بھی بے وفا، ہرجائی، بے حیا اور عیاش ہیں۔ وہ بھی تو کس کس کے ساتھ اپنی راتیں رنگین کرتی ہوں گی۔ وہ بھی تو کس کس سے محبتیں نبھاتی ہوں گی اور تمھاری طرح ان کی مجبوریوں سے کوئی نہ کوئی فائدہ اٹھاتا ہوگا۔ خبردار آج کے بعد اگر تم نے اپنی زبان یا اپنے کسی عمل اور حرکت سے کسی عورت کی توہین کی۔ مجھے آئندہ ذرا سی بھی شکایت ملی تو میں تجھے بھرے بازار میں ننگا کر دوں گی اور تیری ایک ایک بات اور راز سے پردہ اٹھا دوں گی۔ پھر تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ لوگ تیری عزت کرنا چھوڑ دیں گے۔ تجھے چودھری سے چمار بنا کر گدھے پر بٹھا کر پورے گاؤں میں تیرا کالا منہ کر کے پھرائیں گے۔ اور اسی حالت میں تیری تصویریں اخبارات میں شائع کروا دوں گی۔“ میں نے بہ مشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس دوران میں نے اپنی جون بھی بدل لی تھی۔ رادھا میرے سینے سے چپٹی ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اور آنکھیں نیچے کی طرف جھکی ہوئی تھیں۔ اس کی نظر میرے چہرے پر نہیں پڑی۔ میری بدلی ہوئی جون دیکھ کر چودھری کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کے قدموں تلے کی زمین کھسک گئی۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ ایک انسان

اور خصوصاً کمزور انسان پر تو اپنی طاقت آزما سکتا ہے، اپنا حکم چلا سکتا تھا مگر ایک ماورائی مخلوق پر نہیں۔ ایک نادیدہ طاقت کو وہ اپنے بس میں نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مافوق الفطرت شے کو اپنے نوکروں اور چاکروں سے دھکے دے کر باہر نہیں نکلوا سکتا تھا۔ وہ انتہائی سنجیدہ ہو گیا اور بے حد خوف زدہ بھی۔

”مجھے کیا کرنا ہے۔ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ چودھری نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

”سب سے پہلے تو تمھیں رادھا کی ماں سے علانیہ شادی کرنا ہوگی۔ اس کے بعد رادھا کو اپنی حقیقی بیٹی مان کر اسے اپنانا ہوگا اور مان سمان دینا ہوگا۔ اس کے بعد شنکر اور اس کے گھر والوں کی گروی چیزیں، مکان، زمین وجائیداد کے کاغذات اور زیورات واپس کرنے ہوں گے۔“ میں نے رادھا کو چودھری کی طرف جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے منظور ہے۔ میں رادھا کی ماں سے شادی کرلوں گا اور رادھا کو اپنی بیٹی بھی مان لوں گا۔ ان لوگوں کا ہر طرح خیال رکھوں گا اور روپے پیسے سے بھی مدد کرتا رہوں گا لیکن میں یہ شادی گاؤں والوں سے خفیہ رکھوں گا۔ مجھے اتنی سی چھوٹ دے دی جائے۔“ چودھری دیوداس نے زمین پر شمیکا کی جناتی طاقت کے سامنے اپنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔ وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

”میں ابھی شنکر اور اس کے گھر والوں کی گروی چیزیں نکالتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی الماری کھولی، گروی چیزیں اور کاغذات سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔

”مزید کیا حکم ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ شنکر کے گھر۔ یہ گروی چیزیں دینے کے لیے اور ہاں تمھیں ان کے عوض تمھاری رقم سود سمیت مل جائے گی۔ کیوں کہ ہم بھی کسی کا حق ضائع نہیں کرتے اور نہ کسی پر بے وجہ ظلم۔“ میں نے چودھری کو گھور کر دیکھا تو اس نے رادھا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور سارا سامان لے کر میرے ساتھ چلنے لگا۔ میں نے رادھا کو پیار بھرے انداز میں دلاسا دیتے ہوئے رخصت کر دیا۔ اور اسے کسی بھی قسم کی فکر نہ کرنے کو کہا۔ وہ بہت خوش، مطمئن اور شاداں ہو کر اپنے گھر لوٹ گئی تھی۔

”اس کے بعد کی روداد خود تم نے ملاحظہ کی تھی۔“ شمیکا کے منہ سے چودھری دیوداس کے کالے کرتوتوں کا سن کر میرے کانوں کی کٹیرے جھڑ گئے۔ میں حیران تھا کہ کوئی شخص ہوس کے ہاتھوں اس قدر پستی میں بھی گر سکتا ہے۔ شمیکا نے ایک کچے مکان کے سامنے رک کر اس کے دروازے پر دستک دی تو میں خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اس سے پہلے کہ میں شمیکا سے پوچھتا کہ کیا یہ عامل بابا کا گھر ہے؟ اس نے دروازے کھول دیا تھا۔ سامنے عامل بابا کھڑے تھے۔ وہ ایک نظر میں ہم دونوں کو پہچان گئے تھے۔

”آؤ بچو آؤ، اندر آجاؤ۔“ عامل بابا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ میں اور شمیکا گھر میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہ ایک جھونپڑی تھی، جس میں ایک گدڑی، ایک تکیہ، ایک پانی کا مٹکا اور چکنی مٹی کا پیالہ رکھا تھا۔ طاق میں دو چار کتابیں بھی تھیں۔

”بابا! ہم صرف رینا کے بارے میں معلومات کرنے آئے ہیں۔ کیا ہوا رینا کا۔ کیا وہ لوگ پکڑے گئے، جنھوں نے رینا کو اغوا کیا تھا اور جنگل میں لے گئے تھے۔ کیا ان کے گروہ کا پتا چلا کہ وہ لوگ کون تھے۔ ان کا پیشہ لڑکیوں کو اغوا کر کے تاوان وصول کرنا تھا، یا ان کو ہوس کی بھینٹ چڑھانا، یا پھر وہ ان لڑکیوں کو قتل کر دیتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انھیں دیارِ غیر لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہوں، جو، ان سے جسم فروشی کراتے ہوں، یا ان پر جنسی تشدد کرتے ہوں۔“

ہمارے ہر سوال پر عامل بابا مسکرا مسکرا کر ہمیں دیکھتے رہے۔ ہم چپ ہوئے تو وہ بولے۔

”ان تمام باتوں کا خدشہ تھا مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ لوگ اسی گاؤں کے تھے اور اپنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وڈیرے کے حکم پر رینا کو اٹھالے گئے تھے۔ وہ اس کی عزت لوٹنا چاہتے تھے، نہ اسے قتل کرنا۔ اور نہ ہی کسی دیارِ غیر کے لوگوں کو فروخت کرنا۔ اسے اغوا برائے تاوان کے لیے بھی نہیں اٹھایا گیا تھا۔" عامل بابا نے تمام خدشات رد کردیئے تو ہمیں حیرت ہوئی۔

"بابا پھر کس لیے رینا کے ساتھ وہ ایسا سلوک کررہے تھے۔" ہم دونوں کی زبان سے بیک وقت نکلا۔

"دراصل رینا اپنے کالج کے پرنسپل کا ایک راز جان گئی تھی۔ اس لیے وہ لوگ رینا سے سچ بات اگلوانے کے لیے اور اس راز کو راز رکھنے کے لیے اسے ٹارچر کرنے کو وہاں لے کر گئے تھے۔" عامل بابا نے الگ ہی بات بتائی۔

"کیسا راز بابا۔" شمیکا نے پوچھا۔

"دراصل پرنسپل کو اس عہدے پر ترقی دے کر سفارش کے ذریعے لانے والا اس گاؤں کا وڈیرا ہے۔ وڈیرا سائیں نے پرنسپل کی سفارش اس لیے کی تھی کہ پرنسپل اسے ایسی لڑکیوں کی نشان دہی کرتا تھا، جو بدکردار کی ہوتی تھیں اور جن کا چال چلن ٹھیک نہیں ہوتا تھا۔ پرنسپل کی اس نشان دہی پر وڈیرا سائیں بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیتا تھا اور بچا کچا پرنسپل بھی کھا لیتا تھا۔ پرنسپل چوں کہ پڑھا لکھا اور عقل مند تھا۔ اس لیے وہ ایسی لڑکیوں کو شکار کراتا تھا جو اپنی مرضی سے راضی ہوجاتی تھیں اور رقم لے کر چلتی بنتی تھیں۔ وڈیرے سائیں کے پاس پیسوں کی کمی نہیں تھی۔ پرنسپل منصوبے بناتا تھا اور وڈیرا اس پر عمل کرتا تھا۔ ان دونوں کی چالاکی سے یہ لوگ آج تک نہ تو قانون کی گرفت میں آسکے تھے اور نہ ہی بدنامی کا شکار ہوئے تھے۔ ایک روز رینا اپنے کلاس فیلو کے گھر نوٹس لینے کے لیے گئی۔ ان کے امتحانات شروع ہوچکے تھے۔ صبح ان کا پرچہ تھا۔ وہ دونوں امتحان کی تیاری میں رات بھر جاگتے رہے۔ پرنسپل صاحب کے مخبروں نے انھیں اطلاع دی کہ رینا اور راجا بابو رات بھر ایک گھر کے علاحدہ کمرے میں اکیلے رہے ہیں۔ پرنسپل صاحب نے اسے غلط رنگ دیا اور رینا کو بدکردار اور برے فعل کی لڑکی سمجھا۔

دوسرے دن پرنسپل کی نشان دہی پر وڈیرا سائیں کے دو ملازموں نے رینا سے چھیڑ چھاڑ کی اور اسے گناہ کی پیش کش کی۔ رینا غصے میں آگئی اور آپے سے باہر ہوگئی۔ وہ ان کی شکایت کرنے کے لیے پرنسپل کے کمرے میں پہنچی تو وہاں پرنسپل کے ساتھ وڈیرا سائیں بھی موجود تھا۔ رینا کسی سے مرعوب نہیں ہوئی۔ اس نے بلا جھجک اپنی شکایت ظاہر کردی۔ تب پرنسپل کی بے جا حمایت اور وڈیرا سائیں کی وکالت سے اور بے ہنگم گفتگو سے رینا پر یہ راز کھلا کہ وہ دونوں اس گھناؤنے کام میں ملوث ہیں اور ایک دوسرے کی مدد سے یہ شرم ناک سلسلے ایک عرصہ دراز سے چلا رہے ہیں۔ رینا نے اس بات کو افشا کرنے اور پرنسپل کے ساتھ وڈیرا سائیں کو بھی بے نقاب کرنے کی دھمکی دی اور قانون کی مدد لینے کی بات کی تو یہ پیش خیمہ بنا، اس کے اغوا کا۔ اس سے آگے تو تم لوگ وہیں پر موجود تھے۔" عامل بابا نے سکون کا سانس لیا۔

"لیکن بابا! ان لوگوں نے دوبارہ رینا کو تنگ تو نہیں کیا۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں بیٹا! اس دن کی مار اور غائبی طاقت نے ان کے اوسان خطا کررکھے ہیں۔ اب رینا نے بھی کالج جانا چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف سے بے فکر ہوجاؤ۔" عامل بابا نے بے فکری سے کہا۔

"اور بابا! رینا کی سہیلی اپسرا کا کیا ہوا۔ جس کو ہم صحرا کے جن سے چھڑا کر لائے تھے۔ رینا نے بتایا تھا کہ اس کی حالت غیر ہے اور وہ سکتے کے عالم میں ہے، نہ کچھ کھاتی ہے اور نہ کچھ پیتی ہے۔ کیا آپ کو رینا اس کے پاس لے کر گئی تھی۔ میں نے عامل بابا سے ایک اور ادھورے کام کا پوچھا۔

"ہاں بیٹا۔ میں رینا کے ساتھ جاکر اپسرا سے بھی ملا تھا۔" عامل بابا نے بڑے اداس لہجے میں کہا۔

"خیریت تو ہے بابا۔ آپ اس قدر اداس کیوں ہوگئے ہو؟" شمیکا نے پوچھا۔

(بقیہ آئندہ شمارے میں پڑھیے)

Courtesy www.pdfbooksfree.pk